

کلیاتِ پریم چند

8

گٹو دان، منگل سوتر

مرتبہ
مدن گوپال



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)

ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

Kulliyat-e-Premchand-8

Edited by : Madan Gopal

Project Assistant : Dr. Raheel Siddiqui

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جولائی 2002 تک 1924

1100 : پہلا ایڈیشن

172/= : قیمت

1001 : سلسلہ مطبوعات

بشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے، پورم، نئی دہلی 110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈرس، 1397 پھانسی اہلی، بازار منیا محل، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند ایڈیشن منظر عام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو ”کلیات پریم چند“ کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سیٹ کی صورت میں شائع کر رہی ہے۔ ان میں ان کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور ادارے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جا رہے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،

ڈرامے : جلد 15 و جلد 16، خطوط : جلد 17،

متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک، تراجم : جلد 21 و جلد 22

”کلیات پریم چند“ میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسب ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کر کے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

”کلیات پریم چند“ کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقش اول ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کوشش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پائی ہوں گی۔ اس سلسلے میں قارئین کے مفید مشوروں کا خیر مقدم ہے۔

آئندہ اگر پریم چند کی کوئی تحریر / تحریریں دریافت ہوتی ہیں، آئندہ ایڈیشنوں میں ان کو شامل کیا جائے گا۔

اردو کے اہم کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کے انتخاب اور ان کی اشاعت کا فیصلہ قومی اردو کونسل کے ادبی پینل نے پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کی سربراہی میں کیا۔ ادبی پینل نے اس پروجیکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کر کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری رہنمائی کی۔ قومی اردو کونسل ادبی پینل کے تمام ارکان کی شکرگزار ہے۔ ”کلیات پریم چند“ کے مرتب مدن گوپال اور پروجیکٹ اسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح ”کلیات پریم چند“ کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند،

نئی دہلی

فہرست

نمبر شمار	صفحہ نمبر
دیباچہ	
1. گنودان	1-468
2. منگل سوتر	469-515

دیباچہ

گنودان کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یونسکو نے بھی اسے ورلڈ کلاسیکس میں شامل کیا ہے۔ گنودان کی شروعات کی اطلاع پریم چند نے دیا نرائن رقم کو ۲۹ فروری ۱۹۳۲ کے خط میں دی۔ تب کرم بھومی (میدان عمل) چھپ رہا تھا اور غمین کا ترجمہ کیا جا رہا تھا۔ گنودان سے قبل کے سبھی ناول ایک یا دو سال کے عرصے میں لکھے گئے تھے۔ گنودان کو مکمل کرنے میں چار سال سے زیادہ کا وقت لگا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مٹی جی ان دنوں لکھنؤ میں مادھوری کے مدیر تھے اور بنارس سے ہنس بھی نکال رہے تھے۔ پھر بنارس آکر جاگرن کو بھی ہاتھوں میں لیا۔ دونوں رسالوں میں گھانا ہو رہا تھا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۳۴ کو جنیدر کمار کو لکھا ”بھینی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں ہے۔ کنٹریکٹ کی بات ہے۔ سال بھر میں آٹھ ہزار روپیہ۔ میں اس حالت میں پہنچ گیا ہوں جب میرے لیے ہاں کہنے کے سوائے کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو (جو لکھا جا رہا تھا) بازار میں بیچوں“ اس کے بعد پریم چند نے بھینی جا کر فلموں کے مقالے لکھے۔ اس طرح گنودان کی تخلیق کا کام لکھنؤ بنارس اور بھینی میں ہوا۔ بھینی سے واپس آکر اسے ختم کیا۔ مارچ ۱۹۳۶ میں اسے سرسوتی پریس کو دیا۔ ۹ جون ۱۹۳۶ء کو شری مٹی اوشامترا کو لکھا کہ ”گنودان چھپ گیا ہے ہائنڈنگ ہونے پر بھیجوں گا۔“ اگلے دن جنیدر کمار کو لکھا کہ ”گنودان نکل گیا ہے خوب موٹا ہو گیا ہے۔ چھ سو سے اوپر گیا۔ کل تمہارے پاس جائے گا۔“ بارہ دن بعد ”آج گنودان بھیج رہا ہوں۔“ اختر حسین رائے پوری کو بھی لکھا کہ ”میرا ناول گنودان حال ہی میں لکھا ہے اس کی ایک جلد بھیج رہا ہوں، ریویو کرنا۔“

اس ناول کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کا کردار ہوری اور اس کی بیوی دھنیا دیہات کے کسان اور نچلے طبقے کے ان پڑھ غریب اور مذہبی جہات میں پھنسنے لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ زمیندار اور اس کے نمائندے، ساہوکار، مذہبی پیشوا، پٹواری، اور پولیس کے

نمائندے بھی ہیں۔ چینی میل کے ڈائریکٹر، بینک کے منیجر، ڈاکٹر، پروفیسر، اخبار نویس دوسرے کردار ہیں۔ ان کے علاوہ ناول میں شہری زندگی کی بھی جھلک ملتی ہے۔ ہوری روپیہ ادھار لے کر ایک گائے خریدتا ہے۔ جسے اس کا اپنا حاسد بھائی زہر دے دیتا ہے۔ فرض ادا کرتے کرتے ہوری کی حالت دیگر گول ہو جاتی ہے۔ اس کا لڑکا چھپ کر شادی کر لیتا ہے اور شہر چلا جاتا ہے۔ وہاں وہ مزدوری کرتا ہے۔ ہوری بھی آخر میں مزدوری ہی کرتا ہے۔ اور مزدوری کرتے کرتے وہ جان دے دیتا ہے۔ اس کے مرنے وقت صرف ایک دن کی مزدوری کے پیسے ہیں۔ لوگ دھنیا سے کہتے ہیں کہ گودان کی رسم پوری کروادو۔ وہ اس دن کی کمائی برہمن کو دے کر کہتی ہے۔ یہی اس کا گودان ہے۔

پریم چند کی بیوی شورانی دیوی کہتی ہیں کہ گودان (ہندی) کو ختم کر انھیں رونا آگیا اور انھوں نے پریم چند سے پوچھا کہ تم نے ہوری کو کیوں مار دیا؟ (ایسا خیال کچھ قارئین کا بھی ہے۔) گودان (ہندی) جون ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ چھ مہینے میں اس کی دو ہزار جلدیں فروخت ہوئیں اور پہلا ایڈیشن اختتام پر تھا۔ گودان کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے کچھ سروسٹی پریس سے کچھ ہنس پراکاشن سے۔ ۱۹۷۶ء کے ہنس پراکاشن کے ایڈیشن میں پریم چند کے چھوٹے لڑکے امرت رائے نے دیباچے میں لکھا کہ ”مستند متن ابھی تک پیش نہیں کیا گیا۔ اس لیے ہم نے اصل مسودہ اور اوّل ایڈیشن کو ملا کر اور اس کی بنا پر جو متن بازار میں ملتے ہیں ان میں کچھ پھیر بدل کیا ہے۔ اس کام میں مسودوں اور اوّلین ایڈیشن سے بہت مدد ملی ہے۔ پہلے تو ہم نے مسودہ کی اچھی طرح چھان بین کی ہے۔ متن کو ٹھیک کرنے میں کافی سوچ بوجھ سے کام لینا پڑا..... مگر یہ کہنا کہ کتاب لفظ بہ لفظ ایسی ہی چھپی ہے جیسی لکھی گئی تھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ مسودے کی گہری چھان بین کی گئی تو پتہ چلا کہ اس میں بہت سے اغلاط ہیں۔ ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ گودان اس مسودے سے نہیں چھپا اس کے لیے ایک اور مسودہ بنایا گیا ہوگا جو اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔“

اس دیباچے میں امرت رائے نے یہ بھی لکھا کہ ”جب گودان (ہندی) چھپ رہا تھا پریم چند کی بیماری کا آخری دور چل رہا تھا۔ اور پروف دیکھنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ امرت رائے یہ لکھنا بھول گئے کہ بستر مرگ پر وہ اگلا ناول منگل سوتر بھی لکھ رہے تھے۔“ جو بارہ سال بعد شائع ہوا۔

یہ کیفیت تو ہندی ایڈیشنوں کی تھی اب اردو ایڈیشنوں کے بارے میں، کچھ باتیں عرض ہیں۔ کئی ادیبوں نے لکھا ہے اور غیر ضروری انکل بازیاں بھی لگائی ہیں۔ زندگی کے آخری دنوں میں پریم چند کو بالکل فرصت نہیں تھی کہ وہ گوندان کا اردو ترجمہ کرتے۔ اختر حسین رائے پوری کو بستر مرگ پر لکھا کہ ”گوندان کے لیے ایک پبلشر کی تلاش کر رہا ہوں مگر اردو میں تو حالت جیسی ہے وہ تم جانتے ہی ہو بہت ہوا تو ایک روپیہ صفحہ کوئی دے دے گا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد پریم چند نے دم توڑ دیا۔ دیا نرائن نغم نے پریم چند یادگار نمبر میں لکھا ”منشی جی کے تمام قصے اور ناول اردو زبان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ البتہ ان کا آخری ناول گوندان (ہندی) جو ان کی وفات سے چند ہفتہ پہلے شائع ہوا تھا ابھی تک اردو میں منتقل نہیں ہوا۔ مسز پریم چند صاحبہ اور ان کے صاحب زادا اردو میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے مدیر زمانہ کے معرفت لائق مترجم کی تلاش میں ہیں، جو صاحب اس خدمت کو اپنے ذمہ لینا پسند کریں وہ ایڈیٹر زمانہ کانپور کو اپنی شرائط سے مطلع کریں۔ (پریم چند کی وفات کے وقت ان کے دونوں لڑکے کالج میں پڑھ رہے تھے۔ شورانی دیوی ہنس کی ایڈیٹر تھیں اور پریس کا کام بھی دیکھتی تھیں۔) اس کام کے لیے سب سے موزوں مترجم اقبال ورما سحر ہنگامی تھے انھوں نے پریم چند کے پریم آشرم اور رنگ بھوی کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ پریم چند نے اپنی وفات کے دو سال قبل نغم کو لکھا تھا ”میں نے نیجر ہنس کو تاکید کر دی ہے کہ جب میرا افسانہ نہ چھپے وہ اس کی پروف زمانہ کو بھیج دیں اردو ترجمہ کا حق زمانہ کے لیے محفوظ ہے۔ سال میں پانچ چھ سے زائد نہیں لکھتا۔ ہاں سحر صاحب اس کام کے لیے موزوں ہیں۔“ ظاہر ہے مسٹر ہنگامی کی صلاحیت پر انھیں بھروسہ تھا۔

زمانہ فروری ۱۹۳۸ء کے علمی خبریں اور نوٹس میں نغم نے لکھا کہ ہمارے دوست حضرت سحر ہنگامی نے پریم چند آنجنائی کے آخری ناول گوندان (ہندی) کے اردو ترجمے کی خدمت اپنے ذمہ لی تھی۔ لہذا آپ نے اس کا مکمل ترجمہ کر کے پبلشر کے سپرد کر دیا۔ اب گوندان (ہندی) کا اردو ایڈیشن جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے شائع ہوگا۔“ گوندان ۱۹۳۹ء شائع ہوا۔

دوسرے ناول کی طرح گوندان کا پلاٹ بھی انگریزی میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کا خاکہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

1. Hori has two brothers Shobha and Hira. Bhola has two sons Kamta and Jangi and one daughter Jhunia, Who is a Widow. Hori has one son Gobar and two daughters Sona and Rupa. His wife is Jhinki.

2. Shobha is a widower. Hira is hardworking but rash and short temper.

3. Hori purchases the cow. The whole village comes to have a look, Shobha is different but Hira grows jealous. He poisons the cow. Hori seen it, but cannot report him to the police.

4. The whole village goes to the Zamindar to celebrate Dashahra festival. Hori sells his store of barely. He could not hide his face. He wants to increase his territory. Zamindar must be impressed. The party goes to Zamindar. There is a drama A show Dhatri-Yagya. The Zamindar is humane and generous He tells his story. He is also a member of Disst. Board He stands for presidencyship. There are officers to feast and please, endowments to pay. The tenants comes satisfied. Jhunia also comes to the show Gobar proposes. He is not married and marriage means money Jhunia surrenders herself.

5. Jhunia gets a (son कटा हुआ है) daughter, Panchayat. Gobar goes away to Calcutta. Panchayat extorts heavy punishment. For redemption (the कटा हुआ है) Hori has to start on pilgrimage. His hereditary property is mortgaged. He is unable to pay the interest. Gobar does not return. Then Sona is to be married. There is no money, no property. He is a day labourer now. The Girls also

go to work with him. The whole mentality is changed.

6. The property is to be redeemed. The girl is married. The property comes into possession. Then a quarrel with Hori's brothers for Mahua. Hori is beaten. He fights a suit against brothers. The brothers are jailed. Hori enjoys the scene, but in the end takes care of his family.

7. Bhoja's sons separate. Jhunia is dead. His only child. Bhola begins to rear the child. He has surrendered his share to his sons and (becomes a sadhu). The Zamindar takes care of the daughter.

8. zamindar's eldest son is a vakil and a member of council, and also a municipal servant and a natinalist leader. He should be exposed for his hypocrisy, the younger son is a poet and an author with some impulse. He marries Jhunia's daughter. His family out casts him. He is a social worker and is honoured by the tenants.

9. Hori, s younger daughter is sold off. The crops have not failed but they brought only enough for rent. There were cattle to feed, his own mouth to feed. What could he do ? He was Weak. Jhinki was labouring hard to pull on. Then the old man sells off the girl, without knowledge of his wife. He manufactures a Tale to hide his shame.

10. Gobar returns a sobar man. Tell something of his sojourn abroad. Jhunia has been forgotten, but when he has made good deal by doubtful means, his spiritual awakening takes place. He

hurries home.His father is on death bed,but he would not recieve him back. Gobar is retunited to Jhunia.

11. Bhola has brought a widow his wife much younger.He comes to live with Hori.A hut is built for him.He has taken to thieving as he can get no work.Jangi is attracted to this woman and secretly they meet.Then one day the woman gives him up and goes to Jangi.bhola(dies of grief कटा हुआ है) live with Jangi shamelessly for years.At last one one day the wife scolds him for(कटा हुआ है) her and beats him with a broom.This (puts the कटा हुआ है) finishes Bhola.

12 (Gobar कटा हुआ है) Hori drags on a weary and wretched existence.Gobar helps him (every कटा हुआ है) indirectly through his mother who faithfully serves serves the husband.A last his time comes and he expires Gobar gives him a gaudan.

Introduce- agriculture exhibitions,uplift,literary movement,sugar mills,co-operation.

منگل سوتر

پریم چند کا آخری ناول 'منگل سوتر' ان کے پہلے ناول 'اسرار معابد' کی طرح نامکمل تھا۔ 'رنگ بھوی' (چوگان ہستی) کے ناشر دلارے لال بھارگو نے پریم چند کے مضمون جیون سار (ہنس، فروری ۱۹۳۲ء) کو پڑھ کر ان کو صلاح دی تھی کہ وہ اپنی سوانح کی بنا پر ایک ناول لکھیں۔ اس کا عنوان بھی سوچا گیا۔ اس ناول میں پانچ ابواب لکھے جانے تھے، اُس وقت پریم چند اپنے ناول گنودان کی تخلیق میں مصروف تھے۔ جب مارچ ۱۹۳۶ء میں یہ ناول پورا ہوا تو انھوں نے سوانحی ناول کے بارے میں سوچا۔ ناول کے چار ابواب ستمبر ۱۹۳۶ء میں پورے ہوئے۔ ان دنوں وہ سخت بیمار تھے۔ پانچواں باب انھوں نے بول کر لکھوایا۔ یہ کاغذ کے پرزوں پر لکھا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں جوڑ کر ان کے سامنے رکھا جائے گا تب وہ اسے ٹھیک ٹھاک کر کے بھیجیں گے۔ لیکن اس سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ ناول کا یہ حصہ پورا نہ ہو سکا۔ ایک ادیب ڈاکٹر منہر گوپال بھارگو نے لکھا ہے کہ انھوں نے ان کاغذ کے پرزوں کو دلارے لال بھارگو کے پاس خود دیکھا تھا۔ اب یہ گم ہو گئے ہیں۔ اس ناول کی اشاعت کے بارے میں شاید خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔ منگل سوتر ناول میں ہیرو کے بڑے لڑکے کے کردار کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پریم چند کے بڑے لڑکے شری پت رائے نے اس ناول کی اشاعت کی مخالفت کی۔ یہ ناول ۱۹۴۸ء تک شائع نہ ہو سکا۔ تب پریم چند کے چھوٹے لڑکے امرت رائے نے اسے حاصل کر کے اس کی اشاعت کی۔ اس میں پانچ ابواب تو نہیں ہیں مگر کچھ ادیبوں کا خیال ہے کہ پانچویں باب میں ہیرو کے خاندان کے مختلف خیالات کے ارکان کو پھر سے اٹھا کر اکٹھا دکھانا تھا۔ ناول کے مقصد کے لیے شاید یہ رشتہ ضروری نہیں۔ شروع کے دو ابواب میں جو سوال اٹھائے گئے ہیں ان کا جواب تو چوتھے باب میں مل جاتا ہے۔ اس لیے اس ناول کو نامکمل قرار دینا واجب نہیں۔ میں اسے مکمل ناول قرار دیتا ہوں بہر حال یہ موضوع اب بھی بحث کا طالب ہے۔ اس جلد میں منگل سوتر کو اردو رسم الخط میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مدن گوپال

گنودان

ہوری رام نے دونوں بیلوں کو چارا پانی دے کر اپنی بیوی دھنیا سے کہا۔ ”گوبر کو اُدھ گھونٹنے بھیج دینا، میں نہ جانے کب لوٹوں۔ ذرا میری لاشی دے دینا۔“

دھنیا کے دونوں ہاتھ گوبر سے لت پت ہو رہے تھے، اُپلے ہاتھ کر آئی تھی۔ بولی ”ارے کچھ سربت پانی تو کرلو، ایسی جلدی کیا ہے؟“

ہوری نے اپنی تھڑی پڑے ماتھے کو سیٹھ کر کہا۔ ”تجھے سربت پانی کی پڑی ہے، مجھے یہ مھکر ہے کہ دیر ہوگئی تو مالک سے بھینٹ نہ ہوگی انسان دھیان کرنے لگیں گے تو پہروں بیٹھے بیت جائے گا۔“

”اسی لیے تو کہتی ہوں کچھ جل پانی کرلو اور آج نہ جاؤ گے تو کون ہرج ہو جائے گا؟ ابھی تو پرسوں گئے تھے۔“

”تو جو بات سمجھتی نہیں اس میں کیوں ٹانگ اڑاتی ہے؟ میری لاشی دے دے اور اپنا کام دیکھ! یہ اسی ملتے جلتے رہنے کا تو پھل ہے کہ اب تک جان بچی ہوئی ہے، نہیں تو کہیں پتہ بھی نہ لگتا..... کدھر گئے۔ گاؤں میں اتنے آدمی تو ہیں۔ کس کی بیدخلی نہیں ہوئی؟ کس پر کڑکی (قرقی) نہیں آئی؟ جب دوسروں کے پاؤں تلے اپنی گردن دبی ہوئی ہے تو ان کو سہلانے ہی میں بھلائی ہے۔“

دھنیا دنیوی معاملات میں اتنی ہوشیار نہ تھی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ ہم نے زمیندار کے کھیت جوتے ہیں تو وہ اپنا لگان ہی تو لے گا، اس کی خوشامد کیوں کریں؟ اس کے تلوے کیوں سہلائیں؟ اگرچہ اسے اپنی متاہلانہ زندگی کے ان بیس برسوں میں اس بات کا کافی تجربہ ہو گیا تھا کہ چاہے جتنی کتر بیونت کرو، کتنا ہی پیٹ کاٹو، چاہے ایک ایک کوڑی دانت سے پکڑو، پز لگان کا ادا ہو جانا مشکل ہے، پھر بھی وہ ہار نہ مانتی تھی اور اس مسئلے پر آئے دن جھگڑے ہوتے ہی رہتے تھے۔ ان کی چھ اولادوں میں اب صرف تین زندہ تھیں۔ ایک لڑکا گوبر اب کوئی سولہ سال کا تھا۔ دو لڑکیاں تھیں سونا اور روپا۔ ان کی عمر بارہ اور آٹھ سال تھی۔

تین لڑکے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ اس کا دل آج بھی کہتا تھا کہ ان کی دوا دارو ہوتی تو بخ جاتے! مگر وہ ایک دمڑی کی دوا بھی نہ منگا سکی تھی۔ ابھی اس کی عمر بھی کیا تھی؟ چھتیسواں سال ہی تو تھا مگر سر کے سارے بال پک گئے تھے۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ جسم ڈھل گیا تھا۔ خوبصورت گندمی رنگ سانولا پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ یہ سب کچھ پیٹ کی فکر ہی کے سبب تو تھا۔ کبھی تو جینے کا سکھ نہ ملا۔ اس دائمی خستہ حالی نے اس کی خوداری کو بے دلی میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس گریستی میں پیٹ کو روٹیاں بھی نہ مل سکیں، اس کے لیے اتنی خوشامد کیوں؟ ان حالات سے اس کا دل برابر بھڑکتا رہتا تھا اور دوچار جھڑکیاں سن لینے ہی پر اسے اصلیت کا پتہ چلتا تھا۔

اس نے ہار کر ہوری کی لاشی، مرزئی، گپڑی، جوتے، تمباکو کا بٹوا، سب لا کر اس کے سامنے پک دیے۔

ہوری نے اس کی طرف تیوری چڑھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا سرال جانا ہے جو پانچوں پوساک لائی ہے؟ وہاں بھی تو کوئی جوان سالی سرخ نہیں بیٹھی ہے جسے جا کر دکھاؤں۔“

ہوری کے گہرے سانولے پتکے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ دھنیا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”ایسے ہی تو بڑے بچیلے جوان ہو کہ سالی سرخیں دیکھ کر دھجھ جائیں گی۔“

ہوری نے پچھی مرزئی بڑی چوکی سے تہہ کر کے چار پائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو کیا تو سمجھتی ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا؟ ابھی تو چالیس برس بھی پورے نہیں ہوئے۔ مرد ساٹھے پر پاٹھا ہوتا ہے۔“

”جا کر ششے میں منہ دیکھو۔ تم جیسا مرد ساٹھے پر پاٹھا نہیں ہوتا۔ دودھ کھی آنکھیں آنجنے تک کو تو ملتا نہیں، پاٹھے ہوں گے، تمھاری دسا دیکھ دیکھ کر تو میں اور سوکھی جاتی ہوں کہ بھگوان! یہ بڑھاپا کیسے کئے گا۔ کس کے دوارے بھیک مانگیں گے؟“

”ہوری کے وہ عارضی مسکراہٹ حقیقت کے اس آنچ میں گویا جھلس گئی۔ لاشی سنبھلتا ہوا بولا۔ ”ساٹھے تک پہنچنے کی نوبت نہ آنے پائے گی، دھنیا! اس کے پہلے ہی چل دیں گے۔“

دھنیا نے آزر دگی سے کہا۔ ”اچھا رہنے دو، منہ سے اُسھ نہ لکالو، تم سے کوئی اچھی بات بھی کہے تو کو سننے لگتے ہو۔“

ہوری لاشی کندھے پر رکھ کر گھر سے نکلا تو دنیا دروازے پر کھڑی ہوئی اسے دیر تک دیکھتی رہی۔ اس کے بالواسنہ الفاظ نے دنیا کے چوٹ کھائے ہوئے دل میں ہلچل سی پیدا کر دی تھی وہ گویا استری دھرم کے پوری تپیا کے ذریعہ اپنے شوہر کو بلاؤں سے بچائے رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دل سے گویا ایک گڑھ (حصار) سا نکل کر ہوری کو محصور کیے لیتا تھا۔ مصیبت کے اس اتھاہ ساگر میں صرف سہاگ ہی وہ تنکا تھا جس کے سہارے وہ اسے پار کر رہی تھی۔ ہوری کے دل ضمن الفاظ شاید بچ ہونے پر بھی گویا جھکا دے کر اس کے ہاتھ سے اس کمزور سہارے کو چھین لینا چاہتے تھے۔ بلکہ الفاظ کے بچ ہونے کا امکان ہی انھیں اتنا تکلیف دہ بنا رہا تھا۔ کانے کو کانا کہنے سے جو دکھ ہوتا ہے کیا دو آنکھوں والے آدمی کو ہوسکتا ہے؟

ہوری قدم بڑھائے چلا جاتا تھا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف اکیہ کے پودوں کی لہرائی ہوئی ہریالی کو دیکھ کر اس نے دل میں کہا۔ ”بھگوان کہیں ٹھیک برکھا کر دیں اور پیڑ بھی ٹھیک سے رہیں تو ایک گائے جرور لے گا۔ دیسی گائیں تو نہ دودھ دیں اور نہ ان کے بچھڑے ہی کسی کام کے ہوں۔ ہاں بہت ہوا تو تیلی کے کولہوں میں چلے! نہیں، وہ پچھائیں گائے لے گا۔ اس کی پوری سیوا کرے گا۔ کچھ نہیں تو چار پانچ سیر دودھ ہوگا۔ گوہر دودھ کے لیے ترس کر رہ جاتا ہے۔ اس عمر میں نہ کھایا پیا تو پھر کب کھائے گا؟ سال بھر بھی دودھ پا جائے تو دیکھتے بنے۔ بچے بھی اچھے بیل نکلیں گے۔ دوسو سے کم کی جوڑی نہ ہوگی۔ پھر گنوں سے تو دروازے کی سو بھا ہے۔ سیرے سیرے گنوں کے درن ہو جائیں تو کیا کہنا۔ نہ جانے کب یہ سادھ پوری ہوگی، وہ سب دن کب آئے گا؟“

ہر گرجست آدمی کی طرح ہوری کے دل میں بھی گائے رکھنے کی خواہش مدت سے تھی۔ یہی اس کی زندگی کا بہترین خواب، اس کے دل کی سب سے بڑی لگن تھی۔ بینک کے سود سے لطف اٹھانے یا زمین خریدنے یا محل بنانے کے لیے چوڑے منصوبے اس کے تھمے سے دل میں کیسے ساکتے تھے؟

جیٹھ کا سورج آموں کے جھرمٹ سے نکل کر آسمان پر چھائی ہوئی سرخی کو اپنی صاف اور تیز روشنی سے چمکاتا ہوا بلند ہو رہا تھا۔ ہوا گرم ہونے لگی تھی۔ دونوں طرف کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اسے دیکھ کر ”رام رام“، کہتے اور آدر کے ساتھ چلم پینے کے لیے

بلائے مگر ہوری کو اتنی فرصت کہاں تھی؟ اس آدر سے اس کے دل میں رہنے والی عزت کی خواہش، اس کے خشک چہرے پر غرور کی جھلک لاری تھی۔ مالکوں سے ملنے رہنے کا ہی تو یہ پھل ہے کہ آج سب اس کا آدر کرتے ہیں، نہیں تو کون پوچھتا؟ پانچ بجھے کے کسان کی بساط ہی کیا؟ یہ کم عزت نہیں ہے کہ تین تین چار چار مل والے مہو لوگ بھی اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔

اب وہ کھیتوں کے درمیانی راستہ کو چھوڑ کر ایک خیشب میں آگیا تھا جہاں برساتی پانی بھر جانے کے سبب کچھ نمی رہتی تھی اور جینٹھ میں بھی کچھ ہریالی نظر آ جاتی تھیں۔ قریب کے گاؤں کی گائیں وہاں چرنے آیا کرتی تھیں اس اس میں بھی وہاں کی ہوا میں کچھ تازگی اور ٹھنڈک تھی۔ ہوری نے دو تین زور کے سانس لیے۔ جی میں آیا، کچھ دیر یہیں بیٹھ جائے دن بھر تو لو میں مرنا ہی ہے! کئی کسان اس جگہ کا پتہ لکھانے کو تیار تھے، اچھی رقم دیتے تھے مگر بھگوان بھلا کرے رائے صاحب کا، انھوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ زمین چرائی کے لیے چھوڑ دی گئی ہے اور کسی مول پر بھی نہ دی جائے گی۔ کوئی سوار تھی (خود غرض) زمیندار ہوتا تو کہتا، گائیں جائیں بھاڑ میں ہمیں روپے ملتے ہیں، کیوں چھوڑیں؟ مگر رائے صاحب ابھی تک پرانی آن بان نبھائے جاتے ہیں۔ جو مالک رعیت کو نہ پائے وہ بھی کوئی آدمی ہے؟

دھننا اس نے دیکھا کہ بھولا اپنی گائیں لیے اسی طرف چلا آ رہا ہے۔ وہ اسی گاؤں سے ملے ہوئے مزدے کا گولا تھا اور دودھ مکھن کا کاروبار کرتا تھا۔ اچھی قیمت مل جانے پر کبھی کبھی کسانوں کے ہاتھ گائیں بیچ بھی ڈالتا۔ ہوری کا دل گایوں کو دیکھ کر لپکا گیا۔ اگر بھولا وہ آگے والی گائے، اسے دے دے تو کیا کہتا۔ روپے آگے پیچھے لیتا رہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ گھر میں روپے نہیں ہیں۔ ابھی تک لگان نہیں چکایا جاسکا۔ بسیر ساہ کا دینا بھی پڑا ہے جس پر ایک آنہ روپے کا سود چڑھ رہا ہے۔

لیکن مفلسی میں ایک طرح کی کوتاہ اندیشی ہوتی ہے، وہ بے حیائی جو تھا سنا، گالی اور مار سے خوف نہیں کھاتی، اس نے ہوری کو حوصلہ دلایا وہ سادھ جو برسوں سے من میں تھی، اس نے طبیعت کو بے چین کر دیا۔ وہ بھولا کے پاس جا کر بولا۔ ”رام رام بھولا بھائی، کہو کیا رنگ ڈھنگ ہیں؟ سنا ہے اب کی ملے سے نئی گائیں لائے ہو۔“

بھولا نے اس کے دل کی بات تاز لی تھی، رکھائی سے جواب دیا ”ہاں، دو پھیاں اور

دو گائیں لایا۔ پہلے والی گائیں سب سوکھ گئی تھیں۔ بندھی جگہ دودھ نہ پہنچے تو گزر کیسے ہو؟“
 ہوئی نے آگے والی گائے کے پٹھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”دو دھار تو جان پڑتی ہے، کتنی
 میں لی؟“

بھولا نے شان بھائی۔ ”اب کے بازار بہت چڑھا ہوا تھا مہتو، اس کے اتنی روپے
 دینے پڑے۔ آنکھیں نکل آئیں۔ تیس تیس تو دونوں بچھڑوں کے دیے۔ اس پر گاہک روپے
 کا آٹھ سیر دودھ مانگتا ہے۔“

”بڑا بھاری کلیجہ ہے تم لوگوں کا بھائی! لیکن پھر لائے بھی تو وہ مال کہ یہاں دس پانچ
 گاؤں میں تو کسی کے پاس نکلے گا نہیں۔“

بھولا پر نشہ چڑھنے لگا۔ بولا ”بھئی رائے صاحب اس کے نوے روپے دیتے تھے اور
 دونوں کلوروں کے پچاس پچاس، پر ہم نے نہ دیا۔ بھگوان نے چاہا تو سو روپے اسی بیانے
 (جننے) میں پیٹ لوں گا۔“

”اس میں کیا شک ہے بھائی۔ مالک کیا کھا کے لیس گئے؟ بھینٹ نجرانے میں مل
 جائے تو بھلے ہی لے لیں۔ یہ تمہیں لوگوں کا گردہ ہے کہ آنچل بھر روپے بھاگ کے بھرد سے
 کن دیتے ہو۔ یہی جی چاہتا ہے کہ اس گائے کو دیکھتا رہے۔ دھنیہ ہے تمہارا ہیٹا کہ گنڈوں
 کی اتنی سیوا کرتے ہو۔ ہمیں تو گائے کا گوبر بھی میسر نہیں۔ گرہست کے گھر میں ایک گائے
 بھی نہ ہو تو کتنے لاج کی بات ہے۔ سال کا سال بیت جاتا ہے، گنڈوں کے درن نہیں
 ہوتے۔ گھر والی بار بار کہتی ہے، بھولا بھیا سے کیوں نہیں کہتے؟ میں کہہ دیتا ہوں، کبھی ملیں
 گے تو کہوں گا۔ تمہارے سو بھاء سے بڑی کھس رہتی ہے۔ کہتی ہے، ایسا مرد ہی نہیں دیکھا،
 جب بات کریں گے تو نیچی آنکھیں کر کے، کبھی سر نہیں اٹھاتے۔“

بھولا پر جو نشہ چڑھ رہا تھا اس کو اس بھرے ہوئے پیالے نے اور گھبرا کر دیا۔ بولا
 ”بھلا آدمی وہی ہے جو دوسروں کی بہو بیٹی کو اپنی بہو بیٹی سمجھے۔ جو دُشٹ کسی عورت کو تاکہ
 اسے گولی مار دینی چاہیے۔“

”جس طرح مرد کے مرجانے سے عورت بے سہارے ہو جاتی ہے اسی طرح عورت
 کے مرجانے سے مرد کے ہاتھ پاؤں کٹ جاتے ہیں۔ میرا تو گھرا بڑ گیا مہتو، کوئی ایک لونا
 پانی دینے والا نہیں۔“

پار سال بھولا کی عورت لڑ لگ جانے سے مر گئی تھی ، یہ ہوری جانتا تھا لیکن پچاس برس کا کھانکھڑ بھولا اپنے اندر اتنی چکناہٹ رکھتا ہے ، اسے وہ نہ جانتا تھا ۔ عورت کی چاہ میں اس کی آنکھیں آجکوں ہو گئیں ، ہوری کو سہارا مل گیا ! اس کی کاروباری کاشٹکارانہ عقل جاگ اٹھی ۔

” پرانی مثل جھوٹی تموڑی ہے ۔ بن گھرنی گھر بھوت کا ڈیرا ، کہیں سگائی ٹھیک نہیں کر لیتے ؟ “

” تاک میں ہوں مہتو ، پر کوئی پھنستا نہیں ۔ سو پچاس خرچ کر کے بھی تیار ہوں جیسی بھگوان کی مہرجی ۔ “

” اب میں بھی کھوج میں رہوں گا ۔ بھگوان چاہیں گے تو جلدی گھر بس جائے گا ۔ “

” بس یہی سمجھ لو کہ اُبار لو گے بھیا ۔ گھر میں کھانے کو بھگوان کا دیا بہت ہے ۔ چار ہنسیری دودھ روج ہو جاتا ہے ۔ لیکن کس کام کا ؟ “

” میری سسرال میں ایک عورت ہے ۔ تین چار سال ہوئے کہ اس کا آدمی اسے چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا تھا ۔ بے چاری پائی کر کے دن کاٹ رہی ہے ۔ بال بچہ بھی کوئی نہیں ۔ دیکھنے سننے میں بھی اچھی ہے ۔ بس سمجھی سمجھ ۔ “

بھولا کا سکڑا ہوا چہرا جیسے پھول اٹھا ۔ امید میں کتنا امرت ہے ۔ بولا ” اب تو تمہارا ہی آسرا ہے مہتو ۔ چمٹی ہو تو چلو ایک دن دیکھ آئیں ۔ “

میں ٹھیک ٹھاک کر کے تب تم سے کہوں گا ۔ بہت جلدی کرنے سے بھی کام بگڑ جاتا ہے ۔ “

” جب تمہاری کھسی چلو ، جلدی کا ہے کی ! اس کبری گائے پر جی لپٹایا ہو تو لے لو ۔ “

” یہ گائے میرے بس کی نہیں دادا ۔ میں تمہیں کسان نہیں پہنچانا چاہتا ۔ اپنا دھرم یہ نہیں کہ دوستوں کا گلا دبائیں ۔ جیسے اتنے دن بیٹے ہیں دیسے اور بھی بیت جائیں گے ۔ “

” تم تو ایسی باتیں کرتے ہو ہوری جیسے ہم تم دو ہیں ۔ تم گائے لے جاؤ ۔ دام جو چاہے دے دینا ۔ جیسے میرے گھر دیے تمہارے گھر ۔ اتنی میں لی تھی تم اتنی ہی دے دینا ، جاؤ ۔ “

” میرے پاس نگد نہیں ہے دادا ۔ سمجھ لو “

”تم سے نگد مانگتا کون ہے بھائی!“

ہوری کا سینہ گز بھر کا ہو گیا۔ اسی روپے میں گائے مہنگی نہ تھی۔ ایسا اچھا ڈیل ڈول، دونوں وقت میں چھ، سات سیر دودھ اور پھر سیدھی ایسی کہ ایک بچہ بھی دودھ لے۔ اس کا تو ایک ٹھنڈا سوکا ہوگا۔ دروازے پر بندھے گی تو سو بھا بڑھ جائے گی۔ اسے ابھی کوئی چار سو روپے دینے تھے۔ لیکن ادھار کو ایک طرح سے مفت سمجھتا تھا۔ کہیں بھولا کی سگائی ٹھیک ہوگئی تو وہ بولے گا بھی نہیں۔ سگائی نہ بھی ہوئی تو ہوری کا کیا بگڑتا ہے یہی تو ہوگا کہ بھولا بار بار تقاضا کرنے آئے گا، بگڑے گا، گالیاں دے گا مگر ہوری کو اس کی زیادہ شرم نہ تھی۔ اس برتاؤ کا وہ عادی تھا۔ کسان کی زندگی کا تو یہ چڑھاوا ہے۔ بھولا کے ساتھ وہ دعا کر رہا تھا اور ایسا کرتا اس کی شان کے شایان نہ تھا۔ اب بھی لین دین میں اس کے لیے لکھا پڑھی ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق نہ تھا۔ قحط اور سیلاب کی بلائیں اس کے دل کو کمزور بناتی رہتی تھیں۔ خدا کی قہر آلود شکل ہمیشہ اس کے سامنے رہتی تھی۔ مگر یہ دعا اس کے خیال میں دعا نہ تھی۔ یہ صرف اپنا مطلب گانھنا تھا اور یہ کوئی بُری بات نہ تھی، ایسی دعا تو وہ دن رات کرتا رہتا تھا۔ گھر میں دو چار روپے پڑے رہنے پر بھی مہاجن کے سامنے قسمیں کھا جاتا تھا کہ ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ سن کو کچھ نم کر دینا اور روٹی میں کچھ بنولے بھر دینا اس کے دھرم میں جائز تھا۔ اور یہاں تو صرف خود غرضی نہ تھی، تھوڑا سا دل بہلاؤ بھی تھا۔ بوزھوں کی بدشوقی ہنسنے کی چیز ہو اور ایسے بوزھوں سے اگر کچھ اینٹھ بھی لیا جائے تو کوئی گناہ نہیں۔

بھولانے گائے کے گلے کی ڈور ہوری کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ”لے جاؤ مہتو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ بیاجتے ہی چھ سیر دودھ لے لینا۔ چلو میں تمہارے گھر تک پہنچا دوں۔ شاید تمہیں انجان سمجھ کر راہ میں کچھ تنگ کرے۔ اب تم سے سچ کہتا ہوں کہ مالک بنے روپے دیتے تھے۔ پر ان کے یہاں گنڈوں کی کیا گزر؟ مجھ سے لے کر کسی حاکم حکام کو دے دیتے۔ حاکموں کو گنڈوں کی سیوا سے کیا مطلب؟ وہ تو کھون چوسنا جانتے ہیں۔ جب تک دودھ دیتی، رکھتے، پھر کسی کے ہاتھ بیچ ڈالتے۔ کس سے پالا پڑتا کون جانے؟ روپیہ ہی سب کچھ نہیں ہے بھیا، کچھ اپنا دھرم بھی تو ہے تمہارے گھر آرام سے رہے گی تو۔ یہ تو نہ ہوگا کہ تم آپ کھا کر سو رہو اور گائے بھوکی کھڑی رہے۔ اس کی سیوا کرو گے، اسے پیار کرو گے، چکا رو گے، گنڈا ماتا ایس دے گی۔ تم سے کیا کہوں بھیا، گھر میں چنگی بھر بھی بھوسا

نہیں رہا۔ روپے سب بھار میں اٹھ گئے۔ سوچا تھا مہاجن سے کچھ لے کر بھوسہ لے لیں گے، پر مہاجن کا پہلا روپیہ ہی نہیں چکا۔ اس نے انکار کر دیا۔ اتنے جانوروں کو کیا کھلائیں، یہی بھکر مارے ڈالتی ہے۔ چنگی چنگی بھر کھلاؤں تو من بھروج لگے۔ بھگوان ہی پار لگادیں۔“

ہوری نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔ ”تم نے ہم سے پہلے کیوں نہ کہا؟ ہم نے ایک گاڑی بھوسہ بیچ دیا۔“

بھولانے پیشانی ٹھوک کر کہا۔ ”اسی لیے نہیں کہا بھیا، کہ سب سے اپنا دکھڑا کیوں روویں؟ بانٹنا کوئی نہیں، ہنٹے سب ہیں۔ جو گائیں دودھ نہیں دیتیں ان کا دکھ نہیں، حتیٰ سخی کھلا کر جلا لوں گا۔ پر اب یہ تو رات بننا نہیں رہ سکتی۔ ہو سکے تو دس بیس روپے بھوسے کے لیے دے دو۔“

کسان پکا سوار تھی ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں اس کی گانٹھ سے رشوت کے پیسے بڑی مشکل سے نکلتے ہیں۔ بھاد تاؤ میں بھی وہ چوکس ہوتا ہے، سود کی ایک ایک پائی چھڑانے کے لیے وہ مہاجن کی گھنٹوں خوشامد کرتا ہے جب تک پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی کے بہکانے میں نہیں آتا، لیکن اس کی ساری زندگی قدرت کا پورا ساتھ دیتے ہوئے گزرتی ہے۔ بیڑوں میں پھل کھتے ہیں جنھیں سب کھاتے ہیں، کھیتوں میں اناج ہوتا ہے جو دنیا کے کام آتا ہے، گائے کے تھن میں دودھ ہوتا ہے۔ جسے وہ خود پینے نہیں جاتی بلکہ دوسرے ہی پیتے ہیں، بادل سے پانی برستا ہے جس سے زمین آسودہ ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں مذموم خود غرضی کی گنجائش کہاں؟ ہوری کسان تھا اور کسی کے جلتے ہوئے گھر میں ہاتھ سینکنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ بھولا کا دکھڑا سنتے ہی اس کی طبیعت بدل گئی، ڈور بھولا کے ہاتھ میں واپس کرتا ہوا بولا ”روپے تو دادا میرے پاس نہیں ہیں، ہاں تھوڑا سا بھوسا بچا ہے وہ تمہیں دوں گا چل کر اٹھالو۔ بھوسے کے لیے تم گائے بچو گے اور میں لوں گا، میرے ہاتھ نہ کٹ جائیں گے!“

بھولانے بھرے گلے سے کہا ”تمہارے بیل بھوکوں نہ مریں گے؟ تمہارے پاس ہی ایسا کون بہت سا بھوسہ رکھا ہے۔“

”نہیں دادا اب کی بھوسہ اچھا ہو گیا تھا۔“

”میں نے تم سے تاحک بھوسے کی چرچا کی تھی۔“

”تم نہ کہتے اور پیچھے سے مجھے معلوم ہوتا تو بڑا رنج ہوتا کہ تم نے مجھے اتنا گیر سمجھ لیا۔
مؤ کے پر بھائی کی مدد بھائی نہ کرے تو کام کیسے چلے؟“

”ابھی گائے کو تو لیتے جاؤ۔“

”کبھی نہیں دادا، پھر لے لوں گا۔“

”تو بھوسے کے دام دودھ میں کٹوا لینا۔“

ہوری نے غمگین لہجے میں کہا۔ ”دام کوڑی کی اس میں کون بات ہے، دادا؟ میں ایک
دو جون تمہارے گھر کھالوں تو تم مجھ سے دام مانگو گے؟“

”لیکن تمہارے تیل بھوکوں مرے گے کہ نہیں؟“

”بھگوان کوئی نہ کوئی راہ نکالیں گے۔ اساتھ سر پر ہے۔ کربی بولوں گا“

”مگر یہ گائے تمہاری ہو گئی جب چاہو آکر لے جانا۔“

”کسی بھائی کا لیلام پر چڑھا ہوا تیل لینے میں جو پاپ ہے وہی اس سے تمہاری

گائے لینے میں ہے۔“

ہوری میں بال کی کھال نکالنے کی طاقت ہوتی تو وہ خوشی سے گائے لے کر گھر کی راہ
لیتا۔ بھولا جب نقد روپے نہیں مانگتا تو ظاہر تھا کہ وہ بھوسے کے لیے گائے نہیں بیچ رہا تھا
اس کا منشا کچھ اور ہے۔ لیکن جیسے پتوں کے کھڑکنے سے گھوڑا اچانک رک جاتا ہے اور
مارنے پر بھی نہیں بڑھتا وہی حالت ہوری کی تھی۔ مصیبت کی چیز لینا پاپ ہے یہ بات جنم
دن سے اس کے دل کا جزو بن گئی تھی۔

بھولا نے پوچھا ”تو کسی کو بھیج دوں بھوسے کے لیے؟“

ہوری نے جواب دیا ”ابھی میں رائے صاحب کی ڈیوڑھی پر جا رہا ہوں، وہاں سے
گھڑی بھر میں لوٹوں گا تب کسی کو بھیجنا۔“

بھولا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، بولا ”تم نے آج مجھے اُبار لیا ہوری بھائی! مجھے
اب معلوم ہوا کہ میں سنسار میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرا بھی کوئی ساتھی ہے۔“ ایک لمحے کے
بعد اس نے پھر کہا ”اُس بات کو بھول نہ جانا۔“

ہوری آگے بڑھا تو اس کا دل خوش تھا، طبیعت میں ایک عجیب زندہ دلی تھی۔ کیا ہوا
دس پانچ من بھوسہ چلا جائے گا، بے چارے کو مصیبت میں پڑ کر اپنی گائے تو نہ بچتی پڑے

گی۔ جب پاس چارہ ہو جائے گا تب گائے کھول لاؤں گا۔ بھگوان کرے مجھے کوئی عورت مل جائے پھر تو کوئی بات ہی نہیں۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو وہی کبری گائے دم سے کھیاں اڑاتی، سر ہلاتی مستانہ وار آہستہ آہستہ جھومتی چلی جاتی تھی، جیسے لونڈیوں کے بیچ میں کوئی رانی ہو۔ کیسا مبارک ہوگا وہ دن جب وہ گائے اس کے دروازہ پر بندھے گی۔

سمری اور بیلاری دونوں صوبہ اودھ کے گاؤں ہیں۔ ضلع کا نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہوری بیلاری میں رہتا ہے اور رائے صاحب اگر پال سنگھ سمری میں، دونوں گاؤں میں صرف پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ پچھلی ستیہ گرہ کی لڑائی میں رائے صاحب نے بڑا نام کمایا تھا۔ کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل گئے تھے۔ جہی سے ان کے علاقوں کے آسامیوں کو ان سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی۔ یہ نہیں کہ ان کے علاقے میں آسامیوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت کی جاتی ہو یا تاوان، بیگار کی سختی کچھ کم ہو، مگر یہ ساری بدنامی مختاروں کے سر تھی۔ رائے صاحب کی نیک نامی میں بے نہ لگ سکتا تھا۔ وہ بے چارے بھی تو اسی ضابطہ کے غلام تھے۔ ضابطے کا کام تو جیسے ہوتا چلا آیا ہے ویسا ہی ہوگا۔ رائے صاحب کی شرافت اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکتی تھی۔ اس لیے آمدنی اور اختیارات میں بے بھر کی کمی نہ ہونے پر بھی ان کی نیک نامی میں منوں اضافہ ہو گیا تھا۔ آسامیوں سے وہ ہنس کر بولتے تھے، یہی کیا کم تھا؟ شیر کا کام تو شکار کرنا ہے۔ اگر وہ گر بنے اور غزانے کے بجائے میٹھی بولی بول سکتا تو اسے گھر بیٹھے من چاہا شکار مل جاتا، شکار کی کھوج میں اسے جنگل میں نہ بھٹکنا پڑتا۔

رائے صاحب قوم پرست ہونے پر بھی حاکموں سے میل جول قائم رکھتے تھے۔ ان کی نظریں اور ڈالیاں جیوں کی تیوں چلی جاتی تھیں۔ علم ادب اور موسیقی سے دلچسپی تھی، ڈرامے کے شائق، اچھے مقرر، اچھے مضمون نگار اور بڑے نشانہ باز تھے۔ ان کی بیوی کو مرے آج دس سال ہو چکے تھے دوسری شادی نہ کی تھی، ہنس بول کر اپنی تنہا زندگی مزے میں کاٹتے رہتے تھے۔ ہوری ڈیوڑھی پر پہنچا تو دیکھا کہ جینھ کے دسہرہ پر ہونے والے دھنش یکپہ کی تیاریاں بڑے زوروں سے ہو رہی ہیں۔ کہیں اسٹج بن رہا ہے، کہیں پنڈال، کہیں مہمان خانہ اور کہیں دکانیں۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی مگر رائے صاحب خود کام میں لگے ہوئے تھے۔ اپنے باپ کی دولت کے ساتھ انھوں نے رام کی بھگتی بھی پائی تھی اور دھنش یکپہ کو ٹانگ کا روپ دے کر اسے مہذب دل بہلاؤ کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ اس موقع پر ان کے دوست احباب اور

حکام سبھی مدعو ہوتے تھے اور علاقے میں دو تین دن بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ رائے صاحب کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ کوئی ڈیڑھ سو سردار ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ کئی چچا تھے، درجنوں چچا زاد بھائی، کئی حقیقی بھائی اور بیسیوں رشتہ کے بھائی۔ ایک چچا رادھاجی کے بڑے بھگت تھے اور برابر بندرادوں میں رہا کرتے تھے۔ بھگتی کے کتنے گیت بنا ڈالے تھے اور وقتاً فوقتاً انھیں چھوا کر دوستوں میں تقسیم بھی کر دیتے تھے۔ ایک اور چچا بھی تھے، جن کو رام سے بڑی عقیدت تھی اور فارسی میں رامائن کا ترجمہ کر رہے تھے۔ ریاست سے سب کے وسیع مقرر تھے۔ کسی کو کوئی کام کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

ہوری باہر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اپنے آنے کی اطلاع کیسے دے کہ یکا یک رائے صاحب اسی طرف آنکلی اور اسے دیکھتے ہی بولے ”ارے تو آگیا ہوری، میں تو تجھے بلانے ہی والا تھا۔ دیکھ، اب کی تجھے راجہ جنک کا مالی بننا پڑے گا، سمجھ گیا نا؟ جس وقت شری جاگی جی مندر میں پوجا کرنے جاتی ہیں۔ اس وقت تو ایک گلدستہ لیے کھڑا رہے گا اور جاگی جی کی بھینٹ کرے گا۔ غلطی نہ کرنا اور دیکھ، آسامیوں سے تاکید کر کے کہہ دینا کہ سب کے سب شگون کرنے آئیں۔ میرے ساتھ کوشی میں آ، تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

وہ آگے آگے کوشی کی طرف چلے، ہوری پیچھے پیچھے چلا۔ وہیں ایک گھنے بیڑ کے سائے میں وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور ہوری کو زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولے۔ سمجھ گیا میں نے کیا کہا؟ کارکن کو تو جو کچھ کرنا ہے وہ کرے گا ہی، مگر آسامی جس قدر دل سے آسامی کی باتیں سنتا ہے کارکن کی نہیں سنتا۔ ہمیں ان ہی پانچ سات دنوں میں بیس ہزار کا بندوبست کرنا ہے، کیسے ہوگا، سمجھ میں نہیں آتا۔ تم سوچتے ہو گے کہ مجھ نکلے کے آدوی سے مالک کیوں اپنا دکھڑا رونے بیٹھے۔ کس سے اپنے من کی کہوں؟ نا جانے کیوں تمھارے اوپر اعتبار ہوتا ہے اتنا جانتا ہوں کہ دل میں مجھ پر ہنسو گے نہیں اور ہنسو بھی تو تمھاری ہنسی میں برداشت کر سکتا ہوں۔ البتہ ان کی ہنسی نہیں سہ سکتا جو اپنے برابر کے ہیں، کیونکہ ان کی ہنسی میں حسد، بغض اور طغ ہے۔ اور وہ کیوں نہ ہنسیں؟ میں بھی تو ان کی تکلیف، مصیبت اور پست حالی پر ہنستا ہوں دل کھول کر تالیاں بجا کر۔ دولت اور ہمدردی میں ہیر ہے۔ ہم بھی دان دیتے ہیں، دھرم کرتے ہیں، لیکن جانتے ہو کیوں؟ صرف اپنے برابر والوں کو نچا دکھانے کے لیے۔ ہمارا دان اور دھرم محض غرور اور خالص غرور ہے۔ ہم میں سے کسی پر ڈگری ہو جائے، کسی کی

قرقی ہو ، بتایا مال گزاری کی علت میں حوالات ہو جائے ، کسی کا جوان لڑکا مرجائے ، کسی کی بیوہ بہو نکل جائے ، کسی کے گھر میں آگ لگے ، کوئی کسی بیسوا کے ہاتھوں آٹو بن جائے یا اپنے آسامیوں سے ہٹ جائے تو اس کے اور سبھی بھائی اس پر نہیں مے اور بغلیں بھائیں مے ۔ گویا انھیں کل دنیا کی دولت مل گئی اور ملیں مے تو اتنی محبت سے گویا ہمارے پسینے کی جگہ خون بہائیں مے ! ارے اور تو اور ، ہمارے چچا زاد ، پھوپھو زاد ، ماموں زاد اور خالو زاد بھائی جوالیسی ریاست کی بدولت مزے اڑا رہے ہیں ، شعر کہہ رہے ہیں اور جوا کھیل رہے ہیں ، وہ بھی مجھ سے جلتے ہیں اور اگر آج مر جاؤں تو گھی کے چراغ جلائیں ۔ میرے دکھ کو دکھ سمجھنے والا کوئی نہیں ۔ ان کی نگاہوں میں مجھے دکھی ہونے کا کوئی حق ہی نہیں ہے ۔ میں اگر روتا ہوں تو غم کا مٹھکا اڑاتا ہوں ! میں اگر بیمار ہوتا ہوں تو مجھے سکھ ہوتا ہے ۔ میں اگر بیاہ کر کے اپنے گھر میں جھگڑا نہیں بڑھاتا تو یہ میری خود غرضی ہے اور اگر بیاہ کر لوں تو وہ عیش پسندی ہوگی ۔ اگر شراب نہیں پیتا تو میری سنبھولی ہے ، شراب پینے لگوں تو وہ رعایا کا خون ہوگی ۔ اگر عیاشی نہیں کرتا تو خشک مزاج ہوں ، عیاشی کرنے لگوں تو پھر کہنا ہی کیا ۔ ان لوگوں نے مجھے عیش و عشرت میں مبتلا کرنے کے لیے کم چالیں نہیں چلیں اور اب تک چلے جاتے ہیں ۔ ان کی یہی خواہش ہے کہ میں اندھا ہو جاؤں اور وہ لوگ مجھے لوٹ لیں اور میرا فرض یہ ہے کہ میں سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھوں ، سب کچھ جان کر بھی گدھا بنا رہوں ۔“

رائے صاحب نے گاڑی آگے بڑھانے کے لیے دو بیڑے پان کھائے اور ہوری کے منہ کی طرف تاکنے لگے گویا اس کے دلی خیالات کو جاننا چاہتے ہوں ۔

ہوری نے ہمت کر کے کہا ” ہم سوچتے تھے کہ ایسی باتیں ہمیں لوگوں میں ہوتی ہیں ، پر جان پڑتا ہے کہ بڑے آدمیوں میں بھی ان کی کمی نہیں ہے ۔“

رائے صاحب نے منہ پان سے بھر کر کہا ” تم ہمیں بڑا آدمی سمجھتے ہو ہمارے نام بڑے ہیں مگر درشن چھوٹے ! غریبوں میں اگر حسد یا دشمنی ہے تو سوار تھ کے لیے پیٹ کے لیے ! ایسی حسد اور دشمنی کو میں معافی کے قابل سمجھتا ہوں ۔ ہمارے منہ کا لقمہ کوئی چمین لے تو اس کے حلق میں انگلی ڈال کر نکالنا ہمارا دھرم ہو جاتا ہے ۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو دیوتا ہیں ۔ بڑے آدمیوں کا حسد اور دشمنی صرف لطف اٹھانے کے لیے ہے ۔ ہم اتنے بڑے آدمی ہو گئے ہیں کہ ہمیں مکاری اور کمینہ پن ہی میں پورا مزا آتا ہے ۔ ہم دیوتا پن کے درجہ پر پہنچ گئے

ہیں جب ہمیں اوروں کے رونے پر ہنسی آتی ہے۔ اسے تم تھوڑی ریاضت نہ سمجھو۔ جب اتنا
 بڑا کہنہ ہے تو کوئی نہ کوئی تو ہمیشہ ہی پیار رہے گا اور بڑے آدمیوں کے روگ بھی بڑے ہوتے
 ہیں۔ وہ بڑا آدمی ہی کیا جسے کوئی چھوٹا عارضہ ہو؟ معمولی بخار بھی آجائے تو ہمیں سرسام کی
 دوا دی جاتی ہے، ذرا سی پھنسی بھی نکل آئے تو وہ زہر باد بن جاتی ہے۔ اب چھوٹے سرجن
 اور منجھولے سرجن اور بڑے سرجن تار سے بلائے جارہے ہیں، مسیح الملک کو لانے دہلی آدمی
 بھیجا جا رہا ہے اور راج وید کو لانے کے لیے کلکتہ۔ ادھر مندر میں درگا پاٹ ہو رہا ہے اور جوتشی
 مہاراج زانچہ دیکھ رہے ہیں اور منتر جنتر والے گرد اپنے کام میں مصروف ہیں۔ راجہ صاحب کو
 جہراج (فرشتہ اچل) کے منہ سے نکالنے کے لیے دوڑ گئی ہوئی ہے۔ حکیم اور ڈاکٹر اس تاک
 میں رہتے ہیں کہ کب ان کا سر دکھے اور کب ان کے گھر میں سونے کی برکھا ہو اور یہ روپے
 تم سے اور تمہارے بھائیوں سے وصول کیے جاتے ہیں، بھالے کی نوک پر! مجھے تو یہی تعجب
 ہوتا ہے کہ کیوں تمہاری آہوں کی آگ ہمیں بھسم نہیں کر ڈالتی، مگر نہیں، تعجب کی کوئی بات
 نہیں۔ بھسم ہونے میں تو بہت دیر نہیں لگتی، تکلیف بھی ذرا ہی دیر کی ہوتی ہے۔ ہم بھو بھو اور
 انگل انگل کر کے جلتے جا رہے ہیں۔ اس بلا سے بچنے کے لیے ہم پولیس کی، حاکموں کی،
 عدالت کی اور وکیلوں کی پناہ لیتے ہیں اور خوبصورت عورت کی طرح سبھی کے ہاتھوں کا کھلونا
 بنتے ہیں۔ دنیا سمجھتی ہے ہم بڑے سکھی ہیں۔ ہمارے پاس علاقے، محل، سواریاں، نوکر چاکر،
 قرض، بیسوائس، کیا نہیں ہیں؟ مگر جس کے دل میں طاقت نہیں، خودداری نہیں وہ اور
 چاہے کچھ ہو انسان نہیں ہے۔ جسے دشمن کے خوف سے رات کو نیند نہ آتی ہو، جس کے دکھ پر
 سب ہنسیں اور رونے والا کوئی نہ ہو، جس کی چوٹی دوسروں کے پیروں کے نیچے دبی ہو، جو
 عیش و عشرت کے نشے میں اپنے کو بالکل بھول گیا ہو، جو حاکموں کے تلوے چاٹتا ہو اور اپنے
 ہاتھوں کا خون چوستا ہو، اسے میں سکھی نہیں کہتا وہ تو دنیا کا سب سے بڑا بدنصیب جاندار
 ہے۔ صاحب شکار کھیلنے آئیں یا دورے پر، میرا فرض ہے کہ ان کی دم کے پیچھے لگا رہوں،
 ان کے ابروؤں پر شکن پڑی اور ہماری جان نکلی۔ انھیں خوش کرنے کے لیے ہم کیا نہیں
 کرتے اگر وہ سب کہنے لگیں تو شاید تمھیں یقین نہ آئے۔ ڈالیوں اور رشوتوں تک خیر غیبت
 ہے، ہم سجدے کرنے کو بھی تیار رہتے ہیں۔ مفت خوری نے تو ہمیں بے ہاتھ بچر کا بنا دیا
 ہے۔ ہمیں اپنی مردست پر ذرا بھی بھروسہ نہیں، صرف افسروں کے آگے دم ہلا کر کسی طرح

انھیں مہریان رکھنا اور ان کی مدد سے اپنی رعایا پر رعب جمانا ہی ہمارا کام ہے۔ چالپوسوں کی خوشامد نے ہمیں اتنا مغرور اور تنگ مزاج بنا دیا ہے کہ ہم سے شرافت، عاجزی اور خدمت سب رخصت ہو گئی ہیں۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر سرکار ہمارے علاقے چھین کر ہمیں اپنی روزی کے لیے محنت کرنا سکھا دے تو ہم پر بڑا احسان ہو اور یہ تو یقینی ہے کہ اب سرکار بھی ہماری حفاظت نہ کرے گی۔ اب ہم سے اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ علامات سے ظاہر ہے کہ ہمارا طبقہ بہت جلد مٹ جانے والا ہے۔ میں اس دن کا خیر مقدم کرنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ ایسور وہ دن جلد لائے! وہ ہمارے اذہار کا دن ہوگا۔ ہم موجودہ حالتوں کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ وہی ہمارا ستیا ناس کر رہی ہیں اور جب تک پونگی کی یہ بیڑیاں ہمارے پیروں سے نہ نکلیں گی تب تک یہ نحوست ہمارے سر پر منزل لاتی رہے گی۔ ہم انسانیت کا وہ درجہ نہ پاسکیں گے جس پر پہنچنا زندگی کا انتہائی مقصد ہے۔“

رائے صاحب نے پھر گوری دان نکالا اور کئی بیڑے منہ میں رکھ لیے کچھ اور کہنے والے تھے کہ ایک چپراسی نے آکر کہا ”سرکار، بیگاریوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے، کہتے ہیں کہ جب تک ہمیں کھانے کو نہ ملے گا ہم کام نہ کریں گے۔ ہم نے دھمکایا تو سب کام چھوڑ کر الگ ہو گئے۔“

رائے صاحب کے ماتھے پر ہل پڑ گئے، آنکھیں نکال کر بولے ”چلو میں ان بد معاشوں کو ٹھیک کرتا ہوں۔ جب کبھی کھانے کو نہیں دیا گیا تو آج یہ نئی بات کیوں؟ ایک آنہ روز کے حساب سے مزدوری جو ہمیشہ ملتی رہی ہے، اسی مزدوری پر انھیں کام کرنا ہوگا، سیدھے کریں یا ٹیڑھے۔“

پھر ہوری کی طرف دیکھ کر بولے ”تم اب جاؤ ہوری، اپنی تیاری کرو۔ جو بات میں نے کہی ہے اس کا خیال رکھنا۔ تمہارے گاؤں سے مجھے کم از کم پانچ سو کی امید ہے۔“

رائے صاحب تھماتے ہوئے چلے گئے۔ ہوری نے دل میں سوچا کہ ابھی یہ کیسی کیسی دھرم کی باتیں کر رہے تھے اور یکایک اتنے گرم ہو گئے۔

سورج سر پر آگیا تھا۔ اس کی تیش سے متاثر ہو کر پیڑوں نے اپنا پھیلاؤ سمیٹ لیا تھا۔ آسمان غبار آلودہ ہو رہا تھا اور سامنے کی زمین کانپتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔

ہوری نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور گھر چلا۔ شگون کے روپے کہاں سے آئیں گے ابھی فکر اس کے سر پر سوار تھی۔

ہوری اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ابھی تک گوبر کھیت میں اکیچہ گوڑ رہا ہے اور دونوں لڑکیاں بھی اس کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ لڑی چل رہی تھی، مگولے اٹھ رہے تھے، زمین چل رہی تھی، جیسے قدرت نے ہوا میں آگ بھردی ہو۔ یہ سب ابھی تک کھیت میں کیوں کام کے پیچھے جان دینے پر تلے ہوئے ہیں؟ وہ کھیت کی طرف چلا اور دوری سے چلا کر بولا ”آتا کیوں نہیں گوبر، کیا کام ہی کرتا رہے گا؟ دوپہر ڈھل گئی، کچھ سوچتا ہے کہ نہیں۔“

اسے دیکھتے ہی تینوں نے کدالیں اٹھالیں اور ساتھ ہو لیے۔ گوبر سانولا، لمبا، اکھرے بدن کا نوجوان تھا جسے اس کام سے دلچسپی نہ معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر خوشی کی جگہ بے اطمینانی اور بے دلی تھی۔ وہ اس لیے کام میں لگا ہوا تھا کہ وہ دکھانا چاہتا تھا کہ اسے کھانے پینے کی کچھ فکر نہیں ہے۔ بڑی لڑکی سوتا شرمیلی لڑکی تھی۔ سانولی، سڈول، تیز اور خوش۔ گاڑھے کی سرخ ساری جسے وہ گھٹنوں سے موڑ کر کمر میں باندھے ہوئے تھی۔ اس کے ہلکے بدن پر کچھ لدی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اور اسے چنگلی کا رنگ دے رہی تھی۔ چھوٹی لڑکی روپا پانچ چھ سال کی چھوکی تھی، میلی، سر پر بالوں کا ایک گھونسلہ سانا ہوا تھا، ایک لنگوٹی کمر میں لگی ہوئی، بڑی شریر اور رونے والی۔

روپا نے ہوری کے پیروں سے لپٹ کر کہا۔ ”کا کا دیکھو میں نے ایک ڈھیلا بھی نہیں چھوڑا۔ بہن کہتی ہے، جا پیڑ تلے بیٹھ۔ ڈھیلے نہ توڑے جائیں گے کا کا تو مٹی کیسے برابر ہوگی؟“

ہوری نے اسے گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا ”بہت اچھا کیا بیٹی، چل گھر چلیں۔“

کچھ دیر اپنی بے دلی کو دبائے رہنے کے بعد گوبر بولا ”یہ تم روج روج مالکوں کی کھسارہ کرنے کیوں جاتے ہو۔ لگان نہ چکے تو پیادہ آکر گالیاں سناتا ہے، بیگار دینی ہی پڑتی

ہے۔ نجر نجرانہ سب تو ہم سے بھرایا جاتا ہے، پھر کسی کو کیوں سلامی کرو؟“

اس وقت یہی خیالات ہوری کے دل میں بھی آرہے تھے۔ مگر لڑکے کے باغیانہ جذبے کو دہاتا ضروری تھا بولا ”سلامی کرنے نہ جائیں تو رہیں کہاں؟ بھگوان نے جب گلام بنا دیا ہے تو اپنا کیا بس ہے؟ اسی سلامی کی برکت ہے کہ دوارے پر چھو نہڑی بنا لی اور کسی نے کچھ نہ کہا۔ گھورے نے دوارے پر کھونٹا گاڑا تھا جس پر کارندہ نے دو روپے ڈانٹر لے لیے تھے۔ تلیا سے ہم نے کتنی مٹی کھودی، کارندہ نے کچھ نہیں کہا، دوسرا کھودے تو نجر دہلی پڑے۔ اپنے مطلب کے لیے سلامی کرنے جاتا ہوں۔ پاؤں میں سنچر نہیں ہے اور سلامی کرنے میں کچھ سکھ ملتا ہے۔ گھنٹوں کھڑے رہو تب مالک کو کہیں خبر ہوتی ہے کبھی باہر نکلتے ہیں کبھی کہلا دیتے ہیں مگر صحت نہیں ہے۔“

گوبر نے طنز سے کہا۔ ”بڑے آدمیوں کی ہاں میں ہاں ملانے میں تھوڑا بہت سکھ ملتا ہے، نہیں تو لوگ مہری کے لیے کیوں کھڑے ہوں؟“

”جب سر پر پڑے گی تب معلوم ہوگا بیٹا، ابھی جو چاہے کہہ لو۔ پہلے میں بھی ایسا ہی سوچا کرتا تھا پر اب معلوم ہوا کہ ہماری گردن دوسروں کے پاؤں تلے دبی ہوئی ہے، اکڑ کر نباہ نہیں ہو سکتا۔“

گوبر باپ پر اپنا غصہ اتار کر کچھ ٹھنڈا ہو گیا اور چپ چاپ چلنے لگا۔ سونا نے دیکھا کہ روپا باپ کی گود میں چڑھی ہے تو حسد ہوا اسے ڈانٹ کر بولی۔ ”اب گود سے اتر کر پاؤں پاؤں کیوں نہیں چلتی پاؤں ٹوٹ گئے ہیں؟“

روپا نے باپ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر ڈھٹائی سے کہا۔ ”نہ اتریں گے جاؤ۔ کاکا بہن ہم کو چڑھایا کرتی ہے کہ تو روپا ہے میں سونا ہوں۔ میرا نام کچھ اور رکھ دو۔“

ہوری نے سونا کو بناوٹی غصے سے دیکھتے ہوئے کہا ”تو اسے کیوں چڑھاتی ہے سونیا؟ سونا تو دیکھنے کو ہے، نباہ تو روپا سے ہوتا ہے۔ روپا نہ ہو تو روپے کہاں سے بنیں بیٹا؟“

سونا نے اپنی بات رکھنے کے لیے کہا ”سونا نہ ہو تو مہر کیسے بنے، نقی کہاں سے آوے کنٹھا کیسے بنے؟“

گوبر بھی اس تفریحی بحث میں شامل ہو گیا۔ روپا سے بولا ”تو کہہ دے کہ سونا تو

سوکھی ہتی کی طرح پیلا ہوتا ہے ”روپا تو اہلا ہوتا ہے جیسے چندر ماں۔“
 سوتا بولی۔ ”بیابہ میں پہلی سازی پہنی جاتی ہے۔ اجلی سازی کوئی نہیں پہنتا۔“
 روپا اس دلیل سے ہار گئی۔ گوہر اور ہوری کی کوئی دلیل اس کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ اس
 نے روٹی آنکھوں سے ہوری کو دیکھا۔

ہوری کو ایک نئی بات سوجھ گئی ”سوتا بڑے آدمیوں کے لیے ہے، ہم گریبوں کے لیے
 تو روپا ہی ہے جیسے جو کو راجا کہتے ہیں، گریبوں کو چھار۔ تو اسی لیے کہ گریبوں بڑے آدمی
 کھاتے ہیں اور جو ہم لوگ کھاتے ہیں؟“
 سوتا کے پاس اس زبردست دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔ ہار کر بولی ”تم سب ایک ہو
 گئے، نہیں روپا کو رلا کر چھوڑتی۔“

روپا نے ہاتھ منکا کر کہا ”اے رام سوتا چھار! اے رام سوتا چھار!“
 اس جیت کی اسے اتنی خوشی ہوئی کہ باپ کی گود میں نہ رہ سکی زمین پر کود پڑی اور
 اچھل اچھل کر یہ رٹ لگانے لگی ”روپا راجا سوتا چھار! روپا راجا سوتا چھار!“
 یہ لوگ گھر پہنچے تو دھنیا دروازے پر کھڑی ان کی راہ دیکھ رہی تھی، خفا ہو کر بولی ”آج
 اتنی دیر کیوں کی، گوہر؟ کام کے پیچھے کوئی جان تھوڑے ہی دے دیتا ہے۔“ پھر شوہر سے
 گرم ہو کر کہا ”تم بھی وہاں سے کمائی کر کے لوٹے تو کھیت پہنچے کھیت کہیں بھاگا جاتا تھا؟“
 دروازے پر کتوں تھا ہوری اور گوہر نے ایک ایک کلسا پانی سر پر ڈالا۔ روپا کو نہلایا اور
 کھانا کھانے گئے۔ جو کی روٹیاں تھیں مگر گریبوں کی سی سفید اور چکنی۔ ارہر کی دال تھی جس
 میں کچا آم پڑا تھا۔ روپا باپ کی تھالی میں کھانے بیٹھی۔ سوتا نے اسے حسد بھری نگاہوں سے
 دیکھا، گویا کہہ رہی تھی ”واہ رے دلار!“

دھنیا نے پوچھا مالک سے کیا بات چیت ہوئی؟“
 ہوری نے لوٹا بھر پانی چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہی تحصیل وصول کی بات تھی اور کیا۔ ہم
 لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑے آدمی بڑے سکھی ہوں گے پر سچ پوچھو تو وہ ہم سے بھی ادھک دکھی
 ہیں۔ ہمیں اپنے پیٹ ہی کی ہٹکر ہے انھیں تمام ہٹکریں گھیرے رہتی ہیں۔“
 رائے صاحب نے اور کیا کیا کہا تھا وہ ہوری کو یاد نہ تھا۔ اس کل بیان کا
 لب لباب ہی اس کے حافظے میں باقی رہ گیا تھا۔

گوبر نے طر سے کہا ”اپنی ریاست دے دیتے ، اپنے کھیت ، بیل ، بیل ، کدالی سب انھیں دینے کو تیار ہیں ۔ کریں گے بدلہ ؟ یہ سب ڈھونگ ہے ، بڑی مُٹ مردی ! جسے دکھ ہوتا ہے وہ درجنوں موٹر نہیں رکھتا ، عطلوں میں نہیں رہتا ، حلوا پوری ، نہیں کھاتا اور نہ تاج رنگ میں پھنسا رہتا ہے ۔ آرام سے راج کا سکھ بھوگ رہے ہیں ، اس پر دیکھی بنتے ہیں !“

ہوری نے جھنجھلا کر کہا ”اب تم سے جُت کون کرے بھائی ؟ ریاست کسی سے چھوڑی جاتی ہے کہ وہی چھوڑ دیں گے ۔ ہمیں کو کھیتی سے کیا ملتا ہے ؟ ہر آدمی کے حساب سے ایک آنہ روح کی بجوری بھی نہیں پڑتی ۔ جو دس روپے مہینے کا بھی نوکر ہے وہ ہم سے اچھا کھاتا پیتا ہے ۔ پر کھیتوں کو چھوڑا تو نہیں جاتا ۔ کھیتی چھوڑ دیں تو اور کریں گے کیا ؟ نوکری کہاں ملتی ہے ! پھر مر جاد بھی تو پالنا ہی پڑتی ہے ۔ کھیتی میں جو مر جاد ہے ، نوکری میں تو نہیں ہے ۔ اسی طرح جمیداروں کا حال بھی سمجھنا ۔ ان کی جان کو بھی تو سینکڑوں لوگ لگے ہوئے ہیں ۔ حاکموں کو رسد پہنچاؤ ، ان کی سلائی کرو ۔ عطلوں کو کھس کرو تارکھ پر مال بھاری نہ چکا دیں تو حوالات ہو جائے ، کڑکی کی نوبت آجائے ۔ ہمیں تو کوئی حوالات نہیں لے جاتا ۔ دو چار گالیاں یا جھڑکیاں ہی تو مل کر رہ جاتی ہیں ۔“

گوبر نے احتجاج کیا ۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ۔ ہم لوگ دانے دانے کو محتاج ہیں ، سموچے بدن پر کپڑے نہیں ہیں ، چوٹی کا پسینہ اڑی تک جاتا ہے تب بھی گجھر نہیں ہوتی ۔ انھیں کیا ، آرام سے گداز مسند لگائے بیٹھے ہیں ، سیکڑوں نوکر چاکر ہیں ، ہجاردوں آدمیوں پر حکومت ہے ، روپے چاہے نہ ہوتے ہوں پر سکھ تو سبھی طرح کا ملتا ہے ۔ روپیہ لے کر آدمی اور کیا کرتا ہے ؟“

”تو تمھاری سمجھ میں ہم اور وہ برابر ہیں ؟“

”بھگوان نے تو سب کو برابر ہی بنایا ہے ۔“

”یہ بات نہیں ہے بیٹا ۔ چھوٹے بڑے بھگوان کے گھر سے بن کر آتے ہیں ۔ دھن بڑی چہیتا سے ملتا ہے ۔ انھوں نے پہلے جنم میں جیسا کام کیا اس کا سکھ اٹھا رہے ہیں ۔ ہم نے کچھ جمع نہیں کیا تو ملے کیا ؟“

یہ سب من کو سمجھانے کی باتیں ہیں ، بھگوان سب کو برابر بناتے ہیں ۔ یہاں جس کے ہاتھ میں لاشی ہے وہ چھوٹوں کو کھل کر بڑا بن جاتا ہے ۔“

”یہ تمہارا بھرم ہے۔ مالک آج کل بھی نت چار گھنٹے بھگوان کا بھجن کرتے ہیں۔“

”کس کے بل پر یہ بھجن اور دان دھرم ہوتا ہے؟“

”اپنے بل پر۔“

”نہیں کسانوں کے بل پر اور مجوروں کے بل پر! یہ پاپ کا دھن چمکے کیسے؟ اسی لیے دان دھرم کرنا پڑتا ہے، بھگوان کا بھجن بھی اسی لیے ہوتا ہے بھوکے ننگے رہ کر بھگوان کا بھجن کریں تو ہم بھی دیکھیں۔ ہمیں کوئی دونوں بون کھانے کو دے تو ہم آٹھوں پہر بھگوان کا بھجن ہی کرتے رہیں۔ ایک دن کھیت میں اودھ گھوڑا پڑے تو ساری بھگتی بھول جائیں۔“

ہوری نے ہار کر کہا ”اب تمہارے منہ کون لگے بھائی؟ تم تو بھگوان کی لیلیا میں بھی ناگک اڑاتے ہو۔“

تیسرے پہر گو بر کدال لے کر چلا تو ہوری نے کہا ”جرا ٹھہر جا بیٹا، ہم بھی چلتے ہیں۔ تب تک تھوڑا بھوسا نکال کر رکھ دو۔ میں نے بھولا کو دینے کے لیے کہا ہے بے چارہ آج کل بہت تنگ ہے؟“

گو بر نے عدول حکمی کے انداز سے دیکھ کر کہا ”اب ہمارے پاس بیچنے کو بھوسہ نہیں ہے۔“

”بیچتا نہیں ہوں بھائی، یوں ہی دے رہا ہوں! وہ سکٹ میں ہے۔ اس کی مدد تو کرنی ہی پڑے گی۔“

”ہمیں تو اس نے کبھی ایک گائے نہیں دے دی۔“

دھنیا ملک کر بولی ”گائے نہیں وہ تو وہ دے رہا تھا! انھیں گائے دے دے گا! آکھیں آئیں گے کو کبھی دودھ تو بھیجا نہیں، گائے دے دے گا! بڑا دینے والا!“

ہوری نے قسم کھائی ”نہیں جوانی کسم اپنی پچھائیں گائے دے رہے تھے ہاتھ تنگ ہے، بھوسہ چارا نہیں رکھ سکے۔ اب ایک گائے بچ کر بھوسہ لینا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا سکٹ میں پڑے آدمی کی گائے کیا لوں۔ تھوڑا سا بھوسہ دیے دیتا ہوں، کچھ روپے ہاتھ آجائیں گے تو گائے لے لوں گا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے چکا دوں گا۔ اس روپے کی ہے مگر ایسی کے آدمی دیکھتا رہے۔“

گو بر نے آڑے ہاتھوں لیا ”تمہارا یہی دھرماتما پن تو تمہاری درگت کر رہا ہے۔ ساپھ تو بات ہے۔ اس روپے کی گائے ہے، ہم سے بیس کا بھوسہ لے لیں، اور گائے دے

دیں۔ ساتھ رہ جائیں گے وہ ہم دھیرے دھیرے دے دیں گے۔“
 ہوری راز دارانہ طور پر مسکرایا ”میں نے ایسی چال سوچی ہے کہ گائے یوں ہی
 ہاتھ آجائے۔ کہیں بھولا کا بیاہ ٹھیک کرنا ہے، بس دو چار من بھوسہ تو اپنا رنگ جمانے بھر کو
 دیتا ہوں۔“

گوبر نے حقارت سے کہا ”تو تم اب سب کا بیاہ ٹھیک کرتے پھر دے گے؟“
 دھنیا نے تیکھی نگاہوں سے دیکھ کر کہا ”اب یہی ایک کام تو رہ ہی گیا ہے۔ نہیں دینا
 ہے ہمیں بھوسہ کسی کو۔ یہاں بھولی بھولا کسی کا ادھار نہیں کھایا ہے۔“
 ہوری نے اپنی صفائی دی ”اگر میری تدبیر سے کسی کا گھر بس جائے تو کون سی
 برائی ہے؟“

گوبر نے چلم اٹھائی اور آگ لینے چلا گیا۔ اسے یہ جھیل بالکل پسند نہ تھا۔
 دھنیا نے سر ہلا کر کہا ”جو ان کا گھر بسائے گا وہ اتنی روپے کی گائے لے کر چپ نہ
 ہوگا، ایک تھیلی گنوائے گا۔“

ہوری نے پچاڑا دیا ”یہ میں جانتا ہوں لیکن اس کی بھلمنسی کو بھی تو دیکھو کہ مجھ سے
 جب ملتا ہے تو تیرا ہی بکھان کرتا ہے، ایسی بھمی ہے، ایسی سلپکے دار۔“
 دھنیا کے چہرے پر آب آگئی۔ ”میں ان کے بکھان کی بھوک نہیں، وہ اپنا بکھان
 دھرے رہیں۔“

بھولا نے محبت کی مسکراہٹ سے کہا ”میں نے تو کہہ دیا کہ بھیتا وہ ناک پر کبھی بھی
 بیٹھنے نہیں دیتی، گالیوں سے تو بات کرتی ہے۔ پر وہ یہی کہے جائے کہ عورت نہیں بھگی ہے۔
 بات یہ ہے کہ اس کی گھر والی بڑے کڑے موہاؤ کی تھی۔ بے چارہ اس کے ڈر سے بھاگا
 بھاگا پھرتا تھا۔ کہتا تھا جس دن تمہاری گھر والی کا منہ تڑکے دیکھ لیتا ہوں اس دن کچھ نہ کچھ
 جرور ہاتھ لگتا ہے۔ میں نے کہا تمہارے ہاتھ لگتا ہوگا، یہاں تو روج دیکھتے ہیں پر کبھی پیسے
 سے بھینٹ نہیں ہوتی۔“

”تمہارے ہاگ ہی کھوٹے ہیں تو میں کیا کروں۔“
 ”لگا اپنی عورت کی برائی کرنے کہ بھکاری کو بھیک تک نہ دیتی تھی، جھازو مارنے
 دوڑتی تھی، لالچن ایسی کہ تک تک اوروں کے گھر سے مامک لاتی تھی۔“

”مرنے پر کسی کی کیا برائی کروں ، مجھے دیکھ کر جل جاتی تھی۔“

”بھولا بڑا گم کھور تھا کہ اس کے ساتھ نباہ کیا۔ اور ہوتا تو بس کھا کر مر جاتا۔ مجھ سے دس سال بڑے ہوں گے بھولا ، پر رام رام پہلے ہی کرتے ہیں۔“

”تو کیا کہتے تھے کہ جس دن تمہاری گھر والی کا منہ دیکھ لیتا ہوں تو کیا ہوتا ہے؟“

”اس دن بھگوان کہیں نہ کہیں سے کچھ بھیج دیتے ہیں۔“

”بہودیس بھی تو ویسی چٹوری آئی ہیں۔ اب کے سبوں نے دو روپے کے کھر بوجے ادھار کھا ڈالے۔ ادھار مل جائے تو انھیں چھتا نہیں ہوتی کہ دینا بھی پڑے گا یا نہیں۔“

”اور بھولا روتے کاہے کو ہیں۔“

گوبر آکر بولا ”بھولا دادا آگئے ، من دمن بھوسہ ہے سو انھیں دے دو ، پھر ان کا بیاہ کھوجنے نکلو۔“

دھنیا نے سمجھایا ”آدمی دوارے پر بیٹھا ہے۔ اس کے لیے کھاٹ واٹ تو ڈال نہیں دی اوپر سے لگے جھنڈانے ، کچھ تو بھلمنسی سیکھو۔ کسالے جاؤ ، پانی بھر کر رکھ دو ، ہاتھ منہ دھوئیں کچھ سربت پانی کرا دو ، مصیبت ہی میں تو آدمی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔“

ہوری بولا ”سربت دربت کا کام نہیں ، کون کوئی مہمان ہیں۔“

دھنیا نے گبڑ کر کہا ”مہمان اور کیسے ہوتے ہیں ؟ روج روج تمہارے دوارے پر نہیں آتے۔ اتنی دور سے دھوپ گھام میں آئے ہیں ، پیاس لگی ہی ہوگی۔ روپیا ! دیکھ ڈبے میں تماکھو ہے کہ نہیں ، گوبر کے مارے کاہے کو بچی ہوگی ، دوڑ کر ایک پیسے کی تماکھو سیٹھانی کی دوکان سے لے لے۔“

بھولا کی آج جتنی خاطر ہوئی اور کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ گوبر نے چار پائی ڈال دی ، سونا سربت بنا لائی ، روپا تمباکو بھر لائی۔ دھنیا دروازے پر کواڑ کی آڑ میں کھڑی اپنے کانوں سے اپنی تعریف سننے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔

بھولا نے چلم ہاتھ میں لے کر کہا ”اچھی گھر نی گھر میں آجائے تو سمجھ لو کہ کچھ بھی آگئی۔“

وہی جانتی ہے کہ چھوٹے بڑے کا آدرستکار کیسے کرنا چاہیے۔“

دھنیا کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی ، فگر اور مایوسی اور مفلسی سے گھرا ہوا دل ان الفاظ میں نرمی اور تسکین کا احساس کر رہا تھا۔

ہوری جب بھولا کا کھانچا اٹھا کر بھوسہ لانے اندر گیا تو دھنیا بھی پیچھے پیچھے چلی۔ ہوری نے کہا ”نہ جانے کہاں سے اتنا بڑا کھانچا مل گیا، کسی بھڑ بھوچے سے مانگ لایا ہوگا۔ من بھرے کم میں نہ بھرے گا۔ دکھانچے دیے تو دو من بھوسا نکل جائے گا۔“

دھنیا خوش تھی، ملامت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی ”یا تو کسی کو نیو نہ دو اور دو بھی تو پیٹ بھر کھلاؤ۔ تمہارے پاس پان پھول لینے تھوڑے آئے ہیں کہ ٹوکری لے کر چلتے، دیتے ہی ہو تو تین کھانچے دے دو۔ بھلا آدمی اپنے لڑکوں کو کیوں نہیں لایا؟ اکیلا کہاں تک ڈھوئے گا جان نکل جائے گی۔“

”تین کھانچے تو میرے دیے نہ دیے جائیں گے۔“
 ”تب کیا ایک کھانچا دے کر ٹالو گے؟ گوہر سے کہہ دو کہ اپنا کھانچا بھر کر ان کے ساتھ چلا جائے۔“

”گوہر ادکھ کوڑنے جا رہا ہے۔“
 ”ایک دن نہ کوڑنے سے ادکھ نہ سوکھ جائے گی۔“
 ”یہ تو ان کا کام تھا کہ کسی کو ساتھ لاتے۔ بھگوان کے دیے دو دو بیٹے ہیں۔“
 ”نہ ہوں گے گھر پر، دودھ لے کر ہاٹ گئے ہوں گے۔“
 ”یہ تو اچھی دل لگی ہے کہ اپنا مال بھی دو اور اسے گھر تک پہنچا دو۔ لاد دے اور لدا دے اور لادنے والا ساتھ دے۔“

”اچھا بھائی کوئی مت جائے، میں پہنچا دوں گی، بڑوں کی سیوا کرنے میں لاج نہیں۔“

”اور تین کھانچے انھیں دے دوں تو اپنے تیل کیا کھائیں گے؟“
 ”یہ سب تو نیوتا دینے سے پہلے ہی سوچ لیتا تھا۔ نہ ہو تو تم اور گوہر دونوں چلے جاؤ۔“
 ”مروت مروت کی طرح کی جاتی ہے، اپنا گھراٹھا کر نہیں دے دیا جاتا۔“
 ”ابھی جھیندار کا پیادہ آجائے تو اپنے سر پر بھوسہ لاد کر پہنچاؤ گے تم، تمہارا لڑکا اور لڑکی سب اور وہاں سایہ من دو من لکڑی بھی چیرنی پڑے۔“

”جھیندار کی بات اور ہے۔“
 ”ہاں وہ ڈنڈے کے ٹل کام لیتا ہے نہ۔“

”اس کے کھیت نہیں جوتے؟“

”کھیت جوتتے ہیں تو لگان نہیں دیتے ہیں۔؟“

”اچھا بھائی جان نہ کھا، ہم دونوں چلے جائیں گے۔ کہاں سے انھیں میں نے بھوسا دینے کو کہہ دیا یا تو چلے ہی گئی نہیں اور چلے گی تو دوڑنے لگے گی۔“

تینوں کھانچے بھوسے سے بھر دیے گئے۔ گوبر کڑھ رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کے برتاؤ پر ذرا بھی اعتبار نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جہاں جاتے ہیں وہیں کچھ نہ کچھ گھر سے دے آتے ہیں۔ دھنیا خوش تھی، رہا ہوئی وہ دھرم اور سوارتھ کے بیچ میں ڈوبتا اترتا جا رہا تھا۔

ہوری اور گوبر مل کر ایک کھانچہ باہر لائے۔ بھولانے فوراً اپنے آنکھو جھکے کی گنڈی بنا کر سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے رکھ کر ابھی بھاگا آتا ہوں، ایک کھانچہ اور لوں گا۔“

ہوری بولا ”ایک نہیں ابھی دو اور بھرے دھرے ہیں۔ اب تمہیں نہ آنا پڑے گا میں اور گوبر ایک ایک کھانچہ لے کر تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں۔“

بھولا متحیر ہو گیا۔ اسے ہوری اپنا بھائی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر معلوم ہوا۔ اسے اپنے دل میں ایک ایسی آسودگی کا احساس ہوا جس نے اس کی پوری زندگی کو تروتازہ کر دیا۔ تینوں بھس لے کر چلے تو آپس میں باتیں ہونے لگیں۔

بھولانے پوچھا ”دھرا آ رہا ہے مالکوں کے یہاں تو بڑی دھوم دھام ہوگی؟“

”ہاں تنبو سامیانہ گڑ گیا ہے۔ اب کے رام لیللا میں میں بھی کام کروں گا۔ رائے صاحب نے کہا ہے کہ مجھے راجا جنک کا مالی بننا پڑے گا۔“

”مالک تم سے بہت کھس ہیں۔“

”ان کی دیا ہے۔“

ایک لمحے کے بعد بھولانے پھر پوچھا ”سکن کرنے کے لیے روپیوں کا کچھ بندوبست کر لیا ہے؟ مالی بن جانے سے تو گھانا نہ چھوٹے گا۔“

ہوری نے منہ کا پسینہ پوچھ کر کہا ”اسی کی چتا تو مارے ڈالتی ہے دادا، اناج تو سب کا سب کھلیان میں مل گیا۔ حمیدار نے اپنا لیا، مہاجن نے اپنا لیا، میرے لیے پانچ سیر اناج بچ رہا۔ یہ بھوسا تو میں نے راتوں رات ڈھو کر چھپا دیا تھا نہیں تنکا بھی نہ بچتا۔ حمیدار تو ایک ہی ہے پر مہاجن تین تین ہیں۔ سیٹھانی الگ، منگرو الگ اور داتا دین پنڈت الگ،

کسی کا بیاج بھی پورا نہ چکا۔ جمیدار کے بھی آدھے روپے دینے سے رہ گئے۔ سیٹھانی سے پھر روپے ادھار لیے تب کام چلا۔ سب طرح کھایت کر کے دیکھ لیا بھٹا کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارا جنم اسی لیے ہوا ہے کہ اپنا لہو بہادریں اور بڑوں کا گھر بھریں، روپیہ کا دونا سود بھر چکا، پر روپیہ جیوں کا تیوں سر پر سوار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سادی گئی میں، تیرتھ برت میں، ہاتھ باندھ کر کھرچ کرو، پر رستہ کوئی نہیں دکھاتا۔ رائے صاحب نے بیٹے کے پیار میں بیس ہزار لٹا دیے، ان سے کوئی کچھ نہیں کہتا، مگر وہ نے اپنے باپ کے کریا کرم میں پانچ ہزار لگائے اس سے کوئی نہیں پوچھتا۔ ویسی ہی آبرو مر جاد تو سب کی ہے۔“

بھولانے درد آمیز لہجہ میں کہا ”بڑے آدمیوں کی برابری کیسے کر سکتے ہو بھائی؟“
 ”آدی تو ہم بھی ہیں۔“

”کون کہتا ہے کہ ہم تم آدی ہیں؟ ہم میں آدمیت ہے؟ آدی وہ ہیں جن کے پاس دھن ہے، بل ہے اور بڈیا۔ ہم لوگ تو بتل ہیں اور جتنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس پر ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا۔ میل کا نام نہیں ہے، ایک کسان دوسرے کے کھیت پر نہ چڑھے تو کوئی اجا پھا کیسے کرے؟ پریم تو سنسار سے اٹھ گیا ہے۔“

بوڑھوں کے لیے ماضی کی راحتوں، حال کی تکلیفوں اور مستقبل کی تباہیوں سے زیادہ دلچسپ اور کوئی موضوع نہیں ہوتا، دونوں دوست اپنا اپنا دکھڑا روتے رہے۔ بھولانے اپنے بیٹوں کی کرتوتیں کہہ سنائیں۔

ہوری نے اپنے بھائیوں کا روتا رویا اور پھر ایک کنوئیں پر بوجھ رکھ کر پانی پینے کے لیے بیٹھ گئے۔ گوبر نے بننے سے لوٹا اور کلسا مانگا اور پانی کھینچنے لگا۔

بھولانے ہمدردی سے پوچھا ”الگ ہوتے ہوئے تو تمہیں بڑا رنج ہوا ہوگا؟ بھائیوں کو تم نے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔“

ہوری کا گلا بھر آیا بولا ”کچھ نہ پوچھو دادا، جی چاہتا تھا کہ کہیں جا کر ڈوب مروں، میرے جیتے جی سب کچھ ہو گیا۔ جن کے لیے اپنی جوانی دھول میں ملا دی وہی میرے مدی ہو گئے اور جھگڑے کی کیا تھی؟ یہی کہ میری گھروالی ہار میں کام کرنے کیوں نہیں جاتی۔ پوچھو مگر دیکھنے والا بھی تو کوئی چاہیے کہ نہیں؟ لینا، دینا، دھرنا، اٹھانا یہ سب کون کرے؟ پھر وہ مگر پریشانی تو نہیں رہتی جھاڑو، رسوئی، چوکا، برتن لڑکوں کی دیکھ بھال، یہ کوئی تھوڑا کام

ہے؟ سو بھا کی عورت گھر سنبھال لیتی کہ ہیرا کی عورت میں یہ ڈھنگ تھا؟ جب سے الگ ہوا، دونوں گھروں میں ایک بون روٹی بنتی ہے۔ نہیں تو سب کو دن میں چار چار بار بھوک لگتی تھی۔ اب کھائیں چار بار تو دیکھوں! اس مالک پن میں گوبر کی ماں کی جو درگت ہوئی وہ میں ہی جانتا ہوں۔ بے چاری اپنی دیورانیوں کے پھٹے پرانے کپڑے پہن کر دن کا نئی تھی۔ خود بھوکی سو رہی ہوگی پر بہوؤں کے لیے جل پان تک کا دھیان رکھتی تھی۔ اپنے تن پر گھنے کے نام کچا دھاگا نہ تھا پر دیورانیوں کے لیے چار چار گھنے بنوائے۔ سونے کے نہ سہی چاندی کے تو ہیں۔ ذرا یہی تھی کہ یہ مالک کیوں ہے۔ بہت اچھا ہوا کہ الگ ہو گئے، میرے سر سے بلا ٹلی۔“

بھولانے ایک لوٹا پانی چڑھا کر کہا ”یہی حال گھر گھر کا ہے بھیتا۔ بھائیوں کی بات ہی کیا، یہاں تو لڑکوں سے بھی نہیں پنتی اور پنتی اس لیے نہیں کہ میں کسی کی کپال دیکھ کر منہ بند نہیں رکھ سکتا۔ تم جو اکیلے گے، چرس پیو گے، گانے کی دم لگاؤ گے مگر آدے گا کس کے گھر سے؟ کھرچ کرنا چاہتے ہو تو کماء پر کمائی تو کسی سے نہ ہوگی، کھرچ دل کھول کر کریں گے۔ بڑا لڑکا کا مٹا سودا لے کر ہاٹ جائے گا تو آدھے پیسے گائب! پوچھو تو کوئی جواب نہیں، جھوٹا جنگی ہے وہ شگیت کے پیچھے متوالا رہتا ہے۔ سانجھ ہوئی اور ڈھول مجیرا لے کر بیٹھ گیا، شگیت کو میں برا نہیں کہتا۔ گانا بجانا عیب نہیں، پر یہ سب کام پھرمت کے ہیں۔ یہ نہیں کہ گھر کا کوئی کام نہ کرو، آٹھوں پہر اسی دھن میں رہو۔ جاتی ہے میرے سر! چارہ پانی میں کروں، گائے بھینس میں دوہوں، دودھ لے کر ہاٹ میں جاؤں، یہ گرتی کا جنجال ہے۔ گز بھرا ہسیانہ اگلتے بنے نہ نگلتے بنے! لڑکی ہے جھنیا وہ بھی نصیب کی کھوٹی۔ تم تو اس کی سگائی میں آئے تھے۔ کتنا اچھا گھر نہ تھا۔ اس کا آدمی بھینسی میں دودھ کی دکان کرتا تھا۔ ان دنوں وہاں ہندو مسلمانوں میں دنگ ہوا تو کسی نے اس کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا۔ گھر ہی چوہٹ ہو گیا۔ اب لڑکی کا وہاں نباہ نہ تھا۔ جاکر لے آیا کہ دوسری سگائی کر دوں گا، پر وہ مانتی نہیں اور دونوں بھادجیس ہیں کہ رات دن اسے جلاتی رہتی ہیں۔ گھر میں مہا بھارت چا رہتا ہے۔ بیچاری پنتا کی ماری یہاں آئی تو یہاں بھی چین نہیں۔“

ان ہی دکھڑوں میں راستہ کٹ گیا، بھولا کا گاؤں تھا تو جھوٹا مگر بہت گلزار، زیادہ تر اہیر ہی بستے تھے اور کسانوں کے دیکھتے ان کی حالت بہت بری نہ تھی۔ بھولا گاؤں کا

کھیا تھا ، دروازے پر بڑی سی چرنی تھی جس پر دس بارہ گائیں ، بھینسیں کھڑی سانی کھا رہی تھیں ، ادھر دالان میں ایک بڑا سا تخت پڑا تھا جو شاید دس آدمیوں سے بھی نہ اٹھتا ۔ کسی کھوئی پر ڈھول لٹک رہی تھی ، کسی پر بھیرا تھا ۔ ایک طاق پر کوئی کتاب بستے میں بندھی رکھی تھی جو شاید رامائن تھی ۔ دونوں بہوئیں سامنے بیٹھی گوہر ہاتھ رہی تھیں اور چھپا چوکھٹ پر کھڑی تھی ۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ناک کے سرے پر بھی سرفخی تھی ، معلوم ہوتا تھا ابھی روکر اٹھی ہے ۔ اس کے بھرے ہوئے تندرست اور سڈول اعضا میں گویا شباب انگڑیاں لے رہا تھا ۔ چہرا بڑا اور گول تھا ، گال پھولے ہوئے ، آنکھیں چھوٹی اور اندر دھسنی ہوئیں ، ماتھا تنگ ، مگر سینے کا ابھار اور جسم کا گدگد اپن آنکھوں کو کھینچ لیتا تھا ۔ اس پر چھپی ہوئی گلابی سازی اور بھی زینت بڑھا رہی تھی ۔ بھولا کو دیکھتے ہی اس نے لپک کر ان کے سر سے کھانچا اتر وایا ۔ بھولا نے ہوری اور گوہر کے کھانچے اتروائے اور چھپا سے بولے ” پہلے ایک چلم بھر لا اور تھوڑا سربت بنالے ، پانی نہ ہو تو کسلا ، میں کھینچ لوں ہوری مہتو کو پہچانتی ہے نہ ؟ “

پھر ہوری سے بولا ” گھر نی بنا گھر نہیں رہتا ، بھیتا ۔ پرانی کہات ہے ۔ ناٹن کھیتی بہوئیں گھر ۔ ناٹے تیل کیا کھیتی کریں گے اور بہوئیں کیا گھر سنبھالیں گی ؟ جب سے اس کی ماں مری ہے جیسے گھر کی برکت ہی اٹھ گئی ، بہوئیں آتا ہاتھ لیتی ہیں پر گرتی چلانا کیا جانیں ؟ ہاں منہ چلانا کھوب جانتی ہیں ! لونڈے کہیں پھڑ پر جے ہوں گے ۔ سب کے سب آلسی ہیں ، کام چور ۔ جب تک جیتا ہوں ان کے پیچھے مرتا ہوں مر جاؤں گا تو آپ سر پر ہاتھ دھر کر روئیں گے ۔ لڑکی بھی ویسی ہی ہے ۔ تھوڑا سا کہنا بھی کرے گی تو بھجننا کر ۔ میں تو سہ لیتا ہوں ، مرد تھوڑے ہی سہے گا ۔ “

چھپا ایک ہاتھ میں بھری ہوئی چلم ، دوسرے میں سربت کا لوٹا لیے بڑی تیزی سے آ پہنچی ۔ پھر رہی اور کسلا لے کر پانی بھرنے چلی ، گوہر نے اس کے ہاتھ سے کسلا لینے کے لیے ہاتھ بڑھا کر چھینتے ہوئے کہا ” تم رہنے دو ، میں بھرے لاتا ہوں ۔ “

چھپا نے کسلا نہ دیا ، کنوئیں کی جگت پر جا کر مسکراتی ہوئی بولی ۔ ” تم ہمارے مہمان ہو ، کہو گے کہ ایک لوٹا پانی بھی کسی نے نہ دیا ۔ “

” مہمان کا ہے سے ہو گیا ، تمہارا پڑوسی ہی تو ہوں ۔ “

” پڑوسی سال بھر میں ایک بار بھی صورت نہ دکھاوے تو مہمان ہی ہے ۔ “

”روح روح آنے سے تو مر جاو بھی نہیں رہتی۔“

جھپٹا ہنس کر ترجمی لگا ہوں سے تاکتی ہوئی بولی ”وہی مر جاو تو دے رہی ہوں! مہینے میں ایک بار آؤ گے تو غنڈا پانی دوں گی، پندرہویں دن آؤ گے تو چلم پاؤ گے، ساتویں دن آؤ گے تو بیٹھے کو باجی دوں گی، روح روح آؤ گے تو کچھ نہ پاؤ گے۔“

”درن تو دو گی؟“

”درن کے لیے پوجا کرنی پڑے گی۔“

یہ کہتے کہتے جیسے اسے کوئی بھولی بات یاد آگئی، اس کا چہرہ اداس ہو گیا، وہ بدھوا ہے اس کے استری پن کی ڈیوڑھی پر پہلے اس کا شوہر محافظ بنا بیٹھا رہتا تھا اور وہ بے فکر تھی اب اس جگہ کوئی نگہبان نہ تھا اس لیے وہ دروازے کو سدا بند رکھتی تھی۔ کبھی کبھی گھر کے سونے پن سے اکتا کر وہ دروازہ کھولتی ہے مگر کسی کو آتا دیکھ کر خوف سے دونوں کواڑ بند کر دیتی ہے۔

گوبر نے کھسا بھر کر نکالا، سب نے شربت پیا اور ایک چلم تمباکو پی کر لوٹ پڑے۔

بھولانے کہا ”کل تم آکر گائے لے جانا گوبر، اس سے تو سانی کھا رہی ہے۔“

گوبر کی آنکھیں ایسی گائے پر لگی ہوئی تھیں اور وہ دل ہی دل میں مست ہوا جاتا تھا۔

گائے اتنی اچھی اور سڈول ہے، اس کا اسے شان و گمان بھی نہ تھا۔

ہوری نے لالچ روک کر کہا ”منگوالوں گا، جلدی کیا ہے؟“

”تھمیں جلدی نہ ہو، ہمیں تو جلدی ہے۔ اسے دروازے پر دیکھ کر تھمیں وہ بات یاد رہے گی۔“

”اس کی مجھے بڑی پھکر ہے دادا۔“

”تو کل گوبر کو بھیج دینا۔“

دونوں نے اپنے اپنے کھانچے سر پر رکھے اور روانہ ہوئے۔ دونوں اتنے خوش تھے گویا بیاہ کر کے لوٹے ہوں۔ ہوری کو تو اپنی دیرینہ خواہش کے پوری ہونے کی خوشی تھی اور وہ بھی بلا پیسے کے! گوبر کو اس سے بھی زیادہ قیمتی چیز مل گئی تھی اس کے دل میں بھی ایک سوئی خننا جاگ اٹھی تھی۔

موقع پاکر اس نے پیچھے کی طرف دیکھا۔ جھپٹا دروازے پر کھڑی تھی۔ امید کی مستی میں بے صبر اور بے قرار!

ہوری کو رات بھر نیند نہیں آئی نیم کے بیڑ تلے اپنی بانس کی چار پائی پر پڑا بار بار تاروں کی طرف دیکھتا تھا۔ گامے کے لیے ایک ناند گاڑنی ہے۔ اس کی ناند بیلوں سے الگ رہے تو اچھا ہو، ابھی تو رات کو باہر ہی رہے گی لیکن چوما سے میں اس کے لیے دوسری جگہ ٹھیک کرنا ہوگی۔ باہر لوگ نظر لگا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ٹوٹا ٹوٹکا کر دیتے ہیں کہ گائے کا دودھ ہی سوکھ جاتا ہے۔ تھن میں ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی، لات مارتی ہے۔ نہیں، باہر باندھنا ٹھیک نہیں اور باہر ناند ہی کون گاڑنے دے گا؟ کارندہ صاحب خیر کے لیے منہ پھیلائیں گے، چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے رائے صاحب کے پاس پھر یاد لے کر جانا تو ٹھیک نہیں۔ کارندے کے آگے میری سنتا ہی کون ہے؟ ان سے کچھ کہوں تو کارندہ ہیری بن جائے، پانی میں رہ کر مگر سے بیر کرنا نادانی ہے۔ اندر ہی باندھوں گا۔ آنگن ہے تو چھوٹا مگر ایک جھوپڑی ڈال لینے سے کام چل جائے گا۔ ابھی پہلا ہی بیانا ہے۔ پانچ سیر سے کم دودھ نہ دے گی۔ سیر بھر تو گوبر ہی کو چاہیے۔ روپیا دودھ دیکھ کر کیسی لپکتی رہتی ہے، اب پیسے جتنا چاہے! کبھی کبھی دو چار سیر مالکوں کو بھی دے آیا کروں گا۔ کارندہ صاحب کی پوجا بھی کرنی ہی ہوگی اور بھولا کے روپے بھی دے دینا چاہیے۔ سگائی کے ڈکھولے میں اسے کیوں ڈالوں؟ جو آدمی اپنے اوپر اتنا بسواس کرے اسے دھوکا دینا بچوں کا کام ہے۔ اتنی روپے کی گائے میرے بسواس پر دے دی ہے، نہیں یہاں کوئی ایک پیسے کو نہیں پیتا۔ سن میں کیا کچھ نہ ملے گا اگر بچیس روپے بھی دے دوں تو بھولا کو ڈھارس ہو جائے۔ دھنیا سے ٹاٹک بتلادیا، چنکے سے گائے لاکر باندھ دیتا تو چکرا جاتی۔ لگتی پوچھنے کس کی گائے ہے، کہاں سے لائے ہو؟ کھوب دک کر کے بتاتا، پر جب پیٹ میں بات پچے بھی۔ کبھی دو چار پیسے اوپر سے آجاتے ہیں انھیں بھی تو نہیں چھپا سکتا۔ اور یہ اچھا بھی ہے اسے گھر کی چٹنا رہتی ہے اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ان کے پاس بھی پیسے رہتے ہیں تو پھر نکھرے بھگوانے لگے، گوبر کچھ آلسی ہے، نہیں تو مگو کی ایسی سیوا کرتا جیسی چاہیے۔ آلسی والی کچھ نہیں ہے، اس عمر میں کون آلسی نہیں

ہوتا؟ میں بھی دادا کے سامنے مڑمشتی کیا کرتا تھا، بچارے پہر رات سے کربلی کاٹنے لگتے، کبھی دوارے پر جھازو لگاتے، کبھی کھیت میں کھاڈ ڈالتے، میں پڑا سوتا رہتا، کبھی جگا دیتے تو میں بگڑ جاتا اور گھر چھوڑ کر بھاگ جانے کی دھمکی دیتا۔ لڑکے جب اپنے ماں باپ کے سامنے بھی جلدگی کا تھوڑا سا سکھ نہ پائیں تو پھر جب اپنے سر پر پڑ گئی تو کیا پائیں گے؟ دادا کے مرتے ہی کیا میں نے گھر نہیں سنبھال لیا؟ سارا گاؤں یہی کہتا تھا کہ ہوری گھر بگاڑ دے گا، لیکن سر پر بوجھ پڑتے ہی میں نے ایسا چولا بدلا لوگ دیکھتے رہ گئے۔ سو بھا اور ہیرا الگ ہی ہو گئے، نہیں آج اس گھر کی اور بات ہوتی۔ تین مل ایک ساتھ چلتے تھے، اب تینوں الگ الگ چلتے ہیں۔ سب سے کا پھیر ہے، دھنیا کا کیا دکھ تھا؟ بے چاری جب سے گھر میں آئی، کبھی تو چین سے نہ بیٹھی۔ ڈولی سے اترتے ہی سارا کام سر پر اٹھالیا۔ اماں کو پان کی طرح پھیرتی رہتی تھی، جس نے گھر کے پیچھے اپنے کو مٹا دیا وہ اگر دیورانیوں سے کام کرنے کو کہتی تھی تو کیا برائی کرتی تھی؟ آخر اسے بھی تو کچھ آرام ملنا چاہیے، پھر بھاگ میں آرام لکھا ہوتا تب تو ملتا۔ تب دیوروں کے لیے مرتی تھی اب اپنے بچوں کے لیے مرتی ہے۔ وہ اتنی سیدھی، گم کھور، بے جھل کپٹ کی نہ ہوتی تو آج سو بھا اور ہیرا جو مچھوں پر تاؤ دیتے پھرتے ہیں، کہیں بھیک مانگتے ہوتے۔ آدی کتنا مطلبی ہوتا ہے! جس کے لیے مرد وہی ہیری بن جاتا ہے۔ ہوری نے پھر پورب کی طرف دیکھا۔ ساہت سہرا ہو رہا ہے۔ گوبر کا بے کو جاگنے لگا؟ نہیں کہہ کے تو یہی سویا تھا کہ میں منہ اندھیرے ہی چلا جاؤں گا، جا کر تاند تو گاڑ ہی دوں، پر نہیں، جب تک گائے نہ آجائے تاند گاڑنا ٹھیک نہیں۔ کہیں بھولا بدل گئے اور کسی کارن سے گائے نہ دی تو سارا گاؤں ہنسے گا کہ چلے تھے گائے لینے! پٹنے نے اتنی پھرتی سے تاند گاڑ دی جیسے اسی کی کسر تھی! بھولا ہے تو اپنے گھر کا مالک پر جب لڑکے سیانے ہو گئے تو باپ کی کہاں چلتی ہے؟ کامتا اور جنگلی اکڑ جائیں تو کیا بھولا اپنے من سے گائے دے دیں گے؟ کبھی نہیں۔

ایک ایک گوبر چوٹ کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا بولا ”ارے یہ تو بھور ہو گیا، تم نے تاند گاڑ دی دادا۔“

ہوری گوبر کے گھسے ہوئے بدن اور چوڑے سینے کی طرف غرور سے دیکھ کر اور دل میں یہ سوچتے ہوئے کہ اگر اسے کہیں دودھ گھی ملتا تو کیسا ہنسا ہو جاتا، بولا ”نہیں ابھی نہیں گاڑی،

سوچا کہ کہیں نہ ملے تو تھک بھد ہو۔“

گوبر نے تیوری چڑھا کر ”ملے گی کیوں نہیں؟“

”ان کے من میں کوئی چور بیٹھ جائے تو؟“

”چور بیٹھے یا ڈاکو، گائے تو انھیں دینی ہی پڑے گی۔“

گوبر نے اور کچھ نہ کہا، لاشی کندھے پر رکھی اور چل دیا۔ ہوری اسے جاتا ہوا دیکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا رہا۔ اب لڑکے کی سگائی میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ سترھواں سال لگ گیا، پر کریں کیسے؟ کہیں پیسے کے بھی درس ہوں۔ جب سے تینوں بھائیوں میں الگوا ہو گیا، گھر کی ساکھ جاتی رہی۔ مہتو لڑکا دیکھنے آتے ہیں پر گھر کی دسا دیکھ کر منہ پھیکا کر کے چلے جاتے ہیں۔ دو ایک راجی بھی ہوئے تو روپے مانگتے ہیں، دو تین سولڑکی کے دام چکائے اور اتنا ہی اوپر سے خرچ کرے تب جا کر بیاہ ہو۔ کہاں سے ہو؟ اور اب تو سونا بیاہنے لایک ہو گئی ہے۔ لڑکے کا بیاہ نہ ہوا نہ سہی، لڑکی کا بیاہ نہ ہو تو ساری برادری میں ہنسی ہوگی۔ پہلے تو اسی کی سگائی کرنی ہے، پیچھے دیکھا جائے گا۔

ایک آدمی نے رام رام کیا اور پوچھا ”تمہارے کوٹھی میں کچھ بانس ہوں گے مہتو؟“

ہوری نے دیکھا، دمڑی بانس والا سامنے کھڑا ہے۔ ٹاتا، کالا، خوب موٹا، چوڑا منہ، بڑی بڑی مونچھیں، سرخ سرخ آنکھیں، کمر میں بانسی کا نی کی کٹار کھونٹے ہوئے۔ سال میں ایک دو بار آکر چھتیں، کرسیاں، موٹڈھے، ٹوکریاں وغیرہ بنانے کے لیے کچھ بانس کاٹ لے جاتا تھا۔

ہوری خوش ہو گیا۔ منھی گرم ہونے کی کچھ آس بندھی۔ چودھری کو لے جا کر اپنی تینوں کولھیاں دکھائیں، مول بھاؤ کیا، اور بچیس روپے سیکڑے میں پچاس بانسوں کا بیعانہ لے لیا۔ پھر دونوں لونے۔ ہوری نے اسے چلم پلائی، ناشتہ کرایا، اور حب رحم کے لہجے میں بولا ”میرے بانس کبھی تیس روپے سے کم نہیں جاتے۔ مگر تم گھر کے آدمی ہو، تم سے کیا بھاؤ تاؤ کرتا؟ تمہارا وہ لڑکا جس کی سگائی ہوئی تھی، ابھی پردیس سے لوٹا کہ نہیں؟“

چودھری نے چلم کا دم لگا کر کھانتے ہوئے کہا ”اس لوٹڈے کے پیچھے تو مر مٹا مہتو۔ جوان عورت گھر میں بیٹھی تھی اور وہ برادری کی کسی دوسری عورت کے ساتھ پردیس میں موج کرنے چل دیا۔ بہو بھی دوسرے کے ساتھ نکل گئی۔ عورت کی بڑی بری جات ہے مہتو، کسی

کی نہیں ہوتی۔ کتنا سمجھایا کہ تو جو چاہے کھا، میری ناک نہ کٹا، پر کون سنتا ہے؟ عورت کو بھگوان سب کچھ دے، روپ نہ دے، نہیں وہ کابو میں نہیں رہتی۔ کولھیاں تو بٹ گئی ہوں گی؟“

ہوری نے آسمان کی طرف دیکھا اور گویا اس کی وسیع فضا میں اُڑتا ہوا بولا ”سب کچھ بٹ گیا، چودھری! جن کو لڑکوں کی طرح پالا پوسا وہ اب برابر کے حصے دار ہیں۔ مگر بھائی کا حصہ کھانے کی نیت نہیں ہے۔ ادھر تم سے روپے ملیں گے ادھر دونوں بھائیوں کو بانٹ دوں گا۔ چار دن کی جنگانی میں کیوں کسی سے چھل کپٹ کروں؟ نہیں کہہ دوں کہ میں روپے سیکڑے میں بیچے ہیں تو انھیں کیا پتہ چلے گا؟ تم ان سے کہنے تھوڑے ہی جاؤ گے؟ تمہیں تو میں نے برابر اپنا بھائی سمجھا ہے۔“

برتاؤ میں ہم بھائی کے معنی کا کتنا ہی بیجا استعمال کریں لیکن اس کے تصور میں جو پاکیزگی ہے وہ ہماری سیاہ دلی سے کبھی آلودہ نہیں ہو سکتی۔

ہوری نے در پردہ یہ تجویز پیش کر کے چودھری کے منہ کی طرف دیکھا کہ وہ منظور کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا جھوٹا عاجزانہ انداز تھا جو بھیک مانگتے وقت موٹے بھکاریوں کے چہرے پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ چودھری نے ہوری کا آسن پا کر چابک جمایا ”ہمارا تمہارا پرانا بھائی چارہ ہے مہتو، ایسی بات ہے بھلا۔ پر بات یہ ہے کہ آدمی ایمان بیچتا ہے تو کسی لالچ سے۔ میں روپے نہیں میں پندرہ کہہ دوں گا مگر جو میں روپے دام لو تو۔“

ہوری نے کھیا کر کہا ”تم تو چودھری اندھیر کرتے ہو، میں روپے میں کہیں ایسے

بانس ملتے ہیں؟“

”ایسے کیا، اس سے اچھے بانس آتے ہیں دس روپے میں، ہاں دس کوس اور پچھتم چلے جاؤ۔ دام بانس کا نہیں ہے، سہر کے پاس ہونے کا ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ جتنی دیر وہاں جانے میں لگے گی اتنی دیر میں تو دو چار روپے کا کام ہو جائے گا۔“

سودا پٹ گیا۔ چودھری نے مرزئی اتار کر چھپر پر رکھ دی اور بانس کاٹنے لگا۔

اکچھ کی سینچائی ہو رہی تھی۔ ہیرا کی عورت کلیوالے کر کنوئیں پر جاری تھی، چودھری کو بانس کاٹتے دیکھ کر گھونگھٹ کے اندر سے بولی ”کون بانس کاٹتا ہے یہاں؟ بانس نہ کنٹیں گے۔“

چودھری نے ہاتھ روک کر کہا ”بانس مول لیے ہیں، پندرہ روپے سیکڑے کا بیجانہ ہوا ہے، سینٹ میں نہیں کاٹ رہے ہیں۔“

یہ عورت اپنے گھر کی مالکہ تھی۔ اسی کی مخالفت سے بھائیوں میں علاحدگی ہوئی تھی۔ دھنیا کو شکست دے کر شیر ہو گئی تھی۔ ہیرا کبھی کبھی اس کی مرمت کر دیتا تھا۔ ابھی حال میں اتنا مارا تھا کہ وہ کئی دن تک کھاٹ سے اٹھ نہ سکی تھی۔ لیکن وہ اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ ہیرا غصے میں اسے مارتا تھا مگر چلتا تھا اسی کے اشاروں پر، اس گھوڑے کی طرح جو کبھی کبھی مالک کو لات مار کر بھی اسی کی سواری میں چلتا ہے۔

کلیوا کی ٹوکری سر سے اتار کر بولی ”پندرہ روپے میں ہمارے بانس نہ جائیں گے۔“ چودھری عورت ذات سے اس بارے میں بات چیت کرنا خلاف مصلحت سمجھتے تھے، بولے ”جا کر اپنے آدمی کو بھیج دے، جو کچھ کہنا ہو آکر کہیں۔“

عورت کا نام مٹی تھا۔ بچے دو ہی ہوئے تھے لیکن بدن ڈھل گیا تھا۔ بناؤ سنگھار کے ذریعہ وقت کے ہاتھوں ہونے والی بربادی کو چھپایا جاسکتا ہے مگر گرسستی میں کھانے ہی کا ٹھکانا نہ تھا، سنگار کے لیے پیسے کہاں سے آتے؟ اس مفلسی اور مجبوری نے اس کی فطرت کی تری کو جذب کر کے اسے سخت اور خشک بنا دیا تھا جس پر ایک دفعہ پھاوڑا بھی پڑ کر اچٹ جاتا۔

وہ قریب جا کر چودھری کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی ”آدمی کو کیوں بھیج دوں؟ جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو نا! میں نے کہہ دیا کہ میرے بانس نہ نکلیں گے۔“

چودھری ہاتھ جھڑاتا تھا اور مٹی بار بار پکڑ لیتی تھی۔ ایک منٹ تک یہی ہاتھ پائی ہوتی رہی، آخر چودھری نے اسے زور سے ڈھکیل دیا۔ مٹی دھگکا کھا کر گر پڑی مگر پھر سنبھلی اور پاؤں سے تکی نکال کر چودھری کے سر، منہ، پیٹھ پر اندھا دھند جمانے لگی۔ بانس والا ہو کر اسے ڈھکیل دے۔ اس کی یہ بے عزتی! مارتی جاتی تھی اور روتی بھی جاتی تھی۔ چودھری اسے دھگکا دے کر عورت سے طاقت آزمائی کر کے ٹھیس کھا چکا تھا۔ بس کھڑے کھڑے مار کھانے کے سوا اس مصیبت سے بچنے کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ مٹی کا رونا سن کر ہوری بھی دوڑا ہوا آیا۔ مٹی نے اسے دیکھ کر اور زور سے چلانا شروع کیا۔ ہوری نے سمجھا کہ چودھری نے پٹیا کو مارا ہے۔ خون نے جوش مارا اور وہ الگادے کے اونچے بند کو توڑتا ہوا سب کچھ اپنے اندر سمیٹ لینے کے لیے باہر اٹل پڑا۔ چودھری کو زور سے ایک لات بجا کر بولا ”اب اپنا بھلا چاہتے ہو تو چودھری یہاں سے چلے جاؤ، نہیں تمہاری لہاس اٹھے گی۔ تم نے اپنے کو سمجھا کیا ہے؟ تمہاری اتنی مجال کہ تم میری بہو پر ہاتھ اٹھاؤ!“

چودھری قسمیں کھا کھا کر اپنی صفائی دینے لگا۔ تلتیوں کی چوٹ میں اس کا گنہگار دل خاموش تھا۔ یہ لات اسے بلا قصور ملی اور اس کے پھولے ہوئے گال آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ اس نے تو بہو کو چھوا بھی نہیں، کیا وہ اتنا گنوار ہے کہ وہ بہو کے گھر کی عورت پر ہاتھ اٹھائے گا؟ ہوری نے بے اعتباری سے کہا ”آنگھوں میں دھول مت جھونکو! تم نے کچھ کہا نہیں تو بہو جھوٹ موٹ روتی ہے؟ روپے کی گرمی ہے وہ نکال دی جائے گی۔ الگ ہیں تو کیا ہوا، ہے تو ایک کھون۔ کوئی ترچھی آنکھ سے دیکھے تو آنکھ نکال لیں۔“

”نئی چنڑی بنی ہوئی تھی، گلا پھاڑ کر بولی“ تو نے مجھے دھچکا دے کر گرا نہیں دیا؟ کھا جا اپنے بیٹے کی سوگند!“

ہیرا کو بھی خبر ملی کہ چودھری اور پنیا میں جنگ ہو رہی۔ چودھری نے پنیا کو دھچکا دیا، پنیا نے اسے ٹلیوں سے پٹا۔ اس نے پردوں جھوڑا اور اوگی (بیلوں کی چابک) لیے واردات کے موقع پر چلا۔ وہ گاؤں میں اپنے غصے کے لیے مشہور تھا۔ چھوٹا قد، گٹھا ہوا بدن، آنکھیں کوڑی کی طرح نکل آئی تھیں اور گلے کی رگیں تن گئی تھیں۔ مگر اسے چودھری پر غصہ نہ تھا بلکہ غصہ تھا پنیا پر۔ وہ کیوں چودھری سے لڑی؟ کیوں اس کی عزت مٹی میں ملا دی؟ بانس والے سے جھگڑنے سے اسے کیا مطلب؟ اسے جاکر ہیرا سے کل ماجرا بیان کر دینا چاہیے تھا، وہ جیسا مناسب سمجھتا کرتا۔ وہ اس سے لڑنے کیوں لگتی؟ اس کی چلتی تو وہ پنیا کو پردے میں رکھتا۔ پنیا کسی بڑے سے منہ کھول کر باتیں کرے، یہ اسے ناگوار تھا۔ وہ خود جتنا گرم مزاج تھا پنیا کو اتنا ہی زیادہ ٹھنڈا رکھنا چاہتا تھا۔ جب بھیمیا نے پندرہ روپے میں سودا کر لیا تو وہ بیچ میں کودنے والی کون تھی؟

اس نے آتے ہی پنیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھسیتا ہوا الگ لے جاکر لگا لاتیں مارنے ”حرا مجاہدی! تو ہماری ناک کٹانے پر لگی ہوئی ہے۔ تو چھوٹے چھوٹے آدمیوں سے لڑتی پھرتی ہے۔ کس کی پگڑی نیچے ہوتی ہے بتا! (ایک لات اور جھاکر) ہم تو وہاں کلیوا کی باٹ جوہ رہے ہیں تو یہاں لڑائی ٹھانے بیٹھی ہے۔ اتنی بے حیائی! آنکھ کا پانی ایسا گر گیا! کھو کر گاڑ دوں گا۔“

”نئی ہائے کرتی جاتی تھی۔“ تیری منی اٹھے، تجھے مرگی آوے، دہی میا تجھے لیل جائیں، بھگوان کرے تو کوڑھی ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں کٹ کر گریں۔“

اور گالیاں تو ہیرا کھڑا کھڑا سنتا رہا لیکن یہ پھیلی گالی اسے لگ گئی۔ ہیضہ وغیرہ میں کوئی خاص تکلیف نہ تھی، ادھر بیمار پڑے ادھر چل دیے مگر کوڑھ! یہ گھن کی موت اور اس سے بھی گھن کی زندگی! وہ تھلا اٹھا، دانت پیتا ہوا پھر پینا پر چھینا اور ہال پکڑ کر اس کا سر زمین پر رگڑتا ہوا بولا ”ہاتھ پاؤں کٹ کر گر جائیں گے تو میں تجھے لے کر چاٹوں گا؟ تو ہی میرے بال بچوں کو پالے گی؟ ایں، تو ہی اتنی بڑی گرتی چلائے گی؟ تو تو دوسرا بھتا کر کے کنارے کھڑی ہو جائے گی۔“

چودھری کو پنیا کی اس درگت پر رحم آگیا۔ ہیرا کو سمجھانے لگا ”ہیرا مہتاب جانے دو، بہت ہوا۔ کیا ہوا بہونے مجھے مارا میں تو چھوٹا نہیں ہو گیا۔ دھنیہ بھاگ! کہ بھگوان نے یہ دن تو دکھایا۔“

ہیرا نے چودھری کو ڈانٹا ”تم چپ رہو چودھری، میرے گھنے میں پڑ جاؤ گے تو برا ہوگا۔ عورت جات اسی طرح بیکتی ہے۔ آج کو تم سے لڑ گئی ہے، کل کو دوسروں سے لڑ جائے گی۔ تم بھلے مانس ہو، ہنس کر ٹال گئے، دوسرا تو برداس نہ کرے گا۔ کہیں اس نے بھی ہاتھ چلا دیے تو کتنی آبدورہ جائے گی، بتاؤ!“

اس خیال نے اس کے غصے کو پھر بھڑکایا۔ لپکا ہی تھا کہ ہوری نے دوڑ کر پکڑ لیا اور اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا ”ارے تو ہو گیا، دیکھ تو لیا دنیا نے کہ تم بڑے بہادر ہو، اب کیا اسے پس کر لی جاؤ گے؟“

ہیرا اب بھی بڑے بھائی کا ادب کرتا تھا۔ براہ راست نہ لڑتا تھا۔ چاہتا تو ایک جھٹکے میں اپنا ہاتھ چھڑا لیتا مگر اتنی بے ادبی نہ کر سکا۔ چودھری کی طرف دیکھ کر بولا ”اب کیا کھڑے تاکتے ہو؟ جا کر اپنے بانس کاٹو! میں نے سہی کردی پندرہ روپے پیکڑے میں طے ہے۔“

کہاں تو بختی بیٹھی رو رہی تھی اور کہاں جھمک کر اٹھی اور اپنا سر پیٹ کر بولی ”لگادے گھر میں آگ، گلوڑے! مجھے کیا کرنا ہے؟ بھاگ پھوٹ گیا کہ تجھ جیسے کسائی کے پالے پڑی۔ لگادے گھر میں آگ!“

اس نے کلیڈا کی نوکری وہیں چھوڑ دی اور گھر کی طرف چلی۔ ہیرا گرجا ”وہاں کہاں جاتی ہے چڑیل؟ چل کنوئیں پر نہیں تو کھوں پی لوں گا۔“

پنیا کے پیر تھم گئے۔ وہ اس ٹانگ کا دوسرا کھیل نہ کھیلنا چاہتی تھی، چپکے سے نوکری

اٹھائی اور روتے ہوئے کنوئیں کی طرف چلی۔ ہیرا بھی پیچھے پیچھے چلا۔

ہوری نے کہا ”اب پھر مار پیٹ نہ کرنا، اس سے عورت بے سرم ہو جاتی ہے۔“
دھنیا نے دروازے پر آکر بائگ لگائی ”تم وہاں کھڑے کھڑے کیا تماسا دیکھ رہے ہو؟
کوئی تمھاری سنتا بھی ہے کہ یوں ہی چھا دے رہے ہو؟ اس دن اسی بہو نے تمھیں گھونگھٹ
کی آڑ سے داڑھی جا رکھی تھی، بھول گئے؟ بھریا ہو کر پرائے مردوں سے لڑے گی تو ڈانٹ نہ
جائے گی؟“

ہوری دروازے پر آکر نٹ کھٹ پن کے ساتھ بولا ”اور جو میں اسی طرح تجھے
ماروں، تو؟“

”کیا کبھی مارا نہیں جو مارنے کی سادھ بنی ہوئی ہے؟“

”اتنی بے دردی سے مارتا تو تو گھر چھوڑ کر بھاگ جاتی۔ پٹیا بڑی گم کھور ہے۔“

”اوہو ایسے ہی بڑے درد والے ہو تم! ابھی تک مار کا داگ بنا ہوا ہے۔ ہیرا مارتا ہے
تو دلارتا بھی ہے، تم نے تو مارتا ہی سیکھا ہے، دلار کرنا سیکھا ہی نہیں۔ میں ہی ایسی ہوں کہ
تمھارے ساتھ نباہ ہوا۔“

”اچھا رہنے دے، بہت اپنا بکھان نہ کر! تو ہی روٹھ روٹھ کر نیچے بھاگتی تھی، جب
مہینوں منتوی کرتا تھا تب کہیں جا کر آتی تھی۔“

”جب اپنی گرج ستاتی تھی تب منانے جاتے تھے، لالا، میرے دلار سے نہیں جاتے تھے۔“

”اسی سے تو میں سب سے تیرا بکھان کرتا ہوں۔“

ازدواجی زندگی کی صبح میں تمنا اپنے گلابی نشے کے ساتھ طلوع ہوتی ہے اور دل کے
آسمان کو پورے طور پر اپنی سنہری کرنوں سے رنگ دیتی ہے۔ پھر دوپہر کی تیز تپش کا وقت
آتا ہے، دم بدم گبولے اٹھتے ہیں اور زمین کا پٹنے لگتی ہے۔ تمنا کا سنہرا پردہ ہٹ جاتا ہے اور
اصلیت اپنی عریانی میں آگے آکھڑی ہوتی ہے۔ اس کے بعد آرام دہ شام آتی ہے۔ سرد اور
سکون افزا، جب ہم تھکے ہوئے مسافروں کی طرح دن بھر کی مسافت کا حال کہتے اور سنتے
ہیں، بے غرضانہ انداز سے، گویا ہم کسی اونچی چوٹی پر جا بیٹھے ہیں جہاں نیچے کا شور و غل ہم
تک نہیں پہنچتا۔

دھنیا نے ٹھک کر کہا ”چلو چلو، بڑے بکھان کرنے والے! جراسا کوئی کام مگڑ جائے

تو گردن پر سوار ہو جاتے ہو۔“

ہوری نے بیٹھے اولہنے کے ساتھ کہا ”لے اب یہی تیرا انیائے مجھے اچھا نہیں لگتا، دھنیا بھولا سے پوچھ کہ میں نے اس سے تیرے بارے میں کیا کہا تھا۔“

دھنیا نے بات بدل کر کہا ”دیکھو گوبر گائے لے کر آتا ہے یا کھالی ہاتھ۔“
”بھولا اچھا آدمی ہے، پھر لڑکے بڑے کھوت ہیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں سیوں نے گول مال نہ کر دیا ہو۔“

چودھری پسینے میں ڈوبا ہوا آکر بولا ”مہتو چل کر بانس مگن لو۔ کل ٹھیللا لا کر اٹھالے جاؤں گا۔“

ہوری نے بانس مگننے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ چودھری ایسا آدمی نہیں ہے، پھر ایک آدھ بانس اور کاٹ ہی لے گا تو کیا؟ روج ہی تو مگنی میں بانس کٹتے رہتے ہیں۔ بیاہوں میں تو ماٹھ بنانے کے لیے لوگ بیسیوں بانس کاٹ لے جاتے ہیں۔“

چودھری نے ساڑھے سات روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ہوری نے مگن کر کہا ”اور نکالو حساب سے ڈھائی اور ہوتے ہیں۔“

چودھری نے رکھائی سے کہا ”پندرہ روپے میں طے ہوئے ہیں کہ نہیں؟“

”پندرہ روپے میں نہیں بیس روپے میں۔“

”ہیرا مہتو نے تمہارے سامنے پندرہ روپے کہے تھے کہو تو جلاؤں۔“

”طے تو بیس ہی روپے میں ہوئے تھے چودھری اب تمہاری جیت ہے، جو چاہو کہو

ڈھائی روپے ہوتے ہیں، تم دو ہی دے دو۔“

مگر چودھری کچی گولیاں نہ کھینچا تھا۔ اب اسے کس کا ڈر؟ ہوری کے منہ میں تو تالا پڑا ہوا تھا۔ کیا کہے، ماتھے ٹھونک کر رہ گیا بس اتنا بولا ”یہ اچھی بات نہیں ہے چودھری، دو روپے دبا کر راجا نہ ہو جاؤ گے۔“

چودھری تند لہجے میں بولا ”اور کیا تم بھائیوں کے تھوڑے سے پیسے دبا کر راجا ہو جاؤ گے؟ ڈھائی روپے پر ایمان بگاڑ رہے تھے، اس پر مجھے اپدیش دینے چلے ہو۔ ابھی پردہ کھول دوں تو سر نیچا ہو جائے۔“

ہوری پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ چودھری تو روپے سامنے زمین پر رکھ کر چلا بنا مگر وہ

نیم کے نیچے بیٹھا بڑی دیر تک پچھتا رہا۔ وہ کتنا لالچی اور مطلبی ہے، اس کا اسے آج پتہ چلا۔ چودھری نے ڈھائی روپے دے دیے ہوتے تو اسے کتنی خوشی ہوتی۔ اپنی چالاکی کو سراہتا کہ بیٹھے بٹھائے ڈھائی روپے مل گئے۔ ٹھوکر کھا کر ہی تو ہم ہوشیاری کے ساتھ قدم اٹھانا سیکھتے ہیں۔ دھنیا اندر چلی گئی، باہر آئی تو روپے زمین پر پڑے دیکھے۔ گن کر بولی ”اور روپے کیا ہوئے؟ دس نہ چاہیے؟“

ہوری نے لمبا منہ بنا کر کہا۔ ”بھیرا نے پندرہ روپے میں دے دیے تو میں کیا کرتا؟“
 ”بھیرا پانچ روپے میں دے دے، ہم نہیں دیتے ان داموں۔“
 ”وہاں مار پیٹ ہو رہی تھی، بیچ میں کیا بولتا؟“

ہوری نے اپنی ہار اپنے دل ہی میں رکھ لی، جیسے کوئی چوری سے آم توڑنے کے لیے بیڑ پر چڑھے اور مگر پڑنے پر دھول جھاڑتا اٹھ کھڑا ہو کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ جیت کر آپ اپنی دعا بازیوں کی ڈینگ مار سکتے ہیں، جیت میں سب کچھ معاف ہے، مگر ہار کی شرم تو پنی جانے ہی کی چیز ہے۔

دھنیا شوہر کو طعنے دینے لگی۔ ایسے مبارک موقع اسے بہت کم ملتے تھے۔ ہوری اس سے چالاک تھا مگر آج بازی دھنیا کے ہاتھ تھی۔ ہاتھ منکا کر بولی ”کیوں نہ ہو بھائی نے پندرہ روپے کہہ دیے تو تم کیسے ٹوکتے؟ ارے رام رام! لاڈلے بھائی کا دل چھوٹا ہو جاتا کہ نہیں۔ پھر جب اتنا بڑا انتھ ہو رہا تھا کہ لاڈلی بہو کے گلے پر چھری چل رہی تھی تو تم بھلا کیسے بولتے؟ اس بکھٹ (وقت) کوئی تمھارا سب کچھ لوٹ لیتا تو بھی تمھیں سدھ نہ ہوتی۔“
 ہوری چپ چاپ سنتا رہا جھنجھلاہٹ ہوئی، غصہ آیا خون کھولا، آنکھیں جلیں، دانت پیسے، مگر کچھ بولا نہیں۔ چپکے سے کدال لی اور کھیت گونڈنے چلا۔

دھنیا نے کدال چھین کر کہا ”کیا ابھی سیرا ہے کیا، جو ادھ گونڈنے چلے؟ سورج دیوتا سر پر آگئے، نہانے دھونے جاؤ، روٹی تیار ہے۔“ ہوری نے جھنجھٹا کر کہا ”مجھے بھوک نہیں ہے۔“
 دھنیا نے جملے پر نمک چھڑکا ”ہاں کا ہے کو بھوک لگے گی؟ بھائی نے بڑے بڑے لذو کھلا دیے ہیں نا! بھگوان ایسے سپوت بھائی سب کو دیں۔“
 ہوری گہڑا ”تو آج مار کھانے پر لگی ہوئی ہے۔“
 دھنیا نے نقلی عاجزی دکھاتے ہوئے کہا ”کیا کروں، تم دلار ہی اتنا کرتے ہو کہ میرا

سر پھر گیا ہے۔“

”تو گھر میں رہنے دے گی کہ نہیں؟“

”گھر تمہارا، مالک تم، میں بھلا کون ہوتی ہوں تمہیں گھر سے نکالنے والی؟“

ہوری آج دھنیا سے کسی طرح پیش نہیں پاسکتا، اس کی عقل جیسے کند ہو گئی ہے۔ ان طنز کے تیروں کو روکنے کے لیے اس کے پاس کوئی ڈھال نہیں ہے۔ آہستہ سے کدال رکھ دی اور انگوچھالے کر نہانے چلا گیا، لوٹا کوئی آدھے گھنٹے میں، مگر گوبر ابھی تک نہ آیا تھا، اکیلے کیسے کھانا کھائے؟ لوٹا وہاں جا کر سو رہا۔ بھولا کی وہ چنچل چھوڑی نہیں ہے جھینا، اسی کے ساتھ ہنسی دل مگی کر رہا ہوگا۔ کل بھی تو اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ نہیں گائے دی تو لوٹ کیوں نہ آیا؟ کیا وہاں دھرنا دے گا؟

دھنیا نے کہا ”اب کھڑے کیا ہو؟ گوبر سانجھ کو آدے گا۔“

ہوری نے اور کچھ نہ کہا کہ کہیں دھنیا پھر نہ کچھ کہہ بیٹھے۔ کھانا کھا کر نیم کے سایہ میں سو رہا۔ روپا روتی ہوئی آئی۔ ننگے بدن، ایک لنگوٹی لگائے؟ جھبرے بال ادھر ادھر بکھرے ہوئے، ہوری کے سینے پر لوٹ گئی۔ اس کی بڑی بہن سونا کہتی ہے ”گائے آئے گی تو اس کا گوبر میں پاتھوں گی۔“ روپا یہ نہیں برداشت کر سکتی۔ سونا ایسی کہاں کی بڑی رانی ہے کہ سارا گوبر آپ پاتھ ڈالے؟ روپا اس سے کس بات میں کم ہے؟ سونا روٹی پکاتی ہے تو کیا روپا برتن نہیں مانگھتی؟ سونا پانی لاتی ہے تو کیا روپا کنوئیں پر سی نہیں لے جاتی؟ سونا تو کلسا بھر کر اٹھلاتی چلی آتی ہے، سی سمیٹ کر روپا ہی لاتی ہے۔ گوبر دونوں ساتھ پاتھتی ہیں۔ سونا کھیت گونڈنے جاتی ہے تو کیا روپا بکری چرانے نہیں جاتی، پھر سونا اکیلے گوبر کیوں پاتھے گی؟ یہ انیائے روپا کیسے ہے؟

ہوری نے اس کے بھولے پن پر رنجھ کر کہا ”نہیں گائے کا گوبر تو پاتھنا، سونا گائے کے پاس جائے تو بھگا دینا۔“

روپا نے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا ”دودھ بھی میں ہی دوہوں گی۔“

”ہاں ہاں تو نہ دوہے گی تو کون دوہے گا؟“

”وہ میری گائے ہوگی۔“

”ہاں سولہوں آنے تیری!“

روپا خوش ہو کر اپنی جیت کا مبارک ماجرا ہاری ہوئی سونا کو سنانے چلی گئی۔ ”کائے میری ہوگی۔ اس کا دودھ میں دوہوں گی، اس کا گوبر میں پاتھوں گی، تجھے کچھ نہ ملے گا۔“

سونا سن میں نوعمر، جسم میں جوان اور عقل میں بچی تھی، گویا اس کا شباب اسے آگے کھینچتا تھا اور طفلی پیچھے لے جاتی تھی۔ کچھ باتوں میں اتنی ہوشیار کہ نوجوان گریجویٹ عورتوں کو پڑھائے۔ اور کچھ باتوں میں اتنی الہیز کہ بچوں سے بھی پیچھے۔ لبا، روکھا مگر خوش چہرہ، ٹھنڈی نیچے کو کھینچی ہوئی، آنکھوں میں ایک قسم کی آسودگی، نہ بالوں میں تیل، نہ آنکھوں میں کاجل، نہ بدن میں کوئی گھٹنا، جیسے گزشتہ کے بوجھ نے شباب کو دبا کر بونا بنا دیا ہو۔ سر کو ایک جھٹکا دے کر بولی ”جا تو گوبر پاتھ، جب تو دودھ دودھ کر رکھے گی تو میں پی جاؤں گی۔“

”میں دودھ کی ہانڈی تالے میں بند کر کے رکھوں گی۔“

”میں تالا تو زکڑ دودھ نکال لوں گی۔“

یہ کہتی ہوئی وہ باغ کی طرف چل دی۔ آم گلدرا گئے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے ایک آدھ زمین پر گر پڑتے تھے۔ لو کے مارے ہوئے پتکے اور پیلے۔ لیکن بچے نپکا سمجھ کر باغ میں منڈ لایا کرتے تھے۔ روپا بھی بہن کے پیچھے ہولی۔ جو کام سونا کرے وہ روپا ضرور کرے گی۔ سونا کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی تھی، روپا کے بیاہ کا کوئی چرچا نہیں کرتا، اس لیے وہ خود اپنے بیاہ کے لیے ضد کرتی ہے اس کا دولہا کیسا ہوگا اور وہ کیا کیا لائے گا، اسے کیسے رکھے گا، اسے کیا کھلائے گا، کیا پہنائے گا، اس کا وہ بڑا مفصل بیان کرتی جسے سن کر شاید کوئی لڑکا اس سے بیاہ کرنے پر راضی نہ ہوتا۔

شام ہو رہی تھی۔ ہوری ایسا السایا کہ گوڑنے نہ جاسکا۔ بیلوں کو ناند میں لگایا۔ بھوسہ کھلی دی اور ایک چلم بھر کر پینے لگا۔ اس فصل میں سب کچھ کھلیان میں تول دینے پر بھی ابھی اس پر کوئی تین سو کا قرض تھا جس پر کوئی سو روپے سود کے بڑھتے جاتے تھے۔ منگرو شاہ سے آج پانچ برس ہوئے کہ تیل کے لیے ساٹھ روپے لیے تھے۔ پورے ساٹھ دے چکا تھا مگر ساٹھ کے ساٹھ بنے ہوئے تھے۔ داتا دین پنڈت سے تیس روپے لے کر آلو بوئے تھے، آلو تو چور کھو دے گئے اور اس تیس کے ان تین برسوں میں سو ہو گئے تھے۔ دولاری بیوہ سٹانی جو گاؤں میں نمک، تیل، تمباکو کی دوکان رکھے ہوئے تھی۔ بنوارے کے وقت اس سے چالیس روپے لے کر بھائیوں کو دینے پڑے تھے۔ اس کے بھی تقریباً سو روپے ہو گئے

تھے کیونکہ ایک آنہ فی روپیہ سود تھا۔ لگان ہی کہ ابھی پچیس روپے باقی پڑے ہوئے تھے اور دسہرا کے دن شگون کے روپیوں کا بھی کوئی بندوبست کرتا تھا۔ بانسوں کے روپے بڑے موقع سے مل گئے۔ شگون کا مسئلہ حل ہو جائے گا، لیکن کون جانے؟ یہاں تو ایک دھیلا بھی ہاتھ میں آجائے تو گاؤں میں شور مچ جاتا ہے اور لینے والے چاروں طرف سے نوچنے لگتے ہیں۔ یہ پانچ روپے تو وہ شگون میں دے گا، چاہے کچھ ہو جائے۔ مگر ابھی زندگی کے بڑے بڑے کام تو سر پر سوار ہیں، گوہر اور سونا کا بیہ، بہت ہاتھ روکنے پر بھی تین سو سے کم نہ اٹھیں گے۔ یہ تین سو کس کے گھر سے آئیں گے؟ کتنا چاہتا ہے کہ کسی سے ایک پیسہ ادھار نہ لے اور جس کا آتا ہے اس کی پائی پائی چکا دے مگر ہر طرح کی تکلیف اٹھانے پر بھی گلا نہیں چھوٹتا۔ اسی طرح سود بڑھتا جائے گا اور ایک دن اس کا سب گھر بار نیلام ہو جائے گا، تو اس کے بال بچے بے سہارا ہو کر بھیک مانگتے پھریں گے۔ ہوری جب کام دھندلے سے جھنٹی پا کر چلم پینے لگتا تھا تو یہ فکر ایک سیاہ دیوار کی طرح اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی تھی جس میں سے نکل جانے کی اسے کوئی راہ نہ دیکھتی تھی۔ اگر دھیرج تھا تو یہی کہ یہ پتا تھا اس کے سر نہ تھی، بلکہ عموماً سبھی کسانوں کا یہی حال تھا۔ بہتوں کی حالت تو اس سے بھی بدتر تھی۔ سوہا اور ہیرا کو جدا ہوئے ابھی کل تین سال ہوئے تھے مگر دونوں پر چار چار سو کا بار ہو گیا تھا۔ جھینگر دوہل کی کھیتی کرتا ہے، اس پر ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ جیادون بہتو کے گھر بھکاری بھیک بھی نہیں پاتا مگر قرضے کا کوئی ٹھکانہ نہیں یہاں بچا کون ہے؟

ایک ایک سونا اور روپا دونوں دوڑی ہوئی آئیں اور ایک ساتھ بولیں ”بھتا گائے لار ہے ہیں آگے آگے گائے ہے پیچھے پیچھے بھتا ہیں۔“

پہلے روپا نے گوہر کو آتے دیکھا تھا۔ یہ خبر سنانے کی سرخروئی اسے ملنی چاہیے تھی۔ سونا برابر کے سامنے دار ہوئی جاتی ہے۔ یہ اس سے کیسے سہا جاتا؟

اس نے آگے بڑھ کر کہا ”پہلے میں نے دیکھا تھا بھی دوڑی۔ بہن نے تو پیچھے سے دیکھا۔ سونا اس دعویٰ کو تسلیم نہ کر سکی بولی ”تو نے بھتا کو کہاں پہچانا؟ تو تو کہتی تھی کہ کوئی گائے بھاگی آرہی ہے۔ میں نے ہی کہا تھا کہ بھتا ہیں۔“

دونوں پھر باغ کی طرف دوڑیں، گائے کا خیر مقدم کرنے کے لیے۔ دھنیا اور ہوری دونوں گائے باندھنے کی تدبیر کرنے لگے۔ ہوری بولا ”چلو جلدی سے ناند گاڑ دیں۔“

دھنیا کے چہرے پر شباب چمک اٹھا تھا ، بولی نہیں ، پہلے تھالی میں تھوڑا آٹا اور گڑ
گھول کر رکھ دیں ۔ بھاری دھوپ میں چلی ہوگی ، پیاسی ہوگی ۔ تم جا کر ناند گاڑو ، میں
گھومتی ہوں۔“

”کہیں ایک گھنٹی پڑی تھی ، اسے ڈھونڈ لے۔ گائے کے گلے میں باندھیں گے۔“
”سونا کہاں گئی ؟ سینٹانی کی دوکان سے تھوڑا کالا ڈورا منگوا لو، گائے کو ڈنٹھ بہت
لگتی ہے۔“

”آج میرے من کی بڑی بھاری سادھ پوری ہوگئی۔“
دھنیا اپنی دلی مسرت کو دل ہی میں رکھنا چاہتی تھی ۔ اتنی بڑی نعمت اپنے ساتھ کوئی رحمت
نہ لائے ، اس اندیشہ سے اس کا دل کانپ رہا تھا ۔ آسمان کی طرف تاک کر بولی ”گائے کے
آنے کا آند تو جب ہے کہ اس کا پورا قدم بھی اچھا ہو۔ بھگوان کے من کی بات ہے۔“
گویا وہ بھگوان کو بھی دھوکا دینا چاہتی تھی ۔ بھگوان کو بھی دکھانا چاہتی تھی کہ اس گائے
کے آنے سے اسے اتنی خوشی نہیں ہوئی کہ حسدی بھگوان سکھ کا پلڑا اونچا کرنے کے لیے کوئی
نئی پٹا بھیج دیں ۔

وہ ابھی آٹا گھول رہی تھی کہ گوبر گائے کو لیے بچوں کے ایک جلوس کے ساتھ دروازے
پر آ پہنچا ۔ ہوری دوڑ کر گائے کے گلے میں لپٹ گیا ۔ دھنیا نے آٹا چھوڑ دیا اور جلدی سے
ایک پرانی ساڑی کا کالا کنارہ پھاڑ کر گائے کے گلے میں باندھ دیا ۔
ہوری بھگتی بھری نگاہوں سے گائے کو دیکھ رہا تھا جیسے ساچھات (جسم) دیوی جی نے
گھر میں قدم رکھا ہو ۔ آج بھگوان نے یہ دن دکھایا کہ اس کا گھر گنوماتا کے چرنوں سے
پوتر ہو گیا ۔ ایسے اچھے بھاگ ! نہ جانے کس کے پن کے پھل ہیں ؟
دھنیا نے گھبرا کر کہا ”کھڑے کیا ہو آنگن میں ناند گاڑ دو۔“

”آنگن میں جگہ کہاں ہے؟“

”بہت جگہ ہے۔“

”میں تو باہر ہی گاڑتا ہوں۔“

”پاگل نہ بنو۔ گاؤں کا حال جان کر بھی انجان بنتے ہو۔“

”جو بات نہیں جانتے اس میں ٹانگ نہ اڑایا کرو دنیا بھر کی بدیا تم ہی نہیں پڑھے ہو۔“

ہوری سچ سچ آپے میں نہ تھا۔ گائے اس کے لیے صرف بھگتی کی چیز نہ تھی بلکہ زندہ دولت تھی۔ وہ اس سے اپنے دروازے کی رونق اور عزت بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ گائے کو دروازے پر بندھی دیکھ کر پوچھیں کہ یہ کس کا گھر ہے؟ لوگ کہیں، ہوری مہتو کا۔ جسبی لڑکی والوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا؟ دھنیا اس کے خلاف خوف کھا رہی تھی۔ وہ گائے کو سات پردوں کے اندر چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اگر گائے آٹھوں پہر کوٹھری میں رہ سکتی تو وہ شاید اسے باہر نہ نکلنے دیتی۔ یوں تو ہر بات میں ہوری کی جیت ہوتی تھی۔ وہ اپنی بات پر اڑ جاتا تھا اور دھنیا کو دب جانا پڑتا تھا مگر آج دھنیا کے سامنے ہوری کی ایک نہ چلی۔ دھنیا لڑنے پر تل گئی۔ گوبر، سونا اور روپا غرضیکہ کے سارا گھر ہوری کی طرف تھا مگر دھنیا نے تنہا سب کو شکست دی۔ آج اس میں ایک عجیب خود اعتمادی اور ہوری میں ایک عجیب انکسار کا ظہور ہو گیا تھا۔

مگر تماشا کیسے رک سکتا تھا؟ گائے ڈولی میں بیٹھ کر تو آئی نہ تھی، یہ کیسے ممکن تھا کہ گاؤں میں اتنی بڑی بات ہو جائے اور میلا نہ لگے۔ جس نے سنا سب کام کاج چھوڑ کر دیکھنے دوڑا۔ وہ معمولی دیسی گائے نہیں ہے، بھولا کے گھر سے اسی روپے میں آئی ہے۔ ہوری اتنی روپے تو کیا دیں گے؟ پچاس ساٹھ روپے میں لائے ہوں گے۔ گاؤں کی تاریخ میں پچاس ساٹھ روپیوں کی گائے کا آنا بھی انہونی بات تھی۔ بیل تو پچاس کے بھی آئے، سو کے بھی آئے، مگر گائے کے لیے اتنی بڑی رقم کسان کیا کھا کر خرچ کرے گا؟ یہ تو گوالوں ہی کا کلیجہ ہے کہ انہلیوں روپے گن آتے ہیں۔ گائے کیا ہے مجسم دیوی کا روپ ہے۔ تماشاویوں اور نقادوں کا تانتا لگا ہوا تھا اور ہوری دوڑ دوڑ کر سب کی آؤ بھگت کر رہا تھا۔ اتنا منکسر مزاج، اتنا خوش وہ کبھی نہ تھا۔

ستر سال کے بوڑھے پنڈت داتا دین لائھی ٹپکتے ہوئے آئے اور پوچھے منہ سے بولے ”کہاں ہو ہوری؟ نک کہ ہم بھی تمہاری گائے دیکھ لیں،۔ سنا بڑی سندر ہے۔“

ہوری نے دوڑ کر پالاکن کیا اور دل میں متکبرانہ اور مسرت کے حرے لیتا ہوا بری خاطر سے پنڈت جی کو صحن میں لے گیا۔ پنڈت نے گائے کو اپنی پرانی اور تجربے کا رنگا ہوں سے دیکھا، سینگیں دیکھیں، تھن دیکھا، پنپے دیکھے اور تھنی، اجلی بھوؤں کے نیچے چھپی ہوئی آنکھوں میں جوانی کی امتگ لے کر بولے ”کوئی دوکھ نہیں ہے بیٹا، ہال بھونزی سب ٹھیک!

بھگوان چاہیں گے تو تمہارے بھاگ کھل جائیں گے ایسے اچھے پھن ہیں کہ واہ! بس رات ب نہ کم ہونے پاوے۔ ایک ٹھنڈا سو سو کا ہوگا۔“

ہوری نے خوشی کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے ”سب آپ کا آسیر باد ہے دادا۔“
 دادا دین نے سُرُتی کے پیک تھوکتے ہوئے کہا ”میرا آسیر باد نہیں ہے بیٹا، بھگوان کی دیا ہے یہ سب بھگوان کی دیا ہے۔ روپے لگد دیے؟“

ہوری نے بے پر کی اڑائی۔ اپنے مہاجن کے روبرو بھی اپنی امیری دکھانے کا ایسا اچھا موقع وہ کیوں ہاتھ سے جانے دے؟ نکلے کی نئی ٹوپی سر پر کھ کر جب ہم اکڑنے لگتے ہیں۔ ذرا دیر کے لیے کسی سواری پر بیٹھ کر جب ہم آسمان پر اڑنے لگتے ہیں تو اتنی بڑی نعمت پا کر اس کا دماغ کیوں نہ آسمان پر چڑھ جائے؟ بولا ”بھولا ایسا بھلا مانس نہیں ہے مہراج، لگد گمنائے، پورے، چوکس!“

اپنے مہاجن کے سامنے یہ ڈینگ مار کر ہوری نے نادانی تو کی تھی مگر دادا دین کے چہرے پر بے مبری کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ اس کہنے میں کتنی سچائی ہے، یہ ان کی ان نبھی ہوئی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا، جن میں روشنی کی جگہ تجربہ چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ خوش ہو کر بولے ”کوئی حرج نہیں بیٹا، کوئی حرج نہیں! بھگوان سب اچھا کریں گے۔ پانچ سیر دودھ ہے اس میں، بچے کے لیے چھوڑ کر؟“

دھنیا نے فوراً ٹوکا ”ارے نہیں مہراج، اتنا دودھ کہاں؟ بڑھیا ہو گئی ہے، پھر یہاں رات ب کہاں دھرا ہے؟“

دادا دین نے بھید بھری نگاہوں سے دیکھ کر اس کی چوکی کی داد دی، جیسے کہہ رہے ہوں۔ ”گرستن کا بھی دھرم ہے، دون کی لینا مردوں کا کام ہے، انھیں کرنے دو۔“ پھر ویسے ہی لہجے میں بولے ”باہر نہ باندھنا اتنا کہتے دیتے ہیں۔“
 دھنیا نے شوہر کی طرف فتح مندانہ نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہو،، لو اب تو مانو گے۔“

پھر دادا دین سے بولی ”نہیں مہراج، باہر کیا باندھیں گے؟ بھگوان دیں تو اسی آنگن میں تین گائیں اور بندھ سکتی ہیں۔“

سارا گاؤں گائے دیکھنے آیا، نہیں آئے تو سو بھا اور ہیرا جو سکے بھائی تھے۔ ہوری کے دل

میں بھائیوں کے لیے اب بھی جگہ تھی۔ وہ دونوں اگر دیکھ لیتے اور خوش ہو جاتے تو اس کی دلی خواہش پوری ہو جاتی۔ شام ہو گئی، لوٹ آئے، اسی دروازے سے نکلے مگر پوچھا کچھ نہیں۔
 ہوری نے ڈرتے ڈرتے دھنیا سے کہا ”نہ سو بھا آیا، نہ ہیرا آیا، سنا نہ ہوگا۔“

دھنیا بولی ”تو یہاں کون انھیں بلانے جاتا ہے؟“

”تو بات تو سمجھتی نہیں، لڑنے کو تیار رہتی ہے۔ بھگوان نے جب یہ دن دکھایا ہے تو ہمیں سر جھکا کر چلنا چاہیے۔ آدمی کو اپنے سگون کے منہ سے اپنی بھلائی برائی سننے کی جتنی اہمیت ہوتی ہے اتنی باہر والوں کے منہ سے نہیں۔ پھر اپنے بھائی لاکھ برے ہوں تو اپنے بھائی ہی ہیں۔ اپنے حصے بکھرے کے لیے کبھی لڑتے ہیں مگر اس سے کھون تھوڑے ہی بدل جاتا ہے۔ دونوں کو بلا کر دکھا دینا چاہیے نہیں تو کہیں گے کہ گائے لائے اور ہمیں بتایا تک نہیں۔“
 دھنیا نے ناک سیکڑ کر کہا ”میں نے تم سے سو بار، لاکھ بار کہہ دیا کہ میرے منہ پر اپنے بھائیوں کا بکھانا نہ کیا کرو، ان کا نام سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ سارے گاؤں نے سنا، کیا انھوں نے نہ سنا ہوگا؟ کچھ اتنی دُور بھی تو نہیں رہتے۔ سارا گاؤں دیکھنے آیا، ان ہی کے پاؤں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ مگر آدیں کیسے؟ جلن ہوری ہوگی کہ اس کے گھر گائے آگنی۔ چھاتی پھنی جاتی ہوگی۔“

چراغ جلانے کا وقت آگیا تھا، دھنیا نے جاکر دیکھا تو بوتل میں مٹی کا تیل نہ تھا۔ بوتل لے کر تیل لانے چلی گئی۔ پیسے ہوتے تو روپا کو بھیجتی۔ ادھار لانا ہے کچھ لٹو چھو کرے گی جیسی تیل ادھار ملے گا۔

ہوری نے روپا کو بلا کر پیار سے گود میں بٹھایا اور کہا ”ٹھک جاکر دیکھ، ہیرا کا کا آگئے ہیں کہ نہیں۔ سو بھا کا کا کو بھی دیکھتی آنا۔ کہنا کے دادا نے تمہیں بلایا ہے۔ نہ آدیں تو ہاتھ پکڑ کر کھینچ لانا۔“

”روپا ٹھک کر بولی ”چھوٹی کا کی مجھے ڈانٹتی ہے۔“

”کا کی کے پاس کیا کرنے جائے گی؟ پھر سو بھا کے گھر والی تو تجھے پیار کرتی ہے۔“

”سو بھا کا کا مجھے چڑھاتے ہیں، کہتے ہیں میں نہ کہوں گی۔“

”کیا کہتے ہیں، بتا!“

”چڑھاتے ہیں۔“

”کیا کہہ کر چڑھاتے ہیں؟“

”کہتے ہیں کہ تیرے لیے موہن پکڑ رکھا ہے، لے جا، بھون کر کھالے۔“

ہوری کے دل میں گدگدی پیدا ہوئی۔

”تو کہتی نہیں پہلے تم کھالو، تب میں کھاؤں گی؟“

”اماں منع کرتی ہیں، کہتی ہیں کہ ان لوگوں کے گھر نہ جایا کر۔“

”تو اماں کی بیٹی ہے کہ دادا کی؟“

”روپا نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا ”اماں کی!“ اور ہنسنے لگی۔

”تو پھر میری گودی سے اتر جا۔ آج میں تجھے اپنی قتالی میں نہ کھلاؤں گا۔“

گھر میں ایک ہی پھول کی قتالی تھی۔ ہوری اسی میں کھاتا تھا۔ قتالی میں کھانے کی عزت پانے کے لیے روپا ہوری کے ساتھ کھاتی تھی۔ اس عزت کو وہ کیسے چھوڑے؟ ہمک کر بولی ”اچھا تمھاری!“

”تو پھر میرا کہنا مانے گی کہ اماں کا؟“

”تمھارا۔“

”تو جا کر ہیرا اور سوہما کو پکڑ لا۔“

”اور جو اماں بگڑیں گی؟“

”اماں سے کہنے کون جائے گا؟“

روپا کودتی ہوئی ہیرا کے گھر چلی۔ عداوت کا جال بڑی بڑی مچھلیوں کو پھنساتا ہے۔ چھوٹی مچھلیاں یا تو اس میں پھنستی ہی نہیں یا فوراً نکل بھاگتی ہیں۔ ان کے لیے وہ مارنے والا جال کھیل کی چیز ہے، ڈر کی نہیں۔ بھائیوں سے ہوری کی بول چال بند تھی مگر روپا دونوں گھروں میں آتی جاتی تھی۔ بچوں سے کیا ہیر؟

مگر روپا گھر سے نکلی ہی تھی کہ دھنیا تیل لیے ہوئے مل گئی پوچھا ”سانجھ کی ہیرا کہاں جاتی ہے؟ چل گھر!“ روپا ماں کو خوش کرنے کی لالچ کو نہ روک سکی۔

دھنیانے ڈانٹا ”چل گھر، کسی کو بلانے نہیں جاتا۔“

روپا کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ گھر لائی اور ہوری سے بولی ”میں نے تم سے لاکھ بار کہہ دیا ہے کہ میری لڑکی کو کسی کے گھر نہ بھیجا کرو۔ کسی نے کچھ کر دیا تو میں حصیں لے

کر چاٹوں گی؟ ایسا ہی بڑا پریم ہے تو آپ کیوں نہیں جانتے؟ جان پڑتا ہے کہ ابھی پیٹ نہیں بھرا۔“

ہوری ناند جما رہا تھا ہاتھوں میں مٹی لپیٹے ہوئے سنی ان سنی کر کے بولا ”کس بات پر مجبوزی ہے بھائی؟ یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ اندھے کتے کی طرح ہوا پر بھونکا کرے۔“
دھنیا کو کہی میں تیل بھرنا تھا۔ اس وقت جھگڑا نہ بڑھانا چاہتی تھی۔ روپا بھی لڑکوں میں جالی۔

پھر رات سے زیادہ جا چکی تھی، ناند مگر چکی تھی، بھوسہ کھلی ڈال دی مٹی۔ گائے من مارے اداس بیٹھی تھی، جیسے کوئی بہو سسرال آتی ہو۔ ناند میں منہ تک نہ ڈالتی تھی۔ ہوری اور گوہر کھانا کھا کر آدمی آدمی روٹی اس کے لیے لائے، مگر اس نے سونگھا تک نہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی، جانوروں کو بھی اکثر تھان چھوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ہوری باہر کھاٹ پر بیٹھ کر چلم پینے لگا تو پھر بھائیوں کی یاد آئی۔ نہیں آج سبھ سے پر بھائیوں سے بے پروائی نہیں برت سکتا۔ اس کا دل پونجی پا کر بڑا ہو گیا تھا۔ بھائیوں سے جدا ہو گیا ہے تو کیا ہوا؟ ان کایری تو نہیں ہے! یہی گائے تین سال پہلے آئی ہوتی تو سبھی کا اس پر برابر کا حق ہوتا اور کل کو یہی گائے دودھ دینے لگے لگی تو کیا وہ بھائیوں کے گھر دودھ نہ بھیجے گا۔ کیا دہی نہ بھیجے گا؟ ایسا تو اس کا دھرم نہیں ہے۔ بھائی اس کا بُرا جتیس، پر وہ کیوں ان کا بُرا چیتے؟ اپنی اپنی کرنی تو اپنے اپنے ساتھ ہے۔

اس نے ناریل کھاٹ کے پائے سے لگا کر رکھ دیا اور ہیرا کے گھر کی طرف چلا۔ سو بھا کا گھر بھی ادھر ہی تھا۔ دونوں اپنے اپنے دروازے پر پڑے ہوئے تھے کافی اندھیرا تھا۔ ہوری پر ان میں سے کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ دونوں میں کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ ہوری رک گیا اور باتیں سننے لگا۔ ایسا آدمی کہاں ہے جو اپنا چرچا سن کر ہٹ جائے؟

ہیرا نے کہا ”جب تک ایک میں تھے، ایک بکری بھی نہ لی۔ اب چچائیں گائے لی جاتی ہے۔ بھائی کا حک مار کر کسی کو جھلٹے پھولتے نہیں دیکھا۔“

سو بھا بولا ”یہ تم آنتائے کر رہے ہو، ہیرا! بھیا نے ایک ایک پیسے کا حساب دے دیا۔ یہ میں کبھی نہ مانوں گا کہ انھوں نے پہلے کی کمائی چھپا رکھی تھی۔“
تم مانو چاہے نہ مانو، پر ہے یہ پہلے ہی کی کمائی۔“

”کسی پر جھوٹی تہمت نہ لگانا چاہیے۔“

”اچھا تو یہ روپے کہاں سے آگئے؟ کہاں سے ہن برس پڑا؟ اتنے ہی کھیت تو ہمارے پاس بھی ہیں، پھر کیوں ہمارے پاس کمھن کو کوڑی نہیں ہے اور ان کے گھر نی گائے آتی ہے؟“

”ادھار لائے ہوں گے۔“

”بھولا ادھار دینے والا آدمی نہیں۔“

”کچھ بھی ہو، گائے ہے بڑی سندر، گوبر لیے آتا تھا تو میں نے رستے میں دیکھا۔“

”بے ایمانی کا دھن جیسے آتا ہے دیے ہی چلا جاتا ہے۔ بھگوان چاہیں گے تو گائے

گھر میں بہت دن نہ رہے گی۔“

ہوری سے اور نہ سنا گیا۔ وہ گئی گزری باتوں کو بھلا کر اپنے دل میں پریم اور اُٹاوا بھرے ہوئے بھائیوں کے پاس آیا تھا۔ اس صدمے نے جیسے اس کے دل میں سوراخ کر دیا اور وہ برادرانہ جذبہ اس میں کسی طرح نہ ٹھہر سکا۔ جی میں آیا کہ اسی وقت حملے کا جواب دے، مگر بات بڑھ جانے کے ڈر سے چپ رہ گیا۔ اگر اس کی نیت صاف ہے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ بھگوان کے آگے وہ زردو کہ ہے، دوسروں کی اسے پرواہ نہیں ہے۔ اگلے پاؤں لوٹ آیا اور وہی جلی ہوئی چلم چپنے لگا۔ مگر جیسے وہ زہر ہر لکھ اس کے رگوں میں پھیلتا جاتا تھا۔ اس نے سو جانے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ بیلوں کے پاس جا کر انھیں سہلانے لگا تو زہر مدھم پڑا۔ پھر چلم بھری مگر اس میں بھی کچھ مزا نہ تھا۔ زہر نے جیسے احساس کو دبا دیا ہو جیسے نشے میں احساس یک طرفہ ہو جاتا ہے، جیسا پھیلا ہوا پانی ایک سمت میں ہو کر تیزی سے بہنے لگتا ہے وہی حالت اس کی ہو رہی تھی اسی مجنونانہ حالت میں وہ اندر گیا۔ ابھی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صحن میں ایک طرف چٹائی پر پڑی ہوئی دھنیا سونا سے بدن دبوا رہی تھی اور روپا جو روز شام ہوتے ہی سوجاتی تھی، آج کھڑی ہوئی گائے کا منہ کھلا رہی تھی۔ ہوری لے جا کر گائے کو کھونٹے سے کھول لیا اور دروازے کی طرف لے چلا۔ وہ اسی دم گائے کو بھولا کے گھر پہنچانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ اتنا بڑا کلک سر پر لے کر وہ اب گائے کو گھر میں نہیں رکھ سکتا، کسی طرح نہیں!

”دھنیا نے پوچھا ”کہاں لے جاتے ہو رات کو؟“

ہوری نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا ”لے جاتا ہوں بھولا کے گھر، لوٹا دوں گا۔“
دھنیا کو تعجب ہوا، اٹھ کر سامنے آگئی اور بولی ”لوٹا کیوں دو گے؟ لوٹا نے کے لیے ہی لائے
تھے؟“

”ہاں اس کے لوٹا ہی دینے میں کسل ہے۔“

”کیوں بات کیا ہے؟ اتنے ارمان سے لائے اور اب لوٹا نے جارہے ہو، کیا بھولا
روپیہ مانگتے ہیں؟“

”نہیں بھولا یہاں کب آئے۔“

”تو پھر کیا بات ہوئی؟“

”کیا کرے گی پوچھ کر؟“

دھنیا نے اچک کر گائے کی ری ہاتھ سے چھین لی۔ اس کی تیز عقل نے گویا اڑتی
ہوئی چڑیا پکڑ لی۔ بولی ”تمہیں بھائیوں کا ڈر ہو تو جا کر ان کے پیروں پڑو، میں کسی سے نہیں
ڈرتی۔ اگر ہماری بڑھتی دیکھ کر کسی کی چھاتی پھٹتی ہے تو پھٹ جائے، مجھے پرواہ نہیں ہے۔“
ہوری نے منکسرانہ لہجہ میں کہا ”دھیرے دھیرے بولو مہارانی کوئی سنے تو کہے کہ یہ
سب اتنی رات گئے لڑ رہے ہیں۔ میں اپنے کانوں سے کیا کیا سن آیا ہوں، تو کیا جانے؟
یہاں چرچا ہو رہا ہے کہ میں نے الگ ہوتے سے روپے دبا لیے تھے اور بھائیوں سے کٹ کیا
تھا، وہی روپے اب نکل رہے ہیں۔“

”بھرا کہتا ہوگا؟“

”سارا گاؤں کہہ رہا ہے، اکیلے بھرا کو کیوں بدنام کر دوں؟“

”سارا گاؤں نہیں کہہ رہا ہے۔ میں ابھی جا کر پوچھتی ہوں تاکہ تمہارے باپ کتنے
روپے چھوڑ کر مرے تھے؟ داری جادوں کے پیچھے تم بگڑ گئے، ساری جنگی مٹی میں ملا دی،
پال پوس کر سنڈا کیا اور اب ہم بے ایمان ہیں! میں کہے دیتی ہوں کہ اگر گائے گھر کے باہر
نکل تو اترتھ ہو جائے گا۔ رکھ لیے ہم نے روپے، دبا لیے اور بیچ کھیت دبا لیے! ڈنگے کی
چوٹ کہتی ہوں کہ میں نے ہنڈا بھر مہریں چھپالیں۔ بھرا اور سو بھیا اور سنسار کو جو کرنا ہو
کر لے۔ کیوں نہ روپے رکھ لیں؟ دو دو سنڈوں کا بیاہ نہیں کیا، گونا نہیں کیا؟“
ہوری شپٹا گیا۔ دھنیا نے اس کے ہاتھ سے ری چھین لی اور گائے کو کھونٹے سے

باندھ کر دروازے کی طرف چلی، ہوری نے اسے پکڑنا چاہا مگر وہ باہر جا چکی تھی، وہیں سر قہام کر بیٹھ گیا۔ باہر اسے پکڑنے کی کوشش کر کے وہ کوئی ٹانگ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ دھنیا کے غصے سے وہ خوب واقف تھا، بگڑتی ہے تو چنڈی ہی بن جاتی ہے۔ مارو کاٹو سنے گی نہیں۔ لیکن ہیرا بھی تو ایک ہی بگڑیل ہے، کہیں ہاتھ چلا بیٹھے تو پڑے (قیامت) ہی ہو جائے۔ نہیں، ہیرا اتنا مورکھ نہیں ہے۔ میں نے کہاں سے کہاں یہ آگ لگا دی۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ بات دل میں ڈال لیتا تو کیوں یہ بکھیرا ہوتا؟ دفعتاً دھنیا کی کرخت آواز کان میں پڑی، ہیرا کی گرج بھی سن پڑی، پھر مٹی کا تیز لہجہ بھی دل میں چبھا۔ یکا یک اسے گوبر کی یاد آئی۔ باہر لپک کر اس کی کھاٹ دیکھی تو وہ وہاں نہ تھا۔ غضب ہو گیا گوبر بھی وہیں پہنچ گیا، اب ٹسل نہیں۔ اس کا نیا کھون ہے، نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ لیکن ہوری وہاں کیسے جائے؟ ہیرا کہے گا کہ آپ تو بولتے نہیں اور اس ڈان کو لانے کے لیے بھیج دیا۔ شور دم بدم بڑھتا جاتا تھا۔ سارا گاؤں جاگ پڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کہیں آگ لگ گئی ہے اور لوگ چار پائیوں سے اٹھ اٹھ کر بچھانے کے لیے دوڑے جارہے ہیں۔ اتنی دیر تک وہ ضبط کیے بیٹھا رہا، پھر نہ رہا گیا۔ دھنیا پر غصہ آیا۔ وہ کیوں چڑھ کر لڑنے لگی؟ اپنے گھر میں آدمی نہ جانے کس کو کیا کہتا ہے۔ جب تک کوئی منہ پر بات نہ کہے۔ یہی سمجھنا چاہیے کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ ہوری کی کسان فطرت جھگڑے سے بھاگتی تھی۔ چار باتیں سن کر غم کھا جاتا اس سے کہیں اچھا کہ آپس میں جھگڑا ہو، کہیں مار پیٹ ہو جائے تو تھانہ پولیس ہو، بندھے بندھے پھرو، سب کی چوڑی غنی کرو، عدالت کی دھول پھاگو، کھیتی باڑی جہنم میں جائے! اس کا ہیرا پر تو کوئی بس نہ تھا مگر دھنیا کو تو بیل سے کھینچ لاسکتا ہے۔ بہت ہوگا گالیاں دے لے گی، ایک دو دن روٹی رہے گی، تھانا پولیس کی تو نوبت نہ آوے گی۔ وہ جا کر ہیرا کے دروازے پر سب سے دور دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ ایک فوجی افسر کی طرح میدان میں آنے سے پہلے حالات کو بخوبی سمجھ لینا چاہتا تھا۔ اگر اپنی جیت ہو رہی ہے تو کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ ہار ہو رہی ہے تو فوراً کود پڑے گا۔ دیکھا تو وہاں پچاسوں آدمی جمع ہو گئے تھے، پنڈت داتا دین لالہ میشری، دونوں ٹھاکر جو گاؤں کے کرتا دھرتا تھے، سبھی پہنچ گئے ہیں۔ دھنیا کا پلہ ہلکا ہو رہا تھا۔ اس کی تندی رائے عاتہ کو اس کے خلاف کیے دیتی تھی۔ وہ لڑائی کے فن میں طاق نہ تھی، غصے میں ایسی جلی کئی بنا رہی تھی کہ لوگوں کی ہمدردی اس سے

دور ہوتی جاتی تھی۔

وہ گرج رہی تھی ”تو ہمیں دیکھ کر کیوں جلتا ہے؟ ہمیں دیکھ کر کیوں تیری چھاتی پھٹتی ہے؟ پال پوس کر جوان کر دیا۔ یہ اس کا اناں ہے؟ ہم نے نہ پالا ہوتا تو آج کہیں بھیک مانگتے ہوتے، روکھ کی چھانہ بھی نہ ملتی۔“

ہوری کو یہ لفظ ضرورت سے زیادہ کڑے معلوم ہوئے۔ بھائیوں کو پالنا تو اس کا دھرم تھا، ان کے حصے کی جائداد بھی تو اس کے ہاتھ میں تھی، کیسے نہ پالتا پوستا؟ دنیا میں کہیں منہ دکھانے والا رہتا؟

ہیرا نے جواب دیا ”ہم کسی کو کچھ نہیں جانتے، تیرے گھر میں کتوں کی طرح کلوا کھاتے تھے اور دن بھر کام کرتے تھے۔ یہ جانا ہی نہیں کہ لڑکپن اور جوانی کیسی ہوتی ہے۔ دن دن بھر سوکھا گوہر اکٹھا کرتے تھے اس پر بھی تو بنا دس گالی دیے روٹی نہ دیتی تھی۔ تجھ جیسی پاجن کے پالے پڑ کر جنگی کڑی ہو گئی۔“

دھنیا اور تیز پڑی ”جبان سنبال، نہیں تو منہ سے باہر کھینچ لوں گی، پاجن تیری عورت ہو گی، تو ہے کس پھیر میں مونڈی کاٹے، کلوا کھور، نمک حرام!“
داتا دین نے نوکا ”اتنا کڑا بچن کیوں کہتی ہے دھنیا؟ استری دھرم ہے کہ گم کھائے۔ وہ تو اجڑ ہے، کیوں اس کے منہ لگتی ہے؟“

لالہ بیشری پٹواری نے تائید کی ”بات کا جواب بات ہے گالی نہیں۔ تو نے لڑکپن میں اسے پالا پوسا، پر یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ اس کی جائداد تیرے ہاتھ میں تھی؟“
دھنیا نے سمجھا کہ سب کے سب مل کر مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ پس چو کھی لڑائی لڑنے کے لیے تیار ہو گئی ”اچھا تم رہنے دو لالا! میں سب کو پہچانتی ہوں۔ اس گاؤں میں رچے میں برس ہو گئے۔ ایک ایک کی نس نس پہچانتی ہوں۔ میں گالی دے رہی ہوں اور وہ پھول برسا رہا ہے، کیوں؟“

دولاری سیٹھانی نے آگ پر کھی ڈالا ”سچ ہے بڑی گال، دراج عورت ہے بھائی، مردوں کے منہ لگتی ہے۔ ہوری ہی جیسا مرد ہے کہ اس کا نباہ ہوتا ہے، دوسرا ہوتا تو ایک دن نہ بچتی۔“

اگر ہیرا اس وقت ذرا نرم پڑ جاتا تو اس کی فتح ہو جاتی، لیکن وہ گالیاں سن کر آپے

سے باہر ہو گیا۔ اوروں کو اپنی طرف دیکھ کر وہ کچھ شیر ہو رہا تھا۔ گلا پھاڑ کر بولا ”چلی جا میرے دوارے سے، نہیں جوتوں سے بات کروں گا۔ جھوٹا پکڑ کر اکھاڑ لوں گا۔ گالی دیتی ہے ڈاؤن؟ بیٹے کا گھمنڈ ہو گیا۔ کھوں.....“

پانسہ پلٹ گیا۔ ہوری کا خون جوش میں آ گیا۔ جیسے بارود میں چنگاری پڑ گئی ہو۔ آگے آ کر بولا ”اچھا، بس اب چپ ہو جاؤ ہیرا! اب نہیں سنا جاتا۔ میں اس عورت کو کیا کہوں؟ جب میری پیٹھ میں دھول لگتی ہے تو اسی کے کارن نہ جانے کیوں اس سے چپ نہیں رہا جاتا۔“

چاروں طرف سے ہیرا پر بوچھاڑ پڑنے لگی۔ داتا دین نے بے غیرت کہا، چٹشٹری نے غنڈا بتایا، جھنگری سنگھ نے شیطان کا لقب دیا، دولاری نے کپوت کہا۔ ایک کڑے لفظ نے دھنیا کا پلہ ہلکا کر دیا تھا دوسرے کڑے لفظ نے ہیرا کو پستی میں ڈال دیا۔ اس پر ہوری کے سنجیدہ الفاظ نے ری سسی کسر بھی پوری کر دی۔

ہیرا سنبھل گیا کھل گاؤں اس کے خلاف ہو گیا ہے۔ اب چپ رہنے میں ہی خیرت ہے، غصے کے تیز نشے میں بھی اس میں اتنا ہوش باقی تھا۔

دھنیا کا کلیجہ دوتا ہو گیا۔ ہوری سے بولی ”سن لو کان کھول کے بھائیوں کے لیے مرتے رہتے ہو۔ یہ بھائی ہیں؟ ایسے بھائی کا تو منہ نہ دیکھے۔ یہ مجھے جوتوں سے مارے گا۔ کھلا پلا.....“

ہوری نے ڈانٹا ”پھر کیوں بک بک کرنے لگی تو؟ گھر کیوں نہیں جاتی؟“ دھنیا زمین پر بیٹھ گئی اور فریاد کے لہجے میں بولی ”اب تو اس کے جوتے کھا کر گھر جاؤں گی۔ جرات اس کی مردی دیکھ لوں۔ کہاں ہے گوبر؟ اب کس دن کام آوے گا؟ تو دیکھ رہا ہے بیٹا کہ تیرے ماں کو جوتے مارے جا رہے ہیں!“

اس طرح فریاد کر کے اس نے اپنے غصے کے ساتھ ہوری کے غصے کو بھی عملی صورت دے دی۔ آگ کو پھوک پھوک کر اس میں لپٹ پیدا کر دی۔ ہیرا ہارا ہوا سا پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مٹی اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف کھینچ رہی تھی یکا یک دھنیا نے شیرنی کی طرح جھپٹ کر ہیرا کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ دھم سے زمین پر گر پڑا اور بولی ”کہاں جاتا ہے؟ جوتے مار! مار جوتے! دیکھوں تیری مردی!“ ہوری نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھسیٹا ہوا گھر کی طرف چلا۔

ادھر گوبر کھانا کھا کر امیرن ٹولہ جا پہنچا۔ آج جھنیا سے اس کی بہت باتیں ہوئی تھیں۔ جب وہ گائے لے کر چلا تھا تو جھنیا آدھے راستے تک اس کے ساتھ آئی تھی۔ گوبر تنہا گائے کو کیسے لے جاتا؟ اجنبی کے ساتھ جانے میں اس کا بڑکنا قدرتی تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد جھنیا نے گوبر کو بھید بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا ”اب تم کا بے کو کبھی یہاں آؤ گے؟“

ایک روز پہلے تک گوبر کنوارا تھا۔ گاؤں میں جتنی نوجوان عورتیں تھیں وہ یا تو اس کی بہنیں تھیں یا بھادھیں۔ بہنوں سے تو کوئی چھیڑ چھاڑ ہو ہی کیا سکتی تھی، بھادھیں البتہ کبھی کبھی اس سے ٹھٹھولی کیا کرتی تھیں مگر یہ محض تفریحا ہوتا تھا۔ ان کی نگاہوں میں ابھی اس کے شباب میں صرف پھول لگے تھے۔ جب تک پھل نہ لگ جائیں اس پر ڈھیلے پھینکنا بیکار تھا اور کسی طرف سے حوصلہ افزائی نہ پا کر اس کا کنوارا پن اس کے گلے سے لپٹا ہوا تھا۔ جھنیا کا محروم دل جسے بھادھوں کے طعنے و مذاق نے اور بھی خواہش مند بنا دیا تھا، اس کے کنوارے پن ہی پر لچکا اٹھا اس کنوارے پن میں بھی پتے کے کھڑکتے ہی کسی سوئے ہوئے شکاری جانور کی طرح شباب جاگ اٹھا۔

گوبر نے کھلے منچلے پن کے ساتھ کہا ”اگر بھکاری کو ملنے کا آسرا ہو تو وہ دن بھر اور رات بھر داتا کے دوارے پر کھڑا رہے۔“

جھنیا معترضا نہ لہجے میں بولی ”تو یہ کہو کہ تم بھی مطلب کے پار ہو۔“
گوبر کی رگوں کا خون متحرک ہوا تھا، بولا ”بھوکا آدمی اگر ہاتھ پھیلانے تو اسے چھما کر دینا چاہیے۔“

جھنیا اور گھرے اتری ”بھکاری جب تک دس درواجے نہ جائے اس کا پیٹ کیسے گھرے گا؟ ایسے بھکاریوں کو منہ نہیں لگاتی ایسے تو گلی گلی ملتے ہیں۔ بھر بھکاری دینا کیا ہے؟ ایس! ایسوں سے تو کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔“

کم فہم گوبر جھنیا کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ جھنیا چھوٹی ہی سی تھی، جیسی سے گاؤں کے گھر

دودھ لے جایا کرتی تھی سسرال میں بھی اسے گاؤں کے گھر دودھ پہچانا پڑتا تھا۔ آج کل بھی وہی بیچنے کا بار اسی پر ہے۔ اسے طرح طرح کے انسانوں سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ دوچار روپے اس کے ہاتھ لگ جاتے تھے، گھڑی بھر کے لیے دل بہلاؤ بھی ہو جاتا تھا مگر یہ خوشی جیسے مگنی کی چیز ہو۔ اس میں امید نہ تھی، ایثار نہ تھا، اختیار نہ تھا۔ وہ ایسی محبت چاہتی تھی جس کے لیے وہ جیے اور مرے، جس پر وہ خود کو قربان کر دے! وہ صرف جگنو کی چمک نہیں بلکہ چراغ کی مستقل روشنی چاہتی تھی۔ وہ ایک گرسٹ کی لڑکی تھی اور اس کے گرسٹ پن کو رنگین مزاجوں کی نگاہیں چل نہ سکی تھیں۔

گور نے پر شوق بشرے سے کہا ”بھکاری کو ایک ہی دوارے پر بھر پیٹ بھیک مل جائے تو کیوں در در گھومے؟“

جھنڈا نے رحم سے اس کی طرف دیکھا۔ کتنا بھولا ہے جیسے کچھ سمجھتا ہی نہیں، بولی ”بھکاری کو ایک جگہ بھر پیٹ کہاں ملتا ہے؟ اسے تو مٹھی بھر ہی ملے گا۔ سب کچھ تو جیسی پاؤ گے جب اپنا بھی سب کچھ دو گے۔“

”میرے پاس کیا ہے، جھنڈا؟“

”تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ میرے لیے تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ بڑے بڑے لکھتی لوگوں کے پاس بھی نہیں۔ مجھ سے بھیک نہ مانگ کر مجھے مول لے سکتے ہو۔“

”گور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔“

جھنڈا نے پھر کہا ”اور جاننے ہو دام کیا دینا ہوں گے؟ میرا ہو کر رہنا پڑے گا۔ پھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے دیکھوں گی تو گھر سے نکال دوں گی۔“

گور کو جیسے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے چاہی ہوئی چیز مل گئی۔ ایک عجیب خوف بھری خوشی سے اس کا عضو عضو ہلکا اٹھا۔ مگر یہ کیسے ہوگا؟ جھنڈا کو رکھ لے تو رکھنی کو لے کر گھر میں رہے گا کیسے؟ برادری کا جھنجھٹ تو ہے۔ سارا گاؤں کانیں کانیں کرنے لگے گا۔ سبھی دشمن ہو جائیں گے۔ اماں تو اسے گھر میں مگھنے ہی نہ دیں گی۔ مگر جب عورت ہو کر یہ نہیں ڈرتی تو مرد ہو کر وہ کیوں ڈرے؟ بہت ہوگا لوگ اسے الگ کر دیں گے۔ وہ الگ ہی رہے گا۔ جھنڈا جیسی عورت گاؤں میں دوسری کون ہے؟ کتنی سمجھداری کی باتیں کرتی ہے۔ کیا جانتی

نہیں کہ میں اس کے لانسک نہیں ہوں؟ پھر بھی مجھ سے محبت کرتی ہے، میری ہونے کو راجی ہے۔ گاؤں والے نکال دیں گے تو کیا دنیا میں دوسرا گاؤں ہی نہیں ہے؟ اور گاؤں کیوں چھوڑے؟ ماتا دین نے چمارن رکھ لی تو کسی نے کیا کر لیا؟ داتا دین دانت پیس کر رہ گئے۔ ماتا دین نے اتنا ضرور کیا کہ اپنا دھرم بچا لیا۔ اب بھی بنا انسان پوجا کیے منہ میں پانی نہیں ڈالتے، دونوں جون اپنا کھانا آپ پکاتے ہیں۔ اور اب تو الگ کھانا بھی نہیں پکاتے، داتا دین اور وہ ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ جھنگری سنگھ نے بانٹھی (برہمنی) رکھ لی، ان کا کسی نے کیا کر لیا؟ ان کا بھتا آدرت اب بھی ہے بلکہ اور ادھک۔ پہلے نوکری کھوجتے پھرتے تھے؟ اب اس کے روپے سے مہاجن بن بیٹھے۔ ٹھکرائی کا رعب تو تھا ہی، مہاجنی کا رعب جم گیا۔ مگر پھر خیال آیا کہ کہیں جھنڈا ہنسی نہ کر رہی ہو، پہلے اس کا اطمینان ہو جانا ضروری تھا۔ اس نے کہا ”من سے کہتی ہو جھوٹا کہ کھالی لالچ دے رہی ہو؟ میں تو تمہارا ہو چکا اب تم بھی میری ہو جاؤ گی؟“

”تم میرے ہو چکے کیسے جانو؟“

”تم جان بھی مانگو تو دے دوں“

”جان دینے کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟“

”تم سمجھا دینا۔“

”جان دینے کا مطلب ہے ساتھ رہ کر نباہ کرنا۔ ایک بار ہاتھ پکڑ کر عمر بھر نباہ کرتے رہنا، چاہے دنیا کچھ کہے، چاہے ماں باپ، بھائی بند، گھر دار سب کچھ چھوڑنا پڑے۔ منہ سے جان دینے والے بہتوں کو دیکھ چکی، بھونروں کی طرح پھول کا رس لے کر اڑ جاتے ہیں۔ تم بھی تو اسی طرح نہ اڑ جاؤ گے؟“

گوہر کے ایک ہاتھ میں گائے کی رسی تھی دوسرے ہاتھ سے اس نے جھنڈا کا ہاتھ پکڑ لیا، جیسے بجلی کے تار پر ہاتھ پڑ گیا ہو، سارا بدن شباب کے اولین مَس سے کانپ اٹھا۔ کتنی نرم و نازک اور بھری ہوئی کلائی! جھنڈا نے اس کا ہاتھ ہٹایا نہیں، جیسے اس جھونے کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ ہوں۔ پھر لمحہ بھر بعد سنجیدگی سے بولی ”آج تم نے میرا ہاتھ پکڑا ہے، یاد رکھنا۔“

”خوب یاد رکھوں گا جھوٹا اور مرتے دم تک نباہوں گا۔“

تھمنا نے بے اعتباری کی مسکراہٹ سے بولی ”اسی طرح تو سب کہتے ہیں گوہر، بلکہ اس سے بھی بیٹھے چکنے شہدوں میں۔ اگر من میں کپٹ ہو تو مجھے بتا دو۔ ہوشیار ہو جاؤں۔ ایسوں کو دل نہیں دیتی، ان سے ہنس بول لینے ہی کا ناتا رکھتی ہوں، برسوں سے دودھ لے کر ہاٹ جاتی ہوں۔ ایک سے ایک بابو، مہاجن، ٹھاکر، وکیل، عملے افسر اپنی چاہ دکھا کر مجھے پھنسا لیتا چاہتے ہیں۔ کوئی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے ”تھمنا ترسامت“ کوئی مجھے نسلی چٹون سے گھورتا ہے جیسے پریم کے مارے بے سدھ ہو گیا ہو۔ سب میری گلامی کرنے کو تیار رہتے ہیں، عمر بھر، بلکہ دوسرے جنم میں بھی! پر میں ان سیوں کی نس پچھانتی ہوں۔ سب کے سب بھوزے ہیں، رس لے کر اڑ جانے والے۔ میں بھی انھیں لبھاتی ہوں، ترجیحی نگاہوں سے دیکھتی ہوں، مسکاتی ہوں۔ وہ مجھے گدھی بناتے ہیں۔ میں انھیں اتو بناتی ہوں۔ میں مر جاؤں تو ان کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے گا، دے مر جائیں تو میں کہوں گی اچھا ہوا، مر گیا۔ میں تو جس کی ہو جاؤں گی اس کی جنم بھر کے لیے ہو جاؤں گی، سکھ میں، دکھ میں، سمپت میں، بہت میں، اسی کے ساتھ رہوں گی۔ ہر جانی نہیں ہوں کہ سب سے ہنسی بولتی پھروں۔ نہ روپے کی بھوکی ہوں، نہ گہنے کپڑے کی۔ بس بھلے آدمی کا ساتھ چاہتی ہوں، جو مجھے اپنا سمجھے اور جسے میں بھی اپنا سمجھوں۔ ایک پنڈت جی بہت تلک چھاپ لگاتے ہیں۔ آدھ سیر دودھ لیتے ہیں۔ ایک دن ان کی گھر والی کہیں نیوتے میں گئی تھی۔ مجھے کیا معلوم؟ اور دنوں کی طرح دودھ لیے بھیتڑ چلی گئی۔ وہاں پکارتی ہوں، بہو جی بہو جی کوئی بولتا ہی نہیں۔ اتنے میں دیکھتی ہوں تو پنڈت جی باہر کے کواڑ بند کیے چلے آ رہے ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ اس کی نیت بری ہے۔ میں نے ڈانٹ کر پوچھا تم نے کواڑ کیوں بند کر لیے؟ بہو جی کہیں گئی ہیں کیا؟ گھر میں سنا نا کیوں ہے؟“

اس نے کہا ”وہ ایک نیوتے میں گئی ہیں۔“ اور میری طرف دو ڈگ اور بڑھ آیا۔ میں نے کہا ”تمہیں دودھ لینا ہو تو لو، نہیں تو میں جاتی ہوں۔“ بولا ”آج تو تم یہاں سے نہ جانے پاؤ گی جھوٹا رانی! روج روج کلیجے پر چھری چلا کر بھاگ جاتی ہو۔ آج میرے ہاتھ سے نہ بچو گی۔“

”تم سے سچ کہتی ہوں گوہر میرے روئیں کھڑے ہو گئے۔“

گوہر جوش میں بولا ”میں بچہ کو دیکھ پاؤں تو کھود کر گاڑ دوں، کھون پی لوں۔ تم مجھے

دکھا تو دینا۔“

”سنو تو، ایسوں کا منہ توڑنے کے لیے میں ہی بہت ہوں۔ میری چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔ یہ کچھ کر بیٹھے تو کیا کروں گی؟ کوئی چلانا بھی نہ سنے گا پر من میں یہ پٹکا کر لیا تھا کہ میری دہیہ چھوٹی تو دودھ بھری ہانڈی اس کے منہ پر پٹک دوں گی۔ چار پانچ سیر دودھ جائے گا تو جائے، بچہ کو یاد تو ہو جائے گا۔ کلیجہ کڑا کر کے بولی ”اس پھیر میں نہ رہنا پنڈت جی! میں ابیر کی لڑکی ہوں، مونچھ کا ایک ایک بال چنوالوں کی۔ یہی لکھا ہے تمہاری پوتھی پتروں میں کہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اپنے گھر میں بند کر کے اس کی آبرو لو؟ اسی لیے تلک چھاپے کا جال بچھائے بیٹھے ہو؟“ لگا ہاتھ جوڑنے پاؤں پڑنے، بولا ”ایک چاہنے والے کا من رکھ لوگی تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا جھوٹا رانی؟ کبھی کبھی گریبوں پر دیا کیا کرو، نہیں بھگوان پونجیس گے کہ میں نے تمہیں اتنا روپ کا دھن دیا تھا، تم نے اس سے ایک برہمن کا اپکار بھی نہیں کیا، تو کیا جواب دوگی؟ بولو“ روپے پیسے کا دان تو سدا ہی پاتا ہوں، آج روپ کا دان دو۔“

میں نے یوں ہی اس کا من رکھنے کو کہہ دیا کہ میں پچاس روپے لوں گی۔ سچ کہتی ہوں گو بر کہ وہ اسی دم کوٹھری میں گیا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر میرے ہاتھوں میں دینے لگا اور جب میں نے نوٹ دیں گرا دیے اور دوارے کی طرف چلی تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا، میں نے تو پہلے ہی سے تیار تھی۔ ہانڈی اس کے منہ پر دے ماری، سر سے پیر تک سراپور ہو گیا۔ چوٹ بھی بہت لگی، سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور لگا ہائے ہائے کرنے۔ میں نے دیکھا کہ اب یہ کچھ نہیں کر سکتا تو پیٹھ میں دو لاتیں جمادیں اور کواڑ کھول کر بھاگی۔

گو بر قہقہہ لگا کر بولا ”بہت اچھا کیا تم نے دودھ سے نہا گیا ہوگا۔ تلک چھاپا بھی دھل گیا ہوگا؟“

دوسرے دن پھر میں اس کے گھر گئی۔ گھر والی آگئی۔ وہ اپنے بیٹھکے میں سر پر پٹی باندھے پڑا تھا میں نے کہا ”کہو تو کل کی تمہاری کرتوت کھول دوں پنڈت! لگا ہاتھ جوڑنے۔ میں نے کہا، اچھا تھوک کر چاٹو تو چھوڑ دوں۔ دھرتی پر ماتھا ٹک کر کہنے لگا ”اب میری آبرو تمہارے ہاتھ ہے جھوٹا۔ یہی سمجھ لو کہ پنڈتانی مجھے جیتا نہ چھوڑیں گی، مجھے بھی اس پر دیا آگئی۔“

گو بر کو یہ دیا بری لگی، بولا ”یہ تم نے کیا کیا؟ اس کی عورت سے جا کر کہہ کیوں نہ دیا

کہ جوتوں سے چلتی۔ ایسے پکھنڈ یوں پر دیا نہ کرنی چاہیے۔ تم مجھے کل اس کی صورت دکھا دو، پھر دیکھنا کہ کیسی مرمت کرتا ہوں۔“

جھینڈا نے اس کے ادھ کھلے شباب کو دیکھ کر کہا ”تم اسے نہ پاؤ گے پورا دیو ہے، سینت میت کا مال اڑاتا ہے کہ نہیں۔“

گوبر اپنے شباب کی یہ تحقیر کیسے برداشت کرتا؟ ڈینگ مار کر بولا ”موٹے ہونے سے کیا ہوتا ہے، یہاں پھولاد کی ہڈیاں ہیں۔ تین سو ڈنڈ روز مارتا ہوں۔ دودھ گھی نہیں ملتا۔ نہیں تو اب تک سینہ یوں نکل آیا ہوتا“ یہ کہہ کر اس نے اپنا سینہ تان کر دکھلایا۔

جھینڈا نے تقویت بھری آنکھوں سے دیکھا، بولی ”اچھا کبھی دکھا دوں گی۔ پر یہاں تو سبھی ایک سے ایک ہیں، تم کس کس کی مرمت کرو گے؟ نہ جانے مردوں کی کیا عادت ہے کہ جہاں کوئی جوان، سندر عورت دیکھی اور بس لگے گھورنے، چھاتی پیٹنے اور یہ جو بڑے آدمی کہلاتے ہیں یہ تو زے کچالی ہوتے ہیں۔“

”پھر میں تو کوئی سندر ری بھی نہیں ہوں.....“

گوبر نے احتجاج کیا ”تم! تمہیں دیکھ کر تو یہی دل چاہتا ہے کہ کلیجہ میں بٹھالیں۔“ جھینڈا نے اس کی پیٹھ پر ایک ہلکا سا گھونہ جمایا۔ ”لگے آوروں کی طرح تم بھی چالپوسی کرنے۔ میں جیسی کچھ ہوں، میں جانتی ہوں، پر ان لوگوں کو تو کوئی بھی جوان عورت مل جائے، گھڑی بھر من بہلانے کو اور کیا چاہیے؟ گن تو آدمی اس میں دیکھتا ہے جس کے ساتھ جنم بھر نباہ کرنا ہو۔ سنتی بھی ہوں اور دیکھتی بھی ہوں کہ آج کل بڑے گھروں کا عجیب حال ہے۔ جس محلے میں میری سسرال ہے اسی میں گپڈ و گپڈ و نام کے کشمیری رہتے تھے۔ بڑے بھاری آدمی تھے۔ ان کے یہاں پانچ سیر دودھ لگتا تھا۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں۔ کوئی بیس بیس پچیس پچیس برس کی، ایک سے ایک سندر۔ تینوں بڑے کالج میں پڑھنے جاتی تھیں۔ ایک سائٹ کالج میں پڑھاتی تھی اور تین سو کا مہینہ پاتی تھی۔ ستار وے سب بجاویں، ہارمونیا وے سب بجاویں، ناچیں وے، گاویں وے، پر بیاہ کوئی نہ کرتی تھی۔ رام جانے وہ کسی مرد کو پسند نہیں کرتی تھیں کہ مرد انہیں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار میں نے بڑی بی بی سے پوچھا تو ہنس کر بولیں کہ ہم لوگ یہ روگ نہیں پالتے۔ پھر بھیتری بھیتری گھر سے اڑاتی تھیں۔ جب دیکھوں، دوچار لوٹے ان کو گھیرے ہوتے ہیں۔ جو سب سے بڑی تھی

وہ کوٹ پتلون پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر مردوں کے ساتھ گھومنے جاتی۔ سارے سہر میں ان کی لیلا کا چرچا تھا۔ گہڈو بابو سر نچا کیے جیسے منہ میں کالک سی لگائے رہتے تھے۔ لڑکیوں کو ڈانٹتے تھے، سمجھاتے تھے، دے سب کی سب کھلم کھلا کہتی تھیں کہ تمہیں ہمارے بچ میں بولنے کا کچھ مجال نہیں ہے، ہم اپنی من کی رانی ہیں، جو ہمارا جی چاہے گا کریں گے۔ بے چارا باپ جوان لڑکیوں سے کیا بولے؟ مارنے باندھنے سے رہا۔ ڈانٹنے ڈپٹنے سے رہا پر بھائی، بڑے آدمیوں کی باتیں کون چلاوے؟ وہ جو کچھ کریں سب ٹھیک ہے۔ انھیں تو برادری اور پچائیت کا بھی ڈر نہیں ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا کہ کسی کا روج روج من کیسے بدل جاتا ہے۔ کیا آدمی گائے بکری سے بھی گیا بیٹا ہو گیا؟ پر کسی کو برا نہیں کہتی، بھائی من کو جیسا بناؤ ویسا بنتا ہے۔ ایسوں کو بھی دیکھتی ہوں جنہیں سدا کی دال روٹی کے بعد کبھی کبھی منہ کا سواہ بدلنے کے لیے حلوا پوری بھی چاہیے اور ایسوں کو بھی دیکھتی ہوں جنہیں گھر کی روٹی دال دیکھ کر جوڑی آتی ہے۔ کچھ بے چاریاں ایسی بھی ہیں جو اپنی دال روٹی ہی میں تگن رہتی ہیں، حلوا پوری سے انھیں کوئی مطلب نہیں۔ میری دونوں بھادجوں ہی کو دیکھو۔ ہمارے بھائی کانے کبڑے نہیں ہیں۔ دس جوانوں میں ایک جوان ہیں پر بھادجوں کو نہیں بھاتے۔ انھیں تو وہ چاہیے جو سونے کی بالیاں بنائے، مہین ساڑیاں لاوے اور روج چاٹ کھلا دے۔ بالیاں اور ساڑیاں اور مٹھائیاں مجھے بھی کم اچھی نہیں لگتیں مگر جو کہو اس کے لیے اپنی لاج بیچتی پھروں تو بھگوان اس سے بچاویں۔ ایک کے ساتھ روکھا سوکھا کھا کر عمر کاٹ دینا، بس اپنا تو یہی راگ ہے۔ بہت کر کے تو مرد ہی عورتوں کو بگاڑتے ہیں۔ جب مرد ادھر ادھر تانک جھانک کرے گا تو عورت بھی آنکھیں لڑائے گی۔ مرد دوسری عورت کے پیچھے دوڑے گا تو عورت بھی دوسرے مرد کے پیچھے دوڑے گی۔ مرد کا ہر جائی ہونا عورت کو بھی اتنا ہی برا لگتا ہے جتنا عورت کا مرد کو۔ یہی سمجھ لو۔ میں نے تو اپنے آدمی سے ساپھ ساپھ کہہ دیا تھا کہ اگر تم ادھر ادھر لپکے تو میرے بھی جوجی میں آوے گا کروں گی۔ جو یہ چاہو کہ تم تو اپنے من کی کرد اور عورت کو مار کے ڈر سے اپنے بس میں رکھو تو یہ نہ ہوگا۔ تم کھلے کھجانے کرتے ہو وہ چھپ کر کرے گی۔ تم اسے جلا کر سکھی نہیں رکھ سکتے۔“

گوبر کے لیے یہ ایک نئی دنیا کی باتیں تھیں۔ محو ہو کر سن رہا تھا۔ کبھی کبھی تو آپ ہی آپ اس کے پاؤں رک جاتے، پھر چیت کر چلنے لگتا۔ تھمنا نے پہلے اسے اپنے روپ پر

موہ لیا تھا ، آج اس نے اپنی تجربے سے بھری باتوں اور اپنی عصمت پروری کے ذکر سے اسے اپنا گردیدہ بنا لیا ۔ ایسے روپ ، گمن ، اور گمیان والی عورت اسے مل جائے تو دھنیہ بھاگ ! پھر وہ کیوں بچایت اور برادری سے ڈرے ؟

تھمنا نے جب دیکھ لیا کہ اس کا رنگ گہرا جم گیا تو سینے پر ہاتھ رکھ کر زبان کو دانت سے کاٹی ہوئی بولی۔

”ارے یہ تو تمہارا گاؤں آگیا ! تم بھی بڑے چالاک ہو ، مجھے کہا بھی نہیں کہ لوٹ جاؤ۔“

یہ کہہ کر وہ لوٹ پڑی ۔

گوبر نے اصرار سے کہا ”تھمن بھر کے لیے میرے گھر کیوں نہیں چلتی ؟ اماں بھی تو دیکھ لیں۔“

تھمنا نے شرم سے آنکھیں چرا کر کہا ”تمہارے گھریوں نہ جاؤں گی ۔ مجھے تو یہی اچرج ہوتا ہے کہ میں اتنی دور کیسے آگئی ۔ اچھا بتاؤ اب کب آؤ گے ؟ رات کو میرے دروازے پر اچھی سنگت ہوگی ۔ چلے آنا میں اپنے بچھواڑے ملوں گی۔“

”اور جو نہ ملیں؟“

”تو لوٹ آتا۔“

”تو پھر میں نہ آؤں گا۔“

”آنا پڑے گا ۔ نہیں تو کہے دیتی ہوں ، ہاں!“

”تم بھی بچن دو کہ ملو گی۔“

”میں بچن نہیں دیتی۔“

”تو میں بھی نہیں آتا۔“

”میری بلا سے۔“

”تھمنا اٹھوٹھا دکھا کر چل دی ۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے پر اپنا اپنا اقتدار قائم کر چکے تھے ۔ تھمنا جانتی تھی کہ وہ آئے گا ؟ گوبر جانتا تھا کہ وہ ملے گی ، کیسے نہ ملے گی ؟ جب وہ تنہا گائے کو ہانکتا ہوا چلا تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ بہشت سے گر پڑا ہو ۔

جیٹھ کی گرم شام ، سہری کی سڑکوں اور گلیوں میں بھی پانی کے چھڑکاؤ سے نضا سرد و شاداب ہو رہی تھی۔ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں اور پودوں کے گھلے سجا دیے گئے تھے اور بجلی کے عکسے چل رہے تھے۔ رائے صاحب اپنے کارخانے میں بجلی بخوالیتے تھے۔ ان کے سپاہی پہلی دردیاں پہنے اور نیلے صافے باندھے عوام پر رعب جھاتے پھرتے۔ نوکر سفید کرتے پہنے اور زعفرانی رنگ کی پگڑیاں باندھے مہمانوں اور منکصوں کی خاطر و مدارت کر رہے تھے۔ اسی وقت ایک موٹر صدر دروازے کے سامنے آکر رکا اور اس میں سے تین اصحاب اترے۔ وہ جو کھدر کا کرتا اور چہل پہنے ہوئے تھے، ان کا نام پنڈت اونکار ناتھ ہے۔ آپ بجلی نامی روزنامے کے مشہور و معروف ایڈیٹر ہیں جنہیں دلش کی چتا نے گھلا ڈالا ہے۔ دوسرے صاحب جو کوٹ اور پتلون میں ہیں ، وہ ہیں تو وکیل ، مگر وکالت نہ چلنے کی سبب ایک بیمہ کمپنی کی دلالی کرتے ہیں اور تعلقہ اروں کو مہاجنوں اور بینکوں سے قرض دلانے میں وکالت سے کہیں زیادہ کمائی کر لیتے ہیں۔ ان کا نام ہے شام بہاری ٹنٹا اور تیسرے صاحب جو ریشمی اچکن اور جست پا جاما پہنے ہوئے ہیں مسٹر بی مہتا یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ یہ تینوں صاحب رائے صاحب کے ہم سبقوں میں ہیں اور ٹنٹوں کے جلسے میں مدعو ہوتے ہیں۔ آج سارے علاقے کے آسامی آئیں گے اور ٹنٹوں کے روپے نظر کریں گے۔ رات کو دھنس یکید ہوگا مہمانوں کی دعوت ہوگی۔ ہوئی نے پانچ روپے ٹنٹوں کے دے دیے ہیں اور ایک گلابی مرزئی پہنے، گلابی پگڑی باندھے، گٹھنے تک کا چھٹی کا جھٹ، ہاتھ میں ایک کھربلی لیے اور چہرے پر پاؤ ڈر لے راجا جنک کا مالی بن گیا ہے اور گھمنڈ سے اتنا پھول اٹھا ہے گویا ٹھل جلسہ اس کی بدولت ہو رہا ہے۔

رائے صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ دوہرے بدن کے اونچے آدی تھے۔ سکھا ہوا جسم، بارونق چہرہ، بلند پیشانی، گورا رنگ، اس پر شرقتی ریشمی چادر خوب چھب رہی تھی۔ پنڈت اونکار ناتھ نے پوچھا ”اب کے کون سا نانک کھیلنے کا ارادہ ہے؟ میری دلچسپی

کی تو یہاں وہی ایک چیز ہے۔“

رائے صاحب نے تینوں اصحاب کو خیمے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھاتے ہوئے کہا ”پہلے دھنش یکپہ ہوگا اور پھر اس کے بعد ایک مزاحیہ ڈرامہ۔ ٹانک تو کوئی اچھا نہ ملا۔ کوئی اتنا لبا کے شاید پانچ گھنٹوں میں ختم نہ ہو اور کوئی اتنا مشکل کہ شاید یہاں ایک آدمی بھی اس کا مطلب نہ سمجھے۔ آخر میں نے خود ایک مزاحیہ ٹانک لکھ ڈالا جو دو گھنٹوں میں پورا ہو جائے گا۔“

ادوکار ناتھ کو رائے صاحب کی ڈرامہ نگاری میں بہت شک تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ذہانت تو غریبی ہی میں چمکتی ہے، چراغ کی طرح جو اندھیرے ہی میں اپنی روشنی ظاہر کرتا ہے۔ بے پروائی سے منہ پھیر لیا، جسے چھپانے کی بھی انھوں نے کوشش نہیں کی۔

مسٹر فٹن ان بے کار باتوں میں نہ پڑنا چاہتے تھے مگر پھر بھی رائے صاحب کو دکھانا چاہتے تھے کہ اس کے متعلق انھیں کچھ کہنے کا حق ہے بولے ”ٹانک کوئی بھی اچھا ہو سکتا ہے اگر اس کے ایکٹر اچھے ہوں۔ عمدہ سے عمدہ ٹانک برے ایکٹروں کے ہاتھ میں پڑ کر برا ہو سکتا ہے۔ جب تک اسٹیج پر تعلیم یافتہ ایکٹریں نہیں آتیں ہمارے ناگہی فن کا اڈھار نہیں ہو سکتا۔ اب کے تو آپ نے کونسل میں سوالوں کی دھوم مچادی، میں تو دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی ممبر کا ریکارڈ اتنا شاندار نہیں ہے۔“

فلسفہ کے پروفیسر مسٹر مہتا اس تعریف کو سہ نہ سکتے تھے۔ مخالفت تو کرنا چاہتے تھے مگر اصول کی آڑ لے کر انھوں نے حال ہی میں ایک کتاب کئی سال کی محنت سے لکھی تھی۔ اس کی جتنی شہرت ہونی چاہیے تھی اس کا عشرِ عشر بھی نہ ہوئی تھی۔ جس سے وہ بہت مغموم تھے۔ بولے ”بھئی میں سوالوں کا قائل نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری زندگی ہمارے اصولوں کے مطابق ہو۔ آپ کسانوں کے بھی خواہ ہیں، انھیں انواع و اقسام کی مراعات دینا چاہتے ہیں، زمینداروں کے اختیارات چھین لینا چاہتے ہیں۔ بلکہ انھیں تو آپ سماج کی محنت کہتے ہیں، مگر پھر بھی آپ زمیندار ہیں، ویسے ہی زمیندار جیسے ہزاروں اور ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ کسانوں کے ساتھ رعایت ہونی چاہیے تو پہلے آپ خود شروع کریں۔ کسانوں کو نذرانہ لیے بغیر پتے لکھ دیں، بیگار بند کر دیں، اضافہ لگان سے درگزر کریں، چراگاہیں چھوڑ دیں مجھے ان لوگوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے جو باتیں تو کرتے ہیں کیونشنوں کی سی، مگر زندگی ہے رئیسوں کی سی، اتنی ہی عیش پسندی اور خود غرضی سے معمور!“

رائے صاحب کو صدمہ ہوا۔ وکیل صاحب کے ماتھے پر ہل پڑے گئے۔ ایڈیٹر صاحب کے منہ پر کالکھ سی لگ گئی۔ وہ خود اشتراکیت کے پھاری تھے۔ مگر براہ راست گھر میں آگ نہ لگانا چاہتے تھے۔

نٹکانے رائے صاحب کی وکالت کی ”میں سمجھتا ہوں کہ رائے صاحب کا اپنے آسامیوں کے ساتھ جتنا اچھا سلوک ہے ویسا ہی اگر کبھی زمیندار برتیں تو یہ سوال ہی باقی نہ رہے۔“

مہتا نے ہتھوڑے کی دوسری چوٹ بجائی ”مانتا ہوں، آپ کا اپنے آسامیوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ ہے، مگر سوال تو یہ ہے کہ اس میں خود غرضی ہے یا نہیں؟ اس کا ایک سبب کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ دھبی آج میں کھانا ڈالتے دار پکتا ہے؟ گڑ سے مارنے والا زہر سے مارنے والے کی بہ نسبت زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ہم سوشلسٹ ہیں یا نہیں ہیں۔ ہیں، تو دیا برتیں بھی، ورنہ بکنا چھوڑ دیں۔ میں نقلی زندگی کے خلاف ہوں۔ اگر گوشت کھانا اچھا سمجھتے ہو تو اعلان یہ کھاؤ۔ برا سمجھتے ہو تو نہ کھاؤ۔ یہ تو میری سمجھ میں آتا ہے، مگر اچھا سمجھنا اور چھپ کر کھانا، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اسے بزدلی بھی کہتا ہوں اور مکاری بھی جو دراصل ایک ہی ہیں۔“

رائے صاحب ایک صحبت یافتہ آدمی تھے، تو جین اور صدمے کو صبر اور فراخ دلی سے سہنے کی انھیں مہارت تھی۔ کچھ پس و پیش میں پڑ کر بولے ”آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ مہتا جی! آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی صاف گوئی کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ مگر آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسری مسافتوں کی طرح خیالوں کی مسافت میں بھی منزلیں ہوتی ہیں۔ اور آپ ایک منزل کو چھوڑ کر دوسری منزل میں نہیں جا سکتے۔ انسانی زندگی کی تاریخ اس کا ایک بین ثبوت ہے، میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں بادشاہ خدا ہے اور زمیندار خدا کا مشیر ہے۔ میرے والد مرحوم آسامیوں پر اتنی دیا کرتے تھے کہ پالے سوکھے میں کبھی نصف کبھی پورا لگان معاف کر دیتے تھے۔ اپنے ذخیرے سے اناج نکال کر آسامیوں کو کھلا دیتے تھے۔ گھر کے زیور بیچ کر لڑکیوں کے بیاہ میں مدد دیتے تھے۔ مگر یہ سب اسی وقت تک جب رعایا انھیں سرکار اور دھرم اوتار کہتی رہے، انھیں اپنا دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرتی رہے۔ رعایا کو پالنا ان کا سناٹن دھرم تھا مگر اختیار کے نام پر وہ کوڑی کا دندانہ بھی پھوڑ کر دینا نہ جانتے تھے۔ میں اسی ماحول میں پلا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں عملاً خواہ کچھ کروں مگر ارادوں

میں ان سے آگے بڑھ گیا ہوں اور یہ ماننے لگا ہوں کہ جب تک کسانوں کو یہ رعایتیں اختیاری شکل میں نہ ملیں گی، اس وقت تک صرف نیک خیالی کی بنیاد پر ان کی حالت میں سدھار نہیں ہو سکتی۔ اپنی خوشی سے بے غرض بن جانا تو مستحیات میں سے ہے۔ میں خود اچھا خیال رکھتے ہوئے بھی اپنا سوارتھ نہیں چھوڑ سکتا اور چاہتا ہوں کہ ہمارے طبقے کو حکومت کی طاقت اور طرز عمل کے ذریعے سے اپنا سوارتھ چھوڑ دینے کے لیے مجبور کر دیا جائے۔ اسے آپ بزدلی کہیں گے، میں مجبوری کہتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ کسی کو بھی دوسرے کی محنت پر موٹے ہونے کا حق نہیں ہے۔ دوسروں کے بل پر جینا انتہائی بے غیرتی ہے۔ کام کرنا جملہ جانداروں کا دھرم ہے۔ سماج کی وہ تقسیم تدوین جس میں کچھ لوگ مفت مزے اڑائیں اور بیشتر آدمی مراکھا کریں، کبھی راحت بخش نہیں ہو سکتی۔ پونجی اور تعلیم جسے میں پونجی ہی کا ایک پہلو سمجھتا ہوں، ان کا گڑھ جتنی جلدی لوٹ جائے اتنا ہی اچھا۔ جنھیں پیٹ کو روٹی میسر نہیں ان کے افسردہ دس پانچ پانچ ہزار پاتے ہیں۔ یہ ہنسنے کے قابل ہے اور شرم کے بھی! اس نظام نے ہم زمینداروں میں کتنی عیش پسندی، کتنی بد چلتی، کتنی غلامی اور کتنی بے شرمی بھردی ہے، یہ میں خوب جانتا ہوں مگر میں ان ہی وجوہ سے اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ اپنے سوارتھ کے خیال سے بھی اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ اس شان کو نبھانے کے لیے ہمیں اپنے ضمیر کا اتنا خون کرنا پڑتا ہے کہ ہم میں خوداری کا نام بھی نہیں رہ گیا ہے۔ ہم اپنے آسامیوں کو کولونے کے لیے مجبور ہیں۔ اگر افسروں کو قیمتی قیمتی ڈالیاں نہ دیں تو باغی سمجھے جائیں اور شان و شوکت سے نہ رہیں تو کتھوں کہلائیں! انقلابی تحریک کی ذرا سی آہٹ پر ہم کانپ اٹھتے ہیں اور افسروں کے پاس فریاد لے کر دوڑتے ہیں کہ ہمیں بچائیے۔ ہمیں اپنے پر اعتبار نہیں رہا اور نہ ہم میں مردانگی ہی رہ گئی ہیں۔ بس ہماری حالت ان بچوں کی سی ہے جنھیں جج سے دودھ پلا کر پالا جاتا ہے، دیکھنے میں موٹے مگر واقعی کمزور، بے بس اور محتاج!“

مہتا نے تالی بجا کر کہا ”ہیر! ہیر! آپ کی زبان میں جتنی عقل ہے کاش اس کی نصف بھی دماغ میں ہوتی! افسوس یہی کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ اپنے خیالات پر عمل نہیں کر سکتے۔“

اونکارنا تھ بولے ”کیلا چتا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا، مسر مہتا! ہمیں وقت کے ساتھ چلنا

بھی ہے اور اسے اپنے ساتھ چلانا بھی ۔ برے ہی کاموں میں مدد کی ضرورت نہیں ہوتی ، اچھے کاموں کے لیے بھی مدد کی اتنی ہی ضرورت ہے ۔ آپ ہی کیوں آٹھ سو روپے ہڑپ کرتے ہیں جبکہ آپ کے کروڑوں بھائی صرف آٹھ روپے میں اپنا نباہ کر رہے ہیں؟“
 رائے صاحب نے ظاہراً افسوس مگر باطنی اطمینان سے ایڈیٹر صاحب کو دیکھا اور بولے
 ”شخصی باتوں کی تنقید نہ کیجیے ، ایڈیٹر صاحب ! ہم یہاں سماج کے نظام پر غور کر رہے ہیں۔“
 مسٹر مہتا دیے ہی ٹھنڈے دل سے بولے ”نہیں ، میں اسے برا نہیں سمجھتا۔ سماج
 شخصوں سے بنتا ہے اور شخص کو بھول کر ہم کسی نظام پر غور نہیں کر سکتے۔ اس لیے اتنی تنخواہ لیتا
 ہوں کہ میرا اس نظام پر اعتقاد نہیں ہے۔“

ایڈیٹر صاحب کو حیرت ہوئی ”اچھا تو آپ موجودہ نظام کے حامی ہیں؟“
 ”میں اس اصول کا حامی ہوں کہ دنیا میں چھوٹے بڑے ہمیشہ رہیں گے اور انھیں
 ہمیشہ رہنا چاہیے ۔ اسے مٹانے کی کوشش کرنا بنی نوع انسان کی تباہی کا موجب ہوگا۔“
 کشتی کا جوڑ بدل گیا ۔ رائے صاحب الگ کھڑے ہو گئے اور ایڈیٹر صاحب اکھاڑے
 میں اترے۔ ”آپ اس بیسویں صدی میں اعلیٰ ادنیٰ کا فرق مانتے ہیں؟“
 ”جی ہاں ، میں مانتا ہوں ، اور بڑے زوروں سے مانتا ہوں ۔ جس مت کو آپ
 مانتے ہے وہ بھی تو کوئی نیامت نہیں ہے ۔ جب سے انسان میں خودی کا ارتقاء ہوا جیسی
 سے اس مت کا جنم ہوا ۔ بدھ اور افلاطون اور عیسیٰ سبھی سماج میں مساوات کے مبلغ تھے ۔
 یونان اور روم اور شام سبھی نے اس کی آزمائش کی مگر غیر قدرتی ہونے کے سبب کبھی وہ دیر
 پا نہ رہ سکی۔“

”آپ کی باتیں سن کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔“
 ”تعجب نادانی کا دوسرا نام ہے۔“
 ”میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس پر مضامین کا کوئی سلسلہ شروع کر دیں۔“
 ”جی ! میں اتنا احمق نہیں ہوں ۔ اچھی رقم دلائیے تو البتہ۔“
 ”آپ نے اصول ہی ایسا لیا ہے کہ علانیہ عوام کو لوٹ سکتے ہیں۔“
 ”مجھ میں اور آپ میں فرق اتنا ہی ہے کہ میں جو کچھ مانتا ہوں ۔ اس پر عمل کرتا
 ہوں اور آپ لوگ ماننے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ۔ دولت کو آپ کسی بے انصافی کے ذریعے

برابر پھیلا سکتے ہیں مگر عقل، کردار، خوبصورتی، ذہانت اور طاقت کو برابر پھیلا دینا تو آپ کی سکت سے باہر ہے۔ چھوٹے بڑے کا فرق صرف دولت ہی سے نہیں ہوتا۔ میں نے بڑے بڑے دولت مندوں کو فقیروں کے سامنے گھٹنے ٹیکتے دیکھا ہے اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ حسن کی چوکھٹ پر بڑے بڑے راجے ناک رگڑتے ہیں۔ کیا یہ تمدنی افتراق نہیں ہے؟ آپ روس کی مثال دیں گے۔ وہاں اس کے سوا اور کیا ہے کہ مل کے مالک نے سرکاری نوکر کا روپ لے لیا ہے؟ عقل پہلے بھی حکومت کرتی تھی اور آگے بھی ہمیشہ کرے گی۔“

طشتری میں پان مچھلے تھے، رائے صاحب نے مہمانوں کو پان، الائچی دیتے ہوئے کہا ”عقل اگر خود غرضی سے بری ہو تو ہمیں اس کا اقتدار ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ سوشلزم کا یہی معیار ہے۔ ہم سادھو مہاتماؤں کے سامنے اسی لیے سر جھکاتے ہیں کہ ان میں تیاگ کا بل ہے۔ اسی طرح ہم عقل کے ہاتھ میں اختیار بھی دینا چاہتے ہیں، وقار بھی، اور لیڈری بھی، مگر دولت کبھی نہیں! عقلی اختیار اور وقار شخص کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے لیکن اس کی دولت دس بونے کے لیے اس کے بعد اور بھی طاقتور ہو جاتی ہے۔ عقل کے بغیر کوئی ساج نہیں چل سکتا۔ ہم تو صرف اس بچھو کا ڈنک توڑ دینا چاہتے ہیں۔“

دوسرا موٹر آپہنچا اور مسٹر کھتا اترے جو ایک بینک کے منیجر اور شکرمل کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ دو عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ رائے صاحب نے ان دونوں کو اتارا۔ وہ جو کھدر کی ساڑی پہنے ہوئے بہت متین اور دور اندیش سی ہیں، مسٹر کھتا کی بیوی کا منی کھتا ہیں۔ دوسری جو اونچی ایڑی کا بوٹ پہنے ہوئے ہیں اور جن کے حسین چہرے سے ہنسی پھوٹی پڑتی ہے، مس مالتی ہیں جو انگلستان سے ڈاکٹری پڑھ کر آئی ہیں اور اب پریکٹس کرتی ہیں۔ تعلقداروں کے محلوں میں ان کی بڑی آمد و رفت ہے۔ آپ نے جگ کی مجسم صورت ہیں۔ نازک اندام مگر شوفی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی، جھجک کا کہیں نام بھی نہیں۔ وضع میں مکمل، بلا کے حاضر جواب، مردانہ جذبات کی ماہر، کھیل کود کو زندگی کا ماحصل سمجھنے والی، لبھانے اور رجھانے کے فن میں طاق، جہاں روح کا مقام ہے وہاں ظاہر داری، جہاں دل کی جگہ ہے وہاں ناز و انداز، دلی جذبات پر اچھا قابو جس میں رغبت یا خواہش کا نقدان سا ہو گیا ہے!

آپ نے مسٹر مہتا سے ہاتھ ملائے ہوئے کہا ”سچ کہتی ہوں، آپ صورت سے فلسفی معلوم ہوتے ہیں۔ اس نئی کتاب میں آتما کے ماننے والوں کو اذیت کر رکھ دیا ہے، پڑھتے

پڑھتے کئی بار دل میں آیا کہ آپ سے لڑ جاؤں۔ فلاسفروں میں ہمدردی کیوں نہیں ہوتی؟“
 مہتا صاحب جھینپ گئے، کنوارے تھے اور نئے جگ کی عورتوں سے پناہ مانگتے تھے۔
 مردوں کی جماعت میں خوب چپکتے تھے مگر جیوں ہی کوئی عورت آئی اور آپ کی زبان بند
 ہوئی، جیسے عقل پر قفل لگ جاتا تھا۔ عورتوں سے مہذبانہ سلوک تک کرنے کا ہوش نہ رہتا تھا۔
 مسٹر کھٹا نے پوچھا ”فلاسفروں کی صورت میں کیا خاص بات ہوتی ہے، دیوی جی؟“
 مالتی نے مہتا کی طرف رحم سے دیکھ کر کہا ”مہتا جی برا نہ مانیں تو بتا دوں۔“
 کھٹا صاحب مس مالتی کے پرستاروں میں سے تھے۔ جہاں مس مالتی جائیں وہاں
 کھٹا کا پہنچنا لازمی تھا۔ ان کے آس پاس بھنورے کی طرح منڈلاتے رہتے تھے۔ ہر وقت
 ان کی یہی خواہش رہتی تھی کہ مالتی سے زیادہ وہی بولیں اور اس کی نگاہ زیادہ سے
 زیادہ ان ہی پر ہے۔

کھٹا نے آنکھ جھپکا کر کہا ”فلسفی کسی کی بات کا برا نہیں مانتے۔ ان میں یہی تو
 وصف ہے۔“

”تو سینے۔ فلسفی ہمیشہ مردہ دل ہوتے ہیں۔ جب دیکھیے اپنے خیالوں میں غرق بیٹھے
 ہیں! آپ کی طرف تاکیں گے مگر آپ کو دیکھیں گے نہیں، آپ ان سے باتیں کیے جائیں
 لیکن وہ کچھ سنیں گے نہیں، جیسے خلا میں اڑ رہے ہوں۔“

سب لوگوں نے قہقہہ لگایا، مہتا صاحب گویا زمین میں گڑ گئے!

”آکسفورڈ میں میرے فلسفہ کے پروفیسر مسٹر ہسینڈ تھے.....“

کھٹا نے ٹوکا ”نام تو نرالا ہے۔“

”جی ہاں، اور تھے کنوارے.....“

”مسٹر مہتا بھی تو کنوارے.....“

”یہ روگ سبھی فلاسفروں کو ہوتا ہے۔“

اب مہتا کو موقع ملا، بولے ”آپ بھی تو اسی مرض میں مبتلا ہیں؟“

”میں نے عہد کیا ہے کہ کسی فلاسفر ہی سے شادی کروں گی اور یہ طبقہ شادی کے نام
 سے گھبراتا ہے۔ ہسینڈ صاحب عورت کو دیکھ کر گھر میں چھپ جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں
 میں کئی لڑکیاں تھیں۔ اگر ان میں سے کوئی کبھی کچھ پوچھنے کے لیے ان کے دفتر میں چلی جاتی

تو آپ ایسے گھبرا اٹھے جیسے کوئی شیر آگیا ہو۔ ہم لوگ انھیں خوب چھیڑتے تھے مگر تھے
 بیچارے بڑے ہی سادہ مزاج۔ کئی ہزار کی آمدنی تھی مگر میں نے انھیں سدا ایک ہی سوٹ
 پہنے دیکھا۔ ان کی ایک بیوہ بہن تھی۔ وہی ان کے گھر کا سارا انتظام کرتی تھی۔ مسٹر ہسپنڈ
 کو تو کھانے پینے کی فکر ہی نہ رہتی تھی۔ ملنے والوں کے ڈر سے اپنے کمرے کا دروازہ
 بند کر کے لکھا پڑھا کرتے تھے۔ کھانے کا وقت آجاتا تو ان کی بہن اندر کے دروازے سے
 ان کے پاس جا کر ان کی کتاب بند کر دیتی تھی، جیسی انھیں معلوم ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت
 آگیا۔ رات کو بھی کھانے کا وقت مقرر تھا۔ ان کی بہن کمرے کی جی بجا دیا کرتی۔ ایک دن
 بہن نے کتاب بند کرنا چاہا تو آپ نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبا لیا اور بہن بھائی میں زور
 آزمائی ہونے لگی۔ آخر بہن ان کے پیسے دار کرسی کو کھینچ کر کھانے کے کمرے میں لے گئی۔“
 رائے صاحب بولے ”مگر مہتا صاحب تو بڑے خلیق اور خوش مزاج ہیں ورنہ اس
 ہنگامے میں کیوں آتے؟“

”تو آپ فلاسفر نہ ہوں گے۔ جب اپنے تفکرات سے ہمارے سر میں درد ہونے لگتا
 ہے تو پھر دنیا بھر کی فکر سر پر سوار کر کے کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے؟“
 ادھر ایڈیٹر صاحب مسز کھٹا صاحبہ سے اپنی مالی پریشانیوں کی داستان کہہ رہے تھے۔
 ”بس یوں کچھ شریعتی جی کہ ایڈیٹر کی زندگی ایک طویل فریاد ہے جسے سن کر لوگ رحم کے عوض
 کانوں پر ہاتھ دھر لیتے ہیں۔ بیچارہ نہ اپنا بھلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کا۔ پبلک اس سے امید
 تو یہی رکھتی ہے کہ ہر تحریک میں وہ سب سے آگے رہے، جیل جائے، مار کھائے۔ گھر کا
 مال اسباب قرق کرائے، یہ اس کا فرض سمجھا جاتا ہے، مگر اس کی مشکلات کی طرف کسی کو توجہ
 نہیں۔ ہو تو وہ سب کچھ، اسے ہر علم و فن کا ماہر ہونا چاہیے مگر اسے زندہ رہنے کا حق نہیں۔
 آپ تو آج کل کچھ لکھتی ہی نہیں۔ خوش نصیبی سے آپ کی خدمت کرنے کا جو تھوڑا بہت موقع
 مجھے مل سکتا ہے اس سے آپ مجھے کیوں محروم رکھتی ہیں؟“

شریعتی کھٹا کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ اس ناتے سے ایڈیٹر صاحب کبھی کبھی ان سے مل
 آیا کرتے تھے۔ لیکن گھر کے کام و دھندوں میں لگے رہنے کے سبب ادھر وہ بہت دنوں سے
 لکھ نہ سکی تھیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب ہی نے انھیں حوصلہ دلا کر شاعر بنایا تھا۔
 فطری ذکاوت ان میں بہت کم تھی۔

”کیا لکھوں؟ کچھ سوچتا ہی نہیں! آپ نے کبھی مس مالتی سے کچھ لکھنے کو نہیں کہا؟“
ایڈیٹر صاحب نے بے رخی سے کہا ”ان کا وقت قیمتی ہے، کامنی دیوی! لکھتے تو وہ لوگ ہیں جن کے دل میں کچھ درد ہے، پریم ہے، لگن ہے اور گیان ہے۔ جنہوں نے دولت و عیش و عشرت کو زندگی کا مقصد بنا لیا وہ کیا لکھیں گے؟“

کامنی نے حسد آمیز تسخّر سے کہا ”اگر آپ ان سے لکھا سکیں تو آپ کے اخبار کی اشاعت دونی ہو جائے۔ لکھنؤ میں تو کوئی ایسا طبیعت دار نہیں ہے جو آپ کا گاہک نہ بن جائے۔“

”اگر دولت میری زندگی کا مقصد ہوتی تو آج میں اس حالت میں نہ ہوتا۔ مجھے بھی دھن کمانے کا ڈھنگ معلوم ہے۔ آج چاہوں تو لاکھوں کما سکتا ہوں۔ مگر یہاں تو دولت کو کبھی کچھ سمجھا ہی نہیں۔ ادبی خدمت میری زندگی کا مقصد ہے اور رہے گا۔“
”کم سے کم میرا نام تو گا کہوں میں لکھا دیجیے۔“

”آپ کا نام گا کہوں میں نہیں، مریوں میں لکھوں گا۔“
”مریوں میں رانی مہارانیوں کو رکھیے جن کی ذرا سی خوشامد کر کے آپ اپنے اخبار کو نفع کی چیز بنا سکتے ہیں۔“

”میری رانی مہارانی آپ ہیں۔ میں تو آپ کے سامنے کسی رانی مہارانی کی حقیقت نہیں سمجھتا۔ جس میں دیا اور گیان ہے وہ میری رانی مہارانی ہے۔ خوشامد سے مجھے نفرت ہے۔“

کامنی نے چٹکی لی ”لیکن میری خوشامد تو آپ کر رہے ہیں ایڈیٹر صاحب!“
ایڈیٹر نے متانت سے عقیدت بھرے لہجے میں کہا ”یہ خوشامد نہیں ہے، شریستی جی! دل کے سچے جذبات ہیں۔“

رائے صاحب نے پکارا، ایڈیٹر صاحب ذرا ادھر آئیے گا، مس مالتی آپ سے کچھ کہتی ہیں۔“

ایڈیٹر کی وہ سب اکڑ غائب ہو گئی، مجرّد انکسار کی موت بنے ہوئے جا کر کھڑے ہو گئے۔ مالتی نے انھیں ترحانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا ”میں ابھی کہہ رہی تھی کہ دنیا میں مجھے سب سے زیادہ ڈر ایڈیٹروں سے لگتا ہے۔ آپ لوگ جسے چاہیں ایک منٹ میں بگاڑ دیں۔“

مجھی سے چیف سکرٹری صاحب نے ایک دفعہ کہا ”اگر میں اس بلا ڈی اونکار ناتھ کو جیل میں بند کر سکوں تو خود کو خوش نصیب سمجھوں۔“

اونکار ناتھ کی بڑی بڑی موٹھیں تن گئیں اور آنکھوں میں غرور کی چمک آگئی یوں وہ بڑے متحمل مزاج آدمی تھے مگر چیٹنج سن کر ان کی مردانگی متحرک ہو جاتی تھی۔ استقلال کے لہجے میں بولے ”اس مہربانی کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اس بزم میں اپنا ذکر تو ہوتا ہے خواہ کسی طرح ہو۔ آپ سکرٹری صاحب سے کہہ دیجیے گا کہ اونکار ناتھ ان آدمیوں میں نہیں ہیں جو ان گیدڑ بھکیوں سے ڈر جائیں۔ اس کا قلم اسی وقت رکے گا جب اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس نے بے انصافی اور ظلم کو جڑ سے کھود کر پھینک دینے کا حتمیہ کر لیا ہے۔“

مس مالتی نے اور اسکیا ”مگر آپ کا یہ دطیرہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب آپ معمولی خوش اطواری سے حکام کی مدد حاصل کر سکتے ہیں تو کیوں ان سے کئی کانٹے ہیں؟ اگر آپ اپنی تنقیدوں میں آگ اور زہر ذرا کم کر دیں تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کو سرکار سے کافی مدد دلا سکتی ہوں۔ پبلک کو تو آپ نے دیکھ لیا، اس سے اپیل کی، اس کی خوشامد کی، اپنی مشکلیں کہیں، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب ذرا حکام کو بھی آزما دیکھیے۔ تیسرے مہینے آپ مونر پر نہ چلنے لگیں اور سرکاری دعوتوں میں مدعو نہ ہونے لگیں تو مجھے آپ جتنا چاہے کوئے گا تب یہی رئیس اور نیشلسٹ جو آپ کی پرواہ نہیں کرتے آپ کے مکان کا طواف کریں گے۔“

اونکار ناتھ نے گھمنڈ سے کہا ”یہی تو میں نہیں کر سکتا دیوی جی، میں نے اپنے اصولوں کو ہمیشہ بلند اور پاک رکھا ہے اور جیتے جی ان کی حفاظت کروں گا۔ دولت کے پجاری تو گلی گلی ملیں گے، میں اصول کے پجاریوں میں ہوں۔“

”میں اسے مکر کہتی ہوں۔“

”آپ کی خوشی۔“

”دھن کی آپ کو پرواہ نہیں؟“

”اصولوں کا خون کر کے نہیں۔“

”تو آپ کے اخبار میں دویشی چیزوں کے اشتہار کیوں ہوتے ہیں؟ میں نے کسی بھی اور اخبار میں اتنے دویشی اشتہار نہیں دیکھے۔ آپ بنتے تو ہیں بڑے اصول پرست، مگر اپنے

نفع کے لیے دلس کا دھن بدلس بھیجتے ہوئے آپ کو ذرا بھی رنج نہیں ہوتا۔ آپ کسی دلیل سے اپنے اس طرز کو حق بجانب نہیں قرار دے سکتے۔“

ادکار ناتھ کے پاس سچ کچ کوئی جواب نہ تھا۔ انھیں بغلیں جھانکتے دیکھ رائے صاحب نے ان کی مدد کی ”تو آخر آپ کیا چاہتی ہیں؟ ادھر سے بھی مارے جائیں اور ادھر سے بھی مارے جائیں تو اخبار کیسے چلے؟“

مس مالتی نے رحم کرنا نہ سیکھا تھا بولی ”اخبار نہیں چلتا تو بند کر دیجیے۔ اپنا اخبار چلانے کے لیے آپ کو بدلیسی چیزوں کے پرچار کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر آپ مجبور ہیں تو اصول کا ڈھونگ چھوڑیے۔ میں تو اصول پرست اخباروں کو دیکھ کر جل اُٹتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ دیا سلائی دکھا دوں۔ جو شخص قول فعل میں یکسانیت نہیں رکھتا وہ اور چاہے جو کچھ ہو اصول پرست نہیں ہے۔“

مہتا کھل اٹھے، ذرا دیر قبل انھوں نے خود اسی خیال کو پیش کیا تھا۔ انھیں معلوم ہوا کہ اس عورت میں سوچنے کی سکت بھی ہے۔ یہ صرف تتلی نہیں ہے۔ تاہم دور ہو گیا۔ بولے ”یہی بات میں ابھی کہہ رہا تھا۔ قول فعل میں یکسانیت کا نہ ہونا ہی دغا ہے، مکاری ہے۔“

مالتی خوش ہو کر بولی ”تو اس بارے میں آپ اور ہم ایک ہیں، تو میں بھی فلاسفر ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہوں؟“

کھتا کی زبان سمجھلا رہی تھی بولے ”آپ کا ایک ایک عضو فلسفے میں ڈوبا ہوا ہے۔“

مالتی نے ان کی راس کھینچی ”اچھا آپ کو بھی فلسفے میں دخل ہے؟ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ بہت پہلے اپنے فلسفے کو گنگا جی کے حوالے کر بیٹھے۔ ورنہ آپ اتنے بینکوں اور کمپنیوں کے ڈائریکٹر نہ ہوتے۔“

رائے صاحب نے کھتا کو سہارا دیا ”تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ فلاسفروں کو ہمیشہ فاقہ مست رہنا چاہیے؟“

”جی ہاں، فلاسفر اگر رغبت پر فتح نہ پاسکے تو فلاسفر کیسا؟“

”اس لحاظ سے تو شاید مہتا صاحب بھی فلاسفر نہ ٹھہریں۔“

مہتا نے آستین سی چڑھا کر کہا ”میں نے تو کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا، رائے صاحب! میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ جن اوزاروں سے لوہار کام کرتا ہے ان اوزاروں سے سنار نہیں کرتا۔“

کیا آپ چاہتے ہیں کہ آم بھی اسی حالت میں پھولے پھلے جیسے بول یا تازہ؟ میرے لیے دولت صرف ان آسانوں کا نام ہے جن میں میں اپنی زندگی کو بامعنی بنا سکوں۔ دولت میرے لیے بڑھنے اور پھولنے پھلنے والی چیز نہیں بلکہ صرف ذریعہ ہے۔ مجھے دولت کی بالکل خواہش نہیں، آپ صرف دیے ذرائع مہیا کریں۔ جن سے اپنی زندگی کو کام کی چیز بنا سکوں۔“

اونکار ناتھ سوشلسٹ تھے، شخصی فضیلت کو کیسے مان سکتے تھے؟ اسی طرح ہر مزدور کہہ سکتا ہے کہ اسے کام کرنے کی آسانوں کی غرض سے ایک ہزار ماہوار کی ضرورت ہے۔

”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس مزدور کے بغیر آپ کا کام نہیں چل سکتا تو آپ کو وہ آسانیاں دینی پڑیں گی۔ اگر وہی کام دوسرا مزدور کم مزدوری میں کردے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ پہلے مزدور کی خوشامد کریں۔“

”اگر مزدوروں کے ہاتھ میں اختیار ہوتا تو مزدوروں کے لیے عورت اور شراب بھی اتنی ہی ضروری ہو جاتیں جتنی فلاسفوں کے لیے؟“

”تو آپ یقین کیجیے میں ان سے حسد نہ کرتا۔“

”جب آپ کی زندگی بامعنی ہونے کے لیے عورت اس قدر ضروری ہے تو آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

مہتا نے بے تامل کہا ”اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ آزادانہ عیش کوئی روح کے ارتقاء میں رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ شادی تو روح اور زندگی کو بنجرے میں بند کر دیتی ہے۔“

کھتا نے تائید کی ”پابندی اور نفس کشی پرانی تھیوریاں ہیں، نئی تھیوری ہے آزادانہ عیش کوئی۔“

مالتی نے چوٹی پکڑی ”تو اب مزہ کھتا کو طلاق کے لیے تیار رہنا چاہیے؟“

”طلاق کا بل پاس تو ہو۔“

”شاید اس کا اولین استعمال آپ ہی کریں گے؟“

”کامنی نے مالتی کی طرف زہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور منہ سکیڑ لیا، گویا کہہ رہی ہوں ”کھتا تھیں مبارک رہیں مجھے پروا نہیں۔“

مالتی نے مہتا کی طرف دیکھ کر کہا ”اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے مسٹر مہتا؟“

مہتاتین بن گئے۔ وہ کسی مسئلے پر اپنی رائے دیتے تھے تو گویا اپنی کل جان اسی میں ڈال دیتے تھے۔ بولے ”بیادہ کو میں سماجی سمجھوتہ سمجھتا ہوں، جسے رد کرنے کا اختیار نہ مرد کو ہے نہ عورت کو۔ سمجھوتہ کرنے سے پہلے آپ آزاد ہیں مگر اس کے بعد آپ کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔“

”تو آپ طلاق کے خلاف ہیں۔ کیوں؟“

”بالکل۔“

”اور آزاد نہ عیش پرستی والا اصول؟“

”وہ ان کے لیے ہیں جو بیادہ نہیں کرنا چاہتے۔“

”اپنی روح کا کامل ارتقا بھی چاہتے ہیں، مگر ایسے بہت کم ہیں جو لالچ کو روک سکیں۔“

”آپ بہتر کسے سمجھتے ہیں ازدواج کو یا تجرد کو؟“

”سماجی اعتبار سے ازدواج کو اور شخصی نقطہ خیال سے تجرد کو۔“

دھنش یکیہ کا وقت قریب تھا۔ دس سے ایک بجے تک دھنش یکیہ اور ایک سے تین بجے تک ٹانک، یہ پروگرام تھا۔ کھانے کی تیاری شروع ہوئی، مہمانوں کے لیے بیگلے میں الگ الگ رہنے کا انتظام تھا۔

کھتا صاحب اور ان کی پارٹی کے لیے دو کمرے تھے اور بھی کتنے ہی مہمان آگئے تھے۔ سبھی اپنے اپنے کمرے میں گئے اور کپڑے بدل بدل کر دسترخوان پر جا بیٹھے۔ یہاں چھوت چھات کا کوئی ذکر نہ تھا۔ سبھی ذات کے لوگ ایک ساتھ کھانا کھانے بیٹھے، صرف اونکار ناتھ ایڈیٹر سب سے الگ اپنے کمرے میں پھلا ہار کرنے چلے گئے اور کامنی کے سر میں درد تھا پس اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ کھانے کے وقت مہمانوں کی تعداد پچیس سے کم نہ تھی، گوشت بھی تھا۔ اس جلے کے لیے رائے صاحب عمدہ قسم کی شراب خاص طور پر تیار کراتے تھے۔ گوشت بھی کئی طرح کا پکتا تھا۔ کوفتہ، کباب اور پلاؤ۔ مرغ، بکرا، ہرن، تیر، بیر، جسے جو پسند ہو، کھائے۔

کھانا شروع ہو گیا تو مالقی نے پوچھا ”ایڈیٹر صاحب کہاں گئے؟ کسی کو بھیجئے رائے صاحب، کہ انھیں کچل لائے، رائے صاحب نے کہا ”وہ ویشنو ہیں، ان کو یہاں بلا کر کیوں

بے چارے کا دھرم بگاڑو گی۔ بڑا ہی دھرم کرم والا آدمی ہے۔“
 ”اجی اور کچھ نہ سہی، تماشا تو رہے گا۔“

لیکایک ایک صاحب کو دیکھ کر اس نے پکارا ”آپ بھی تشریف رکھتے ہیں، مرزا خورشید! اچھا یہ کام آپ کے سپرد۔ آپ کی لیاقت کا امتحان ہو جائے گا۔“

مرزا خورشید گورے پٹے آدمی تھے، بھوری مونچھیں، نیلی آنکھیں، دو ہرا بدن، چاند پر کے بال صفا چٹ، چھ کیا اپکن اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔ اوپر سے ہیٹ لگاتے تھے۔ کونسل کے ممبر تھے مگر وہاں بیشتر اوقات خراٹے ہی لیتے رہتے تھے۔ رائے دینے کے وقت چونک پڑتے تھے اور بیٹنٹوں کی طرف سے بول دیتے تھے، صوفی تھے، دوبار حج کر آئے تھے مگر شراب خوب پیتے تھے۔ کہتے تھے کہ جب ہم خدا کا ایک حکم بھی کبھی نہیں ماننے تو دین کے لیے کیوں جان دیں؟ بڑے پر مذاق اور لا ابالی انسان تھے۔ پہلے بصرے میں ٹھیکے کا کام کرتے تھے۔ لاکھوں کمائے مگر شملت اعمال کہ ایک میم سے آشنائی کر بیٹھے۔ مقدمے بازی ہوئی جیل جاتے جاتے بچے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ملک سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ جو کچھ جہاں تھا وہیں چھوڑا اور صرف پچاس ہزار لے کر بھاگ کھڑے ہوئے، بسنٹی میں ان کے ایجنٹ تھے، سوچا تھا کہ ان سے حساب کتاب کر لیں گے اور جو کچھ نکلے گا اسی میں زندگی کاٹ دیں گے۔ مگر ایجنٹوں نے جعل کر کے ان سے وہ پچاس ہزار بھی اٹھ لے لیے۔ نراس وہاں سے لکھنؤ چلے۔ گاڑی میں ایک مہاتما سے ملاقات ہوئی۔ مہاتما نے انھیں سبز باغ دکھا کر ان کی گھڑی، انگوٹھیاں اور روپے سب اڑا دیے۔ بے چارے لکھنؤ پہنچے تو جسم کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ رائے صاحب سے دیرینہ مراسم تھے۔ کچھ ان کی مدد سے، کچھ اور دوستوں کی مدد سے ایک جوتے کی دکان کھول لی جو اب لکھنؤ کی سب سے زیادہ چلتی ہوئی دکان تھی۔ چار پانچ سو روزانہ کی بکری تھی۔ عوام کو ان پر چند ہی روز میں اتنا اعتقاد ہو گیا تھا کہ ایک بڑے بھاری مسلم تعلقدار کو نیچا دکھا کر کونسل میں پہنچ گئے تھے۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بولے ”جی نہیں، میں کسی کا دین نہیں بگاڑتا۔ یہ کام آپ کو خود کرنا چاہیے۔ مرزا تو جب ہے کہ آپ انھیں شراب پلا کر چھوڑیں۔ یہ آپ کے معجزہ حسن کی آزمائش ہے۔“

چاروں طرف سے آوازیں آئیں ”ہاں، ہاں مس مالٹی! آج اپنا کمال دکھائیے۔“

مالٹی نے مرزا کو لکارا ”کچھ انعام دو گے؟“

”سورپے کی تھیلی۔“

”ہش، سورپے، لاکھ روپے کا دھرم بگاڑوں سو کے لیے؟“

”اچھا آپ خود اپنی فیس بتائیے؟“

”ایک ہزار، کوڑی کم نہیں۔“

”اچھا منظور۔“

”جی نہیں لاکر مہتا صاحب کے ہاتھ میں رکھ دیجیے۔“

مرزا صاحب نے فوراً سورپے کا نوٹ جیب سے نکالا اور اسے دکھاتے ہوئے کھڑے ہو کر بولے ”بھائیو! یہ ہم سب مردوں کی عزت کا معاملہ ہے، اگر مس مالتی کی فرمائش نہ پوری ہوئی تو ہمارے لیے کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی اگر میرے پاس روپے ہوتے تو میں مس مالتی کی ایک ایک ادا پر ایک ایک لاکھ روپے قربان کر دیتا۔ ایک قدیم شاعر نے اپنے معشوق کے ایک ایک سیاہ خال پر سر قنار اور بخارا کے صوبے بچھا کر دیے تھے! آج آپ بھی صاحبوں کی جوانمردی اور حسن پرستی کا امتحان ہے، جس کے پاس جو کچھ ہو سچے سورما کی طرح نکال کر رکھ دے۔ آپ کو علم کی قسم اور معشوق کی اداؤں کی قسم اور اپنی عزت کی قسم پیچھے قدم نہ ہٹائیے مردو! روپے خرچ ہو جائیں گے مگر نام ہمیشہ کے لیے رہ جائے گا۔ ایسا تماشا لاکھوں میں بھی سستا ہے۔ دیکھیے، لکھنؤ کی حسینوں کی ملکہ ایک زاہد پر اپنے حسن کا جادو کیسے چلاتی ہے۔“

تقریر ختم کرتے ہی مرزا صاحب نے ہر ایک پاکٹ کی تلاشی شروع کر دی۔ پہلے مسٹر کھٹا کی تلاشی ہوئی ان کی جیب سے پانچ روپے نکلے۔

مرزا صاحب نے اداس ہو کر کہا ”واہ کھٹا صاحب واہ، نام بڑے درشن چھوٹے! اتنی کمپنیوں کے ڈائریکٹر لاکھوں کی آمدنی اور آپ کی جیب میں پانچ روپے!“

لاحول ولا قوۃ! کہاں ہیں مہتا، آپ ذرا جا کر مسز کھٹا سے کم سے کم سو روپے وصول کر لائیے۔“

کھٹا کھٹا کر بولے ”اجی ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہ ہوگا۔ کون جانتا تھا کہ آپ یہاں تلاشی لینا شروع کر دیں گے۔“

”خیر اب خاموش رہیے، ہم اپنی قسمت تو آزمالیں۔“

”اچھا تو میں جا کر ان سے پوچھتا ہوں۔“
 ”جی نہیں، آپ یہاں سے مل نہیں سکتے۔ مسٹر مہتا آپ فلاسفر ہیں۔ ماہر علم النفس،
 دیکھیے اپنی مہمہ نہ کرایئے گا۔“

مہتا شراب پی کر مست ہو جاتے تھے تو اس مستی میں ان کا قلفہ اڑ جاتا تھا اور زندہ
 دلی جاگ اٹھتی تھی۔ لپک کر مسز کھنا کے پاس گئے اور پانچ ہی منٹ میں منہ لٹکائے لوٹ
 آئے۔

مرزا نے پوچھا ”ارے کیا خالی ہاتھ؟“
 راے صاحب بنے ”قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے!“
 مرزا نے کہا ”ہو بڑے خوش نصیب کھنا، خدا کی قسم!“
 مہتا نے قہقہہ لگایا اور جیب سے سو سو روپے کے پانچ نوٹ نکالے۔
 مرزا نے دوڑ کر انھیں گلے لگا لیا۔

چاروں طرف سے آوازیں انھیں ”کمال ہے! ماننا ہوں استاد! کیوں نہ ہو، فلاسفر ہی
 تو ٹھیرے!“

مرزا نے نوٹوں کو آنکھوں سے لگا کر کہا ”بھئی مہتا! آج سے میں تمہارا مرید ہو گیا بتاؤ
 کیا جادو مارا؟ مہتا اکڑ کر سرخ سرخ آنکھوں سے تاکتے ہوئے بولے ”اجی کچھ نہیں۔ ایسا
 کون سا بڑا کام تھا؟ جا کر پوچھا، اندر آؤں؟ بولیں آپ ہیں مہتا جی، آئیے میں نے
 اندر جا کر کہا، وہاں لوگ برج کھیل رہے ہیں۔ مالتی پانچ سو روپے ہار گئی ہیں اور اپنی انگوٹھی
 بیچ رہی ہیں جو ہزار سے کم نہیں ہے۔ آپ نے تو دیکھا ہے بس وہی۔ آپ کے پاس روپے
 ہوں تو پانچ سو دے کر ایک ہزار کی چیز لے لیجیے۔ ایسا موقع پھر نہ ملے گا۔ مس مالتی نے
 اس وقت روپے نہ دیے تو بے داغ نکل جائیں گی بعد کو کون دیتا ہے؟ شاید اس لیے انھوں
 نے انگوٹھی نکالی ہو کہ پانچ سو روپے کس کے پاس دھرے ہوں گے۔ یہ سن کر وہ مسکرائیں
 اور جھٹ پٹ اپنی تھیلی سے پانچ نوٹ نکال کر دے دیے اور بولیں میں کچھ لیے بغیر گھر سے
 نہیں نکلتی، نہ جانے کب کیا ضرورت پڑ جائے۔“

کھنا کھیا کر بولے ”جب ہمارے پروفیسروں کا یہ حال ہے تو یونیورسٹی کا ایٹور ہی
 مالک ہے۔“

خورشید نے زخم پر نمک چھڑکا ”ارے تو ایسی کون سی بڑی رقم ہے جس کے لیے آپ کا دل بیٹھا جاتا ہے؟ ذرا جھوٹ نہ کہلائے تو یہ آپ کی ایک دن کی آمدنی ہے۔ بس سمجھ لیجیے گا ایک دن بیمار پڑ گئے۔ اور پھر روپیہ جائے گا بھی تو مس مالتی ہی کے ہاتھ میں اور آپ کے درد جگر کی دوا مس مالتی کے پاس ہی تو ہے۔“

مالتی نے ٹھوکر دی ”دیکھیے مرزا جی، طویلے میں بچھا وچ اچھی نہیں۔“

مرزا نے دم ہلائی ”کان پکڑتا ہوں مس صاحبہ۔“

مسٹر ٹٹھا کی تلاش ہوئی۔ مشکل سے دس روپے نکلے۔ مہتا کی جیب سے صرف اٹنی۔ نکلی۔ کئی اصحاب نے ایک ایک دو دو روپے اپنے آپ دے دیے۔ حساب جوڑا گیا تو پورے تین سو کی کمی تھی۔ یہ کی رائے صاحب نے فراخ دلی کے ساتھ پوری کر دی۔

ایڈیٹر صاحب نے میوے اور پھل کھائے تھے اور ذرا کمر سیدھی کر رہے تھے کہ رائے صاحب نے جا کر کہا ”آپ کو مس مالتی یاد کر رہی ہیں۔“

وہ خوش ہو کر بولے ”زہے نصیب کے مس مالتی مجھے یاد کر رہی ہیں۔“

رائے صاحب کے ساتھی ہال میں پہنچ گئے۔

ادھر نوکروں نے میزیں صاف کر دی تھیں۔ مالتی نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔

ایڈیٹر نے انکسار دکھایا، بولے ”بیٹھے، تکلف نہ کیجیے۔ میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں۔“

مالتی نے عقیدت کے لہجے میں کہا ”آپ تکلف سمجھتے ہوں گے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میں اپنی تو قیر بڑھا رہی ہوں۔ یوں آپ اپنے کو کچھ نہ سمجھیں اور آپ کے لیے زیبا بھی یہی ہے، مگر یہاں جتنے لوگ جمع ہیں وہ سبھی آپ کی قومی اور ادبی خدمت سے خوب واقف ہیں۔ آپ نے اس دائرے میں جو اہم کام کیا ہے خواہ ابھی لوگ اس کی قدر نہ کریں لیکن وہ وقت بہت دور نہیں ہے بلکہ میرے خیال سے بہت قریب آ گیا ہے جب ہر شہر میں آپ کے نام پر سڑکیں بنیں گی، کلب کھلیں گے اور ٹاؤن ہال میں آپ کی تصویر لٹکائی جائے گی۔ اس وقت جو کم و بیش بیداری ہے وہ آپ ہی کی عظیم کوشش کا نتیجہ ہے۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ملک میں اب آپ کے ایسے مقلد پیدا ہو گئے ہیں جو ”گرام سدھار“ کے کام میں آپ کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہیں اور ان سب کی بڑی خواہش ہے کہ یہ کام سنگٹھن کے ساتھ کیا جائے اور اس کے لیے ایک گاؤں سدھار سجا بٹائی جائے جس کے آپ صدر ہوں۔“

اونکار ناتھ کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ انھیں چوٹی کے آدمیوں میں اتنی عزت ملے۔ یوں وہ عام جلسوں میں کبھی کبھی بولتے اور کئی سभाؤں کے سکریٹری اور اسسٹنٹ سکریٹری بھی تھے مگر تعلیم یافتہ جماعت نے اب تک ان کی جانب سے بے اعتنائی برتی تھی۔ ان لوگوں میں کسی طرح وہ مل جل نہ پاتے تھے اور اسی لیے جلسوں میں ان کی کالمی اور خود غرضی کی شکایت کیا کرتے تھے اور اپنے اخبار میں ایک ایک کو دھر کھینٹتے تھے۔ قلم تیز تھا، کلمے سخت تھے، صاف گوئی کے بجائے، ہر ذہ گوئی کر بیٹھتے تھے۔ اس لیے لوگ انھیں خالی ڈھول سمجھتے تھے۔ اسی جماعت میں آج ان کی اتنی عزت! کہاں ہیں آج ”سوراج“، اور آزاد ہندوستان، اور ”ہنر“ کے ایڈیٹر؟ آکر دیکھیں اور اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں! آج یقیناً ان پر دیوتاؤں کی مہربانی ہے۔ نیک کوشش کبھی بیکار نہیں جاتی! یہ رشیوں کا قول ہے وہ خود اپنی نظروں میں اٹھ گئے تھے۔ ممنونیت سے خوش ہو کر بولے ”دیوی جی! آپ تو مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہیں۔ میں نے تو عوام کی جو کچھ خدمت کی وہ اپنا فرض سمجھ کر کی، میں اس عزت کو ذاتی نہیں بلکہ اس مقصد کی عزت سمجھ رہا ہوں جس کے لیے میں نے اپنی زندگی قربان کر دی ہے۔ لیکن میری التجا ہے کہ صدر کا عہدہ کسی باعزت شخص کو دیا جائے۔ عہدہ پر میرا اعتقاد نہیں۔ میں تو خادم ہوں اور خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“

مس مالٹی اسے کسی طرح قبول نہیں کر سکتیں۔ صدر پنڈت جی کو بنا پڑے گا۔ شہر میں ایسا بااثر آدمی دوسرا نہیں دکھائی دیتا جس کے قلم میں جادو ہے، اور جس کی زبان میں جادو ہے، جس کی شخصیت میں جادو ہے۔ وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ بااثر نہیں؟ وہ زمانہ گیا جب دولت اور اثر میں میل تھا۔ اب ذہانت اور اثر کے میل کا زمانہ ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو وہ صدارت ضرور قبول کرنی ہوگی۔ سکریٹری مس مالٹی ہوں گی۔ اس سभा کے لیے ایک ہزار کا چندہ بھی ہو گیا ہے ابھی تو کھل شہر اور صوبہ پڑا ہوا ہے۔ چار پانچ لاکھ مل جانا تو معمولی بات ہے!

اونکار ناتھ پر کچھ نشہ سا چڑھنے لگا، ان کے دل میں جو ایک طرح کی سنسنی اٹھ رہی تھی اس نے سنجیدہ ذمہ داری کی صورت کر لی۔ بولے ”مگر آپ یہ سمجھ لیں مس مالٹی کہ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور آپ کو اپنا بہت وقت دینا پڑے گا۔ میں اپنی جانب سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سभा کے مقام پر مجھے سب سے پہلے موجود پائیں گے۔“

مرزا صاحب نے ہنچاڑا دیا ”آپ کا بڑے سے بڑا دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ اپنا فرض ادا کرنے میں کسی سے پیچھے رہے۔“

مس مالٹی نے دیکھا کہ شراب کا اثر کچھ کچھ ہو رہا ہے تو اور بھی سنجیدہ ہو کر بولیں ”اگر ہم لوگ اس کام کی اہمیت نہ سمجھتے تو نہ یہ سجا قائم ہوتی اور نہ آپ اس کے پریسڈنٹ ہوتے۔ ہم کسی رئیس یا تعقلدار کو پریسڈنٹ بنا کر روپیہ خوب بٹور سکتے اور خدمت کی آڑ میں اپنا مطلب پورا کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارا یہ مقصد نہیں ہے۔ ہمارا واحد مقصد عوام کی خدمت کرنا ہے اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ آپ کا اخبار ہے۔ ہم نے طے کر لیا ہے کہ شہر اور گاؤں میں اس کا پرچار کیا جائے اور جلد سے جلد اس کے گاہکوں کی تعداد بیس ہزار تک پہنچادی جائے۔ صوبے کی کل میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے چیئرمین صاحب ہمارے دوست ہیں کئی چیئرمین یہیں موجود ہیں اگر ہر ایک نے پانچ سو کاپیاں لے لیں تو پچیس ہزار تو آپ یقینی سمجھیں۔ پھر راجا صاحب اور مرزا جی کی یہ صلاح ہے کہ اس کے تعلق کونسل میں یہ تجویز پیش کی جائے کہ ہر گاؤں کے لیے ”بجلی“ کی ایک کاپی سرکاری طور پر منگائی جائے یا کچھ سالانہ امداد منظور کی جائے یقین کامل ہے کہ یہ تجویز پاس ہو جائے گی۔“

ادکار ناتھ نے جیسے نشر میں جھومتے ہوئے کہا ”ہمیں گورنر کے پاس ڈیپوٹیشن لے جانا ہوگا۔“

مسٹر خورشید بولے ”ضرور ضرور!“

”ان سے کہنا ہوگا کہ کسی مہذب حکومت کے لیے یہ کتنی شرم اور بدنامی کی بات ہے کہ گرام سدھار کا واحد اخبار ہونے پر بھی ”بجلی“ کی ہستی تک نہیں تسلیم کی جاتی۔“

خورشید نے کہا ”ضرور ضرور!“

”میں گھمنڈ نہیں کرتا۔ ابھی گھمنڈ کرنے کا وقت نہیں آیا پر مجھے اس کا دعویٰ ہے کہ دیہاتی گھمنڈ کے لیے ”بجلی“ نے جتنا کام کیا ہے.....“

مسٹر مہتا نے اصلاح کی ”نہیں جناب تپیا کہیے!“

”میں مسٹر مہتا کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہاں اسے تپیا ہی کہنا چاہیے، بڑی کٹھن تپیا!“ ”بجلی“ نے جو تپیا کی ہے وہ اس صوبے ہی کی نہیں بلکہ ملک کی تاریخ میں لا جواب ہے۔“

خورشید بولے ”ضرور، ضرور!،“

مس مالتی نے ایک پیک اور دیا، ہماری سہانے یہ بھی طے کیا ہے کہ کنسل میں اب کے جو جگہ خالی ہو اس کے لیے آپ کو کھڑا کیا جائے۔ آپ کو صرف اپنی منظوری دینی ہوگی، باقی یہ کام ہم لوگ کر لیں گے، آپ کو نہ خرچ سے مطلب، نہ پر چار سے، نہ دوڑ دھوپ سے۔“

اونکار ناتھ کی آنکھوں کی روشنی دونی ہو گئی، فخریہ انکسار سے بولے ”میں آپ لوگوں کا خادم ہوں، جو کام چاہیے لے لیجیے۔“

”ہم لوگوں کو آپ سے ایسی ہی امید ہے۔ ہم اب تک فرضی دیوتاؤں کے سامنے ماتھا رگڑتے رگڑتے ہار گئے اور کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اب ہم نے آپ کی ذات میں اپنا سچا رہنما، سچا مرشد پایا ہے اور اس مبارک دن کی خوشی میں آج ہمیں ایک دل یک زبان ہو کر اپنے غرور اور اپنی مکاری کو ترک کر دینا چاہیے۔ ہم میں آج سے کوئی برہمن نہیں، کوئی شودر نہیں، کوئی ہندو نہیں، کوئی مسلمان نہیں، کوئی اونچا نہیں، کوئی نیچا نہیں، ہم سب لوگ ایک ہی ماں کے بیٹے، ایک ہی گود کے کھیلنے والے اور ایک ہی تھالی کے کھانے والے بھائی ہیں جو لوگ تفریق پر اعتقاد رکھتے ہیں، جو لوگ علیحدگی اور کٹر پن کے قائل ہیں ان کے لیے ہماری سہا میں گنجائش نہیں۔ جس سہا کے پر سیڈنٹ شری اونکار ناتھ جی جیسے بڑے دل والے مہاشے ہوں اس سہا میں بڑے چھوٹے کا، کھانے پینے کا اور ذات پات کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اتحاد اور قومیت میں اعتقاد نہ رکھتے ہوں وہ براہ کرم یہاں سے اٹھ جائیں۔“

رائے صاحب نے شبہ ظاہر کیا ”میرے خیال میں اتحاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب لوگ کھانے پینے کا بچار چھوڑ دیں۔ میں شراب نہیں پیتا تو کیا مجھے اس سہا سے الگ ہو جانا پڑے گا؟“

مالتی نے بے مروتی سے کہا ”بے شک الگ ہو جانا پڑے گا! آپ اس سہا میں رہ کر کسی طرح کا امتیاز نہیں رکھ سکتے۔“

مہتا نے گھڑے کو ٹھونکا ”مجھے شک ہے کہ ہمارے پر سیڈنٹ صاحب خود ہی کھانے پینے کے اتحاد پر یقین نہیں رکھتے۔“

اونکار ناتھ کا چہرے زرد پڑ گیا اس بد معاش نے یہ کیا بے وقت کی شہنائی بجا دی؟

لمبخت کہیں گڑے مردے نہ اکھاڑنے لگے ورنہ یہ ساری خوش نصیبی سپنے کی طرح غلا میں غائب ہو جائے گی۔

مس مالتی نے ان کے چہرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور استہلال سے کہا ”آپ کا یہ شک بے بنیاد ہے، مہتاجی! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قومی اتحاد کا ایک بے نظیر حامی، ایسا فراخ دل شخص، ایسا طبیعت دار شاعر ان بیہودہ اور شرمناک تفریقوں کا قائل ہوگا؟ ایسا شک کرنا اس کی قوم پرستی کو ذلیل کرتا ہے۔“

اونکار ناتھ کا چہرہ چمک اٹھا، خوشی اور اطمینان کی جھلک دوڑ گئی۔

مالتی نے اسی لہجے میں کہا ”اور اس سے بھی زیادہ ان کے مردانہ جذبات کی توہین کرنا ہے، ایک عورت کے ہاتھوں سے شراب کا پیالہ پا کر وہ کون مہذب شخص ہے جو اونکار کر دے؟ یہ تو نسوانی طبقہ کی توہین ہوگی، اس طبقے کی جس کی نگاہ تیروں سے اپنے دل کو چھلنی بنانے کی خواہش بھی مردوں میں پائی جاتی ہے اور جس کی اداؤں پر مر مٹنے کی ہوس بڑے بڑے راجے مہاراجے تک رکھتے ہیں۔ لائیے بوتل اور گلاس اور دور چلے دیجیے۔ اس مبارک موقع پر کسی طرح کا شبہ یا کسی طرح کا عذر، غداری سے کم نہیں ہے۔ پہلے ہم اپنے پریذیڈنٹ صاحب کی صحت کا جام پیئیں گے۔“

شراب سوڈا اور برف پہلے ہی سے تیار تھا۔ مالتی نے اونکار ناتھ کو اپنے ہاتھوں سرخ زہر سے بھرا ہوا گلاس دیا اور انھیں کچھ ایسی جادو بھری چتون سے دیکھا کہ ان کا سارا اعتقاد اور نجی برتری کا سارا خیال کافور ہو گیا۔ دل نے کہا ”چال چلن ماحول کے تابع ہے۔ آج تم مفلس ہو، کسی موٹر کو گرد اڑاتے دیکھے تو ایسا بگڑتے ہو کہ اسے پتھروں سے چور چور کر ڈالو گے لیکن کیا تمہارے دل میں موٹر کی تمنا نہیں ہے؟ ماحول ہی سب کچھ ہے بقیہ کچھ نہیں! باپ دادوں نے نہیں لی تھی تو نہ لی ہو، انھیں ایسا موقع ہی کب ملا تھا، ان کا رزق تو پوتھی پتروں پر تھا شراب لاتے کہاں سے؟ اور پیتے بھی تو جاتے کہاں؟ پھر وہ تو ریل گاڑی پر نہ چڑھتے تھے، تل کا پانی نہ پیتے تھے، انگریزی پڑھنا گناہ سمجھتے تھے۔ زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ وقت کے ساتھ اگر نہیں چل سکتے تو وہ تمہیں پیچھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ایسی حسینہ کے نازک ہاتھوں سے اگر زہر بھی ملے تو اسے قبول کرنا چاہیے، جس خوش نصیبی کے لیے بڑے بڑے راجے مہاراجے ترستے ہیں وہ

آج ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ کیا وہ اسے ٹھکرا سکتے ہیں؟ انھوں نے گلاس لیا اور اپنا سر جھکا کر اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے ایک ہی سانس میں پی گئے اور جب لوگوں کو متکبرانہ انداز سے دیکھا گیا کہہ رہے ہوں ”اب تو آپ کو مجھ پر یقین آیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں بالکل پونگا پنڈت ہوں؟ اب تو آپ مجھے مکار اور فریبی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے؟“

ہال میں ایسا شور وغل مچا کر کچھ نہ پوچھو جیسے پناری میں بند قہقہے نکل پڑے ہوں ”واہ دیوی جی کیا کہنا! کمال ہے مس مالتی کمال ہے! توڑ دیا نمک کا قانون، توڑ دیا دھرم کا قلعہ، توڑ دیا پارسائی کا گھڑا!“

اونکار ناتھ کے حلق کے نیچے شراب کا اترا تھا کہ ان کے منچلے پن میں گویائی آگئی۔ مسکرا کر بولے ”میں نے اپنے دھرم کی امانت مس مالتی کے نازک ہاتھوں میں سوپ دی اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس کی واجبی حفاظت کریں گی۔ ان کے کنول سے قدموں پر میں ایسے ایک ہزار دھرموں کو نچھاور کر سکتا ہوں۔“

قہقہوں سے ہال گونج اٹھا۔

ایڈیٹر صاحب کا چہرہ پھولا ہوا تھا، آنکھیں جھکی پڑتی تھیں، دوسرا گلاس بھر کر بولے ”یہ مس مالتی کا جام صحت ہے، آپ لوگ نوش کریں اور انھیں دعائیں دیں۔“

لوگوں نے پھر اپنے اپنے گلاس خالی کر دیے۔

اسی وقت مرزا خورشید نے ایک مالالا کر ایڈیٹر صاحب کے گلے میں ڈال دی اور کہا ”صاحبو! فندی نے ابھی اپنے معزز صدر صاحب کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے، اجازت ہو تو سنا دوں۔“

چاروں طرف سے آوازیں آئیں ”ہاں، ہاں، ضرور، ضرور سنائیے!“

اونکار ناتھ بھگت تو آئے دن پیا کرتے تھے اور ان کا دماغ اس نشے کا عادی ہو گیا تھا مگر شراب پینے کا یہ پہلا ہی موقع تھا۔ بھگت کا نشہ رفتہ رفتہ نیند کی طرح آتا تھا اور دماغ پر بادل کی طرح چھا جاتا تھا۔ احساس قائم رہتا تھا۔ انھیں خود معلوم ہوتا رہتا تھا کہ اس وقت ان کی تقریر بڑے لچھے دار ہے۔ اور ان کا تخیل بہت بلند ہے۔ شراب کا نشہ ان پر شیر کی طرح چھٹا اور دبوچ بیٹھا۔ کہتے کچھ ہیں اور منہ سے کچھ نکلتا ہے۔ پھر یہ بات بھی جانتی

رہی۔ وہ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں ، اس کا خیال ہی نہ رہ گیا۔ یہ خواب کے رومان والے عجائبات نہ تھے بلکہ بیداری کا وہ چکر تھا جس میں مجسم تا مجسم ہو جاتا ہے۔ خدا جانے یہ بات ان کے دماغ میں کیسے آگئی کہ قصیدہ پڑھنا کوئی بہت برا کام ہے۔ میز پر ہاتھ مار کر بولے ”نہیں ہرگز نہیں۔ یہاں کوئی قصیدہ نہیں ہو گا۔ ہم پریسڈنٹ ہیں۔ ہمارا حکم ہے۔ ہم ابی اس سبا کو توڑ سکتے ہیں۔ ابی توڑ سکتے ہیں سبھی کو نکال سکتے ہیں۔ کوئی ہمارا کچھ نہیں کر سکتا۔ ہم پریسڈنٹ ہیں کوئی اور پریسڈنٹ نہیں ہے۔“

مرزا نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”حضور اس قصیدے میں تو آپ کی تعریف کی گئی ہے۔“ ایڈیٹر صاحب نے سرخ مگر بے نور آنکھوں سے دیکھا ”تم نے ہماری تعریف کیوں کی؟ کیوں کی؟ بولو کیوں ہماری تعریف کی؟ ہم کسی کا نوکر نہیں۔ ہم کسی سالے کا دیا نہیں کھاتے۔ ہم خود ایڈیٹر ہیں۔ ہم بجلی کا ایڈیٹر ہے۔ اس میں سب کا تعریف کرے گا۔ دیوی جی ! ہم تمہارا تعریف نہیں کرے گا۔ ہم کوئی بڑا آدمی نہیں ہے۔ ہم سب کا گلام ہے۔ ہم آپ کے پاؤں کے دھول ہے۔ مالتی دیوی بھی ہے ، ہماری سرسوتی ہماری رادھا!“

یہ کہتے ہوئے وہ مالتی کے بیروں کی طرف بچکے اور منہ کے بل فرش پر گر پڑے مرزا نے دوڑ کر انھیں سنبھالا اور کرسیاں ہٹا کر وہیں زمین پر لٹا دیا۔ پھر ان کے کانوں کے پاس منہ لے کر جا کر بولے ”رام رام ست ہے ! کیسے تو آپ کا جنازہ نکالوں؟“

رائے صاحب نے کہا۔ ”کل دیکھنا کتنا بگڑتا ہے۔ ایک ایک کو اپنے اخبار میں کو سے گا اور اس طرح کہ آپ بھی یاد کریں گے۔ ایک ہی پاجی ہے ، کسی پر رحم نہیں کرتا۔ لکھنے میں تو اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ایسا گدھا آدمی کیسے اتنا اچھا لکھتا ہے ، یہ ایک راز ہے۔“

کئی آدمیوں نے ایڈیٹر صاحب کو اٹھایا اور لے جا کر ان کے کمرے میں لٹا دیا۔ مگر پنڈال میں دھنش یکیدہ شروع ہو گیا تھا۔ کئی باران لوگوں کو بلانے کے لیے آدمی آچکے تھے۔ حاکم بھی پنڈال میں آ پہنچے تھے۔ لوگ ادھر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ دفعتاً ایک افغان آکر کھڑا ہو گیا گورا رنگ ، بڑی بڑی مونچھیں ، اونچا قد ، چوڑا سینہ ، آنکھوں میں بے خوفی کا جنون بھرا ہوا ، ڈھیلا لمبا کرتا ، پیروں میں شلوار ، زردوزی کے کام کی صدری ، سر پر پگڑی اور مٹھا ، کندھے سے چمڑے کا بیگ لٹکائے ، کندھے پر بندوق رکھے اور کمر میں تلوار باندھے نہ جانے کدھر سے آکھڑا ہوا اور گرج کر بولا ”خبردار کوئی یہاں سے مت جاؤ۔“

ہمارے ساتھ کے آدمی پر ڈاکہ پڑا ہے۔ یہاں کا جو سردار ہے وہ ہمارا آدمی کو لوٹ لیا ہے اس کا مال تم کو دینا ہوگا۔ ایک ایک کوڑی دینا ہوگا۔ کہاں ہے سردار اس کو بلاؤ!“
 رائے صاحب نے سامنے آکر غصہ بھری آواز میں کہا۔ ”کیسی لوٹ؟ کیسا ڈاکہ؟ یہ تم لوگوں کا کام ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں لوٹا۔ صاف صاف کہو کیا معاملہ ہے؟“

افغان نے آنکھیں نکالیں اور بندوق کا کندہ زمین پر پٹک کر بولا ”ام سے پوچھتا ہے، کیسا لوٹ، کیسا ڈاکہ؟ تم لوٹا ہے، تمہارا آدمی لوٹا ہے ام یہاں کی کوٹھی کا مالک ہے۔ اماری کوٹھی میں بچیس جوان ہے۔ ہمارا آدمی روپیہ قسمل کر لاتا تھا۔ ایک ہزار۔ وہ تم لوٹ لیا۔ اور کہتا ہے۔ کیسی لوٹ، کیسا ڈاکہ؟ ام بتائے گا کیسا ڈاکہ ہوتا ہے۔ امارا بچسیوں جوان ابھی آتا ہے۔ ام تمہارا گاؤں لوٹ لے گا۔ کوئی سالا کچھ نہیں کر سکتا، کچھ نہیں کر سکتا۔“
 کھنٹا نے افغان کے تیور دیکھے تو چپکے اٹھے کہ نکل جائیں۔ اس نے زور سے ڈانٹا ”کاں جاتا ہے تم؟ کوئی کہیں نہیں جاسکتا۔ نہیں ام سب کو قتل کر دے گا۔ ابی فیر کر دے گا! امارا تم کچھ نہیں کر سکتا۔ ام تمہاری پولیس سے نہیں ڈرتا۔ پولیس کا آدمی ہمارا شکل دیکھ کر بھاگتا ہے۔ امارا اپنا کانسل ہے۔ ام اس کو خط لکھ کر لاٹ صاحب کے پاس جاتا ہے۔ ام یاں سے کسی کو نہیں جانے دے گا۔ تم ہمارا ایک ہزار روپیہ لوٹ لیا۔ امارا روپیہ نہیں دے گا تو ہم کسی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ تم سب آدمی دوسروں کے مال لوٹ کرتا ہے اور یاں معشوق کے ساتھ شراب پیتا ہے۔“

مس مالتی اس کی آنکھ بچا کر کمرے نکلنے سے لگیں کہ وہ باز کی طرح ٹوٹ کر ان کے سامنے آکھڑا ہوا اور بولا ”تم ان بد معاشوں سے ہمارا مال دلوائے نہیں ام تم کو اٹھالے جائے گا اور اپنی کوٹھی میں جشن منائے گا۔ تمہارا حسن پر ہم عاشق ہو گیا یا تو ام کو ایک ہزار ابی ابی دے دے یا تم کو امارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ تم کو ہم نہیں چھوڑے گا۔ ام تمہارا عاشق ہو گیا ہے۔ ہمارا دل اور جگر پھٹا جاتا ہے۔ امارا اس جگہ بچیس جوان ہے۔ اس ضلع میں امارا پانچ سو جوان کام کرتا ہے۔ ام اپنے قبیلے کا خان ہے۔ امارے قبیلے میں دس ہزار سپاہی ہے ہم کابل کے امیر سے لڑ سکتا ہے۔ انگریز سرکار ہم کو بیس ہزار سالانہ خراج دیتا ہے۔ اگر تم امارا روپیہ نہیں دے گا تو ام گاؤں لوٹ لے گا اور تمہارا معشوق کو اٹھالے جائے گا خون کرنے میں ہم کو مزہ آتا ہے۔“

مجلس پر خوف چھا گیا۔ مس ہانتی اپنا چہکنا بھول گئیں، کھٹنا کی پنڈ لیاں کانپ رہی تھیں۔ بے چارے پر چوٹ چپیٹ کے ڈر سے ایک منزلہ بنگلے میں رہتے تھے۔ زینہ پر چڑھنا ان کے لیے سولی پر چڑھنے سے کم نہ تھا۔ گرمی میں بھی دہشت کے مارے کمرے میں سوتے تھے۔ رائے صاحب کو محضری پن کا گھمنڈ تھا۔ وہ اپنے ہی گاؤں میں ایک پنھان سے ڈر جانا مضحکہ انگیز سمجھتے تھے۔ مگر اس کی بندوق کو کیا کرتے؟ انھوں نے ذرا بھی جیس چپڑ کی اور اس نے بندوق داغ دی۔ ہوٹس تو ہوتے ہی ہیں یہ سب اور نشانہ بھی ان سب کا کتنا بے خطا ہوتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں بندوق نہ ہوتی تو رائے صاحب اس سے سنگین ملانے کو تیار ہو جاتے۔ مشکل یہی تھی کہ کبخت کسی کو باہر نہیں جانے دیتا ورنہ دم کے دم میں سارا گاؤں جمع ہو جاتا اور اس کے پورے جتنے کو مار پیٹ کر رکھ دیتا۔

آخر انھوں نے دل مضبوط کیا اور جان پر کھیل کر بولے ”ہم نے آپ سے کہہ دیا کہ ہم چور ڈاکو نہیں ہیں۔ میں یہاں کے کونسل کا ممبر ہوں۔ اور یہ دیوی جی لکھنؤ کی مشہور ڈاکٹر ہیں، یہاں سبھی شریف اور معزز لوگ جمع ہیں۔ ہمیں بالکل خبر نہیں کہ آپ کے آدمیوں کو کس نے لوٹا۔ آپ جا کر تھانے میں رپٹ کیجیے۔“

خان نے زمین پر پیر پکے، ہتیرے بدلے اور بندوق کو کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لیتا ہوا دھاڑ اٹھا۔ ”مت بک کرو، کونسل کے ممبر کو ہم اسی طرح پیروں سے مسل دیتا ہے (زمین رگڑتا ہے)، ہمارا ہاتھ مضبوط ہے، ہمارا دل مضبوط ہے، ہم خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتا، تم ہمارا روپیہ نہیں دے گا تو ہم (رائے صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ابی ابی تم کو قتل کر دے گا۔“

اپنی طرف بندوق کا سرا دیکھ کر رائے صاحب جھک کر میز کے برابر آگئے۔ عجیب مصیبت تھی۔ شیطان خواہ مخواہ کہتا ہی جاتا ہے کہ تم نے ہمارے روپے لوٹ لیے۔ نہ کچھ سنتا ہے، نہ کچھ سمجھتا ہے اور نہ کسی کو باہر جانے آنے دیتا ہے۔ نوکر چاکر، سیاہی پیادے سب دھنش یکیہ دیکھنے میں مصروف تھے۔ زمینداروں کے نوکر، یوں بھی کامل طور کام چور ہوتے ہی ہیں، جب تک دس دفعہ نہ پکارا جائے بولتے ہی نہیں اور اس وقت تو وہ ایک اچھے کام میں لگے ہوئے تھے۔ دھنش یکیہ ان کے لیے صرف ایک تماشا نہیں بلکہ بھگوان کی لیلیا تھی۔ اگر ایک آدمی بھی ادھر آ جاتا تو سپاہیوں کو خبر ہو جاتی اور دم بھر میں خان کی ساری خانی نکل جاتی۔

داڑھی کا ایک ایک بال بچ جاتا۔ کتنا غصہ در ہے۔ ہوتے بھی تو جلا دیتے ہیں۔ نہ مرنے کا غم نہ جینے کی خوشی۔

مرزا سے انگریزی میں بولے ”اب کیا کرنا چاہیے؟“
مرزا صاحب نے حیرت سے دیکھا، کیا بتاؤں کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ میں آج اپنا ہسپتال گھر ہی میں چھوڑ آیا ورنہ مزا چکھا دیتا۔“

کھنّا روٹی صورت بنا کر بولے ”کچھ روپے دے کر کسی طرح اس بلا کو ٹال لے۔“
رائے صاحب نے مالتی کی طرف دیکھا ”دیوی جی، اب آپ کی کیا صلاح ہے؟“
مالتی کا چہرہ اتنا رہا تھا بولی ”ہو گا کیا؟ میری اتنی بے عزتی ہو رہی ہے اور آپ لوگ بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ میں مردوں کے ہوتے ایک اجڑ پٹھان میری اتنی درگت کر رہا ہے اور آپ لوگوں کے خون میں ذرا بھی گرمی نہیں آتی۔ آپ کو جان پیاری ہے؟ کیوں ایک آدمی باہر جا کر شور نہیں مچاتا؟ کیوں آپ لوگ اس پر جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے بندوق نہیں چھین لیتے؟ بندوق ہی تو چلائے گا؟ چلانے دو ایک یا دو کی جان ہی تو جائے گی؟ جانے دو۔“
مگر دیوی جی مر جانا جتنا آسان سمجھتی تھیں اور لوگ نہ سمجھتے تھے۔ کوئی آدمی باہر نکلنے کی کر پھر ہمت کرے اور پٹھان غصے میں آکر دس پانچ فیئر کر دے تو یہاں صفایا ہو جائے گا۔ بہت ہو گیا تو اسے پھانسی کی سزا ہوگی۔ وہ بھی کیا ٹھیک؟ ایک بڑے قبیلے کا سردار ہے اسے پھانسی دیتے ہوئے سرکار بھی کافی سوچ بچار کرے گی۔ اوپر سے دباؤ پڑے گا۔ سیاست کے مقابلے میں انصاف کو کون پوچھتا ہے؟ ہمارے اوپر اگلے مقدمے دائر ہو جائیں اور زائد پولیس تعینات کر دی جائے تو تعجب نہیں۔ کتنے مزے سے ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ اب تک ڈراما کا لطف اٹھاتے ہوتے۔ اس شیطان نے آکر ایک نئی بلا کھڑی کر دی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلا دو ایک خون کیے مانے گا بھی نہیں۔

کھنّا نے مالتی کو پھنکارا ”دیوی جی، آپ تو ہمیں لتاڑ رہی ہیں جیسے اپنی جان بچانا کوئی پاپ ہے۔ جان سبھی جانداروں کو پیاری ہوتی ہے۔ اور ہمیں بھی ہو تو کوئی شرم کی بات نہیں۔ آپ ہماری جان اتنی سستی سمجھتی ہیں، یہ دیکھ کر مجھے رنج ہوتا ہے۔ ایک ہزار ہی کا تو معاملہ ہے۔ آپ کے پاس مفت کے ایک ہزار ہیں، وہ دے کر کیوں نہیں رخصت کر دیتیں؟ آپ خود اپنی بے عزتی کر رہی ہیں، اس میں ہمارا کیا قصور۔“

رائے صاحب نے گرم ہو کر کہا ”اگر اس نے دیوی جی کو ہاتھ لگایا تو چاہے میری لاش یہیں ترپنے لگے، میں اس سے بھڑ جاؤں گا۔ آخر وہ بھی آدمی ہی تو ہے۔“

مرزا نے شبیہ سے سر ہلا کر کہا ”رائے صاحب آپ ابھی ان سب کے مزاج سے واقف نہیں ہیں۔ یہ فائر کرنا شروع کرے گا تو پھر کسی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ ان کا نشانہ بے خطا ہوتا ہے۔“

مسٹر میخا آنے والے چنناؤ کا مسئلہ حل کرنے آئے تھے اور دس پانچ ہزار کا پختہ کر کے گھر جانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ یہاں جان ہی عذاب میں پڑ گئی۔ بولے ”سب سے سہل طریقہ وہی ہے جو ابھی کہنا جی نے بتایا۔ ایک ہزار ہی کی بات ہے اور روپے موجود ہیں تو پھر آپ لوگ کیوں اتنا پس و پیش کر رہے ہیں؟“

مس مالٹی نے میخا کو حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا بولیں ”آپ لوگ اتنے بزدل ہیں، میں نہ سمجھتی تھی۔“

”میں بھی یہ نہ سمجھتا تھا کہ آپ کو روپے اتنے پیارے ہیں اور وہ بھی مفت کے روپے۔“

”جب آپ لوگ میری بے عزتی دیکھ سکتے ہیں تو اپنے گھر کی عورتوں کی بھی بے عزتی دیکھ سکتے ہوں گے؟“

”تو آپ بھی پیسوں کے لیے اپنے گھر کے مردوں کو قربان کر دینے میں تامل نہ کریں گی؟“

خان اتنی دیر سے بھلایا ہوا ان لوگوں کی گٹ پٹ سن رہا تھا۔ اب یکا یک گرج کے بولا ”ام اب نہیں مانے گا۔ ام اتنی دیر سے یہاں کھڑا ہے۔ تم لوگ کوئی جواب نہیں دیتا (جیب سے سیٹی نکال کر) ام تم کو ایک لمحہ اور دیتا ہے، اگر تم روپیہ نہیں دیتا تو ہم سیٹی بجایا اور امارا پچیس جوان یہاں آجائے گا۔“ پھر آنکھوں سے عشق کا اظہار کرتے ہوئے مس مالٹی سے بولا ”تم امارے ساتھ چلے گا، دلدار! ام تمہارے اوپر فدا ہو جائے گا۔ اپنا جان تمہارے قدموں میں رکھ دے گا۔ اتنا آدمی تمہارا عاشق ہے مگر کوئی سچا عاشق نہیں ہے۔ سچا عاشق کیسا ہوتا ہے، ہم دکھا دے گا۔ تمہارا اشارہ پاتے ہی ہم اپنے سینے میں خنجر چبھا سکتا ہے۔“

مرزا نے گھٹکھیا کر کہا ”دیوی جی، خدا کے لیے اس موذی کو روپے دے دیجیے۔“

کھٹا نے دست بستہ التجا کی ”ہم پر رحم کرو مس مالٹی!“
 رائے صاحب تن کر بولے ”ہرگز نہیں۔ آج جو کچھ ہونا ہے ہو جانے دیجیے۔ یا تو ہم
 خود مرجائیں گے یا ان ظالموں کو ہمیشہ کے لیے سبق دے دیں گے۔“
 ٹکھا نے رائے صاحب کو ڈانٹ بتائی ”شیر کی ماند میں کھٹا کوئی بہادری نہیں ہے۔ میں
 اسے حماقت سمجھتا ہوں۔“

مگر مس مالٹی کے دلی خیالات کچھ اور ہی تھے۔ خان کی محبت بھری نگاہوں نے انھیں
 مطمئن کر دیا تھا اور اب اس تماشے میں انھیں کچھ مچلے پن کا سرور آرہا تھا ان کا جی کچھ دیر
 ان جوانمردوں کے بیچ میں رہ کر ان کے وحشیانہ عشق کا لطف اٹھانے کے لیے لچا رہا تھا۔
 مہذبانہ عشق کی کمزوری اور مردہ دلی کا انھیں تجربہ ہو چکا تھا۔ آج وحشی اور نامہذب پٹھانوں
 کے مجنونانہ عشق کے لیے ان کا دل بے قرار تھا، جیسے موسیقی کا لطف اٹھانے کے بعد کوئی
 مست ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کو دوڑے۔“

انھوں نے خان کے سامنے آکر بے خوفی سے کہا ”تمہیں روپے نہیں ملیں گے۔“
 خان نے ہاتھ بڑھا کر کہا ”تو ام تم کو لوٹ لے جائے گا۔“
 ”تم اتنے آدمیوں کے درمیان سے ہمیں نہیں لے جاسکتے۔“
 ”ہم تم کو ایک ہزار آدمیوں کے درمیان سے لے جاسکتا ہے۔“
 ”تم کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔“

”ہم اپنے معشوق کے لیے اپنے بدن کا ایک ایک بوٹی کٹوا سکتا ہے۔“
 اس نے مالٹی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اسی وقت ہوری نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ راجا
 جنک کا مالی بنا ہوا تھا اور اس کے کھیلوں نے دیہاتیوں کو ہنساتے ہنساتے لوٹ پوٹ کر دیا
 تھا۔ اس نے سوچا کے مالک ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ وہ بھی تو آکر دیکھیں کہ دیہاتی اس
 کام میں کتنے ہوشیار ہوتے ہیں۔ ان کے یار دوست بھی دیکھیں۔ کیسے مالک کو بلائے؟ وہ
 موقع کھوج رہا تھا اور جیوں ہی فرصت ملی وہ دوڑا ہوا یہاں آیا مگر یہاں کا منظر دیکھ کر
 ششدر ہو گیا۔ سب لوگ بالکل چپ تھے اور کانپتے ہوئے، خوف بھری نگاہوں سے خان کو
 دیکھ کر سب کچھ بھانپ گیا۔ اسی وقت رائے صاحب نے پکارا ”ہوری دوڑ کر جا اور سپاہیوں
 کو بلا لا! جلد دوڑ!“

ہوری پیچھے مڑا ہی تھا کہ خان نے اس کے آگے ہندوق تان کر ڈانٹا ”کہاں جاتا ہے سور، ہم گولی مار دے گا!“

ہوری گنوار تھا، سرخ پکڑی دیکھ کر اس کی جان ٹھپ جاتی تھی مگر مست سائڈ پر لٹھی لے کر ٹوٹ پڑتا تھا۔ وہ بزدل نہ تھا، مرنا اور مارنا دونوں ہی جانتا تھا مگر پولیس کے ہتھکنڈوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ بندھا بندھا کون پھرے؟ گھوس کے روپے کہاں سے لائے؟ بال بچے کس پر چھوڑے؟ پر جب مالک للکارتے ہوں تو کس کا ڈر؟ تب وہ موت کے منہ میں بھی کود سکتا ہے!

اس نے جھپٹ کر خان کی کمر پکڑی اور ایسا اڑنگا مارا کہ خان چاروں کھانے چت زمین پر آ رہے اور گلے پشتوں میں گالیاں دینے۔ ہوری ان کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اور زور سے داڑھی پکڑ کر کھینچی۔ داڑھی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ خان نے فوراً اپنی ٹھوہ اتار کر پھینک دیا اور زور لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ارے! یہ تو مسر مہتا ہیں! وہی!

لوگوں نے چاروں طرف سے مہتا کو گھیر لیا۔ کوئی ان کے گلے لگتا تھا اور کوئی پیٹھ پر تھپکیاں دیتا تھا۔ مسر مہتا کے چہرے پر نہ تبسم تھا نہ غرور، خاموش کھڑے تھے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

مالتی نے نفلی غصہ سے کہا ”آپ نے یہ بہرہ ویا پن کہاں سیکھا؟ میرا دل ابھی تک دھڑک رہا ہے۔“

مہتا نے مسکراتے ہوئے کہا ”ذرا ان بھلے مانسوں کی جوانمردی کا امتحان لے رہا تھا۔ جو گستاخی ہوئی ہو اسے معاف کیجیے گا۔“

یہ کھیل جب ختم ہوا تو ادھر پنڈال میں دھنش یکیہ بھی ختم ہو چکا تھا اور سوشل مزاحیہ ڈارے کی تیاری ہو رہی تھی۔ مگر ان لوگوں کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی صرف مہتا صاحب دیکھنے گئے اور شروع سے آخر تک جھے رہے انھیں بہت مزا آرہا تھا۔ سچ سچ میں تالیاں بجاتے رہے تھے اور ”پھر کہو، پھر کہو“ کا اصرار کر کے ایکٹروں کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ رائے صاحب نے اس کھیل میں ایک مقدمے باز دیہاتی زمیندار کا خاکہ اڑایا تھا۔ کہنے کو تو مزاحیہ تھا مگر درد و الم سے بھرا ہوا۔ ہیرو کا بات بات میں قانونی دفعات کا حوالہ دینا، بیوی پر صرف اس لیے مقدمہ چلانا کہ اس نے کھانا تیار کرنے میں ذرا سی دیر کی تھی، پھر وکیلوں کے غرے اور دیہاتی گواہوں کی چالاکیاں اور جھانسنے بازیاں، گواہی کے لیے فوراً تیار ہو جانا مگر اجلاس پر جاتے وقت خوب مناوون کرانا اور طرح طرح کی فرمائش کر کے الو بنانا، یہ سبھی مناظر دیکھ کر لوگ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ سب سے بہترین منظر وہ تھا جس میں وکیل گواہوں کو ان کے بیانات کا سبق پڑھا رہا تھا۔ گواہوں کا بار بار بھول جانا۔ وکیل کا بگڑنا، پھر ہیرو کا دہقانی لہجے میں گواہوں کو سمجھانا اور بالآخر اجلاس پر گواہوں کا بدل جانا، ایسا پر لطف اور صحیح خاکہ تھا کہ مہتا صاحب اچھل پڑے اور تماشا ہونے پر ہیرو کو گلے سے لگا لیا اور سبھی ایکٹروں کو ایک ایک تمغہ دینے کا اعلان کر دیا۔ رائے صاحب کے متعلق ان کے دل میں عقیدت کے جذبات جاگ اٹھے۔ رائے صاحب اسٹیج کے پیچھے ڈرامے کی نگرانی کر رہے تھے۔ مہتا صاحب دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گئے اور بے خود ہو کر بولے ”آپ کی نگاہ اتنی تیز ہے، اس کا مجھے شان گمان بھی نہ تھا۔“

دوسرے روز ناشتہ کے بعد شکار کا پروگرام تھا۔ وہیں کسی ندی کے کنارے پر کھانا کپے، خوب جی بھر کر نہائیں، غوطے لگائیں، اور شام کو لوگ واپس آئیں۔ اس طرح دیہاتی زندگی کا لطف حاصل کیا جائے۔ مہمانوں میں صرف وہی لوگ رہ گئے جن کا رائے صاحب سے گہرا تعلق تھا۔ مزہ کھانے کے سر میں درد تھا بس وہ نہ جاسکیں۔ ایڈیٹر صاحب تو اس جماعت سے

جلے ہوئے تھے اور ان لوگوں کے خلاف ایک سلسلہ مضامین نکالنے اور اچھی طرح لینے کے خیال میں محو تھے۔ ”سب کے سب چھٹے ہوئے غنڈے ہیں۔ حرام کے پیسے اڑاتے ہیں اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اس کی انھیں کیا خبر؟ ان کے پردوں میں کون مر رہا ہے، انھیں اس کی کیا پرواہ؟ انھیں تو اپنے عیش و عشرت سے کام ہے۔ یہ مہتا جو فلسفی بنا پھرتا ہے اسے یہی دھن ہے کہ زندگی کو ہر طرح مکمل بناؤ، مہینے میں ایک ہزار مار لاتے ہو، تمھیں اختیار ہے کہ زندگی کو مکمل بناؤ یا اس سے بھی زیادہ۔ جسے یہ فکر مارے ڈالتی ہے کہ لڑکوں کا بیاہ کیسے ہو، یا بیمار بیوی کے لیے ڈاکٹر کیسے آئیں، یا اب کے گھر کا کرایہ کہا سے آئے گا وہ اپنی زندگی کیسے مکمل بنائے؟ کھلے ساڈ بنے ہوئے دوسرے کے کھیت میں منہ مارتے پھرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ دنیا میں سب سکھی ہیں۔ تمھاری آنکھیں جب کھلیں گی جب انقلاب ہوگا اور تم سے کہا جائے گا کہ بچہ کھیت میں چل کر بل چلاؤ۔ تب دیکھیں گے کہ تمھاری زندگی کیسے مکمل ہوتی ہے اور وہ جو ہے مالتی جو بیڑ گھاٹوں کا پانی پی کر مس بنی پھرتی ہے، شادی نہیں کرے گی کیونکہ اس سے زندگی بندش میں پڑ جاتی ہے اور بندش میں زندگی کا کامل ارتقاء نہیں ہو پاتا۔ ارتقاء تو اسی میں ہے کہ دنیا کو لوٹے جاؤ اور آزادانہ عیش کیے جاؤ۔ ساری بندشیں توڑ دو، دھرم اور سماج کو گولی مارو، فرانس کو پاس نہ پھٹکنے دو، بس تمھاری زندگی مکمل ہو گئی! اس سے زیادہ آسان اور کیا ہوگا؟ ماں باپ سے نہیں ہٹتی تو انھیں دھتا تاؤ، بیاہ مت کرو، یہ بندھن ہے اور بچے ہوں گے تو وہ موہ کا جال ہے! مگر ٹیکس کیوں دیتے ہو؟ قانون بھی تو بندھن ہے، اسے کیوں نہیں توڑتے؟ اس سے کیوں کٹی کاٹتے ہو؟ جانتے ہوتا کہ قانون کی ذرا بھی خلاف ورزی کی اور بیڑیاں پڑ جائیں گی۔ بس وہی بندھن توڑو جو اپنی ہوس رانیوں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ رسی کو سانپ بنا کر پیٹوں اور تیس مار خاں بنو۔ زندہ سانپ کے پاس جاؤ ہی کیوں؟ وہ پھنکار بھی مارے گا تو لہر آنے لگی گی۔ اسے آتا دیکھو تو دم دبا کر بھاگ کھڑے ہو۔ یہ تمھاری مکمل زندگی ہے۔“

شکاری جماعت آٹھ بجے روانہ ہوئی۔ کننا نے کبھی شکار نہ کھیلا تھا، ہندوق کی آواز سے کانپ اٹھتے تھے، مگر مس مالتی جا رہی تھیں تو وہ کیسے رک سکتے۔ مسٹر ٹنچا کو ابھی تک چناؤ کے بارے میں بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ شاید وہاں مل جائے۔ رائے صاحب اپنے اس علاقے میں عرصے سے نہ گئے تھے۔ وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی

علاقے میں جانے آنے سے آسامیوں کے ساتھ کچھ تعلق بھی قائم رہتا ہے اور اپنا رعب بھی - کارندے اور پیادے بھی چوکس رہتے ہیں - مرزا خورشید کو زندگی کے نئے تجربات حاصل کرنے کا شوق تھا ، خصوصاً ایسے ، جن میں ہمت دکھانی پڑے - مس مالٹی تنہا کیسے رہتیں؟ انھیں تو شائقین کا ٹھکانا چاہیے - صرف مہتا صاحب شکار کھیلنے کے لیے سچے حوصلے سے جارہے تھے - رائے صاحب کی خواہش تو تھی کہ خوراک کا سامان ، باورچی ، کبار ، خدمت گار، سب ساتھ چلیں لیکن مہتا نے مخالفت کی -

کھانا نے کہا ”آخر وہاں کھائیں گے یا بھوکے مریں گے؟“
 مہتا نے جواب دیا ”کھائیں گے کیوں نہیں؟ لیکن آج ہم سب لوگ خود اپنا سارا کام کریں گے - دیکھنا تو چاہیے کہ بلا نوکر کے بھی ہم زندہ رہ سکتے ہیں یا نہیں - مس مالٹی پکائیں گی اور ہم لوگ کھائیں گے - دیہاتوں میں تھالیاں اور پٹل مل ہی جاتے ہیں اور ایندھن کی کوئی کمی ہی نہیں ، شکار ہم کریں گے ہی -“
 مالٹی نے گلہ کیا ”- معاف کیجیے آپ نے رات میری کلائی اتنے زور سے پکڑی کہ ابھی تک دکھ رہی ہے -“

”کام تو ہم لوگ کریں گے ، آپ صرف بتلاتی جائیں گی -“
 مرزا خورشید بولے ”اجی آپ لوگ تماشا دیکھتے رہیے گا میں سارا انتظام کر دوں گا - بات ہی کون سی ہے؟ جنگل میں ہانڈی اور برتن ڈھونڈنا حماقت ہے - ہرن کا شکار کیجیے ، بھونپے ، کھائیے اور وہیں درختوں کے سائے میں خراٹے لیجیے -“

یہی تجویز منظور ہوئی - دو موٹر روانہ ہوئے ایک مس مالٹی چلا رہی تھیں اور دوسرا خود رائے صاحب - کوئی بیس پچیس میل کے بعد پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا - دونوں طرف اونچی پہاڑیوں کا سلسلہ دوڑا چلا جا رہا تھا - سڑک بھی پیچدار ہوتی جا رہی تھی - کچھ دور کی چڑھائی کے بعد یکا یک ڈھال آگیا اور موٹر تیزی سے نیچے کی طرف چلے - دور سے دریا نظر آرہا تھا - کسی مریض کی طرح کمزور اور بے حس کنارے پر برگد کے گھنے سایہ میں موٹر روک دیے گئے اور لوگ اترے - یہ مشورہ ہوا کہ دو دو کی ٹولی بنے اور شکار کھیل کر بارہ بجے تک یہاں آجائیں - مس مالٹی مہتا کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں - کھنا دل موس کر رہ گئے - جس خیال سے آئے تھے اس میں جیسے میٹر ہو گیا - اگر جانتے کے مالٹی دھوکا دے گی تو گھر واپس لوٹ

جاتے۔ مگر رائے صاحب کا ساتھ بھی اتنا دلچسپ نہ سہی تاہم برا نہ تھا ان سے بہت سی معاطے کی باتیں کرتا تھیں۔ خورشید اور نٹھانچے رہے۔ ان کی ٹولی بنی بنائی تھی۔ تینوں ٹولیاں ایک سمت کو چل دیں۔

کچھ دور تک پھریلی پگڈنڈی پر مہتا کے ساتھ چلنے کے بعد مالتی نے کہا ”تم تو چلے ہی جاتے ہو، ذرا دم تو لے لینے دو۔“

مہتا مسکرائے ”ابھی تو ہم میل بھر بھی نہیں آئے، ابھی سے تھک گئیں؟“

”تھکی نہیں، پر کیوں نہ ذرا دم لے لو۔“

”جب تک کوئی شکار نہ ہاتھ آجائے، ہمیں آرام کرنے کا حق نہیں۔“

”میں شکار کھیلنے نہیں آئی تھی!“

مہتا نے انجان بن کر کہا ”اچھا، یہ میں نہ جانتا تھا۔ تو پھر کیا کرنے آئی تھیں؟“

”اب تم سے کیا بتاؤں؟“

ہرنوں کا ایک جھنڈ چرتا ہوا نظر آیا۔ دونوں ایک چٹان کی آڑ میں چھپ گئے۔ نشانات لگا کر گولی چلائی گئی۔ نشانہ خالی گیا اور جھنڈ بھاگ نکلا۔

مالتی نے پوچھا ”اب؟“

”کچھ نہیں چلو، بھر کوئی شکار ملے گا۔“

دونوں کچھ دور تک چپ چاپ چلتے رہے، پھر مالتی نے ذرا رک کر کہا ”گرمی سے

برا حال ہو۔ ہا ہے۔ آؤ اس پیڑ کے نیچے بیٹھ جائیں۔“

”ابھی نہیں۔ تم بیٹھنا چاہتی ہو تو بیٹھو، میں تو نہیں بیٹھتا۔“

”بڑے بے رحم ہو تم! سچ کہتی ہوں۔“

”جب تک کوئی شکار نہ مل جائے بیٹھ نہیں سکتا۔“

”تب تو تم مجھے مار ہی ڈالو گے! اچھا بتاؤ رات تم نے مجھے اتنا کیوں ستایا؟ مجھے تم پر

بڑا غصہ آ رہا تھا۔ یاد ہے کہ تم نے مجھے کیا کہا تھا؟ تم ہمارے ساتھ چلے گا، دلدار، میں نہ

جانتی تھی کہ تم اتنے شریر ہو۔“

اچھا، سچ کہنا کیا تم اس وقت مجھے اپنے ساتھ لے جاتے؟“

مہتا نے کوئی جواب نہ دیا جیسے سنا ہی نہیں۔

دونوں کچھ دور چلتے رہے۔ ایک تو جینھ کی دھوپ دوسرے پتھر یلا راستہ، مالتی تھک کر بیٹھ گئی، مہتا کھڑے کھڑے بولے ”اچھی بات ہے تم آرام کرلو، میں یہیں آجاؤں گا۔“
 ”مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟“

”میں جاتا ہوں کہ تم اپنی حفاظت کر سکتی ہو۔“
 ”کیسے جانتے ہو؟“

”نئے جگ کی دیویوں میں یہی تو صفت ہے۔ وہ مرد کا سہارا نہیں چاہتیں بلکہ اس کے دوش بدوش چلنا چاہتی ہیں۔“

مالتی نے جھینپتے ہوئے کہا ”تم کو رے فلسفی ہو مہتا، سچ!“

سانے درخت پر ایک مور بیٹھا ہوا تھا۔ مہتا نے نشانہ لگایہ اور بندوق سر کی۔ مور اڑ گیا۔ مالتی خوش ہو کر بولی ”اچھا ہوا، بہت اچھا ہوا، میری بددعا گئی۔“

مہتا نے بندوق کندھے پر رکھ کر کہا ”تم نے مجھے نہیں اپنے آپ کو بددعا دی شکار مل جاتا تو میں تمہیں دس منٹ کی مہلت دیتا۔ اب تو تم کو فوراً چلنا پڑے گا۔“

مالتی اٹھ کر مہتا کا ہاتھ پکڑتی ہوئی بولی ”فلاسفوں کے شاید دل نہیں ہوتا۔ تم نے اچھا کیا کہ شادی نہیں کی۔ اس غریب کو ماری ڈالتے! مگر میں یوں نہ چھوڑوں گی۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“

مہتا نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور آگے بڑھے۔

مالتی آبدیدہ ہو کر بولی ”میں کہتی ہوں نہ جاؤ، ورنہ میں اسی چٹان پر سر پٹک دوں گی۔“

مہتا نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ مالتی انھیں دیکھتی رہی۔ جب وہ بیس قدم نکل گئے تو جھنجھلا کر اٹھی اور ان کے پیچھے دوڑی۔ تنہا آرام کرنے میں تو کوئی لطف نہ تھا۔

قریب جا کر بولی ”میں تمہیں اتنا حیوان نہ سمجھتی تھی۔“

”میں جو ہرن ماروں گا اس کی کھال تمہیں بھیٹ کر دوں گا۔“

”کھال جائے بھاڑ میں! میں تم سے بات نہ کروں گی۔“

”کہیں ہم لوگوں کے ہاتھ کچھ نہ لگا اور دوسرے نے اچھے شکار مارے تو مجھے بڑی جینپ ہو گی۔“

ایک چوڑا ٹالا منہ پھیلائے آگے بڑھا تھا جس کے چہ کی چٹانیں دانتوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ دھار میں اتنا زور تھا کہ لہریں اچھلی پڑتی تھیں سورج سر پر آ پہنچا اور اس کی پیاسی کرنیں پانی میں کھیل رہی تھیں۔

مالتی نے خوش ہو کر کہا ”اب تو لوٹنا پڑا۔“

”کیوں؟ اس پار چلیں گے وہیں تو شکار ملے گا۔“

”دھار کس زور کی ہے، میں تو بہہ جاؤں گی۔“

”اچھی بات ہے تم یہیں بیٹھو، میں جاتا ہوں۔“

”آپ جانے مجھے اپنی جان سے بیر نہیں۔“

مہتا نے پانی میں قدم رکھا اور پیروں کو سادھتے ہوئے چلے۔ جیوں جیوں آگے جاتے تھے پانی گہرا ہوتا جاتا تھا، حتیٰ کے سینے تک آگیا۔

مالتی گھبرا اٹھی، اندیشے سے دل بے قرار ہو گیا۔ ایسی بے چینی تو اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ بلند لہجے میں بولی ”پانی گہرا ہے، ٹھہر جاؤ! میں بھی آتی ہوں۔“

”نہیں تم پھسل جاؤ گی دھار تیز ہے۔“

مالتی سازی اوپر چڑھا کر نالے میں گھس پڑی مگر دس ہاتھ جاتے جاتے پانی اس کی کمر تک آگیا۔

مہتا گھبرائے دونوں ہاتھوں سے اسے لوٹ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے ”تم یہاں نہ آؤ مالتی! یہاں تمہارے گلے تک پانی ہے۔“

مالتی نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر کہا ”ہونے دو تمہاری یہی مرضی ہے کہ میں مر جاؤں تو تمہارے پاس ہی مروں گی۔“

مالتی پیٹ تک پانی میں تھی۔ دھار اتنی تیز تھی کہ معلوم ہوتا تھا، اب قدم اکھڑا مہتا لوٹ پڑے اور مالتی کو ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔

مالتی نے نشیلی آنکھوں میں غصہ بھر کے کہا ”میں نے تم جیسا بے درد آدمی کبھی نہ دیکھا تھا۔ بالکل پتھر ہو! خیر، آج سٹالو جتنا ستاتے بنے، میں بھی کبھی سمجھوں گی۔“

مالتی کے پیر اکھڑتے ہوئے معلوم ہوئے۔ وہ بندوق سمجھاتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔ مہتا نے دلا سا دیتے ہوئے کہا ”تم یہاں کھڑی نہیں رہ سکتیں، میں تمہیں اپنے

کندھے پر بیٹھائے لیتا ہوں۔“

مالتی نے چہیں بھیں ہو کر کہا۔ ”تو اس پار جانا اتنا ضروری ہے؟“

مہتا نے کچھ جواب نہ دیا۔

بندوق کو کٹہری سے کندھے پر ڈالیا اور مالتی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کندھے پر

بٹھایا۔

مالتی اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے بولی ”اگر کوئی دیکھ لے؟“

”تو دیکھ لے اس میں شرم کی کیا بات ہے؟“

”بھدا تو لگتا ہے۔“

دو قدم کے بعد اس نے درد بھری آواز میں کہا ”اچھا بتاؤ اگر میں یہیں ڈوب جاؤں

تو تمہیں رنج ہوگا یا نہیں؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ تمہیں بالکل رنج نہ ہوگا۔“

مہتا بولے ”تم تو سمجھتی ہو کہ میں انسان نہیں ہوں۔“

”میں تو یہی سمجھتی ہوں، کیوں چھپاؤں؟“

”سچ کہتی ہو مالتی؟“

”تم کیا سمجھتے ہو؟“

”میں پھر کبھی بتاؤں گا۔“

پانی مہتا کے گلے تک آگیا، کہیں اگلا قدم اٹھاتے ہی سر تک نہ آجائے۔ مالتی کا دل

دھڑکنے لگا۔ بولی ”مہتا! ایٹور کے لیے اب آگے مت جاؤ ورنہ میں پانی میں کود پڑوں گی۔“

اس سٹک میں مالتی کو ایٹور یاد آیا، جس کا وہ مذاق اڑایا کرتی تھی۔ جانتی تھی کہ ایٹور

کہیں بیٹھا نہیں ہے جو آکر انھیں بچالے۔ مگر دل کو جس سہارے اور طاقت کی ضرورت تھی

وہ اور کہاں تھا؟ پانی کم ہونے لگا۔ مالتی نے خوش ہو کر کہا ”اب تم مجھے اتار دو۔“

”نہیں نہیں، چپ چاپ بیٹھی رہو۔ کہیں آگے کوئی گڑھا نہ ہو۔“

”مجھے اس کی اجرت دے دینا۔“

مالتی کے دل میں گدگدی ہوئی اور بولی ”کیا اجرت لوگے؟“

یہی کہ جب تمہاری زندگی میں کوئی ایسا ہی موقع آئے تو مجھے بلا لینا۔“

دونوں کنارے پر آگئے۔ مالتی نے ریت پر اپنی سازی نچوڑی، جوتے کا پانی نکالا،

منہ ہاتھ دھویا، مگر یہ الفاظ اپنے بھید بھرے مطلب کے ساتھ اس کے سامنے ٹاپتے رہے۔

اس نے تجربے کا لطف اٹھاتے ہوئے کہا ”یہ دن یاد رہے گا۔“

مہتا نے پوچھا ”تم بہت ڈر رہی تھیں؟“

”پہلے تو ڈری پھر مجھے یقین ہو گیا کہ تم، ہم دونوں کی حفاظت کر سکتے ہو۔“

مہتا نے فخر سے مالتی کو دیکھا ”اس کے چہرے پر تھکان کی سرخی کے ساتھ چمک بھی

تھی۔“ بولے مجھے یہ سن کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ تم نہ سمجھ سکو گی مالتی؟“

”تم نے سمجھایا کب؟ الٹا اور جنگلوں میں گھسیٹے پھرتے ہو! ابھی پھر لونٹے وقت یہی

نالا پار کرنا ہوگا۔ تم نے کیسی آفت میں جان ڈال دی۔ مجھے تمہارے ساتھ رہنا پڑے تو ایک

’اٹا نہ پٹے۔‘

مہتا مسکرائے۔ ان الفاظ کا اشارہ خوب سمجھ رہے تھے۔

”تم مجھے اتنا دشت سمجھتی ہو! اور جو میں کہوں کہ تم سے محبت کرتا ہوں، مجھ سے بیاہ

کر لگی؟“

”ایسے سنگ دل سے کون بیاہ کرے گا؟ رات دن جلا کر مار ڈالو گے!، اور محبت

بھری آنکھوں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہو“ اس کا مطلب تم خوب سمجھتے ہو اتنے نادان نہیں۔“

مہتا نے جیسے ہوش میں آکر کہا ”تم سچ کہتی ہو مالتی! میں کسی عورت کو خوش نہیں رکھ

سکتا۔ مجھ سے کوئی عورت پریم کا سواگ نہیں کر سکتی۔ میں اس کے دل کی گہرائی تک پہنچ جاؤ

ں گا۔ پھر مجھے اس سے مغفرت ہو جائے گی۔“

مالتی کانپ اٹھی۔ ان باتوں میں کتنی سچائی تھی، پوچھا ”اچھا بتاؤ تم کیسی محبت سے

مطمئن ہو گے۔“

”بس یہی کہ جو دل میں ہو، وہی زبان پر ہو۔ میرے نزدیک رنگ روپ اور ناز و

انداز کی قیمت اتنی نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے۔ میں وہ خوراک چاہتا ہوں جس سے روح کی

آسودگی ہو۔ متحرک اور جاذب اشیا کی ضرورت نہیں۔“

مالتی نے ہونٹ سکیز کر گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا ”تم سے کوئی پیش نہ پائے گا ایک

ہی گھاگھ ہو! اچھا بتاؤ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

مہتا نے شرارت سے مسکرا کر کہا ”تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ دانا ہو، ہوشیار ہو، طباع

ہو، رحم دل ہو، شوق ہو، خوددار ہو، تیاگ کر سکتی ہو مگر محبت نہیں کر سکتیں۔“
 مالتی نے تیز نگاہ سے تاک کر کہا ”جھوٹے ہو تم، بالکل جھوٹے! مجھے تمہارا یہ دعویٰ
 بے دلیل معلوم ہوتا ہے کہ تم عورت کے دل تک پہنچ جاتے ہو۔“

دونوں نالے کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے بارہ بج چکے تھے مگر اب مالتی کو
 نہ آرام کی خواہش تھی نہ واپسی کی۔ آج کی گھنگلوں میں اسے ایسا حرا آ رہا تھا جو اس کے لیے
 بالکل نیا تھا۔ اس نے کتنے ہی عالموں اور لیڈروں کو ایک مسکراہٹ میں، ایک چتون میں،
 ایک بات میں احسب بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ ایسی ریت کی دیوار پر وہ زندگی کی بنیاد نہیں قائم
 کر سکتی تھی۔ آج اسے وہ سخت اور ٹھوس پتھری زمین مل گئی جو پھاؤڑوں سے چنگاریاں نکال
 رہی تھی اور یہ سختی اسے زیادہ سے زیادہ فریفتہ کیے لیتی تھی۔

دھائیں کی آواز ہوئی۔ ایک ”لال سر“ نالے پر اڑا جا رہا تھا۔ مہتا نے نشانہ مارا۔
 چڑیا چوٹ کھا کر بھی کچھ دور اڑی۔ پھر بچ دھاریں میں گر پڑی اور لہروں کے ساتھ بہنے لگی
 ”اب؟“

”ابھی جا کر لاتا ہوں، جاتا کہاں ہے؟“

یہ کہتے ہی وہ ریت میں دوڑے اور بندوق کنارے پر رکھ کر پانی میں کود پڑے اور
 بہاؤ کی طرف تیرنے لگے مگر نصف میل تک پورا زور لگانے پر بھی وہ چڑیا کو نہ پاسکے۔ چڑیا
 مر کر بھی گویا اڑی جا رہی تھی! دفعتاً انھوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی کنارے کی ایک
 جھوپڑی سی نکلی۔ چڑیا کو بہتا دیکھ کر ساڑی کو راتوں تک چڑھایا اور پانی میں کود پڑی۔ ایک
 لمحے میں اس نے چڑیا پکڑ لی اور مہتا کو دکھائی ہوئی بولی ”پانی سے نکل آؤ بابو جی! تمہاری
 چڑیا یہ ہے۔“

مہتا صاحب لڑکی کی چستی اور ہمت دیکھ کر دنگ ہو گئے، فوراً کنارے کی طرف بڑھے
 اور دو منٹ میں اس کے پاس جا پہنچے۔

لڑکی کا رنگ تھا تو سیاہ اور گہرا سیاہ، کپڑے بہت ہی میلے اور گھٹنوں، زیور کے نام پر
 صرف ہاتھوں میں دو دو موٹی چوڑیاں، سر کے بال الجھے اور بکھرے ہوئے، چہرے کا کوئی
 حصہ ایسا نہیں جسے سندس یا سڈول کہا جاسکے، مگر وہاں کی صاف آب و ہوا نے اس کی سیاحی
 میں ایسی ملاحت بھر دی تھی اور قدرت کی مود میں پل کر اس کے اعضا اتنے سڈول اور کسے

ہوئے اور پھر تیلے ہو گئے تھے کہ شباب کی تصویر کے لیے اس سے بہتر نمونہ ملنا مشکل تھا۔ اس کی عمدہ صحت گویا مہتا کے دل میں سکت اور چمک لا رہی تھی۔

مہتا نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ”تم بڑے موقع سے پہنچ گئیں ورنہ مجھے نہ جانے کتنی دور تیرنا پڑتا۔“

لڑکی نے خوش ہو کر کہا ”میں نے تمہیں تیرتے دیکھا تو دوڑی سکار کھیلنے آئے ہو گے؟“

”ہاں آئے تو تھے شکار ہی کھیلنے مگر دوپہر ہو گئی اور یہی ایک چڑیا ملی ہے۔“

”تیندوا مارنا چاہو تو میں اس کی جگہ دکھا دوں۔ رات کو یہاں روج وہ پانی پینے آتا ہے۔ کبھی کبھی دوپہر میں بھی آ جاتا ہے۔“

پھر ذرا شرما کر سر جھکائے ہوئے بولی ”اس کی کھال ہمیں دینی پڑے گی چلو میرے دوارے پر وہاں پتیل کی چھایا ہے، یہاں دھوپ میں کب تک کھڑے رہو گے؟ کپڑے بھی تو بھیکے ہوئے ہیں۔“

مہتا نے اس کے بدن سے لپٹی ہوئی بھگی ساڑی کو دیکھ کر کہا ”تمہارے کپڑے بھی تو بھیکے ہوئے ہیں۔“

اس نے بے پروائی سے کہا ”آئہ ہمارا کیا، ہم تو جنگل کے جیو ہیں دن دن بھر دھوپ اور پانی میں کھڑے رہتے ہیں۔ تم تھوڑے ہی رہ سکتے ہو۔“

لڑکی کتنی سمجھدار ہے اور بالکل گنوار۔

”تم کھال لے کر کیا کرو گی؟“

”ہمارے دادا ہاٹ میں بیچتے ہیں۔ یہی تو ہمارا کام ہے۔“

”لیکن دوپہر یہاں کاٹیں تو تم کھلاؤ گی کیا؟“

لڑکی نے شرما تے ہوئے کہا ”تمہارے کھانے لائق ہمارے گھر میں کیا ہے؟ ککے کی روٹیاں کھاؤ تو دھری ہیں چڑے کا سالن پکا دوں گی۔ تم بتاتے جانا جیسا بنانا ہو۔ تھوڑا دودھ بھی ہے ہماری گائے کو ایک بار تیندوے نے گھیرا تھا وہ اس کو سیبگوں سے بھگا کر چلی آئی تھی۔ تب سے تندو اس سے ڈرتا ہے۔“

”لیکن میں اکیلا نہیں ہوں، میرے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔“

”تمہاری گھر والی ہوگی؟“

”نہیں، گھر والی تو ابھی نہیں ہے، جان پہچان کی ہے۔“

”تو میں دوڑ کر ان کو بلائے لاتی ہوں، تم چل کر چھاہنہ میں بیٹھو۔“

”نہیں، نہیں، میں بلائے لاتا ہوں۔“

”تم تھک گئے ہو گے۔ سہر کے پاسی جنگل میں کاہے کو آتے ہو گے؟ ہم تو جنگلی

آدی ہیں۔ کنارے ہی پر تو کھڑی ہوں گی؟“

جب تک مہتا کچھ بولیں وہ ہوا ہو گئی۔ مہتا اوپر چڑھ کر پتیل کے سائے میں بیٹھے تو اس آزادانہ زندگی سے انھیں رغبت پیدا ہو گئی؟ سامنے کا پہاڑی سلسلہ فلسفے کے اصولوں کی طرح ناقابل عبور اور لامتناہی دور تک پھیلا ہوا گویا فہم و فراست کو وسعت دے رہا تھا، گویا دل اس عقل کو، اس نور کو، اس عشق کو اس کے مجسم اور عظیم صورت میں دیکھ رہا ہو۔ دور کی ایک بہت بلند چوٹی پر ایک چھوٹا سا مندر تھا جو اس ناقابل فہم مقام میں گیان کی طرح اونچا مگر کھویا ہوا سا کھڑا تھا۔ گویا پرند وہاں تک پر مار کر آرام اور آسائش حاصل کرنا چاہتا ہے مگر کہیں جگہ نہیں پاتا۔

مہتا انھیں خیالات میں غرق تھے کہ وہ لڑکی مس مالتی کو ساتھ لیے آئینی۔ ایک جنگلی پھول کی طرح دھوپ میں کھلی ہوئی اور دوسری سکیلے کے پھول کی طرح دھوپ سے زرد اور مر جھائی ہوئی۔

مالتی نے بے دلی سے کہا ”پتیل کی چھاؤں بہت اچھی لگ رہی ہے، کیوں؟ اور یہاں بھوک کے مارے جان نکل جاتی ہے!“

لڑکی دو بڑے بڑے سٹکے اٹھا لائی اور بولی ”تم جب تک یہیں بیٹھو، میں دوڑ کر پانی لاتی ہوں۔ پھر چوہا جلاؤں گی اور میرے ہاتھ کا کھاؤ تو میں چھن بھر میں بائیاں بنا دوں گی، نہیں تو اپنے آپ سینک لینا۔ ہاں گیہوں کا آٹا میرے گھر میں نہیں ہے اور یہاں کوئی دکان بھی نہیں ہے کہ لادوں۔“

مالتی کو مہتا پر غصہ آ رہا تھا۔ بولی ”تم یہاں کیا آکر پڑ رہے؟“

مہتا نے چڑھاتے ہوئے کہا ”ایک روز ذرا اس صحرائی زندگی کا لطف بھی تو اٹھاؤ۔ دیکھو مکا کی روٹیوں میں کتنی لذت ہے۔“

”مجھ سے وہ روٹیاں کھائی ہی نہ جائیں گی اور کسی طرح نگل بھی جاؤں تو ہضم نہ ہوں گی۔ تمہارے ساتھ آکر میں بہت چھتا رہی ہوں۔ راستہ بھر دوڑا کر مار ڈالا اور اب یہاں لا کر پلک دیا۔“

مہتا نے کپڑے اتار دیے تھے اور صرف ایک گیلا جاگھیا پہنے ہوئے بیٹھے تھے۔ لڑکی کو مکے لے جاتے دیکھا تو اس کے ہاتھ سے جھین لیے اور کنوئیں پر پانی بھرنے چلے۔ فلنے کے عمیق مطالعے میں بھی انھوں نے اپنی صحت کی حفاظت کی تھی اور دونوں مکے لے کر چلتے ہوئے ان کے بھرے ہوئے بازوؤں چوڑے سینے اور پٹھے دار رانوں سے کسی یونانی مجسمے کے مناسب اعضا کی طرح ان کی قوت کا پتہ مل رہا تھا۔ لڑکی انھیں پانی کھینچتے ہوئے شوق کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اب اس کے رحم کے نہیں بلکہ اس کی عقیدت کے مستحق ہو گئے تھے۔

کنواں بہت گہرا تھا، کوئی ساٹھ ہاتھ۔ مکے بھاری تھے اور مہتا صاحب ورزش کے عادی ہوتے ہوئے بھی ایک منکا کھینچتے کھینچتے ست پڑ گئے۔ لڑکی دوڑ کر ان کے ہاتھوں سے ری چھین لی اور بولی ”تم سے نہ کھینچے گا، تم جا کر کھاٹ پر بیٹھو، میں بھرے لاتی ہوں۔“

مہتا اپنی مردیت کی یہ توجہ نہ سہ سکے۔ ری اس کے ہاتھ سے پھر لے لی اور زور لگا کر ایک لمحے میں دوسرا منکا بھی کھینچ لیا۔ پھر دونوں ہاتھوں میں مکے لیے ہوئے آکر چھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ لڑکی نے آنا فانا آگ جلائی اور چڑے کے پر جھلس دیے۔ پھر چھرے سے اس کی بوٹیاں بنائیں اور چولھے میں آگ جلا کر گوشت چڑھا دیا اور چولھے کے پچھلے حصے پر کڑھائی میں دودھ ابلانے لگی۔

اور مالٹی بھونیں چڑھائے چار پانی پر اداس پڑی ہوئی اس منظر کو اس طرح دیکھ رہی تھی گو اس کے آپریشن کی تیاری ہو رہی ہو۔

مہتا چھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہو کر لڑکی کی خانہ دار یوں کو شوق و رغبت سے دیکھتے ہوئے بولے ”مجھے بھی تو کوئی کام بتاؤ، میں کیا کروں؟“

لڑکی نے ملائم جھڑکی کے ساتھ کہا ”تمہیں کچھ نہیں کرنا۔ جا کر بائی کے پاس بیٹھو بے چاری بہت بھوکی ہیں۔ دودھ گرم ہوا جاتا ہے، اسے پلا دینا۔“

اس نے ایک گھڑے سے آنا نکالا اور گھوندھنے لگی۔ مہتا اس کے اعضا کی خوشگوار

حرکت دیکھتے رہے۔ لڑکی بھی رہ رہ کر انھیں ٹھکیوں سے دیکھتے ہوئے اپنا کام کرنے لگتی تھی۔

مالتی نے پکارا ”تم وہاں کیا کھڑے ہو؟ میرے سر میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ آدھا سر ایسا پھنا پڑتا ہے جیسے گر جائے گا۔“

مہتا نے آکر کہا ”معلوم ہوتا ہے، دھوپ لگ گئی ہے۔“

”میں کیا جانتی تھی کہ تم مجھے مار ڈالنے کے لیے یہاں لائے ہو؟“

”تمہارے ساتھ کوئی دوا بھی تو نہیں ہے؟“

”کیا میں کسی مریض کو دیکھنے آ رہی تھی جو دوا لے کر چلتی؟ میرا ایک دواؤں کا بکس

ہے وہ سری میں ہے۔ اف! سر پھنا جاتا ہے۔“

مہتا اس کے سر ہانے زمین پر پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ اس کا سر سہلانے لگے۔ مالتی نے

آنکھیں بند کر لیں۔

لڑکی ہاتھوں میں آتا بھرے ہوئے ہر کے بال بکھیرے، آنکھیں دھوئیں سے سرخ اور

اٹک آلود، کل بدن پینے سے تر جس سے اس کا ابھرا ہوا سینہ صاف جھلک رہا تھا، آکر

کھڑی ہو گئی۔ اور مالتی کو آنکھیں بند کیے پڑا دیکھ کر بولی ”بائی کو کیا ہو گیا ہے۔؟“

”مہتا بولے ”سر میں بڑا درد ہے۔“

”پورے سر میں ہے کہ آدھے سر میں؟“

”آدھے میں بتاتی ہیں۔“

”دہنی طرف ہے کہ بائیں طرف؟“

”بائیں طرف۔“

”میں ابھی دوڑ کر ایک دوا لاتی ہوں جسے کھس کر کلاتے ہی اچھا ہو جائے گا۔“

”تم اس دھوپ میں کہاں جاؤ گی؟“

لڑکی نے سنا ہی نہیں۔ تیزی سے ایک طرف جا کر پہاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ کوئی

آدھ گھنٹے بعد مہتا نے اسے اونچی پہاڑی پر چڑھتے دیکھا۔ دور سے بالکل گڑیا سی لگ رہی

تھی۔ دل میں سوچا کہ اس جنگلی چھوکری میں خدمت کا کتنا جذبہ اور کتنا عملی علم ہے۔ لو، اور

دھوپ میں آسمان میں چڑھی جا رہی ہے۔

مالتی نے آنکھیں کھول کر دیکھا بولی ”کہاں گئی وہ کلونی؟ غضب کی کالی ہے جیسے آہنوں کا کندہ۔ اسے بھیج دو۔ رائے صاحب سے کہہ آئے کہ موٹر یہاں بھیج دیں۔ اس دھوپ میں میرا دم نکل جائے گا۔“

”کوئی دوا لانے گئی ہے۔ کہتی ہے کہ اس سے آدھا سیسی کا درد بہت جلد دور ہو جاتا ہے۔“

”ان کی دوائیں ان ہی کو نفا کرتی ہیں، مجھے نہ کریں گی۔ تم تو اس چھوکری پر لٹو ہو گئے۔ کتنے چھپوڑے ہو! جیسی روح ویسے فرشتے۔“

مہتا کو تلخ سچائی کہنے میں تامل نہ ہوتا تھا، بولے ”کچھ باتیں تو اس میں ایسی ہیں کہ اگر تم میں ہوتیں تو تم سچ سچ دیوی ہو جاتیں۔“

”اس کی خوبیاں اسے مبارک ہوں! مجھے دیوی بننے کی ہوس نہیں ہے۔“

”تم کہو تو میں جا کر موٹر لاؤں، اگرچہ میں نہیں کہہ سکتا کہ موٹر یہاں آ بھی سکے گا یا نہیں۔“

”اس کلونی کو کیوں نہیں بھیج دیتے؟“

”وہ تو دوا لینے گئی ہے، پھر کھانا پکائے گی۔“

”تو آج آپ اس کے مہمان ہیں۔“

مہتا نے اس حملے سے چڑھ کر کہا ”اس لڑکی کی جانب میرے دل میں جو محبت و عقیدت ہے وہ ایسی ہے کہ اگر میں اس کی طرف بدنگاہی سے دیکھوں تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔ میں اپنے کسی دلی دوست کے خاطر بھی اس دھوپ اور لو، میں اس اونچی پہاڑی پر نہ جاتا اور ہم صرف گھڑی بھر کے مہمان ہیں، اسے وہ جانتی ہے۔ وہ کسی غریب عورت کے لیے بھی اسی مستعدی سے دوڑ جائے گی۔ میں اس امر کو صرف تحریر یا تقریر کے ذریعہ ادا کر سکتا ہوں کہ دنیا میں سب لوگ بھائی بھائی ہیں اور سبھی میں برادرانہ محبت ہونی چاہیے مگر وہ ان جذبات پر عمل کر کے دکھلا سکتی ہے۔ کہنے سے کرنا مشکل ہے، یہ تو تم بھی جانتی ہو۔“

مالتی نے طہر سے کہا ”بس بس، وہ دیوی ہے میں مان گئی، اس کے سینہ میں ابھار، کمر میں لپک، جسم میں وزن ہے۔ دیوی ہونے کے لیے اور کیا چاہیے؟“

مہتا تملتا اٹھے۔ فوراً اٹھے، کپڑے پہنے جو سوکھ گئے تھے، بندوق اٹھائی اور چلنے کو تیار

ہو گئے۔ مالتی نے پھکار چھوڑی ”تم نہیں جاسکتے مجھے تنہا چھوڑ کر!“

”پھر کون جائے گا؟“

”وہی تمہاری دیوی۔“

مہتابہ دھواس سے کھڑے تھے۔ عورت مرد پر کتنی آسانی سے فتح پاسکتی ہے اس کا آج انہیں زندگی میں پہلا تجربہ ہوا۔

وہ دوڑی ہانپتی چلی آرہی تھی، وہی کالی کلوٹی لڑکی، ہاتھ میں ایک جھاڑ لیے ہوئے۔ پاس آکر مہتابہ کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر بولی ”میں وہ جڑی کھوج لائی۔ ابھی کھس کر لگاتی ہوں۔ مگر تم کہاں جا رہے ہو؟ ماس (گوشت) تو پک گیا ہوگا۔ میں بانیاں سینکے دیتی ہوں، دو ایک کھا لیتا۔ بائی دودھ پی لیں گی۔ ٹھنڈے میں چلے جانا۔“

اس نے بلا تامل مہتابہ کی اچکن کے ٹن کھول دیے۔ مہتابہ بہت ضبط کیے ہوئے تھے، جی چاہتا تھا کہ اس دھتانی لڑکی کے قدم چوم لیں۔

مالتی نے کہا ”اپنی دوا رہنے دے۔ ندی کے کنارے برگد کے نیچے ہمارا موٹر کھڑا ہے۔ وہاں اور لوگ ہوں گے ان سے جا کر کہنا، موٹر یہاں لائیں۔ دوڑی ہوئی جا!“

لڑکی نے مایوسانہ نگاہوں سے مہتابہ کو دیکھا۔ اتنی محنت سے جڑی لائی، اس کی یہ بے قدری! اس گنوارن کی دوا انہیں نہیں بچی تو نہ سہی، اس کا من رکھنے ہی کو ذرا سی لگوا لیتیں تو کیا ہوتا؟۔

اس نے جڑی کو زمین پر رکھ کر پوچھا ”تب تک تو چولہا ٹھنڈا ہو جائے گا بائی جی۔ کہو تو روٹیاں سینک کر رکھ لوں۔ بابو جی کھانا کھالیں، تم دودھ پی لو اور دونوں بنے آرام کرو۔ تب تک میں موٹر والے کو بلا لاؤں۔“

وہ جھونپڑی میں گئی، بجھی ہوئی آگ پھر جلائی، دیکھا تو گوشت ابل گیا تھا، کچھ جل بھی گیا تھا، جلد جلد روٹیاں سینکیں، دودھ گرم تھا اسے ٹھنڈا کیا اور ایک کنوڑے میں مالتی کے پاس لائی۔ مالتی نے کنوڑے کے بھدے پن پر منہ بنایا لیکن دودھ نہ چھوڑ سکی۔ مہتابہ جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھ کر ایک تھالی میں گوشت اور روٹیاں کھانے لگے۔ لڑکی کھڑی ہوئی پکھا جھل رہی تھی۔ مالتی نے لڑکی سے کہا ”انہیں کھانے دے، کہیں بھائے نہیں جاتے۔ تو جا کر موٹر لا۔“

لڑکی نے مالتی کی طرف ایک مرتبہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ کیا چاہتی ہیں؟ ان کا مطلب کیا ہے؟ اسے مالتی کے چہرے پر مریضوں کی سی عاجزی اور احسان مندی اور التجا کی جھلک نہ دکھائی دی، اس کی جگہ غرور اور رعوت کی جھلک تھی۔ دہقانی لڑکی دل کی پرکھ میں ہوشیار تھی بولی ”کسی کی لوٹھی نہیں ہوں، بائی جی! تم بڑی ہوگی اپنے گھر کی۔ میں تم سے مانگنے نہیں جاتی۔ میں موٹر لینے نہ جاؤں گی۔“

مالتی نے ڈانٹا ”اچھا تو نے گستاخی پر کمر باندھی ہے، بتا تو کس کے علاقے میں رہتی ہے؟“

”رائے صاحب کا علاقہ ہے۔“

”تو تجھے انھیں رائے صاحب کے ہاتھوں ہنروں سے پٹواؤں گی۔“

”مجھے پٹوانے سے تمہیں سکھ ملے تو پٹوالینا بائی جی، کوئی رانی مہرانی تھوڑے ہی ہوں کہ لسکر بھیجنا پڑے۔“

مہتا نے دوچار نوالے کھائے تھے کہ مالتی کی یہ باتیں سنیں۔ نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ جلدی سے ہاتھ دھویا اور بولے ”وہ نہیں جائے گی میں جا رہا ہوں۔“

مالتی بھی کھڑی ہو گئی ”اسے جانا پڑے گا!“

مہتا نے انگریزی میں کہا ”اس کی توہین کر کے تم اپنی توقیر بڑھا نہیں رہی ہو مالتی!،“

مالتی نے پھینکار بتائی ”ایسی ہی لوٹھیاں تو مردوں کو پسند آتی ہیں، جن میں کوئی اور گمن ہو نہ ہو مگر جو ان کی خدمت دوڑ دوڑ کر خوشی سے کریں اور اپنے بھاگ کو سراہیں کہ اس مرد نے مجھ سے کچھ کام کرنے کو تو کہا۔ بس وہی تو دیویاں ہیں! میں سمجھتی تھی کہ ویسی مردی کم سے کم تم میں نہیں ہے، لیکن تم بھی دل کے ویسے ہی نکلے۔“

مہتا علم انفس کے ماہر تھے۔ مالتی کے دلی خیالات کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ حسد کی ایسی انوکھی مثال انھیں کبھی نہ ملی تھی۔ اس عورت میں جو اتنی نرم مزاج، اتنی فراخ دل اور اتنی ہنس مکھ تھی، حسد کی ایسی تیز آگ!

بولے ”کچھ بھی کہو مگر میں اسے نہ جانے دوں گا۔ اس کی خدمتوں اور مہربانیوں کا یہ صلہ دے کر میں اپنی نظروں میں ذلیل نہیں بن سکتا،“ مہتا کی آواز میں کچھ ایسی سختی تھی کہ مالتی آہستہ سے انھی اور جانے کو تیار ہو گئی۔ اس نے جل کر کہا ”اچھا تو میں ہی جاتی ہوں۔“

تم اس کے چرنوں کی پوجا کر کے بعد کو آنا۔“
 مالتی دو تین قدم چلی گئی تو مہتا نے اس لڑکی سے کہا ”اب مجھے اجازت دو بہن !
 تمہاری یہ محبت ، تمہاری یہ بے غرضانہ خدمت ہمیشہ یاد رہے گی۔“
 لڑکی نے آبدیدہ ہو کر دونوں ہاتھوں سے انھیں پرنام کیا اور جھونپڑی میں چلی گئی۔

دوسری ٹولی رائے صاحب اور کھٹا کی تھی۔ رائے صاحب تو اپنے اسی رہنمی کرتے اور
 رہنمی چادرے میں تھے مگر کھٹا نے شکاری پوشاک پہن رکھی تھی جو شاید اسی دن کے لیے تیار
 کرائی گئی تھی کیونکہ کھٹا کو آسامیوں کے شکار سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ جانوروں کا شکار
 کھیلتے؟ کھٹا پستہ قد اور اکھرے بدن کے کھلیل آدمی تھے۔ گندی رنگ ، بڑی بڑی آنکھیں ،
 منہ پر چپک کے داغ ، بات چیت میں بڑے ہوشیار !
 کچھ دور چلنے کے بعد کھٹا نے مہتا صاحب کا ذکر چھیڑ دیا جو کل ہی سے ان کے سر پر
 کسی نحوست کی طرح سوار تھے ؛ بولے ”یہ مہتا بھی کچھ عجیب آدمی ہے۔ مجھے تو کچھ بنا ہوا
 معلوم ہوتا ہے۔“

رائے صاحب مہتا کی عزت کرتے تھے اور انھیں سچا بے ریا آدمی سمجھتے تھے۔ مگر کھٹا
 سے کچھ لین دین بھی تھا اور کچھ مزاج میں بھی امن پسندی تھی۔ پس مخالفت نہ کر سکے۔
 بولے ”میں تو انھیں صرف تفریح کی چیز سمجھتا ہوں کبھی ان سے بحث نہیں کرتا اور کرتا بھی
 چاہوں تو اتنا علم کہاں سے لاؤں؟ جس نے زندگی کے دائرے میں کبھی پیر ہی نہیں رکھا، وہ
 اگر زندگی کے بارے میں کسی نئے اصول کا راگ الاپتا ہے تو مجھے اس پر ہنسی آتی ہے۔ مزے
 سے ایک ہزار ماہوار وصول کرتے ہیں ، نہ جو رو نہ جاتا ، نہ کوئی فکر نہ تکلیف ، وہ فلسفہ نہ
 بگھاریں تو کون بگھارے؟ آپ آزاد رہ کر زندگی کو مکمل بنانے کا خواب دیکھتے ہیں ، ایسے
 آدمی سے کیا بحث کی جائے؟“

”میں نے سنا کے چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”بے فکرے پن میں چال چلن ٹھیک رہ کیسے سکتا ہے؟“ سوسائٹی میں رہو اور اس کے
 فرائض انجام دو جب پتہ چلے۔“
 ”مس مالتی نہ جانے کیا دیکھ کر ان پر فریفتہ ہو جاتی ہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف تھیں جلا رہی ہے۔“

”مجھے وہ کیا کھا کر جلائیں گی؟ میں انہیں کھلونے سے زیادہ نہیں سمجھتا۔“

”یہ تو نہ کہو مسٹر کھنا، مس مالتی پر جان تو دیتے ہو تم!“

”یوں تو میں بھی آپ پر وہی الزام لگا سکتا ہوں۔“

”میں انہیں واقعی کھلونا سمجھتا ہوں۔ آپ البتہ انہیں مورت بنائے ہوئے ہیں۔

کھانا نے زور سے قہقہہ لگایا حالانکہ ہنسی کی کوئی بات نہ تھی۔“ اگر ایک لوٹا جل چڑھا

دینے سے بردان مل جائے تو کیا برا ہے؟“

اب کے رائے صاحب نے زور کا قہقہہ مارا جس کا کوئی مطلب نہ تھا۔ ”تب آپ نے

اس دیوی کو سمجھا ہی نہیں۔ آپ جتنا ہی اس کی پوجا کریں گے اتنا ہی آپ سے دور بھاگیں

گی اور جتنا ہی دور بھاگے گا اتنا ہی آپ کی طرف دوڑیں گی۔“

”میری طرف! میں اس شوقین جماعت سے بالکل باہر ہوں، مسٹر کھنا! سچ کہتا ہوں۔

مجھ میں جتنی عقل اور طاقت ہے وہ اس علاقے کے انتظام ہی میں خرچ ہو جاتی ہے۔ گھر کے

جتنے لوگ ہیں، سبھی اپنی اپنی دھن میں مست ہیں۔ کوئی پرستش میں اور کوئی عیش و عشرت میں!

اور ان سب اجگروں کو خوراک دینا میرے ذمے ہے؟ میرا فرض ہے! میرے بہت سے

تعلقدار بھائی عیش کر رہے ہیں، یہ میں جانتا ہوں مگر وہ لوگ گھر بھونک کر تماشا دیکھتے ہیں!

قرض کا بار سر پر بڑھتا جا رہا ہے، روزانہ ڈگریاں ہو رہی ہیں، جس سے لیتے ہیں اسے دینا

نہیں جانتے، چاروں طرف بدنامی ہی بدنامی ہے۔ میں تو ایسی زندگی سے مر جانا بہتر سمجھتا

ہوں۔ معلوم نہیں کن کرموں کے پھل سے میرے آتما میں ذرا سی جان باقی رہ گئی ہے جو

مجھے دیس اور سماج کے بندھن میں باندھے ہوئے ہے۔ ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی۔ جیل

گیا اور لاکھوں روپے کی زیر باری اٹھائی اور ابھی تک اس کا خیا زہ بھگت رہا ہوں مجھے اس کا

پچھتاوا نہیں ہے، بالکل نہیں! مجھے فخر ہے۔ میں اس آدمی کو آدمی نہیں سمجھتا جو قوم اور ملک

کے بہبود کی کوشش نہ کرے اور قربانی نہ کرے۔ مجھے کیا اچھا لگتا ہے کہ بے جان کسانوں کا

خون چوسوں اور اپنے کنبے والوں کی نفس پرستیوں کے ذرائع مہیا کروں مگر کروں کیا؟ جس

انتظامی فضا میں میری پرورش اور بالیدگی ہوئی اس سے نفرت ہونے پر بھی اس کا موہ چھوڑ

نہیں سکتا اور اسی چکر میں رات دن پڑا رہتا ہوں کہ کسی طرح عزت آرو پائی رہے اور ضمیر

کا خون نہ ہونے پائے ایسا آدمی مس مالتی ہی کیا کسی مس کے پیچھے نہیں پڑ سکتا اور پڑے تو اس کا ستیا ناس کھجے ، ہاں ذرا سی تفریح کر لینا دوسری بات ہے ۔“

کھانا بھی جری فغص تھے ، میدان میں آگے بڑھنے والے ۔ دوبار جیل ہو آئے تھے ۔ کسی سے دینا نہ جانتے تھے ۔ کھڈر پہنتے تھے اور فرامیسی شراب پیتے تھے ۔ موقع پر بڑی بڑی تکلیفیں جھیل سکتے تھے جیل میں شراب چھوٹی تک نہیں تھی اور اے ، کلاس میں رہ کر ہی ، کلاس کی روٹیاں کھاتے رہے ، اگرچہ انھیں ہر طرح کا آرام مل سکتا تھا ۔ مگر میدان جنگ میں چلنے والا تھ بھی تو تیل کے بغیر نہیں چل سکتا ۔ ان کے لیے زندگی ذرا سی شوقی ذرا سی رنگینی لازمی تھی ۔ بولے ”آپ سنیا سی بن سکتے ہیں ۔ مگر میں تو نہیں بن سکتا ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو دنیا دار نہیں وہ لڑائی میں پورے حوصلے سے شریک نہیں ہو سکتا جو عورت سے محبت نہیں کر سکتا اس کی حب الوطنی پر میرا یقین نہیں ۔“

رائے صاحب مسکرائے ”آپ بھی پر آوازے کئے گئے ۔“

آوازے نہیں ٹھیک بات ہے ۔“

”شاید ہو ۔“

”آپ اپنے دل میں اتر کر دیکھیے تو پتہ چلے ۔“

”میں نے تو دیکھ لیا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہاں خواہ کتنی ہی برائیاں ہوں

مگر زہر کی ہوس نہیں ہے ۔“

”تب تو مجھے آپ پر رحم آتا ہے ۔ آپ جو اتنے مغموم اور متفکر ہیں اس کا واحد سبب آپ کی نفس کشی ہے میں تو یہ نامک کھیل کر ہی رہوں گا ۔ خواہ اس کا انجام رنج ہی کیوں نہ ہو ۔ وہ مجھ سے مذاق کرتی ہے اور دکھاتی ہے کہ مجھے تیری پروا نہیں ۔ مگر میں ہمت ہارنے والا انسان نہیں ہوں میں اب تک اس کا مزاج نہیں سمجھ سکا ۔ نشانہ کہاں ٹھیک بیٹھے گا اس کا تصفیہ نہیں کر سکا ۔ جس دن یہ کنبی ہاتھ آگئی بس فتح ہے ۔“

”لیکن وہ کنبی آپ کو شاید ہی ملے ۔ شاید مہتا آپ سے بازی مار لے جائیں ۔“

ایک ہرن کئی ہرنوں کے ساتھ چر رہا تھا ، بڑی سینکوں والا اور بالکل سیاہ ۔ رائے صاحب نے نشانہ لگایا ۔ کھانا نے روکا ”کیوں ہتھیا کرتے ہو یار ! بے چارہ چر رہا ہے ، چر نے دو ۔ دھوپ تیز ہو گئی ہے ۔ آئیے کہیں بیٹھ جائیں ۔ آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں ۔“

رائے صاحب نے بندوق چلائی مگر ہرن بھاگ گیا۔ بولے ”ایک شکار ملا بھی تو نشانہ خالی گیا۔“

”ایک ہتیا سے بچے۔“

”ہاں کہیے کیا بات کرنے کو کہہ رہے تھے۔“

”آپ کے علاقے میں اکٹھ ہوتی ہے؟“

”بڑی کثرت سے۔“

”تو پھر کیوں نہ ہمارے شکر بل میں شریک ہو جائیے۔ جسے دھڑا دھڑا بک رہے

ہیں۔ آپ زیادہ نہیں تو ایک ہزار جسے خرید لیں۔“

”غضب کیا، میں اتنے روپے کہاں سے لاؤں گا؟“

”اتنے نامی گرامی تعلقدار اور آپ کو روپیوں کی کمی! کل پچاس ہزار ہی تو ہوتے ہیں

اور اس میں بھی تو ابھی پچیس فی صدی دینا ہے۔“

”نہیں بھائی صاحب، اس وقت میرے پاس بالکل روپے نہیں ہیں۔“

”روپے جتنے چاہیں مجھ سے لے لیں۔ بینک آپ کا ہے۔ ہاں ابھی آپ نے اپنی

زندگی کا بیمہ نہ کرایا ہوگا۔ میری کمپنی کی ایک بڑھیا پالیسی لے لیجیے سو دو سو ماہوار بڑی آسانی

سے دے سکتے ہیں اور بعد کو ایک سیکائی رقم مل جائے گی چار پانچ ہزار۔ لڑکوں کے لیے اس

سے بہتر بندوبست آپ نہیں کر سکتے۔ ہمارے قواعد دیکھیے۔ ہم باہمی امداد کے اصول پر پورا

عمل کرتے ہیں۔ دفتر اور عملے کے خرچ کے سوا نفع کی ایک پائی بھی کسی کی جیب میں نہیں

جاتی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ اس طریقے پر کمپنی کیسے چل رہی ہے اور میری صلاح سے تھوڑا سا

نئے کام شروع کر دیجیے۔ یہ جو آج صد ہا کر دڑپتی بنے ہوئے ہیں سب اسی کی بدولت

بنے ہوئے ہیں۔ روٹی، شکر، گیہوں، برکسی جنس کا سفا کیجیے منٹوں میں لاکھوں کا نپھارا ہوتا

ہے۔ کام ذرا بے ٹکا ہے۔ بہت سے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں مگر وہی جو اناڑی ہیں۔ آپ

جیسے تجربے کا تعلیم یافتہ اور دور اندیش لوگوں کے لیے تو اس سے بہتر نفع کا کام ہی نہیں

ہے۔ بازار کا اتار چڑھاؤ کوئی ناگہانی واقعہ نہیں۔ یہ بھی ایک سائنس ہے۔ ایک بار اسے غور

سے دیکھ لیجیے کہ کیا مجال کے دھوکہ ہو جائے۔“

رائے صاحب کو کمپنیوں پر اعتبار نہ تھا۔ دو ایک بار اس کا انھیں تلخ تجربہ بھی ہو چکا

تھا۔ لیکن مسٹر کھنا کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے ترقی کرتے ہوئے دیکھا تھا اور ان کے کمال فن کے قائل ہو گئے تھے۔ ابھی دس سال پہلے جو شخص بینک میں کلرک تھا وہ صرف اپنی محنت اور ذہانت سے شہر میں پوجا جاتا ہے۔ اس کی صلاح کو یوں ہی ٹالا نہ جاسکتا تھا۔ اس بارے میں اگر کھنا ان کے رہنما بن جائیں تو انھیں بہت کچھ کامیابی ہو سکتی ہے۔ ایسا موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیا جائے۔ طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ دفعتاً ایک دیہاتی ایک بڑی ٹوکری میں کچھ جڑیں، پتیاں اور پھول لیے جاتا ہوا دکھائی دیا؟“

کھنا نے پوچھا ”ارے کیا بیچتا ہے؟“

دیہاتی ڈر گیا کہ کہیں بیگار میں نہ پکڑ جائے بولا ”کچھ تو نہیں مالک، یہی گھاس

پات ہے۔“

”کیا کرے گا ان کا؟“

”پتوں کا مالک۔ جڑی بوٹی ہے۔“

”کون کون سی جڑی بوٹی ہے؟“

دیہاتی نے اپنا دواخانہ کھول کر دکھایا۔ معمولی چیزیں تھیں جو جنگل کے آدمی اکھاڑے جاتے ہیں اور شہری عطاردوں کے ہاتھ دوچار روپے میں بیچ آتے ہیں جیسے کو، کنگھی، شہد سی، مکروندہ، تخم دھتورہ، مدار کے پھول، کرنبے گھونگنی وغیرہ ہر چیز دکھاتا تھا اور رٹے ہوئے لفظوں میں ان کے اوصاف بھی بتلاتا جاتا تھا۔ ”یہ مکوے ہے سرکار! تاپ ہو؟ مندا گنی ہو؟ تلی ہو، دھڑکن ہو، ہول ہو، کھانسی ہو ایک خوراک میں آرام ہو جاتا ہے۔ یہ دھتورے کے بیج ہیں مالک! گھٹیا ہو، بائی ہو.....“ کھنا نے دام پوچھے۔ اس نے آٹھ آنے کہے۔ کھنا نے ایک روپیہ پھینک دیا اور اسے پڑاؤ پر رکھ آنے کو کہا۔ غریب نے منہ مانگے دام ہی نہیں پائے بلکہ دمنے پائے، دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

رائے صاحب نے پوچھا ”آپ یہ گھاس پات لے کر کیا کرے گے؟“

کھنا نے مسکرا کر کہا ”ایران کی اشرفیاں بناؤں گا۔ میں کیسیا مگر ہوں۔ یہ آپ کو

شاید نہیں معلوم؟“

”تو یار وہ منتر ہمیں بھی سکھا دو۔“

”ہاں ہاں! شوق سے میری شاگردی کیجیے۔ پہلے سوا سیر لڈو لاکر چڑھائیے، تب

بتاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ مجھے طرح طرح کے آدمیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو جڑی بوٹیوں پر جان دیتے ہیں، بس انھیں اتنا معلوم ہو جائے کہ یہ کسی فقیر کی دی ہوئی جڑی بوٹی ہے تو پھر آپ کی خوشامد کریں گے، ناک رگڑیں گے اور آپ وہ چیز انھیں دے دیں تو سدا کے لیے آپ کے احسان مند بن جائیں گے ایک روپے میں اگر دس بیس احمقوں پر احسان کا منہ کسا جاسکا تو کیا برا ہے؟ ذرا سے احسان سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں۔“

رائے صاحب نے شوق بھرے تعجب سے پوچھا ”مگر ان بوٹیوں کے گمن آپ کو یاد کیسے رہتے ہیں؟“

کھانا نے قہقہہ لگایا۔ آپ بھی رائے صاحب بڑے مزے کی بات کرتے ہیں جس بوٹی میں جو گمن چاہیے بتا دیجیے، یہ آپ کی لیاقت پر منحصر ہے۔ صحت تو روپے میں آٹھ آنے اعتقاد سے ہوتی ہے۔ آج جوان بڑے بڑے افراد کو دیکھتے ہیں اور ان لمبی دم والے عالموں کو اور ان رئیسوں کو، یہ سب کورانہ اعتقاد والے ہوتے ہیں۔ میں تو علم نباتات کے پروفیسروں کو جانتا ہوں جو ککروندے کے نام سے بھی واقف نہیں۔ ان عالموں کا مزاق تو ہمارے سوامی جی خوب اڑاتے ہیں۔ آپ کو تو کبھی ان کے درشن نہ ہوئے ہوں گے۔ اب کے آئیں گے تو ان سے ملاؤں گا۔ جب سے میرے باغیچے میں ٹھہرے ہیں، رات دن لوگوں کو تانتا لگا رہتا ہے۔ ہوس تو انھیں چھو بھی نہیں گئی۔ صرف ایک بار دودھ پیتے ہیں۔ ایسا عالم مہاتما میں نے نہیں دیکھا۔ نہ جانے کتنے برسوں تک ہمالیہ پر تپسیا کرتے رہے۔ پورے پہنچے ہوئے سادھو ہیں۔ آپ ان کے مرید ضرور ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ساری پریشانیاں ہوا ہو جائیں گی۔ آپ کو دیکھتے ہی وہ آپ کا ماضی، حال، مستقبل سب کہہ سنائیں گے ایسے ہنس مکھ ہیں کہ دیکھتے ہی دل شگفتہ ہو جاتا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ خود اتنے بڑے مہاتما ہیں، مگر سنیاں تیاگ، مندر اور منہ اور پنٹھ ان سب کو ڈھونگ کہتے ہیں کہ رواجی بندشوں کو توڑو اور انسان بنو۔ دیوتا بننے کا خیال چھوڑ دو، دیوتا بن کر تم انسان نہ رہ جاؤ گے۔“

رائے صاحب کے دل میں شبہ ہوا۔ مہاتماؤں پر انھیں بھی پورا اعتقاد تھا جو ذی اقتدار لوگوں میں عموماً ہوتا ہے۔ دکی دل کو دھیان میں جو تسکین ملتی ہے اس کے لیے وہ بھی للچاتے

رہتے ہیں۔ جب مالی مشکلات کے سبب مایوس ہو جاتے ہیں تو دل میں آتا کہ دنیا سے منہ موڑ کر گویہ تہائی میں جا بیٹھیں اور نجات کی سبیل کریں۔ دنیاوی بندشوں کو وہ بھی عوام کی طرح روحانی ترقی کی راہ کا روڑا سمجھتے تھے اور ان سے دور ہو جانا ہی ان کی زندگی کا بھی معیار تھا۔ مگر سنیاں اور تیاگ کے علاوہ بندشوں کے توڑنے کی اور کیا تدبیر ہے؟

بولے ”جب وہ سنیاں کو ڈھونگ کہتے ہیں تو خود کیوں سنیاں لیا ہے۔؟“

”انہوں نے سنیاں کب لیا ہے صاحب؟ وہ تو کہتے ہیں کہ انسان کو اخیر تک کام۔

کرتے رہنا چاہیے۔ آزاد خیالی ان کی نصائح کی جان ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آزاد خیالی کا مطلب کیا ہے۔؟“

”سمجھ میں تو میری بھی کچھ نہیں آیا۔ اب کے آپ آئیے تو ان سے گفتگو ہو۔ وہ

پریم کو زندگی کی سچائی کہتے ہیں۔ اور اس کی ایسی عمدہ صراحت کرتے ہیں کہ طبیعت خوش

ہو جاتی ہے۔“

”کس مالیتی کو ان سے ملایا نہیں۔“

”آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔ مالیتی کو بھلا ان سے کیا ملاتا؟.....“

بات ختم نہ ہوئی تھی کہ سامنے کی جھاڑی میں سرسراہٹ سن کر وہ چونک پڑے اور جان

بچانے کی غرض سے رائے صاحب کے پیچھے آگئے۔ جھاڑی سے ایک تیندوا نکلا اور آہستہ

آہستہ سامنے کی طرف چلا۔

رائے صاحب نے بندوق اٹھائی اور نشانہ لگانا چاہتے تھے کہ کھانے کہا ”یہ کیا کرتے

ہو آپ؟ خواہ خواہ اسے چھپھر رہے ہیں۔ کہیں لوٹ پڑے تو؟“

”لوٹ کیا پڑے گا؟ وہیں ڈھیر ہو جائے گا۔“

”تو مجھے اس نیلے پر چڑھ جانے دیجیے۔ میں شکار کا ایسا شائق نہیں۔“

”جب کیا شکار کھیلنے چلے تھے؟“

”شامت اور کیا؟“

رائے صاحب نے بندوق نیچی کر لی۔

”بڑا بڑھیا شکار نکل گیا۔ ایسے موقعے کب ملتے ہیں؟“

”میں تو اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا، خطرناک مقام ہے۔“

”ایک آدھ شکار تو مار لینے دیجیے۔ خالی ہاتھ لوٹے شرم آتی ہے۔“
 ”آپ مجھے مہربانی کر کے موٹر تک پہنچا دیجیے، پھر چاہے آپ تندوے کا شکار کریں یا
 چیتے کا۔“

”جج آپ بڑے ڈر پوک ہیں مسٹر کھنا!“
 ”مفت اپنی جان خطرے میں ڈالنا بہادری نہیں۔“
 ”اچھا تو آپ خوشی سے واپس جاسکتے ہیں۔“
 ”تہا؟“

”راستہ بالکل صاف ہے۔“

”جی نہیں، آپ کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔“

رائے صاحب نے بہت سمجھایا مگر کھنا نے ایک نہ مانی۔ ڈر کے مارے ان کا چہرہ زرد
 پڑ گیا تھا۔ اس وقت اگر جھاڑی سے ایک گھری بھی نکل آتی تو وہ چیخ مار کر گر پڑتے۔ بوٹی
 بوٹی کانپ رہی تھی۔ پسینہ سے تر ہتر ہو گئے تھے۔ رائے صاحب کو مجبور ہو کر ان کے ساتھ
 لوٹنا پڑا۔ جب دونوں بڑی دور نکل آئے تو کھنا کے ہوش ٹھکانے ہوئے بولے ”خطرے سے
 نہیں ڈرتا لیکن خطرہ مول لینا حماقت ہے۔“

”اجی جاؤ بھی، ذرا سائیندوا دیکھ لیا تو جان نکل گئی۔“

”میں شکار کھیلنا اس وقت کا رواج سمجھتا ہوں جب انسان حیوان تھا۔ اب اس وقت

سے تہذیب بہت آگے بڑھ گئی ہے۔“

”میں مس مالتی سے آپ کی قلعی کھولوں گا۔“

”میں انہما کا ماننا شرم کی بات نہیں سمجھتا۔“

”اچھا تو یہ آپ کا انہما والا مسئلہ تھا؟ شاباش!“

کھنا نے غرور سے کہا ”جی ہاں، یہ میرا وہی مسئلہ تھا۔ آپ بدھ اور شکر کے نام پر فخر
 کرتے ہیں اور بے زبان جانوروں کا خون کرتے ہیں۔ شرم آپ کو آنی چاہیے نہ کہ مجھے۔“
 ”کچھ دور تک دونوں پھر چپ چاپ چلتے رہے۔ کھنا بولے ”تو آپ کب تک آئیں
 گے؟ میں چاہتا ہوں کہ آپ پالیسی کا فارم آج ہی بھردیں اور شکر میل کے حصوں کا بھی۔
 میرے پاس دونوں فارم موجود ہیں۔“

رائے صاحب نے مشکرا نہ لہجے میں کہا ”ذرا سوچ لینے دیجیے۔“
 ”اس میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔“

تیسری ٹولی خورشید اور مٹھا کی تھی۔ خورشید کے لیے ماضی اور مستقبل سادہ کاغذ جیسا تھا۔ وہ حال میں رہتے تھے۔ نہ ماضی کا پچھتاوا تھا نہ مستقبل کی فکر۔ جو کچھ آگے آجاتا تھا اسی میں دل و جان سے لگ جاتے تھے۔ دوستوں کی جماعت میں وہ مذاق کے پتلے تھے۔ کونسل میں ان سے زیادہ حوصلہ مند ممبر کوئی نہ تھا۔ جس سوال کے پیچھے پڑ جاتے فئسٹروں کو رولا دیتے۔ کسی کے ساتھ رو رعایت کرنا نہ جانتے تھے۔ بیچ بیچ میں ہنسی بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کے لیے آج زندگی کا دن تھا، کل کا پتہ نہیں۔ غصہ در بھی ایسے کہ خم ٹھونک کر سامنے آجاتے تھے۔ اکسار کے آگے سجدہ کرتے تھے، جہاں کسی نے شان دکھائی اور یہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے۔ نہ اپنا لینا یاد رکھتے تھے نہ دوسروں کا دینا۔ شراب و شاعری کا شوق تھا۔ عورت صرف تفریح کی چیز تھی۔ بہت دن ہوئے دل کا دیوالہ نکال چکے تھے۔

مٹھا صاحب بڑے کاٹ بیچ کے آدمی تھے۔ سودا ہانے میں، معاملہ سلجھانے میں، اڑنکا لگانے میں، بالو سے تیل نکالنے میں، گلا دبانے میں اور دم جھاڑ کر نکل جانے میں بڑے ہوشیار تھے۔ کیسے تو ریت میں ناؤں چلا دیں، پتھر پر دوب اکادیں، تعلقہ اوروں کو مہاجنوں سے قرض دلانا، نئی کمپنیاں کھولنا، چنآؤ کے وقت امیدوار کھڑا کرنا، یہی سب ان کا کام تھا۔ خاص کر چنآؤ کے وقت ان کی قسمت چمک اٹھتی تھی۔ کسی مالدار امیدوار کو کھڑا کرتے دل و جان سے اس کا کام کرتے اور دس بیس ہزار بنا لیتے۔ جب کانگریس کا زور تھا تو کانگریسی امیدوار کے مددگار تھے جب فرقہ وارانہ جماعت کا زور ہوا تو ہندو سبھا کی طرف سے کام کرنے لگے، مگر اس الٹ پھیر کو ٹھیک ثابت کرنے کے لیے، ان کے پاس ایسے دلائل تھے جن کی تردید نہ ہو سکتی تھی۔ شہر کے سبھی رؤسا، سبھی امراء اور سبھی حکام سے ان کا یارا نہ تھا۔ دل میں چاہے لوگ ان کی طریقے پسند نہ کریں مگر وہ ایسے منکسر مزاج تھے کہ کوئی ان کے منہ پر نہ کہہ سکتا تھا۔

مرزا خورشید نے رومال سے پسینہ پوچھ کر کہا ”آج تو شکار کھیلنے لائق دن نہیں ہے۔ آج تو کوئی مشاعرہ ہونا چاہیے تھا۔“

دکیل صاحب نے تائید کی ”جی ہاں، وہیں باغ میں، بڑی بہار رہتی۔“

ذرا دیر بعد ٹٹھانے معاملہ کی بات شروع کی ”اب کے چٹاؤ میں بڑے بڑے گل کھلیں گے۔ آپ کے لیے بھی مشکل ہے۔“

مرزا بے پروائی سے بولے ”اب کے میں کھڑا ہی نہ ہوں گا۔“

ٹٹھانے پوچھا ”کیوں؟“

”مفت کی ہائے ہائے میں کون پڑے؟ فائدہ ہی کیا؟ مجھے اب اس ڈیموکریسی پر اعتقاد نہیں رہا۔ ذرا سا کام اور مہینوں کی بحث! ہاں عوام کی آنکھوں میں دھول جمونکٹنے کے لیے اچھی بحث ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ ایک گورنر رہے۔ خواہ وہ ہندوستانی ہو یا انگریز، اس سے بحث نہیں۔ ایک انجن جس گاڑی کو بڑے مزے سے ہزاروں میل کھینچ لے جاسکتا ہے اسے دس ہزار آدمی بھی مل کر اتنی تیزی سے نہیں کھینچ سکتے۔ میں تو سارا تماشا دیکھ کر کونسل سے بیزار ہو گیا ہوں۔ میرا بس چلے تو کونسلوں میں آگ لگا دوں۔ جسے ہم ڈیموکریسی کہتے ہیں وہ اصل میں بڑے بڑے تاجروں اور زمینداروں کا راج ہے، اور کچھ نہیں۔ چٹاؤ میں وہی بازی لے جاتا ہے جس کے پاس روپیہ ہے۔ روپے کے زور سے اسے سبھی آسانیاں مل جاتی ہیں۔ بڑے بڑے پنڈت، بڑے بڑے مولوی، بڑے بڑے لکھنے اور بولنے والے، جو قلم اور زبان سے پبلک کو جدرہ چاہیں موڑ دیں، سبھی سونے کے دیوتا کے پیروں پر ناک رگڑتے ہیں۔ میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اب چٹاؤ کے پاس نہ جاؤں گا۔ میرا پروپیگنڈا اب ڈیموکریسی کے خلاف ہوگا۔“

مرزا صاحب نے قرآن کی آیتوں سے ثابت کیا کہ قدیم زمانہ کے بادشاہوں کا معیار کتنا بلند تھا۔ آج تو ہم ان کی طرف تاک بھی نہیں سکتے۔ ہماری آنکھوں میں چکا چوند آجائے گی۔ بادشاہ کو خزانے کی ایک کوڑی بھی نجی خرچ میں لانے کا اختیار نہ تھا۔ وہ کتابیں نقل کر کے، کپڑے سی کر، لڑکوں کو پڑھا کر اپنا گذر کرتا تھا۔ مرزا نے ایسے بادشاہوں کی ایک طویل فہرست گنادی۔ کہاں تو وہ رعایا پرورد بادشاہ اور کہاں آج کل کے فسر لوگ جنھیں پانچ، چھ، سات، آٹھ ہزار ماہوار ملنا چاہیے۔ یہ لوٹ ہے یا ڈیموکریسی؟

ہرنوں کا جھنڈ چرتا ہوا نظر آیا۔ مرزا کے چہرے پر شکار کا جوش چمک اٹھا، بندوق اٹھائی اور نشانہ مارا۔ ایک کالا ہرن گر پڑا ”وہ مارا! اس مجنونانہ آواز کے ساتھ مرزا بھی بے تحاشہ دوڑ پرے۔ بالکل بچوں کی طرح اچھلتے کودتے اور تالیاں بجاتے ہوئے۔“

پاس ہی ایک درخت پر ایک شخص لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ وہ بھی فوراً درخت سے اتر کر مرزا کے ساتھ دوڑا۔ ہرن کی گردن میں گولی لگی تھی۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ اور اس کی آنکھیں پتھر اگنی تھیں۔ لکڑہارے نے ہرن کو منموم دکھا ہوں سے دیکھ کر کہا ”اچھا پٹھا تھا، من بھر سے کم نہ ہوگا۔ حکم ہو تو میں اٹھا کر پیچا دوں۔“

مرزا کچھ بولے نہیں۔ وہ ہرن کی درد بھری آنکھوں کو دیکھ رہے تھے۔ ابھی ایک منٹ قبل اس میں زندگی تھی۔ ذرا سا پتا بھی کھڑکتا تو کان کھڑے کر کے چوڑیاں بھرتا ہوا نکل بھاگتا۔ اپنے ساتھیوں اور بال بچوں کے ساتھ خدا کی اگائی ہوئی گھاس چر رہا تھا مگر اب بے بس پڑا ہے۔ اس کی کھال ادھیڑ لو، اس کی ہونیاں کر ڈالو، اسے خبر بھی نہ ہوگی۔ اس کی تفریحی زندگی میں جو کشش تھی جو لطف تھا، وہ کیا اس بے جان لاش میں ہے؟ کتنا سڈول جسم تھا، کتنی پیاری آنکھیں، کتنا دلکش جلوہ! اس کی قلائیں دل میں خوشی کی لہریں پیدا کر دیتی تھیں، اس کی چوڑیوں کے ساتھ ہمارا دل بھی چوڑیاں بھرنے لگتا تھا۔ اس کی جانداري اپنے ساتھ ہر جگہ زندگی سی بکھراتی چلی جاتی تھی۔.....، جس طرح پھول اپنی خوشبو، پھیلاتا ہے۔ لیکن اب اسے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔

لکڑہارے نے پوچھا ”کہاں پہنچانا ہوگا مالک؟ مجھے دو چار پیسے دے دینا۔“
مرزا صاحب جیسے دھیان سے چونک پڑے۔ بولے اچھا اٹھالے۔ کہاں چلے گا؟“

”جہاں حکم ہو مالک۔“

”نہیں جہاں تیری مرضی ہو وہاں لے جا میں تجھے دیتا ہوں۔“
لکڑہارے نے مرزا کی طرف تعجب سے دیکھا۔ کانوں پر یقین نہ آیا بولا ”ارے نہیں مالک، بھور نے سکار کیا ہے سو ہم کیسے کھالیں؟“
”نہیں نہیں، میں خوشی سے کہتا ہوں کہ تم اسے لے جاؤ۔ تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”کوئی آدھا کوس ہوگا مالک۔“

”تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ دیکھوں گا کہ تمہارے بال بچے کیسے خوش ہوتے ہیں؟“

”اسے تو میں نہ لے جاؤں گا سرکار! آپ اتنی دور سے آئے اس کمری دھوپ میں شکار کیا، میں کیسے اٹھا لے جاؤں؟“

”اٹھا، اٹھا، دیر نہ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ تو بھلا آدمی ہے۔“

لکڑہارے نے ڈرتے ڈرتے اور رہ رہ کر مرزا کے چہرے کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہ کہیں بگڑ نہ جائیں ہرن کو اٹھایا۔ یکا یک اس نے ہرن کو چھوڑ دیا اور کھڑا ہو کر بولا ”میں سمجھ گیا مالک، ہجور نے اس کی حلائی نہیں کی۔“

”مرزا جی نے ہنس کر کہا ”بس، بس، تو نے خوب سمجھا۔ اب اٹھا لے اور گھر چل۔“

مرزا صاحب مذہب کے اتنے پابند نہ تھے۔ انھوں نے دس سال سے نماز نہ پڑھی تھی۔ دو مہینے میں ایک دن پورا روزہ رکھ ڈالتے تھے۔ بالکل بلا کچھ کھائے پیے مگر لکڑہارے کو اس خیال سے جو تسلی ہوئی تھی کہ ہرن اب لوگوں کے کھانے کی چیز نہیں رہ گیا، اسے پھیکا نہ کرنا چاہتے تھے۔ لکڑہارے نے ہلکے دل سے ہرن کو گردن پر رکھ لیا اور گھر کی طرف چلا۔ ٹنٹھا ابھی تک بے پردہ اسی سے وہیں درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دھوپ میں ہرن کے پاس جانے کی تکلیف کیوں گوارا کرتے؟ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ کہ معاملہ کیا ہے؟ لیکن جب لکڑہارے کو دوسری طرف جاتے دیکھا تو آکر مرزا سے بولے ”آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں حضرت؟ کیا راستہ بھول گئے۔“

مرزا نے خطا دار کی طرح مسکرا کر کہا ”میں نے شکار اس غریب آدمی کو دے دیا۔ اب ذرا اس کے گھر جا رہا ہوں۔ آپ بھی آئیے نا۔“

ٹنٹھا نے مرزا کو تعجب سے دیکھا اور بولے ”آپ اپنے ہوش میں ہیں یا نہیں؟“

”کہہ نہیں سکتا، مجھے خود نہیں معلوم۔“

”شکار اسے کیوں دے دیا؟“

”اس لیے کہ اسے پا کر اس کو جتنی خوشی ہوگی اتنی مجھے یا آپ کو نہ ہوگی۔“

ٹنٹھا کھیا کر بولے ”جائیے! سوچا تھا کہ خوب کہاں اڑائیں گے سو آپ نے سارا مزا کر کر دیا۔ خیر رائے صاحب اور مہتا کچھ نہ کچھ لائیں گے ہی، کوئی غم نہیں۔ میں اس چٹاؤ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نہیں کھڑے ہونا چاہتے تو نہ سہی۔ آپ کی جیسی مرضی۔ مگر آپ کو اس میں کیا تامل ہے کہ جو لوگ کھڑے ہو رہے ہیں ان سے اس

کی اچھی قیمت وصول کی جائے۔ میں آپ سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ کسی پر بھید نہ کھلنے دیں کہ آپ کھڑے نہیں ہو رہے ہیں۔ روسا کے دوٹ تو سولہوں آنے ان کی طرف ہیں ، حکام بھی ان کے مددگار ہیں پھر بھی پبلک پر آپ کا جو اثر ہے اس سے وہ گھبرارہے ہیں۔ آپ چاہیں تو آپ کو ان سے دس بیس ہزار روپے محض یہ ظاہر کر دینے کے لیے مل سکتے ہیں کہ آپ ان کی خاطر بیٹھے جاتے ہیں..... نہیں مجھے عرض کر لینے دیجیے۔ اس معاملہ میں آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے۔ آپ بے فکر بیٹھے رہیے میں آپ کی طرف سے ایک مٹی فنو نکال دوں گا، اور اسی شام کو آپ مجھ سے دس ہزار نقد وصول کر لیجیے۔“

مرزا صاحب نے ان کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا ”میں روپے پر اور آپ پر لعنت بھیجتا ہوں۔“

مسٹر نکخانے کچھ بھی برا نہیں مانا ، ماتھے پر ٹھکن تک نہ آنے دی۔
”مجھ پر آپ جتنی لعنتیں چاہیں بھیجیں مگر روپے پر لعنت بھیج کر آپ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔“

”میں ایسے روپے کو حرام سمجھتا ہوں۔“
”آپ شریعت کے اتنے پابند تو نہیں ہیں؟“
”لوٹ کی کمائی کو حرام سمجھنے کے لیے شرع کے پابند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“
”تو اس معاملے میں آپ اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتے؟“
”جی نہیں۔“

”اچھی بات ہے، اسے جانے دیجیے۔ کسی بیرہ کمپنی کے ڈائریکٹر ہو جانے میں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟ آپ کو کمپنی کا ایک حصہ بھی نہ خریدنا پڑے گا۔ آپ صرف اپنا نام دے دیجیے گا۔“

”جی نہیں، مجھے یہ بھی منظور نہیں ہے۔ میں کئی کمپنیوں کا ڈائریکٹر کئی کانفیج ایجنٹ ، کئی کاچیرمین تھا۔ دولت میرے پاؤں چومتی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ دولت سے آرام و تکلیف کے کتنے سامان جمع کیے جاسکتے ہیں۔ مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ دولت انسان کو کتنا خود غرض بنا دیتی ہے۔ کتنا عیش پسند ، کتنا مکار اور کتنا بے غیرت!“

دکیل صاحب کو پھر کوئی تجویز پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مرزا صاحب کے دانشمند

اور با اثر ہونے میں انہیں جو یقین تھا وہ بہت کم ہو گیا، ان کے لیے دولت ہی سب کچھ تھی اور ایسے شخص سے جو دولت کو ٹھکراتا ہو ان کا کوئی میل نہ ہو سکتا تھا۔

لکڑہارا ہرن کو کندھے پر رکھے لپکا چلا جا رہا تھا۔ مرزا نے بھی قدم بڑھایا۔ مگر مونے جسم والے لمحہ صاحب پیچھے رہ گئے انھوں نے پکارا ”ذرا سنیے مرزا جی۔ آپ تو بھاگے جا رہے ہیں۔“

مرزا نے بلا رکے جواب دیا ”وہ غریب بوجھ لیے کتنی تیزی سے چلا جا رہا ہے ہم کیا اپنا بدن لے کر اس کے برابر نہیں چل سکتے؟“

لکڑہارے نے ہرن کو ایک کھنڈ پر اتار کر رکھ دیا اور دم لینے لگا۔

مرزا صاحب نے آکر پوچھا ”تھک گئے کیوں؟“

لکڑہارے نے شرماتے ہوئے کہا ”بہت بھاری ہے سرکار۔“

”تو لاؤ کچھ دور میں لے چلوں۔“

لکڑہارا ہنسا۔ مرزا ذیل ڈول میں اس سے کہیں زیادہ اونچے اور مونے تازے تھے،

پھر بھی وہ دہلا پٹلا آدمی ان کی اس بات پر ہنسا۔ مرزا پر جیسے چابک پڑ گیا۔

”تم بنے کیوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اسے نہیں اٹھا سکتا؟“

لکڑہارے نے گویا معافی مانگی ”سرکار، آپ لوگ بڑے آدمی ہو بوجھ اٹھانا تو ہم جیسے

مجوروں کا کام ہے۔“

”میں تمہارا دگمنا جو ہوں۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے مالک؟“

مرزا کی مردانگی اپنی زیادہ توہین نہ سہہ سکی۔ انھوں نے بڑھ کر ہرن کو گردن پر اٹھالیا

اور چل پڑے مگر مشکل سے پچاس قدم چلے ہوں گے کہ گردن پھٹنے لگی، پیر کاٹنے لگے اور

آنکھوں میں تتلیاں اڑنے لگیں۔ کلیجہ مضبوط کیا اور کوئی بیس قدم پھر چلے کبخت کہاں رہ گیا؟

جیسے اس لاش میں سیسہ بھر دیا گیا ہو۔ ذرا مسٹرٹھا کی گردن پر رکھ دوں تو مرزا آجائے۔ لیکن

بوجھ اتاریں کیسے؟ دونوں اپنے دل میں کہیں گے کہ بڑی جوانمردی دکھانے چلے تھے، پچاس

ہی قدم میں چیں بول گئے۔

لکڑہارے نے چنگلی لی ”کہو مالک کیسے رنگ ڈھنگ ہیں؟ بہت ہلکا ہے نا؟“

مرزا کو بوجھ کچھ ہلکا معلوم ہونے لگا، بولے ”اتنی دور تو لے ہی جاؤں گا جتنی دور تم لائے ہو۔“

کئی دن گردن دکھے گی مالک۔“

تم کیا سمجھتے ہو کہ میں یوں پھولا ہوا ہوں؟“

”نہیں مالک، اب تو ایسا نہیں سمجھتا، مگر آپ حیران نہ ہوں۔ وہ چٹان ہے اس پر اتار دیجیے۔“

”میں اسے ابھی اتنی ہی دور اور لے جا سکتا ہوں۔“

”مگر یہ اچھا نہیں لگتا کہ میں یوں ہی چلوں اور آپ لدے رہیں۔“

مرزا صاحب نے چٹان پر ہرن کو اتار کر رکھ دیا۔ وکیل صاحب بھی آہنچے۔ مرزا نے دانہ پھینکا۔ اب تو آپ کو بھی کچھ دور لے چلنا پڑے گا جناب!“

وکیل صاحب کی نگاہوں میں مرزا صاحب کی کوئی اہمیت نہ تھی بولے ”معاف کیجیے، مجھے اپنی پہلوانی کا دعویٰ نہیں ہے۔“

”اجی رہنے بھی دیجیے۔“

”آپ اگر اسے سو قدم لے چلیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ میرے سامنے جو تجویز رکھیں گے اسے منظور کر لوں گا۔“

”میں ان چکموں میں نہیں آتا۔“

”میں چکمہ نہیں دیتا ہوں واللہ! آپ جس حلقے سے کہیں گے کھڑا ہو جاؤں گا اور جب حکم دیں گے بیٹھ جاؤں گا۔ جس کہنی کا ڈاکٹر، ممبر، گماشتہ، کنویر جو کچھ کہیے گا بن جاؤں گا۔ بس سو قدم لے چلیے۔ میری تو ایسے ہی دوستوں سے نہجی ہے جو موقع پڑنے پر سب کچھ کر سکتے ہوں۔“

ٹٹھا کا جی چلبلا اٹھا۔ مرزا اپنے قول کے پکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہ تھا۔ ہرن کیا ایسا بہت بھاری ہوگا۔ آخر مرزا اتنی دور لے ہی تو آئے۔ بہت زیادہ تھکے تو نہیں معلوم ہوتے۔ اگر انکار کرتے ہیں تو سنہرا موقع ہاتھ سے جاتا ہے، آخر ایسا کون پہاڑ ہے؟ بہت ہوگا چار پانچ ہنسیری ہوگا دو چار دن گردن ہی تو دکھے گی۔ جیب میں روپے ہوں تو تھوڑی سی بیماری سکھ کی چیز ہے۔

”سو قدم کی رہی۔“

”ہاں سو قدم، میں گنتا چلوں گا۔“

”دیکھیے نکل نہ جائیے گا۔“

”نکل جانے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔“

ٹٹھا نے جوتے کا فیتہ پھر سے باندھا، کوٹ اتار کر ککڑہارے کو دیا، پتلون اوپر چڑھایا، رومال سے منہ پونچھا اور اس طرح ہرن کو دیکھا جیسے اوکھلی میں سر ڈالنے جا رہے ہوں۔ پھر ہرن کو اٹھا کر گردن پر رکھنے کی کوشش کی، دو تین بار زور لگانے پر لاش گردن پر تو آگئی مگر گردن نہ اٹھ سکی۔ کمر جھک گئی، ہانپ اٹھے اور لاش زمین پر پکٹنے ہی والے تھے کہ مرزا نے انھیں سہارا دے کر آگے بڑھایا۔

ٹٹھا نے ایک قدم اس طرح اٹھایا جیسے دلدل میں چل رہے ہوں۔ مرزا نے بڑھاوا دیا ”شاباش میرے شیر! واہ، واہ۔“

ٹٹھا نے ایک قدم اور رکھا۔ معلوم ہوا، گردن ٹوٹی جاتی ہے۔

”مار لیا میدان! شاباش! جیتا رہ پٹھے!“

”بس ایک بار اور زور مارو دوست! سو قدم کی شرط غلط، پچاس ہی قدم رہی!“

وکیل صاحب کا برا حال تھا وہ بے جان ہرن شیر کی طرح انھیں دلوچے ہوئے ان کے دل کا خون پی رہا تھا، ساری طاقت جواب دے چکی تھی، صرف لالچ کسی اہنی شہتیر کی طرح چھت کو سنبھالے ہوئے تھا۔ ایک سے پچیس ہزار تک گونی تھی۔ مگر بالآخر وہ شہتیر بھی جواب دے گیا، لالچ کی کمر ٹوٹ گئی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا سر پر چکر آیا اور وہ شکار گردن پر لیے ہوئے پتھر ملی زمین پر گر پڑے۔

مرزا نے فوراً اٹھایا اور اپنے رومال سے ہوا کرتے ہوئے ان کی پیٹھ ٹھوگی۔

”زور تو یار تم نے خوب مارا مگر قسمت ہی کھوٹی ہے۔“

ٹٹھا نے ہانپتے ہوئے ایک لمبا سانس کھینچ کر کہا، ”آپ نے آج میری جان ہی لے لی تھی۔ دامن سے کم نہ ہوگا سر!“

مرزا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”لیکن بھائی جان! میں بھی تو اتنی دور اٹھا کر لایا ہی تھا۔۔۔ وکیل صاحب نے خوشامد کرنی شروع کی،، مجھے تو آپ کی فرمائش پوری کرنی تھی آپ

کو تماشا دیکھتا تھا، وہ آپ نے دیکھ لیا۔ اب آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا!..

”آپ نے معاہدہ کب پورا کیا؟“

”کوشش تو جان توڑ کر کی۔“

”اس کی سند نہیں۔“

لکڑہارے نے پھر اس کو اٹھایا تھا اور بھاگا چلا جا رہا تھا وہ دکھا دینا چاہتا تھا کہ تم لوگوں نے کاکھ کاکھ کر اسے دس قدم اٹھایا تو یہ نہ سمجھو کہ پاس ہو گئے۔ اس میدان میں میں تم سے کمزور ہونے پر بھی آگے ہی رہوں گا۔ ہاں کاغذ تم چاہے جتنا کالا کرو اور جھوٹے مقدمے تم چاہے جتنے بناؤ۔

ایک کالا ملا جس میں بہت تھوڑا پانی تھا۔ تالے کے اس پار نیلے پر ایک جھوٹا سا پانچ چھ گھروں کا پردہ تھا اور کئی لڑکے اہلی کے درخت کے نیچے کھیل رہے تھے۔ لکڑہارے کو دیکھ کر سب نے دوڑتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا اور لگے پوچھنے ”کس نے مارا؟ باپو! کیسے مارا؟ کہاں مارا؟ کیسے گولی لگی؟ اس کے کیوں لگی اور ہرنوں کے کیوں نہ لگی؟“ لکڑہارا ”ہوں ہوں، کرتا اہلی کے نیچے پہنچا اور ہرن کو اتار کر قریب کی جھونپڑی سے دونوں اصحاب کے لیے چار پائی لینے دوڑا اس کے چاروں لڑکوں اور لڑکیوں نے شکار کو اپنے چارج میں لے لیا اور دوسرے لڑکوں کو بھگا دینے کی کوشش کرنے لگے۔ سب سے جھوٹے لڑکے نے کہا ”ہمارا ہے۔“

اس کی بڑی بہن نے جو چودہ پندرہ برس کی تھی، مہمانوں کی طرف دیکھ کر جھوٹے بھائی کو ڈانٹا۔ ”چپ! نہیں سپاہی پکڑ لے جائے گا۔“

مرزا نے لڑکے کو چھیڑا ”تمھارا نہیں ہے ہمارا ہے۔“

لڑکے نے ہرن پر سوار ہو کر اپنا قبضہ ثابت کر دیا اور بولا ”باپو تو لائے ہیں۔“

بہن نے سکھایا ”کہہ دے بھیا کہ تمھارا ہے۔“

ان بچوں کی ماں بکریوں کے لیے چتے توڑ رہی تھی۔ دو نئے بھلے مانسوں کو دیکھ کر اس نے ذرا سا گھونگھٹ نکال لیا اور شرمائی کہ اس کی ساڑی کتنی میلی، کتنی پھٹی اور اچھی ہے وہ اس بھیس میں مہمانوں کے سامنے کیسے جائے؟ اور گئے بغیر کام نہیں چلے گا۔ پانی والی دینا ہوگا۔ ابھی دو پہر ہونے میں کچھ کسرتھی۔ مگر مرزا نے اسی گاؤں میں دو پہر کاٹنے کا ارادہ

کر لیا تھا۔ گاؤں کے آدمیوں کو جمع کیا، شراب آئی، شکار پکا، قریب کے بازار سے سبھی اور میدہ منگایا اور گاؤں بھر کو دعوت دی۔ چھوٹے بڑے عورت مرد سبھی نے دعوت اڑائی۔ مردوں نے خوب شراب پی اور مست ہو کر شام تک گاتے رہے اور مرزا صاحب بچوں کے ساتھ بچ، شرابیوں کے ساتھ شرابی، بوڑھوں کے ساتھ بوڑھے، اور جوانوں کے ساتھ جوان بنے ہوئے تھے۔ اتنی ہی دیر میں گاؤں بھر سے ان کا اتنا گھبراہٹ جمل جول ہو گیا تھا گویا وہیں کے باشندے ہوں۔ لڑکے تو ان پر لدے پڑتے تھے، کوئی ان کی پھندنے دار ٹوپی سر پر رکھے لیتا تھا کوئی ان کی رائفل کندھے پھر رکھ کر اکڑتا ہوا چلتا تھا اور کوئی ان کی رسٹ وایج کھول کر اپنی کلائی پر باندھے لیتا تھا۔ مرزا نے خود دیسی شراب پی اور جھوم جھوم کر جنگلی آدمیوں کی طرح گاتے رہے۔

جب یہ لوگ شام کے وقت یہاں سے رخصت ہوئے تو گاؤں بھر کے عورت مرد انھیں بڑی دور تک بھیجے گئے۔ کئی تو رو رہے تھے! ایسی خوش قسمتی کا موقع ان غریبوں کی زندگی میں شاید اول ہی مرتبہ آیا ہو کہ کسی شکاری نے ان سب کی ضیافت کی ہو۔ ضرور یہ کوئی راجا نواب ہے، نہیں تو اتنا دریا دل اور کس کا ہوتا ہے؟ ان کے درس کا ہے کہ وہ ہوں گے۔

کچھ دور چلنے کے بعد مرزا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولے ”بے چارے کتنے خوش تھے! کاش میری زندگی میں ایسے موقع روز آتے! آج کا دن بڑا مبارک تھا۔“

ٹٹھانے بے رخی سے کہا ”آپ کے لیے مبارک ہوگا“ میرے لیے تو منحوس ہی نکلا۔ مطلب کی کوئی بات نہ ہوئی۔ تمام دن جنگلوں اور پہاڑوں کی خاک چھاننے کے بعد اپنا سا منہ لیے لوٹے جاتے ہیں۔“

مرزا نے رکھائی سے کہا۔ ”مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے۔“

دونوں جب برگد کے نیچے پہنچے تو دونوں ٹولیاں لوٹ چکی تھیں۔ مہتا منہ لٹکائے ہوئے تھے، مانتی اداس سی الگ بیٹھی تھی جو نئی بات تھی۔ رائے صاحب اور کھنا دونوں بھوکے ہی رہ گئے تھے اور کسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ وکیل صاحب اس لیے غمگین تھے کہ مرزا نے ان کے ساتھ بے فائی کی تھی۔ تب مرزا صاحب خوش تھے اور وہ خوشی روحانی تھی۔

جب سے ہوری کے گھر میں گائے آگئی ہے، گھر کی رونق ہی کچھ اور ہوگئی ہے دھنیا کا سمہند تو اس کی بساط سے باہر ہو رہا تھا جب دیکھو وہی گائے کا چرچا ہے۔
 بھوسہ ختم ہو گیا تھا۔ اکیچ میں کچھ چری بوئی گئی تھی۔ اسی کو کاٹ کتر کر موشیوں کو کھلانا پڑتا تھا، آنکھیں آسمان کی طرف لگی رہتی تھیں کہ کب پانی برسے اور گھاس اگے۔ آدھا اسازھ گزر گیا اور بارش نہیں ہوئی۔

یکا یک ایک روز بادل اٹھے اور اسازھ کا پہلا تھلا پڑا۔ کسان خریف کی فصل بونے کے لیے ہل لے کر نکلے ہی تھے کہ رائے صاحب کے کارندے نے کہلا بھیجا کہ جب تک لگان نہ بیات ہو جائے گا کسی کو کھیت میں ہل نہ لے جانے دیا جائے گا۔ کسانوں پر جیسے بجلی گری اور کبھی تو اتنی سختی نہ ہوتی تھی، اب کے یہ کیسا حکم؟ کوئی گاؤں چھوڑ کر بھاگ تھوڑا ہی جاتا ہے۔ اگر کھیتوں میں ہل نہ چلے تو روپیہ کہاں سے آئے گا؟ ٹکلیں گے تو کھیت ہی سے۔ سب مل کر کارندے کے پاس جا کر رویئے۔ کارندے کا نام تھا پنڈت نوکھے رام۔ آدمی برے نہ تھے مگر مالک کا حکم تھا۔ اسے کیسے ٹالیں؟ ابھی اس دن رائے صاحب نے کیسی دیا اور دھرم کی باتیں کی تھیں اور آج اسامیوں پر یہ ظلم! ہوری مالک کے پاس جانے کو تیار ہوا مگر پھر سوچا کہ انھوں نے کارندے کو ایک بار جو حکم دے دیا اسے کیوں ٹالنے لگے وہ سب کا سرغنہ ہو کر کیوں برا بنے؟ جب اور کوئی کچھ نہیں بولتا تو وہی کیوں آگ میں کودے، جو سب کے سر پڑے گی اسے وہ بھی جھیل لے گا!

کسانوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی، سبھی گاؤں کے مہاجنوں کے پاس روپے لینے کے لیے دوڑے۔ گاؤں میں آج کل معرود شاہ کی خوب چلی رہی تھی۔ اب کے برس اسے سن میں اچھا نفع ہوا تھا۔ گیہوں اور اسی میں بھی اس نے کچھ کم نہیں کمایا تھا۔ پنڈت داتا دین اور دلاری سیٹھانی کے یہاں بھی لین دین کا کام ہوتا تھا۔ سب سے بڑے مہاجن تھے جھنگری سنگھ جو شہر کے ایک بڑے مہاجن کے ایجنٹ تھے۔ ان کی ماتحتی میں کئی آدمی اور تھے جو آس پاس

کے دیہاتوں میں گھوم گھوم کر لین دین کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے موٹے مہاجن تھے جو دو آنے روپے سود پر بغیر لکھا پڑھی کے روپے دیتے تھے۔ گاؤں والوں کو بھی لین دین کا کچھ ایسا خط تھا کہ جس کے پاس دس بیس روپے جمع ہو جاتے وہی مہاجن بن بیٹھا۔ ایک وقت میں تو ہوری نے بھی مہاجنی کی تھی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ لوگ ابھی تک یہی سمجھتے تھے ہوری کے پاس گڑے ہوئے روپے ہیں۔ آخر وہ روپیہ گیا کہاں؟ ہزارے میں نکلا نہیں۔ ہوری نے کوئی تیرتھ برت یا بھوج کیا نہیں، روپیہ گیا تو کہاں گیا؟ جوتے پھٹ جانے پر بھی اس کے گھٹے بنے رہتے ہیں؟

کسی نے کسی دیوتا کو سیدھا کیا، کسی نے کسی کو۔ کسی نے آنہ روپیہ سود دینا منظور کیا، کسی نے دو آنے۔ ہوری کی خود داری بالکل جاتی نہ رہی تھی جن لوگوں کے روپے اس پر باقی تھے ان کے پاس کون سا منہ لے کر جائے، جھنگری سنگھ کے سوا اسے اور کوئی نہ سوجھا۔ وہ پکا کاغذ لکھاتے تھے، نذرانہ الگ لیتے تھے، دستوری الگ اور اسٹامپ کی تحریر الگ۔ اس پر ایک سال کا سود پیشگی کاٹ کر دیتے تھے، پچیس روپے کا تمسک لکھو تو مشکل سے سترہ روپے ملتے تھے۔ مگر اس آڑے وقت میں اور کیا کیا جائے؟ رائے صاحب کی زبردستی ہے ورنہ اس وقت کسی کے سامنے کیوں ہاتھ پھیلاتا پڑتا۔

جھنگری سنگھ بیٹھے ہوئے داتون کر رہے تھے۔ ٹھٹکنے، موٹے، چندوے کالے، لمبی ناک اور بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی تھے۔ بالکل نائک کے مسخرے کی طرح! اور وہ تھے بھی بڑے ہنسوڑ۔ اسی گاؤں میں اپنی سرال بنا کر مردوں سے سالے یا سرور اور عورتوں سے سالی یا سرج کا ناتا جوڑ لیا کرتے تھے۔ راستے میں لڑکے انھیں چڑھاتے ”پنڈت جی پاگلی“، اور جھنگری سنگھ انھیں جھٹ پٹ اشیر باد دیتے ”تمھاری آنکھیں پھوٹیں، تمھارا گھٹنا ٹوٹے، تمھیں مرگی آدے، تمھارے گھر میں آگ لگ جائے“، وغیرہ۔ لڑکے اس اشیر باد سے کبھی آسودہ نہ ہوتے تھے۔ مگر لین دین کے معاملے میں وہ بڑے سخت تھے۔ سود کی ایک پائی نہ چھوڑتے تھے۔ اور وعدے پر روپیہ لیے بغیر دروازے سے نہ ملتے تھے۔

ہوری نے جا کر سلام کیا اور اپنا ڈکھڑا روٹایا۔

جھنگری سنگھ نے مسکرا کر کہا ”وہ سب پرانا روپیہ کیا کر ڈالا؟“

”پرانے روپے ہوتے ٹھاکر، تو مہاجنوں سے اپنا پنڈ نہ چھڑا لیتا بیاج بھرتے کسی کو

”اچھا لگتا ہے؟“

”گڑے روپے نہ نکلیں چاہے سود کتنا دینا پڑے، تم لوگوں کا یہی ڈھنگ ہے۔“

”کہاں کے گڑے روپے ٹھاکر صاحب؟ کھانے کو تو ہوتا نہیں لڑکا جوان ہو گیا، بیاہ کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ بڑی لڑکی بھی بیاہنے لایک ہو گئی۔ روپیہ ہوتا تو کس دن کے لیے گاڑ رکھتے؟“

جھنگری سنگھ نے جب سے اس کے دروازے پر گائے دیکھی تھی اس پر دانت لگائے ہوئے تھے۔ گائے کا ذیل ڈول اور سڈول پن کہہ رہا تھا کہ اس میں پانچ سیر سے کم دودھ نہیں ہے۔ دل میں سوچ لیا تھا کہ ہوری کو کسی ادب میں ڈال کر گائے اڑالینی چاہیے۔ آج وہ موقع آ گیا تھا۔

بولے ”اچھا بھائی تمہارے پاس کچھ نہیں ہے! اب راجی ہوئے؟ جتنے روپے چاہو لے جاؤ لیکن تمہارے بھلے کے لیے کہتے ہیں کہ کچھ کہنے ہوں تو گردی رکھ کر روپے لے لو۔ اسام لکھو گے تو سود بڑھے گا اور جھیلے میں پڑ جاؤ گے۔“

ہوری نے قسم کھائی کہ گھر میں کہنے کے نام کچا تاگا بھی نہیں ہے۔ دھنیا کے ہاتھوں میں کڑے ہیں تو وہ بھی گلٹ کے۔ جھنگری سنگھ نے چہرے سے ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا ”تو ایک بات کرو۔ یہ نئی گائے جو لائے ہو اسے ہمارے ہاتھ بیچ ڈالو۔ سود، اسام، سب بکمیڑوں سے بیچ جاؤ گے۔ چار آدمی جو بھی دام کہیں وہ ہم سے لے لو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم اسے اپنے سوکھ، کے لیے لائے ہو اور بیچنا نہیں چاہتے، لیکن یہ سنگٹ تو ٹالنا ہی پڑے گا۔“

ہوری پہلے تو اس بات پر ہنسا۔ وہ اس پر غصے دل سے غور نہ کرنا چاہتا تھا لیکن ٹھاکر نے ایسی اونچ نیچ سمجھائی، مہاجنی، جھکنڈوں کا ایسا بھیاک روپ دکھایا کہ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ٹھاکر ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ جب ہاتھ میں روپیہ آجائے تو گائے، لوٹا لینا۔ تیس روپے کا کاغذ لکھنے پر کہیں پچیس روپے ملیں گے اور اگر تین چار برس نہ دیے گئے تو پورے سو ہو جائیں گے۔ پہلے کا تجربہ یہی بتا رہا تھا کہ قرض وہ مہمان ہے جو ایک بار آکر جانے کا نام نہیں لیتا۔ بولا ”میں گھر جا کر سب سے صلاح کروں تو بتاؤں۔“

”صلاح نہیں کرنا ہے، ان سے کہہ دینا کہ روپیہ ادھار لینے میں اپنی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں ٹھاکر، ابھی آکر جواب دیتا ہوں۔“

لیکن مگر آکر اس نے جیوں ہی یہ بات کہی کہ کہرام مچ گیا۔ دھنیا تو کم چلائی مگر دونوں لڑکیوں نے تو آسمان سر پر اٹھالیا۔ نہیں دیتے اپنی گائے، روپیہ جہاں سے چاہو لاؤ، سونا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس سے تو کہیں اچھا یہ ہے مجھے بچ ڈالو تو گائے سے کچھ بیسی ہی مل جائے گا۔ ہوری بے چارہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ دونوں لڑکیاں بچ بچ گائے پر جان دیتی تھیں۔ روپا تو اس کے گلے سے لپٹ جاتی تھی۔ اور اسے کھلائے بغیر منہ میں لقمہ نہ ڈالتی تھی۔ گائے کتنے پیار سے اس کا ہاتھ چاٹتی تھی، کتنی محبت بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی تھی۔ اس کا چمچڑا کتنا سندر ہوگا۔ ابھی سے اس کا نام بھی رکھ دیا گیا تھا منڑو۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر سوئے گی۔ اس گائے کے پیچھے دونوں بہنوں میں کئی بار لڑائی ہو چکی تھی۔ سونا کہتی کہ مجھے چاہتی ہے اور روپا کہتی کہ مجھے۔ اس کا فیصلہ ابھی تک نہ ہوا تھا اور دونوں کے دعوے برابر قائم تھے۔

مگر ہوری نے آگاہی سمجھا کر آخر دھنیا کو کسی طرح راضی کر لیا ایک دوست سے گائے ادھار لے کر بچ ڈالنا ہے تو بہت سی دہلیات بات، مگر مصیبت میں تو آدمی کا دھرم تک چلا جاتا ہے۔ پھر یہ کون سی بری چیز ہے؟ ایسا نہ ہو تو پھر مصیبت سے لوگ اتنا ڈریں کیوں؟ گوبر نے بھی کوئی خاص اعتراض نہ کیا وہ آج کل اور ہی دھن میں مست تھا۔ یہ طے کیا گیا کہ جب دونوں لڑکیاں رات کو سو جائیں تو گائے جھنگری سنگھ کے یہاں پہنچا دی جائے، گوبر اس درد ناک منظر سے بھاگ کر کہیں چلا گیا تھا۔ وہ گائے کو جاتے کیسے دیکھ سکے گا؟ اپنے آنسوؤں کو کیسے روکے گا؟ ہوری بھی اوپر ہی سے سخت بنا ہوا تھا۔ اندر سے وہ بھی بے چین تھا۔ ایسا کوئی مائی کا لال نہیں جو اس وقت اس کو بچیس روپے ادھار دے دے چاہے پھر بچیس کے پچاس ہی لے لے۔ وہ گائے کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی سیاہ سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں آنسوں بھرے ہوئے ہیں، گویا کہہ رہی ہے ”کیا چار ہی دن میں تمہارا دل مجھ سے پھر گیا؟ تم نے بچن دیا تھا کہ جیتے جی ایسے نہ بچوں گا، یہی بچن تھا تمہارا؟ میں نے تم سے کبھی کسی بات کا گلہ بھی نہیں کیا، جو کچھ روکھا سوکھا تم نے دے دیا وہی کھا کر آسودہ ہو گئی۔ بولو!“

دھنیا نے کہا کہ لڑکیاں تو سو گئیں، اب اسے لے کیوں نہیں جاتے؟ جب پہنچا ہی ہے

تو ابھی سہی۔“

ہوری نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ”میرا تو ہاتھ نہیں اٹھتا دھنیا! اس کا منہ نہیں دیکھتی۔ رہنے دے! روپے سود پر لے لوں گا۔ بھگوان نے چاہا تو سب ادا ہو جائیں گے۔ تین چار سو ہوتے ہی کیا ہیں۔ ایک بار ادکھ جگ جائے۔“ دھنیا نے غریہ محبت سے اس کی طرف دیکھا بولی ”اور کیا۔ اتنی تپیا کے بعد تو گھر میں گنو آئی تو اسے بھی بیچ دو۔ لے لو کل روپے۔ جیسے سب چکا دیے جائیں گے ویسے ہی یہ بھی چکا دیں گے۔

اندر بڑی اس ہو رہی تھی۔ ہوا بند تھی۔ ایک پتی بھی نہ ہلتی تھی۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ مگر بارش کے آثار نہ تھے۔ ہوری نے گائے کو لے جا کر باہر باندھ دیا۔ دھنیا نے ٹوکا بھی کہ کہاں لیے جاتے ہو، مگر ہوری نے سنا نہیں، بولا ”باہر ہوا میں باندھے دیتا ہوں۔ آرام سے رہے گی اس میں بھی تو جان ہے۔“

گائے باندھ کر وہ اپنے تھلے بھائی سو بھا کو دیکھنے گیا جسے ادھر کئی مہینے سے دمہ کا مرض ہو گیا تھا۔ دوا دارو نام کو نہیں، کھانے پینے کا بندوبست نہیں، اور کام کرنا پڑتا تھا جان تو زکر۔ اس لیے اس کی حالت دن بدن بگڑتی جاتی تھی۔ سو بھا غم خوار آدمی تھا لڑائی جھگڑوں سے کوسوں دور بھاگنے والا۔ کسی سے مطلب نہیں، اپنے کام سے کام۔ ہوری اسے چاہتا تھا اور وہ بھی ہوری کا ادب کرتا تھا۔ دونوں میں روپے پیسے کی باتیں ہونے لگیں۔ رائے صاحب کے اس نئے فرمان کی تنقید ہو رہی تھی۔

کوئی گیارہ بجتے بجتے ہوری لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ جیسے گائے کے پاس کوئی آدمی کھڑا ہے۔ پوچھا ”کون ہے وہاں کھڑا؟“ ہیرا بولا ”میں ہوں دادا، تمہارے الاؤ میں آگ لینے آیا تھا۔“

ہیرا اس کے الاؤ میں آگ لینے آیا ہے۔ اس ذرا سی بات سے ہوری کو بھائی کی لگاؤ کا پتہ چلا۔ گاؤں میں اور بھی الاؤ ہیں، کہیں سے بھی آگ مل سکتی ہے۔ ہیرا اس کے الاؤ میں آگ لے رہا ہے تو اپنا ہی سمجھ کے تو۔ سارا گاؤں اس الاؤ میں آگ لینے آتا تھا جو گاؤں میں سب سے بڑا تھا، مگر ہیرا کا آنا دوسری بات تھی۔ اور اس دن کی لڑائی۔؟ لڑائی کے بعد ہیرا کے من میں میل نہیں رہتا۔ کُتہ در ہے پر دل کا ساچھ ہے۔“

اس نے محبت کے لہجے میں پوچھا ”تو کھو ہے کہ لاؤں؟“

”نہیں تماکھو ہے۔ دادا۔“

”سو بھاتا آج بہت بے حال ہے۔“

”کوئی دوا نہیں کھاتا تو کیا کیا جائے؟ اس کے حساب میں تو سارے بید، ڈاکٹر، حکیم، اناڑی ہیں۔ بھگوان کے پاس جتنی بدھی تھی وہ اس کے اور اس کے گھر والی کے حصہ میں پڑ گئی ہے۔“

ہوری نے تشویش سے کہا ”یہی تو برائی ہے اس میں۔ اپنے سامنے کسی کو گنتا ہی نہیں اور چڑچڑے تو بیماری میں سبھی ہو جاتے ہیں، تمہیں یاد ہے کہ نہیں جب تمہیں نفزا (انفلونزا) ہو گیا تھا تو دوائی اٹھا کر پھنک دیتے تھے، تمہارے دونوں ہاتھ پکڑتا تھا تب تمہاری بھابی منہ میں دوائی ڈالتی تھی اس پر تم اسے تمام گالیاں دیتے تھے۔“

”ہاں دادا، بھلا وہ بات بھول سکتا ہوں تم نے اتنا نہ کیا ہوتا تو تم سے لڑنے کے لیے کیسے بچا رہتا؟“

ہوری کو ایسا معلوم ہوا کہ ہیرا کی آواز بھاری ہو گئی ہے۔ اس کا گلا بھی بھر آیا، بولا ”بیٹا! لڑائی جھگڑا تو زندگی کا دھرم ہے۔ اس سے جو اپنے ہیں وہ پرانے تھوڑے ہی ہو جاتے ہیں۔ جب گھر میں چار آدمی رہتے ہیں۔ تبھی لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں، جس کے کوئی ہے ہی نہیں اس کے یہاں کون لڑے گا؟

دونوں نے ساتھ چلم پی۔ پھر ہیرا اپنے گھر گیا اور ہوری اندر کھانا کھانے۔

دھنیا غصہ سے بولی ”دیکھو اپنے سپوت کی لیلا اتنی رات ہو گئی اور اسے ابھی سیر سپانے سے چھٹی نہیں ملی۔ میں سب جانتی ہوں مجھ کو سارا پتا مل گیا ہے، بھولا کی وہ رائڈ لڑکی نہیں ہے جھیا وہ اسی کے پھیر میں پڑا رہتا ہے، ہوری کے کانوں میں بھی یہ بھنک پڑی تھی مگر اسے یقین نہ ہوا تھا۔ گوہر بے چارا ان باتوں کو کیا جانے بولا ”کسی نے کہا تم سے کچھ؟“

دھنیا تیز پڑی ”تم سے چھپی ہوگی اور سبھی جگہ چرچا ہے۔ یہ ہے بھگلا اور وہ بیتر گھاٹ کا پانی پیے ہوئے، اسے انگلیوں پر نچا رہی ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس پر جان دیتی ہے، تم اسے سمجھا دو نہیں تو کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کہیں کے نہ رہو گے۔“

ہوری کا دل امنگ پر تھا چھیر کی سوچی سمجھی دیکھنے سننے میں تو بری نہیں ہے۔ اسی سے کر لے سگائی۔ ایسی سستی نہر یا اور کہاں ملی جاتی ہے؟“

دھنیا کو یہ چھیڑ تیری لگی ”جھپا اس گھر میں آئے تو منہ مجلس دوں رائٹ کا۔ گوہر کی چپیتی ہے تو اسے لے کر جہاں چاہے رہے۔“
 ”اور جو گوہر اسی گھر میں لاوے۔“

”تو یہ دونوں لڑکیاں کس کے گلے باندھو گے؟ پھر برادری میں تمہیں کون پوچھے گا؟ کوئی دوارے پر کھڑا تک تو ہو گا نہیں۔“
 ”اسے اس کی کیا پروا؟“

”اس طرح نہیں چھوڑوں گی لالا کو! مرمر کے میں نے پالا ہے اور جھپیا آکر راج لے گی! منہ میں آگ لگا دوں گی رائٹ کے!“
 یکا یک گوہر آکر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا ”دادا سندریا کو کیا ہو گیا؟ کیا کالے نے کاٹ لیا؟ وہ تو بڑی ترپ رہی ہے۔“

ہوری چوکے میں جا چکا تھا۔ تھالی سامنے چھوڑ کر باہر نکل آیا اور بولا ”کیا اسکن منہ سے نکالتے ہو۔ ابھی تو میں دیکھے آ رہا ہوں۔ لیٹی ہوئی تھی۔“

تینوں باہر گئے۔ چراغ لے کر دیکھا۔ سندریا کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا، آنکھیں پتھرا گئیں تھیں، پیٹ پھول گیا تھا اور چاروں پاؤں پھیل گئے تھے دھنیا سر پٹنے لگی۔ ہوری پنڈت داتا دین کے پاس دوڑا۔ گاؤں میں وہی مولشی ڈاکٹر تھے۔ پنڈت جی سونے جا رہے تھے۔ دوڑے ہوئے آئے دم کے دم میں سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ گائے کو کسی نے کچھ کھلادیا، علامت صاف تھی۔ صاف زہر دیا گیا ہے لیکن گاؤں میں ایسا کون دشمن ہے جس نے زہر دیا ہو؟ ایسی واردات تو اس گاؤں میں کبھی ہوئی ہی نہیں۔ مگر باہر کا کون آدمی گاؤں میں آیا؟ ہوری کی کسی سے عداوت بھی نہ تھی کہ اس پر شبہ کیا جائے۔ ہیرا سے کچھ کہا سنی ہوتی تھی مگر وہ بھائی بھائی کا جھگڑا تھا۔ سب سے زیادہ دکھی تو ہیرا ہی تھا۔ دھمکی دے رہا تھا کہ جس نے یہ ہتھیاروں کا کام کیا ہے اسے پائے تو لہو پی جائے۔ وہ لاکھ غصہ ور ہو مگر اتنی کمینہ حرکت نہیں کر سکتا۔

آدھی رات تک جھکھا رہا۔ سبھی ہوری کے دکھ میں دکھی تھے اور ہتیارے کو گالیاں دیتے تھے۔ وہ اس وقت پکڑا جاسکتا تھا تو اس کی جان کی خیر نہ تھی۔ جب یہ حال ہے تو کوئی جانوروں کو باہر کیسے باندھے گا؟ ابھی تک سبھی جانور باہر پڑے رہتے تھے۔ کسی طرح کی چھتا

نہ تھی لیکن اب تو ایک نئی مصیبت آکھڑی ہوئی تھی۔ کیا گائے تھی کہ بس دیکھتا رہے! پونے لاکھ۔ پانچ سیر سے کم دودھ نہ تھا۔ سو سو کا ایک ایک چھڑا ہوتا۔ آتے دیر نہ ہوئی کہ پہاڑ پھٹ پڑا۔

جب سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے تو دھنیا ہوئی کو کوٹنے لگی۔ ”تمہیں کوئی لاکھ سمجھائے مگر کرو گے اپنے ہی من کی۔ تم گائے کھول کر آنگن سے چلے تب تک میں جو جیتی رہی کہ باہر نہ لے جاؤ۔ ہمارے دن پتلے ہیں، نا جانے کب کیا ہو جائے۔ پر نہیں اسے گرمی لگ رہی ہے اب کھوب ٹھنڈی ہوگئی اور تمہارا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ ٹھاکر مانگتے تھے دے دیا ہوتا تو ایک بوجھ سر سے اتر جاتا اور احسان کا احسان ہوتا۔ مگر پھر یہ تھوڑے کیسے پڑتا؟ کوئی بری بات ہونے والی ہوتی ہے تو مت پہلے ہی ماری جاتی ہے۔ اتنے دن گھر میں آرام سے بندھی رہی، نہ گرمی لگی نہ جوڑی آئی۔ اتنی جلدی سب کو پہچان گئی تھی کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ باہر سے آئی ہے۔ بچے اس کی سینگوں سے کھیلتے رہتے، سر تک نہ ہلاتی تھی۔ جو کچھ ناند میں ڈال دو، چاٹ پونچھ کر صاف کر دیتی تھی۔ کبھی تھی، ابھاگوں کے گھر میں کیا رہتی؟“

سونا اور روپا بھی اس لہجہ سے جاگ اٹھی تھیں اور زار و قطار رو رہی تھی اس کی خدمت کا بار زیادہ تر ان ہی دونوں پر تھا۔ ان کی ساتھی ہو گئی تھی۔ دونوں کھا کر اٹھتی تو ایک ایک کھڑا اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھی۔ کیسا چھہ نکال کر کھالتی تھی اور جب تک ان کے ہاتھ کور نہ پالیتی کھڑی رہتی۔ بھاگ پھوٹ گئے!

گوبر اور دونوں لڑکیاں رد رو کر سو گئی تھیں۔ ہوئی بھی لینا۔ دھنیا بھی اس کے سر ہانے پانی کا لوٹا رکھنے آئی تو ہوئی نے آہستہ سے کہا ”ترے پیٹ میں بات چیتی نہیں، کچھ سن پائے گی تو گاؤں بھر میں ڈھنڈورا بجتی پھرے گی۔“

دھنیا نے احتجاج کیا ”بھلا سنوں تو۔ میں نے کون سی بات پیٹ دی کہ یوں ہی نام بدنام کر دیا۔“

”اچھا تیرا سک کسی پر ہوتا ہے؟“

”میرا سک تو کسی پر نہیں ہے۔ کوئی باہری آدمی تھا۔“

”کسی سے کہے گی تو نہیں؟“

”کہوں گی نہیں تو گاؤں والے مجھے کہنے کیسے گردھروں گے۔“

”اگر کسی سے کہا تو ماری ڈالوں گا۔“

”مجھے مار کر کسی نہ رہو گے۔ اب دوسری مہر یا نہیں ملی جاتی۔ جب تک ہوں تمہارا گھر سمھالے ہوئے ہوں، جس دن مر جاؤں گی سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گے۔ ابھی مجھ میں ساری برائیاں ہی برائیاں ہیں تب آنکھوں سے آنسو بہیں گے۔“

”میرا سک تو ہیرا پر ہوتا ہے۔“

”جھوٹ بالکل جھوٹ! ہیرا اتنا بچ نہیں، وہ منہ کا ہی برا ہے۔“

”میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، سچ حیرے سر کی سوگند۔“

”تم نے اپنی آنکھوں دیکھا کب؟“

”وہی، میں سو بھا کو دیکھ کر آیا تو وہ سندریا کی ناند کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا کون ہے، تو بولا میں ہوں ہیرا! الاؤ سے آگ لینے آیا تھا۔ تھوڑی دیر مجھ سے بات کرتا رہا مجھے چلم پلائی۔ وہ ادھر گیا، میں گھر میں آگیا، اور وہیں گوبر نے پکار مچائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں گائے باندھ کر سو بھا کے گھر گیا ہوں اور اس نے ادھر آکر کچھ کھلا دیا۔ سایت پھر یہ دیکھنے آیا تھا کہ مری یا نہیں۔“

دھنیا نے سرد آہ کھینچ کر کہا ”اس طرح کے ہوتے ہیں بھائی، جنہیں بھائی کا گلا کاٹنے پر بھی ہچک نہیں ہوتی۔ افوہ! ہیرا من کا اتنا کالا ہے! اور داری جار کو میں نے ہی پال پوس کر بڑا کیا۔“

”اچھا جا، سورہ! اگر کسی سے بھول کر بھی چہ چا نہ چلانا۔“

”کون، تڑکا ہوتے ہی لالا کو تھانے نہ پہنچاؤں تو اپنے اصل باپ کی نہیں! ہتیارا بھائی کہنے لاسک نہیں۔ یہی بھائی کا کام ہے۔ وہ بیری ہے، پکا بیری اور بیری کو مارنے میں پاپ نہیں، چھوڑنے میں پاپ ہے۔“

ہوری نے دھمکایا۔ میں کہے دیتا ہوں دھنیا! انتھ ہو جائے گا۔“

دھنیا جوش میں بولی ”انتھ نہیں انتھ کا باپ ہو جائے، میں بنا لالا کو بڑے گھر بھجوائے مانوں گی نہیں۔ تین سال چکی پھوڑوں گی، تین سال! دہاں سے چھوٹیں گے تو ہتیا لگے گی۔ تیرتھ کرنا پڑے گا۔ اس دھوکے میں نہ رہیں لالا! اور گواہی دلاؤں گی تم سے، لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھا کر۔“

اس نے اندر جا کر کواڑ بند کر لیے اور ہوری خود کو کوستا ہوا پڑ رہا۔ ”جب میرے ہی پیٹ میں بات نہیں چلی تو وضیا کے پیٹ میں کیا بچے گی۔؟ اب یہ چڑیل ماننے والی نہیں۔ ہٹ پر آ جاتی ہے تو کسی کی سنتی ہی نہیں۔ آج میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑی بھول کی۔“

چاروں طرف سنسان تاریکی چھائی تھی۔ دونوں بیلوں کی گلے کی گھنٹیاں بھی کبھی بج اٹھتی تھیں۔ دس قدم پر مردہ گائے پڑی ہوئی تھی۔ اور ہوری بڑے ہی پچھتاوے میں پڑا کر دھیس بدل رہا تھا۔ اندھیرے میں اجالے کی لکیر کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔

علی الصباح ہوری کے مکان میں ایک پورا ہنگامہ تھا۔ ہوری دھنیا کو مار رہا تھا اور دھنیا اسے گالیاں دے رہی تھی، دونوں لڑکیاں باپ کے پاؤں سے لپٹی ہوئی چلا رہی تھیں اور گوہر ماں کو بچا رہا تھا۔ بار بار ہوری کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ڈھکیل دیتا مگر جیوں ہی دھنیا کے منہ سے گالی نکل جاتی، ہوری اپنے ہاتھ چھڑا کر اس کو دو چار لات جما دیتا۔ اس کا بوڑھا غصہ جیسے کسی چھپی اور جمع کی ہوئی طاقت کو باہر نکال لایا ہو۔ سارے گاؤں میں جھلکا مچ گیا۔ لوگ سمجھانے بجھانے کے بہانے تماشا دیکھنے آ پہنچے۔ سو بھلا لاشی نیکتا آکھڑا ہوا۔ داتا دین نے ڈانٹا ”ایں، یہ کیا ہے ہوری؟ تم بادلے ہو گئے ہو کیا؟ کوئی اس طرح گھر کی کچھی پر ہاتھ چھوڑتا ہے کیا؟ تمہیں تو یہ روگ نہ تھا، کیا ہیرا کی چھوت تمہیں بھی لگ گئی؟“

ہوری نے پالاگن کر کے کہا ”مہراج! تم اس بکھٹ نہ بولو۔ میں آج اس کی بان چھڑا کر تب دم لوں گا۔ میں جتنا ہی طرح دیتا ہوں اتنی ہی سرچڑھتی جاتی ہے۔“

دھنیا غصہ میں روتی ہوئی بولی ”مہراج تم گواہ رہنا۔ میں اس کے تیارے بھائی کو جیل بھجوا کر تب پانی پیوں گی۔ اس کے بھائی نے گائے کو بس کھلا کر مار ڈالا ہے۔ اب جو میں تھانے میں رہٹ لکھانے جاتی ہوں تو یہ تیارا مجھے مارتا ہے۔ میں نے اس کے پیچھے اپنی جندگانی، ملیا میٹ کر دی اس کا یہ انام دے رہا ہے۔“

ہوری نے دانت چپیں کر اور آنکھیں نکال کر کہا ”پھر وہی بات منہ سے نکالی! تو نے دیکھا تھا ہیرا کو بس دیتے؟“

”تو کسم کھا جا کہ تو نے ہیرا کو گائے کے پاس کھڑا نہ دیکھا؟“

”ہاں میں نے نہیں دیکھا کسم کھاتا ہوں۔“

”بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کسم کھا۔“

ہوری نے گوہر کے سر پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھ کر، کانپتی ہوئی آواز میں کہا ”میں بیٹے کی

کسم کھاتا ہوں میں نے ہیرا کو ناند کے پاس نہیں دیکھا۔“

دھنیا نے زمین پر تھوک کر کہا ”ٹھوہی ہے تیری ٹھکانی پر، تو نے آپ مجھ سے کہا کہ ہیرا چور کی طرح ناند کے پاس کھڑا تھا اور اب بھائی کے لیے جھوٹ بولتا ہے، ٹھوہی ہے! اگر میرے بیٹے کا بال بھی بیکا ہوا تو گھر میں آگ لگا دوں گی، ساری گزشتہی میں آگ لگا دوں گی۔ بھگوان! آدمی منہ سے بات کہہ کر اتنی بے سہمی سے پلٹ جاتا ہے!“

ہوری پاؤں پٹک کر بولا ”دھنیا! بس مت دلا ورنہ برا ہوگا۔“

”مار تو رہا ہے اور مار لے، تو جو اپنے باپ کا بیٹا ہوگا تو آج مجھے مار کر تب پانی پیے گا! پانی نے مار مار کر مجھے بھر کس کر دیا، پھر بھی اس کا جی نہیں بھرا۔ مجھے مار کر سمجھتا ہے کہ بڑا بہرہوں۔ بھائیوں کے سامنے بھگتی ملی بن جاتا ہے، پانی کہیں کا! بتیارا!“

پھر وہ فریاد کر کے رونے لگی۔ اہل گھر میں آکر اس نے کیا کیا دکھ درد نہیں جھپلا، کس طرح اپنا پیٹ نہیں کاٹا، کس طرح ایک ایک لٹے کو ترسی کس طرح ایک ایک پیسہ جان کر طرح بچا کر رکھا، کس طرح گھر بھر کو کھلا کر اور آپ پانی پی کی سو رہی اور آج ان سارے بلدانوں کا یہ بدلا! بھگوان بیٹھے یہ انیائے دیکھ رہے ہیں اور اسے بچانے نہیں دوڑتے!

رفتہ رفتہ رائے عامہ اب دھنیا کے موافق ہونے لگی۔ اس میں اب کسی کو شک نہ رہا کہ ہیرا ہی نئے گائے کو زہر دیا۔

ہوری نے بالکل جھوٹی قسم کھائی ہے، اس کا بھی لوگوں کو یقین ہو گیا۔ گوہر کو باپ کی اس جھوٹی قسم اور اس کی وجہ سے آنے والی مصیبت کے اندیشے نے ہوری کا مخالف بنادیا۔ اس پر جو داتا دین نے ڈانٹ بتائی تو ہوری ہار کھا گیا اور چپکے سے چلا گیا۔ راستی کی فتح ہوئی۔

داتا دین نے سوہما سے پوچھا ”تم کچھ جانتے ہو سوہما! کیا بات ہوئی؟“

سوہما زمین پر لیٹا ہوا بولا ”میں تو مہراج! آٹھ دن سے باہر نہیں نکلا۔ ہوری دادا کبھی کبھی جا کر کچھ دے آتے ہیں، اسی سے کام چلتا ہے، کل رات میں بھی وہ میرے پاس گئے تھے۔ کس نے کیا کیا، میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں سانجھ کو ہیرا میرے گھر کھڑی مانگنے گیا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک جڑی کھودتا ہے۔ پھر تب سے اس سے میری بیسٹ نہیں ہوئی۔“

دھنیا شہہ کو پا کر بولی ”پڈت دادا، یہ اسی کا کام ہے، سوہما کے گھر سے کھڑی مانگ

کر لایا اور کوئی جڑی کھود کر گائے کو کھلا دی۔ اس رات کو جو بھگڑا ہوا تھا اسی دن سے وہ رنج مانے بیٹھا ہے۔“

داتا دین بولے ”یہ بات ثابت ہو گئی، تو اسے ہتیا لگے گی۔ پولیس کچھ کرے یا نہ کرے، دھرم تو بٹا ڈنڈ دیے رہے گا نہیں، چلی تو جا روپا! ہیرا کو بلا لا۔ کہنا کہ پنڈت دادا بلا رہے ہیں۔ اگر اس نے ہتیا نہیں کی تو گنگا جلی اٹھالے اور چورے پر چل کر سوگند کھائے۔“

دھنیا بولی ”مہراج! اس کی سوگند کا بھروسہ نہیں، جھٹ پٹ کھالے گا۔ جب اس نے جھوٹی سوگند کھالی جو بڑا دھرماتا بنتا ہے تو ہیرا کا کیا بسواس؟“
اب گوہر بولا ”کھالے جھوٹی سوگند، بنس کا انت ہو جائے، بوڑھے جیتے رہیں، جوان جی کر کیا کریں گے؟“

روپا ایک لمحے میں آکر بولی ”کا کا گھر میں نہیں پنڈت دادا! کا کی کہتی ہے کہ کہیں چلے گئے ہیں۔“

داتا دین نے لمبی داڑھی پھٹکار کر کہا ”تو نے پوچھا نہیں کہ کہاں چلے گئے ہیں؟ مگر میں چمپا بیٹھا نہ ہو دیکھ تو سونا! اندر تو نہیں بیٹھا ہے؟“

دھنیا نے ٹوکا ”اسے نہ سمجھو دادا! ہیرا کے سر ہتیا سوار ہے نہ جانے کیا کر بیٹھے۔“
داتا دین نے خود لکڑی سنبھالی اور خبر لائے کے ہیرا ج کچ کہیں چلا گیا ہے۔ چنیا کہتی ہے، لٹیا ڈور، اور ڈنڈا سب لے کر گئے ہیں۔ چنیا نے پوچھا بھی کہ کہاں جاتے ہو، پر بتایا نہیں۔ اس نے پانچ روپے آرے میں رکھے تھے روپے وہاں نہیں ہیں۔ شاید روپے بھی لہتا گیا۔

دھنیا ٹھنڈے دل سے بولی ”منہ میں کا لک لگا کر کہیں بھاگ گیا ہوگا۔“

سوہا بولا ”بھاگ کر کہاں جائے گا؟ گنگا نہانے نہ چلا گیا ہو۔“

دھنیا نے شک ظاہر کیا ”گنگا جاتا تو روپے کیوں لے جاتا؟ اور آج کل کوئی پر ب نہان بھی تو نہیں ہے۔“

اس شک کو کوئی دور نہ کر سکا، خیال مضبوط ہو گیا۔ آج ہو رہی کے گھر کھانا نہیں پکا، نہ کسی نے بیلوں کو پانی دیا۔ سارے گاؤں میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ دو دو چار چار آدمی جگہ

جگہ جمع ہو کر اس واقعہ پر رائے زنی کر رہے تھے۔ ہیرا ضرور کہیں بھاگ گیا۔ دیکھا ہوگا کہ بھید کھل گیا اب جیل الگ جانا پڑے گا اور ہتیا الگ لگے گی بس کہیں بھاگ گیا۔ پتیا بھی رو رہی تھی کہ کچھ کہا نہ سنا، نہ جانے کہا چل دیے۔

جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ شام کے وقت حلقے کے تھانیدار نے آکر پوری کر دی۔ گاؤں کے چوکی دار نے اس واقعے کی رپٹ کی جو اس کا فرض تھا۔ پھر تھانیدار صاحب اپنے فرض سے کب چوکنے والے تھے؟ اب گاؤں والوں کو بھی اس کی خاطر مدارت کر کے اپنا فرض پورا کرنا چاہیے۔ داتا دین، جھنگری سنگھ، نوکے رام، ان کے چاروں پیادے، منگرو شاہ اور لالا بیشوری سبھی آپہنچے اور داروغہ جی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ ہوری کی طلبی ہوئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ تھانیدار کے سامنے آیا۔ ایسا ڈر رہا تھا جیسے پھانسی ہو جائے گی۔ دھنیا کو پینتے وقت اس کا ایک ایک عضو پھڑک رہا تھا۔ داروغہ جی کے سامنے کھوے کی طرح اندر ہی اندر سستا جاتا تھا۔ داروغہ نے اسے محققانہ نگاہوں سے دیکھا اور اس کے دل تک پہنچ گئے قیاذہ شناسی میں انھیں اچھی مہارت تھی۔ کتابی علم انفس میں کورے ہوں مگر عملاً اس کے ماہر تھے۔ یقین ہو گیا کہ آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھے ہیں۔

ہوری کا چہرہ کہے دیتا تھا کہ اس کے لیے صرف ایک دھمکی کافی ہے۔ داروغہ نے پوچھا تجھے کس پر ہسبہ ہے۔؟“

ہوری نے زمین چھوئی اور ہاتھ جوڑ کر بولا ”میرا سبہ کسی پر نہیں ہے سرکار! گائے اپنی موت مری ہے۔ بوڑھی ہو گئی تھی۔“

دھنیا بھی آکر پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ فوراً بولی ”گائے ماری ہے تمہارے بھائی ہیرا نے۔ سرکار ایسے مورکھ نہیں ہیں کہ جو کچھ تم کہہ دو گے مان لیں گے۔ یہاں جانچ کرنے آئے ہیں۔“

داروغہ جی نے پوچھا ”یہ کون عورت ہے؟“

کئی آدمیوں نے داروغہ جی سے گفتگو کرنے کی خوش نصیبی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ ایک ساتھ بولے اور ہر ایک نے اپنے دل کو اس خیال سے تسکین دی کہ پہلے میں بولا ”ہوری کی گھر والی ہے سرکار۔“

”تو اسے بلاؤ میں پہلے اسی کا بیان لکھوں گا۔ وہ کہاں ہے ہیرا؟“

”خاص لوگوں نے ایک آواز سے کہا ”وہ تو آج تڑکے سے کہیں چلا گیا ہے سرکار۔“
 ”میں اس کے گھر کی تلاشی لوں گا۔“

تلاشی! ہوئی! کانس اوپر نیچے ہونے لگا۔ اس کے بھائی ہیرا کے گھر کی تلاشی ہوگی اور ہیرا گھر میں نہیں ہے! تو پھر ہوئی کے جیتے جی اور اس کے دیکھتے یہ تلاشی نہ ہونے پاوے گی اور دھنیا سے اب اس کا کوئی ناتا نہیں ہے جہاں چاہے جائے جب وہ اس کی آبرو بگاڑنے پر آگئی ہے تو اس کے گھر میں کیسے رہ سکتی ہے؟ جب گلی گلی ٹھوکر کھائے گی جب پتہ چلے گا۔

گاؤں کے خاص لوگوں نے اس سنکٹ کو ٹالنے کی لیے کانا پھوسی شروع کی۔
 داتا دین نے اپنا گنجا سر ہلا کر کہا ”یہ سب کمانے کے ڈھنگ ہیں۔ پوچھو ہیرا کے گھر میں کیا رکھا ہے؟“

پیشوری لالا بہت لمبے تھے مگر لمبے ہو کر بھی بیوقوف نہ تھے۔ اپنا لمبا کالا منہ اور لمبا کر کے بولے ”اور یہاں آیا ہے کس لیے اور جب آیا ہے تو کچھ لیے دیے گیا کب ہے؟“
 جھنگری سنگھ نے ہوئی کو بلا کر کان میں کہا ”نکالو جو کچھ دینا ہو، یوں گلا نہ چھوٹے گا۔“

دارودہ جی نے اب گرج کر کہا ”میں ہیرا کے گھر کی تلاشی لوں گا؟“
 ہوئی کا چہرہ ایسا فق ہو گیا گویا جسم کا سارا خون خشک ہو گیا ہو۔ تلاشی اس کے گھر ہوئی تو اس کے بھائی کے گھر ہوئی تو ایک ہی بات ہے۔ ہیرا الگ سہی مگر دنیا تو جانتی ہے کہ اس کا بھائی ہے۔ مگر اس سے اس کا کچھ بس نہیں۔ اس کے پاس روپے ہوتے تو پچاس لاکر دارودہ کے پاؤں پر رکھ دیتا اور کہتا ”سرکار، میری آبرو اب آپ کے ہاتھ میں ہے مگر اس کے پاس تو زہر کھانے کو ایک پیسہ نہیں ہے۔ دھنیا کے پاس دو چار روپے پڑے ہوں پر وہ جڑیل بھلا کب دینے لگی؟ چھانسی کی سزا پائے آدمی کی طرح سر جھکائے اپنی بے عزتی کو سختی سے محسوس کرتا ہوا خاموش کھڑا رہا۔

داتا دین نے ہوئی کو آگاہ کیا ”اب اس طرح کھڑے رہنے سے کام نہ چلے گا ہوئی! روپے کی کوئی تدبیر کرو۔“

ہوئی عاجزانہ بولا ”اب میں کیا کہوں مہراج! ابھی تو پہلے ہی کی گھڑی سر پر لدی

ہے اور کس منہ سے مانگوں؟ پر اس سنگٹ سے لہار لو۔ ہیتا رہا تو کوڑی کوڑی چکا دوں گا۔
میں مر جاؤں گا تو گوبر تو ہے ہی۔“

لیڈروں میں مشورہ ہونے لگا ”تھانیدار کو کیا بھیٹ کیا جائے“ وانا دین نے پچاس
تجویز کیے۔ جنگری سنگھ کی رائے میں سو سے کم پر سودا نہ ہوگا۔ نوکھے رام بھی سو کے حق میں
تھے اور ہوری کے لیے سو اور پچاس میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس تلاشی کا سنگٹ اس کے سر سے
ٹل جائے، چاہے پوچھا کتنی ہی چڑھائی پڑے۔ مردے کو ایک من لکڑی سے جلاؤ یا دس من
سے اسے کیا پروا؟

مگر پیشوری سے یہ بے انصافی نہ دیکھی گئی۔ کوئی ڈاکہ یا قتل تو ہوا نہیں، صرف تلاشی
ہو رہی ہے، بس میں روپے بہت ہیں۔

لیڈروں نے لعنت ملاحت کی ”تو پھر تمہیں تھانیدار سے بات چیت کرنا، ہم لوگ پاس
نہ جائیں گے۔ کون گزریاں کھائے گا؟“

ہوری نے پیشوری کے قدم پر سر رکھ دیا ”بھیا، میرا اُوحار کرو۔ جب تک جیوں گا
تمہاری تابعداری کروں گا۔“ دارودہ نے پھر اپنے چوڑے سینے اور بڑے پیٹ کا پورا زور لگا
کر کہا ”کہاں ہے ہیرا کا گھر؟ میں اس کے گھر کی تلاشی لوں گا۔“

پیشوری نے آگے بڑھ کر دارودہ جی کے کان میں کہا ”تلاشی لے کر کیا کرو گے سرکار
؟ اس کا بھائی آپ کی تابعداری کے لیے حاضر ہے۔“

دونوں آدمی ذرا الگ جا کر باتیں کرنے لگے۔

”کیسا آدمی ہے؟“

”بہت ہی گریب ہجور کھانے کا ٹھکانہ بھی نہیں۔“

”سچ!“

”ہاں ہجور ایمان سے کہتا ہوں۔“

”ارے تو کیا ایک پچاسے کا بھی ڈول نہیں ہے۔“

”کہاں کی بات سرکار! اس ٹل جائیں تو ہزار کھجے۔ پچاس تو پچاس جہنم میں بھی ممکن

نہیں اور وہ بھی جب کوئی مہاجن کھڑا ہو جائے۔“

دارودہ جی نے ایک منٹ تک غور کر کے کہا ”تو پھر اسے ستانے سے کیا فائدہ؟ میں

ایسوں کو نہیں ستاتا جو آپ ہی مر رہے ہوں۔“
 پیٹھوری نے دیکھا کہ نشانہ اور آگے جا پڑا۔ بولے ”نہیں سرکار ایسا نہ کریں، نہیں تو
 پھر ہم کہاں جائیں گے۔ ہمارے پاس دوسری کون سی کھیتی ہے؟“
 ”تم علاقہ کے پنواری ہوگی، کیسی باتیں کرتے ہو؟“
 ”جب ایسا ہی کوئی موقع آجاتا ہے، آپ کی بدولت ہم بھی پا جاتے ہیں، نہیں تو
 پنواری کو کون پوچھتا ہے؟“

”اچھا جاؤ تیس روپے دلوا دو، میں روپے ہمارے اور دس تمہارے۔“
 ”چار کھیاں ہیں، اس کا تو خیال کیجیے؟“
 ”اچھا نصف نصف پر رکھو اور جلدی کرو مجھے دیر ہو رہی ہے۔“
 پیٹھوری نے جھنگری سے کہا۔ جھنگری نے ہوری کو اشارے سے بلایا، اپنے گھر لے
 گئے تیس روپے گن کر اسے دیے اور احسان رکھتے ہوئے بولے ”آج ہی کا گڈ لکھ دینا۔ تمہارا
 منہ دیکھ کر روپے دے رہا ہوں، تمہاری بھلمنسی پر۔“
 ہوری نے روپے لیے اور انگوٹھے کے چھور میں باندھے ہوئے خوش خوش داروغہ جی کی
 طرف چلا۔

یکا یک دنیا جھپٹ کر آگے آئی اور انگوٹھا ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے ہاتھ سے چھین
 لیا۔ گانٹھ مضبوط نہ تھی۔ جھٹکے کے زور سے کھل گئی اور سارے روپے زمین پر بکھر گئے۔ ناگن
 کی طرح پھنکار کر بولی ”یہ روپے کہاں لے جا رہا ہے؟ بتا! بھلا چاہتا ہے تو کبھی روپے لوٹا
 دے نہیں تو کہے دیجی ہوں! گھر کے آدمی رات دن مریں، دانے دانے کو ترسیں، چھتھرا پہنے
 کو نہ ملے اور انجلی بھر روپے لے کر چلا ہے اجت بچانے! ایسی بڑی ہے تیری اجت جس
 کے گھر میں چوہے لوٹیں وہ بھی اجت والا ہے! دروگا حلائی ہی تو لے گا، لے لے جہاں
 چاہے حلائی۔ ایک تو سو روپے کی گائے گئی، اس پر پلچھن! ولہ رے تیری اجت!“
 ہوری لبو کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ کل مجمع جیسے تھرا اٹھا۔ لیڈروں کے سر جھک گئے اور
 تھانیدار کا منہ ذرا سے نکل آیا۔ اپنی زندگی میں ان کی ایسی تو جین نہ ہوئی تھی۔
 ہوری حقیر سا کھڑا رہا۔ زندگی میں آج پہلی بار دنیا نے اسے بھرے اکھاڑے میں
 پٹک دیا، آسمان ٹکا دیا۔ اب وہ کیسے سر اٹھائے؟

مگر داروغہ جی اتنی جلد ہار ماننے والوں میں نہ تھے، کھیا کر بولے ”مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شیطان کی خالہ نے ہیرا کو پھسانے کے لیے خود زہر دے دیا ہے۔“
 دھنیا ہاتھ مٹکا کر بولی ”ہاں دے دیا۔ اپنی گائے تھی، مار ڈالی پھر؟ کسی دوسرے کا جانور تو نہیں مارا! تمہاری جانچ میں یہی لکھا ہے تو یہی لکھو۔ پہنا دو میرے ہاتھ میں جھنڑی۔ دیکھ لیا تمہارا نیاؤ اور تمہاری بدھی کی پہنچ۔ گریبوں کا گھلا کاٹنا دوسری بات ہے اور دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کرنا دوسری بات ہے۔“

ہوری آنکھوں سے انگارے برساتا دھنیا پر جھپٹا مگر گوبر آگے کھڑا ہو گیا اور تیزی سے بولا ”اچھا دادا، اب بہت ہوا پیچھے ہٹ جاؤ نہیں تو کہے دیتا ہوں کہ میرا منہ نہ دیکھو گے۔ تمہارے اوپر ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ ایسا کپوت نہیں ہوں۔ مگر یہیں گلے میں پھانسی لگا لوں گا۔“
 ہوری پیچھے ہٹ گیا اور دھنیا شیر ہو کر بولی ”تو ہٹ جا گوبر دیکھوں تو وہ کیا کرتا ہے میرا! دروگاہی بیٹھے ہیں، اس کی ہمت دیکھوں۔ گھر میں تھلائی ہونے سے اس کی اجت جاتی نہ ہے اور اپنی عورت کو سارے گاؤں کے سامنے لتیانے میں اس کی اجت نہیں جاتی! یہی تو بیروں کا دھرم ہے! بڑا بیر ہے تو کسی مرد سے لڑ! جس کی یاہنہ پکڑ کر لایا اسے مار کر بیرتا دکھا دے گا۔ تو سمجھتا ہوگا کہ میں اسے روٹی کپڑا دیتا ہوں تو لے آج سے اپنا گھر سمکھال۔ دیکھوں تو کہ اسی گاؤں میں تیری چھاتی پر مونگ ڈل کر رہتی ہوں کہ نہیں اور تیرے گھر سے اچھا کھاؤں گی، اچھا پہنوں گی۔ جی میں آوے تو دیکھ لے!“

ہوری مغلوب ہو گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ عورت سے مرد کتنا کمزور ہے، کتنا بے بس۔
 لیڈروں نے روپے جن کر اٹھا لیے تھے اور داروغہ جی کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کر رہے تھے کہ دھنیا نے ایک ٹھوکر اور جمائی ”جس کے روپے ہے اس کو لے جا کر دے دو، ہمیں کسی سے ادھار نہیں لینا ہے اور جو دیتا ہے تو اسی سے لینا۔ میں دمڑی بھی نہ دوں گی چاہے مجھے حاکم کی کچھری تک جانا پڑے۔ ہم باکی چکانے کو بچیں روپے مانگتے تھے تو کسی نے نہ دیا۔ آج اٹلی بھر روپے لٹنا ٹھن نکال کر دے دیے۔ میں سب جانتی ہوں۔ یہاں تو حصہ بانٹ ہونے والا تھا۔ سبکی کے منہ میٹھے ہوتے۔ یہ ہتیارے گاؤں کے کھیا ہیں۔ گریبوں کا کھون چوسنے والے۔ سود بیاج، ڈیڑھی سوائی، نجر بھینٹ، گھوس رسوت، جیسے ہو گریبوں کو لوٹو۔ اس پر سوراج چاہیے۔ جہل سے سوراج نہ ملے گا۔ سوراج ملے گا دھرم سے نیاؤ سے۔“

لیڈروں کے منہ میں کالکھ سی لگ گئی تھی اور داروغہ جی کے منہ پر جھاڑوسی پھر گئی۔ اپنی اپنی عزت رکھنے کے لیے ہیرا کے گھر کی طرف چلے۔

راستے میں تھانیدار نے تسلیم کیا ”عورت ہے بڑی دلیر!“
پیشوری لالا بولے ”دلیر کیا ہے سرکار، کرکسا ہے۔ ایسی عورت کو تو گولی مار دے۔“

”تم لوگوں کا کافیہ تنگ کر دیا اس نے۔ چار چار تو ملتے ہی۔“

”سرکار کے بھی تو پندرہ گئے۔“

”میرے کہاں جاسکتے ہیں نہ دے گا تو گاؤں کے کھیا دیں گے اور پندرہ کی جگہ

پورے پچاس روپے! آپ لوگ فوراً انتظام کیجیے۔“

پیشوری نے ہنس کر کہا ”سرکار بڑے دل لگی باز ہیں۔“

داتا دین بولے ”بڑے آدمیوں کے یہی لہجہ ہیں۔ ایسے بھاگوانوں کے درشن کہاں

ہوتے ہیں۔“

داروغہ نے سخت لہجے میں کہا ”یہ چالوسی پھر کیجیے گا۔ اس وقت تو مجھے پچاس روپے

دلایئے نقد اور یہ سمجھ لو کہ آنا کافی کی تو میں چاروں کے گھر کی تلاشی لوں گا۔ بہت ممکن ہے

کہ تم نے ہیرا اور ہوری کو پھنسا کر ان سے سو پچاس اینٹھ لینے کے لیے یہ حرکت کی ہو۔“

لیڈر لوگ ابھی تک یہ سمجھ رہے تھے کہ داروغہ جی مذاق کر رہے ہیں۔

جنگری سنگھ نے آنکھ مار کر کہا ”نکالو پچاس روپے، پنواری صاحب۔“

نوکھے رام نے تائید کی ”پنواری صاحب کا الاکا ہے۔ انھیں آپ کی کھاطر کرنی ہی

چاہیے۔“ پنڈت نوکھے رام کی چو پال آگئی۔ داروغہ جی ایک پٹنگ پر بیٹھ گئے اور بولے۔

”تم لوگوں نے کیا ملے کیا؟ روپے نکالتے ہو یا تلاشی کراتے ہو۔“

داتا دین نے عذر کیا ”مگر سرکار.....“

”میں اگر مگر کچھ نہیں سننا چاہتا۔“

جنگری سنگھ نے جرأت کی۔ ”سرکار یہ تو سراسر.....“

میں پندرہ منٹ کی مہلت دیتا ہوں اگر اتنی دیر میں پورے پچاس نہ آگئے تو سب کے

گھروں کی تلاشی ہوگی اور گنڈا سنگھ کو جاننے ہو۔ اس کا مارا پانی نہیں مانگتا۔

ہیشوری نے تیز ہو کر کہا ”آپ کو اختیار ہے تلاشی لے لیں۔ یہ ابھی دل لگی ہے کہ کام کون کرے اور پکڑا کون جائے۔“

”میں نے پچیس سال تھانا داری کی ہے جانے ہو۔“

”لیکن ایسا اندھیر تو کبھی نہیں ہوا۔“

”تم نے ابھی اندھیر دیکھا کہاں؟ کہو تو وہ بھی دکھا دوں۔ ایک ایک کو پانچ پانچ

سال کے لیے بھجوا دوں۔ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایک ڈاکے میں کل گاؤں کو کالا

پانی دلا سکتا ہوں۔ اس دھوکے میں نہ رہنا۔“

چاروں آدمی چوپال کے اندر جا کر صلاح کرنے لگے۔

پھر کیا ہوا کسی کو معلوم نہیں۔ ہاں داروغہ جی خوش خرم نظر آرہے تھے اور چاروں

آدمیوں کے منہ پر لعنت برس رہی تھی۔

داروغہ جی گھوڑے پر سوار ہو کر چلے تو چاروں لیڈر لوگ پیچھے دوڑ رہے تھے۔ گھوڑا دور

نکل گیا تو لوٹے اس طرح جیسے کسی عزیز کی لاش جلا کر مرگٹ سے لوٹ رہے ہوں۔

یہ ایک داتا دین بولے ”میرا سراپ نہ پڑے تو منہ نہ دکھاؤں۔“

نوکے رام نے تائید کی ”ایسا دھن کبھی پھلتے نہیں دیکھا۔“

ہیشوری نے پشیم گوئی کی۔ ”حرام کی کمانی حرام میں جائے گی۔“

جنگری سنگھ کو آج خدائی انصاف میں شہ پڑ گیا تھا۔ بھگوان نہ جانے کہاں ہے،

اندھیر دیکھ کر بھی پاپیوں کو ڈنڈ نہیں دیتا۔

اس وقت ان لوگوں کی تصویر دیکھنے لائق تھی۔

ہیرا کا کہیں پتہ نہ چلا اور دن گزرتے جاتے تھے۔ ہوری سے جہاں تک بن پڑا دوڑھوپ کی پھر ہار کر بیٹھ رہا۔ کھیتی باڑی کی فکر کرنی تھی۔ اکیلا آدمی کیا کیا کرتا؟ اور اب اپنی کھیتی سے زیادہ فکر تھی پٹیا کی کھیتی کی۔ پٹیا اب تنہا ہو کر اور بھی تیز پڑ گئی تھی۔ ہوری کو اب اس کی خوشامد کرتے گزرتی تھی۔ ہیرا تھا وہ پٹیا کو دبائے رہتا تھا۔ اس کے چلے جانے سے اب پٹیا پر کوئی آگس نہ رہ گیا تھا۔ ہوری کی مخالفت ہیرا سے تھی۔ پٹیا عورت تھی۔ اس سے وہ کیا تنا تتی کرتا۔ اور پٹیا اس کے مزاج سے واقف تھی اور اس کی شرافت کا اسے خوب مزہ چکھاتی تھی۔ خیریت یہی ہوئی کہ کارندہ صاحب نے پٹیا سے بٹایا لگان وصول کرنے کے لیے کوئی سختی نہیں کی، صرف تھوڑی سی نذر پاکر راضی ہو گئے ورنہ ہوری اپنے بٹایا کے ساتھ اس کا بٹایا ادا کرنے کے لیے بھی قرض لینے کو تیار تھا۔ سادوں میں دھان لگانے کی ایسی کثرت رہی کہ مزدور نہ ملے اور ہوری اپنے کھیتوں میں دھان نہ لگا سکا۔ لیکن پٹیا کے کھیتوں میں کیسے نہ لگائے جاتے.....؟ ہوری نے پہر پہر رات گئے تک کام کر کے اس کے دھان لگائے۔ اب ہوری ہی تو اس کا محافظ تھا اگر پٹیا کو کوئی تکلیف ہوئی تو دنیا اسی پر تو بیٹے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہوری کے خریف کی فصل میں بہت تھوڑا اناج ملا اور پٹیا کہ یہاں دھان رکھنے کی جگہ نہ تھی!

ہوری اور دھنیا میں اس دن سے برابر کشیدگی چلی آتی تھی۔ گوبر سے بھی ہوری کی بول چال بند تھی۔ ماں بیٹے نے مل کر گویا اس کا ہانکٹ کر دیا تھا۔ اپنے گھر میں پردیسی بنا ہوا تھا۔ دو کشیوں میں سوار ہونے والے کی جو درگت ہوتی ہے وہی اس کی ہوری تھی۔ گاؤں میں بھی اب اس کی اتنی عزت نہ تھی۔ دھنیا اپنی ہمت سے صرف عورتوں کی نہیں بلکہ مردوں کی بھی لیڈر بن بیٹھی تھی۔ مہینوں تک قرب و جوار کے علاقوں میں اس واقعے کا خوب چرچا رہا۔ حتیٰ کہ وہ ایک آسانی صورت اختیار کرتا جاتا تھا ”دھنیا پر دیوی جی کا اشت ہے۔ داروہہ جی نے جیوں ہی اس کے آدمی کے ہاتھوں میں پھنکڑی ڈالی کہ دھنیا نے دیوی کو یاد کیا۔

دیوی اس کے سر آگئی پھر تو اس میں اتنی سکت آگئی کہ اس نے ایک جھٹکے میں اپنے مرد کی جھٹکڑی توڑ ڈالی اور داروغہ کی مونچھیں پکڑ کر اکھاڑ لیں ، پھر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ داروغہ نے جب بہت منت کی تب جا کر اسے چھوڑا۔ کچھ دن تک لوگ دھنیا کے درشن کو آتے رہے۔ وہ بات تو پرانی پڑ گئی مگر گاؤں میں دھنیا کی عزت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس میں عجیب ہمت ہے جو وقت پر مردوں کے بھی کان کاٹ سکتی ہے۔

مگر رفتہ رفتہ دھنیا میں ایک تبدیلی ہو رہی تھی۔ ہوری کو پنیا کی کھیتی میں لگا ہوا دیکھ کر وہ کچھ نہ بولتی تھی۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ وہ ہوری کی طرف سے بالکل بے پرواہ ہو گئی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ پنیا پر اسے اب رحم آتا تھا۔ ہیرا کا گھر سے بھاگ جانا اس کا بدلہ پورا کرنے کے لیے کافی تھا۔

اسی اثنا میں ہوری کو بخار آنے لگا۔ فصلی بخار پھیلا ہی تھا۔ ہوری بھی اسی کی زد میں آگیا۔ اور کئی سال کے بعد بخار آیا تو اس نے سارا بقیہ وصول کر لیا۔ ایک مہینے تک ہوری بستر پر پڑا رہا۔ اس بیماری نے ہوری کو کچل ہی ڈالا۔ مگر دھنیا پر بھی فتح حاصل کر لی۔ شوہر جب مر رہا ہے تو اس سے کیسا حیر؟ ایسی حالت میں تو بیروں سے بھی حیر نہیں رہتا پھر وہ تو اپنا ہی مرد ہے۔ لاکھ برا ہو مگر اس کے ساتھ زندگی کے پچیس سال کئے ہیں۔ آرام ملا ہے تو اسی کے ساتھ اور تکلیف جھیلی ہے تو اسی کے ساتھ۔ اب چاہے وہ اچھا ہے یا برا، اپنا ہے۔ داری جارنے مجھے سب کے سامنے مارا۔ سارے گاؤں کے سامنے میرا پانی اتار لیا۔ لیکن تب سے کتنا لجاتا ہے کہ سیدھے تاکتا بھی نہیں۔ کھانے آتا ہے تو سر جھکائے کھا کر اٹھ جاتا ہے ، ڈرتا رہتا ہے میں کچھ کہہ نہ بیٹھوں۔

ہوری جب اچھا ہوا تو شوہر وزن میں میل ہو گیا تھا۔

ایک دن دھنیا نے کہا ”تمہیں اتنا کتنے کیسے آگیا؟ مجھے تمہارے اوپر کتنا کسے آوے پر ہاتھ نہ اٹھاؤں گی۔“

ہوری نادم ہو کر بولا ”اب اس کا چرچا نہ کر دھنیا۔ میرے اوپر کوئی بھوت سوار تھا۔ اس کا مجھے کتنا دکھ ہوا ہے یہ میں جانتا ہوں۔“

”اور جو میں بھی اسی رس میں ڈوب مری ہوتی؟“

”تو کیا رونے کے لیے بیٹھا رہتا؟ میری لاش بھی تیرے ساتھ چتا پر جاتی۔“

”اچھا چپ رہو، بے بات کی بات مت کہو۔“
 ”گائے گئی سو گئی، میرے سر ایک پتہ ڈال گئی۔ پنیا کی چتا مجھے مارے ڈالتی ہے۔“
 ”اسی لیے تو کہتے ہیں کہ بھگوان گھر کا بڑا نہ بناوے۔ چھوٹوں کو کوئی نہیں ہنسا، نیکی
 بدی سب بڑوں کے سر جاتی ہے۔“

ماگھ کے دن تھے۔ مہاوٹ لگ رہی تھی۔ گھنا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا ایک تو جاڑوں
 کی رات دوسرے ماگھ کی برکھا، موت کا سناٹا تھا۔ ہوری کھانا کھا کر پنیا کے مڑ کے کھیت کی
 مینڈ پر اپنی جھونپڑی پر لیٹا ہوا تھا۔ چاہتا تھا کہ ٹھنڈ کو بھول جائے اور سورہے مگر تار تار کھل
 اور بھٹی ہوئی مرزئی اور ٹھنڈ سے گیلا پوال، اتنے ہیروں کے سامنے آنے کی ہمت نیند میں نہ
 تھی۔ آج تمباکو بھی نہ ملا کہ اس سے دل بہلتا۔ اپلا سگ لایا تھا۔ پر وہ بھی ٹھنڈ سے ٹھنڈا ہو
 گیا تھا۔ بوائی پھنے پیروں کو پیٹ میں ڈال کر اور ہاتھوں کو رانوں کے چچ میں دبا کر اور کھل
 میں منہ چھپا کر اپنی ہی گرم سانسوں سے اپنے کو گرمی پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پانچ سال
 ہوئے یہ مرزئی بنوائی تھی۔ دھنیانے ایک طرح سے جبراً بنوادی تھی۔ وہی جب ایک بار ایک
 کابلی سے کپڑے لیے تھے جس کے پیچھے کتنی آفت ہوئی اور کتنی گالیاں کھانا پڑیں۔ اور یہ کھل
 تو اس کے جنم سے بھی پہلے کا ہے بچپن میں وہ اپنے باپ کے ساتھ اس میں سوتا تھا، جوانی
 میں گوبر کو لے کر اس کھل میں اس کے جاڑے کٹتے تھے، اور بڑھاپے میں آج وہی بوڑھا
 کھل اس کا ساتھی ہے۔ مگر اب وہ کھانے کو چبانے والا دانت نہیں بلکہ دکھنے والا دانت ہے
 زندگی میں ایسا تو کوئی دن نہیں آیا کہ زمیندار اور مہاجن کو دے کر کبھی کچھ۔ بچا ہو، اور بیٹھے
 بیٹھائے یہ ایک جنجال پڑ گیا۔ نہ کرو تو دنیا بنے اور کرو تو یہ کھٹکا لگا رہے کہ لوگ کیا کہتے
 ہیں۔ سب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پنیا کو لوٹے لیتا ہے۔ احسان تو کیا ہوگا الٹا کلنگ لگتا ہے۔ اور
 ادھر بھولا کئی بار یاد دلا چکے ہیں کہ کہیں سگائی کا ڈول کرو، اب کام نہیں چلتا۔ سو بھا اس سے
 کتنی بار کہہ چکا ہے کہ پنیا کا خیال اس کی طرف سے اچھا نہیں ہے۔ نہ ہو پنیا کی گرتی تو
 اسے سنبھالتی ہی پڑے گی، چاہے ہنس کر سنبھالے یا روکر۔ دھنیانے دل بھی ابھی تک صاف
 نہیں ہوا۔ ابھی تک اس کے دل میں ملال بھرا ہوا ہے۔ مجھے سب آدمیوں کے سامنے اسے
 مارنا نہ چاہیے تھا۔ جس کے ساتھ پچیس سال بیت گئے اسے مارنا اور کل گاؤں کے سامنے
 مارنا میرا کمینہ پن تھا۔ مگر دھنیانے بھی میری آبرو اتارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

میرے سامنے سے کیسا کترا کر نکل جاتی جیسے کبھی کی جان پہچان ہی نہیں کوئی بات کہنی ہوتی تو سونا یا روپا سے کہلاتی۔ دیکھتا ہوں کہ اس کی ساڑی پھٹ گئی ہے۔ مگر کل مجھ سے کہا بھی تو سونا کی ساڑی کے لیے اپنی ساڑی کا نام تک نہ لیا۔ سونا کی ساڑی دو ایک مہینے گانتھ جوڑ کر چل سکتی ہے اس کی ساڑی تو تھمکیدوں سے بالکل گزری ہو گئی ہے۔ اور پھر میں ہی کون اس کا من رکھ رہا ہوں؟ اگر میں ہی اس کے من کی دوچار باتیں کرتا رہتا تو کون چھوٹا ہو جاتا۔ یہی تو ہوتا ہے کہ وہ تھوڑا سا منادوں کراتی، دوچار گلے والی باتیں سناتی، تو کیا مجھے چوٹ لگ جاتی؟ پھر میں بوڑھا ہو کر بھی الو بنا رہا۔ وہ تو کہو اس بیماری نے اسے نرم کر دیا، نہیں تو نہ جانے کب تک منہ پھلائے رہتی۔

اور آج ان دونوں میں جو باتیں ہوئی تھیں وہ گویا بھوکے کے لیے غذا تھیں۔ وہ دل سے بولی تھی اور ہوری گمن ہو گیا تھا۔ جی میں آیا کہ اس کے پیروں پر سر رکھ دے اور کہے ”میں نے تجھے مارا ہے تو لے میں بھی سر جھکائے دیتا ہوں جتنا چاہے مار لے، جتنی گالیاں دینا چاہے دے لے۔“

یہ ایک اسے جھونپڑی کے سامنے چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ اس نے کان لگا کر سنا، ہاں کوئی ہے۔ پنواری کی لڑکی ہوگی یا چاہے پنڈت کی گھروالی ہو۔ منڑ اکھاڑنے آئی ہوگی، نہ جانے کیوں ان لوگوں کی نیت اتنی کھوٹی ہے۔ سارے گاؤں سے اچھا پہنتے ہیں، گھر میں ہجاردوں روپے گڑے ہوئے ہیں، لین دین کرتے ہیں۔ ڈیرھی سوائی چلاتے ہیں، گھوس لیتے ہیں، دستواری لیتے ہیں ایک نہ ایک معاملہ کھڑا کر کے اُسے بھی پیستے ہی رہتے ہیں، پھر بھی نیت کا یہ حال! باپ جیسا ہوگا ویسی ہی سنتان بھی ہوگی اور آپ نہیں آتے عورتوں کو بھیجتے ہیں۔ ابھی اٹھ کر ہاتھ پکڑ لوں تو کیا پانی رہ جائے؟ چھوٹا کہنے کو چھوٹا ہے پھر جو بڑا ہے اس کا جی تو اور بھی چھوٹا ہے۔ عورت جات کا تو ہاتھ بھی نہیں پکڑتے بنتا۔ آنکھوں دیکھ کر کبھی نگنی پڑتی ہے، اکھاڑ لے بھائی جتنا تیرا جی چاہے۔ سمجھ لے میں نہیں ہوں۔ بڑے لوگ اپنی لاج نہ رکھیں، چھوٹوں کو تو ان کی لاج رکھنی ہی پڑتی ہے۔

مگر نہیں، یہ تو دھنیا ہے پکار رہی ہے۔

دھنیا نے پکارا ”سو گئے کہ جاگتے ہو۔“

ہوری چھپٹ کر اٹھا اور جھونپڑی کے باہر آیا۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ دیوی گمن ہو کر

اے بھوان دینے آئی ہے ، اس کے ساتھ ہی اس بادل بوندی اور جاڑے پالے میں اتنی رات گئے اس کا آنا اندیشے کی بات تھی ۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہوئی ہے ۔

”بولا“ ٹھنڈ کے مارے نیند بھی آتی ہے ۔ تم اس جاڑے پالے میں کیسے آئیں ؟ سب کسل تو ہے ۔“

”ہاں سب کسل ہے ۔“

”گوبر کو بھیج کر مجھے کیوں نہیں بلوایا ۔“

دھیانے کوئی جواب نہ دیا ۔ جھونپڑی میں آکر پوال پر بیٹھتی ہوئی بولی ”گوبر نے منہ پر کالکھ لگادی ، اس کی کرنی کا کیا پوچھتے ہو ؟ جس بات کو میں ڈرتی تھی وہی ہو کر رہی ۔“

”کیا ہوا کیا ؟ کسی سے مار پیٹ کر بیٹھا ؟“

”اب میں کیا جانوں ، کیا کر بیٹھا ؟ چل کر پوچھو اسی راٹھ سے !“

”کس راٹھ سے ؟ کیا کہتی ہے تو ؟ بورا تو نہیں گئی ہے ؟“

”ہاں بورا کیوں نہ جاؤں گی ، بات ہی ایسی ہوئی ہے کہ چھاتی دونی ہو جائے ۔“

ہوری کے دل میں روشنی کا ایک طویل خط کھینچ گیا ۔

”صاف صاف کیوں نہیں کہتی ؟ کس راٹھ کو کہہ رہی ہے ؟“

”اسی جھینڈا کو اور کس کو !“

”تو جھینڈا کیا یہاں آئی ہے ؟“

”اور کہاں جاتی ؟ پوچھتا کون ؟“

”گوبر کیا گھر میں نہیں ہے ؟“

”گوبر کا کہیں پتہ نہیں ، جانے کہاں بھاگ گیا ۔ اسے پانچ مہینے کا پیٹ ہے ۔“

ہوری سب کچھ سمجھ گیا ۔ گوبر کو باز بار اچھرن ٹولہ جاتے دیکھ کر وہ کھٹک گیا مگر اسے کھلاڑی نہ سمجھتا تھا ۔ نوجوانوں میں کچھ لگاوت ہوتی ہی ہے ، اس میں کوئی غی بات نہیں مگر جس روٹی کے گالے کو نیلے آسمان میں ہوا کے جھونکوں سے اڑتا دیکھ کر وہ صرف مسکرا دیا تھا ، وہی سارے آسمان میں پھیل کر اس کے راستے کو اتنا تاریک بنا دے گا ، یہ تو کوئی دیوتا بھی نہ جان سکتا تھا گوبر ایسا بد چلن ! وہ سیدھا سادا اور گنوار جسے وہ ابھی بچہ سمجھتا تھا ! مگر اسے بھونچ پڑ جانے کی فکر نہ تھی ، پتہ چایت کا خوف نہ تھا ، جھینڈا کیسے گھر میں رہے گی ، اس کی فکر

اسے نہ تھی ، اسے لکڑھی تو گوبر کی ۔ لڑکا شرمیلا ہے ، اناڑی ہے ، پانی دار ہے ، کہیں کوئی نادانی نہ کر بیٹھے ۔

گھبرا کر بولا ”جھینڈا نے کچھ کہا نہیں کہ گوبر کہاں گیا ؟ اس سے تو کہہ کر ہی گیا ہوگا ۔“
 دھنیا جھنجھلا کر بولی ”تمہاری اکل تو گھاس کھا گئی ہے ۔ اس کی چیتنی تو یہاں بیٹھی ہے وہ بھاگ کر جائے کہاں ؟ یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہوگا دودھ تھوڑے ہی پیتا ہے کہ کھو جائے گا مجھے تو اس کل منی جھینڈا کی چتا ہے کہ اسے کیا کروں ۔ اپنے گھر تو چھن بھر نہ رہنے دوں گی ۔ جس دن گائے لانے گیا ہے اسی دن سے دونوں میں تاک جھانک ہونے لگی تھی ۔ پیٹ نہ رہتا تو ابھی بات نہ کھلتی ۔ مگر پیٹ رہ گیا تو لگی جھینڈا گھبرانے ۔ کہنے لگی کہ کہیں بھاگ چلو ۔ گوبر نالتا رہا ۔ ایک عورت کو ساتھ لے کر کہاں جائے ، کچھ نہ سوچھا ۔ پر جب آج وہ سر ہو گئی کہ مجھے یہاں سے لے چلو نہیں تو میں جان دے دوں گی ، تو بولا ”تو چل کر میرے گھر میں رہ کوئی کچھ نہ بولے گا ۔ میں اماں کو مناؤں گا تب یہ کل منی اس کے ساتھ چل پڑی کچھ دور تو وہ آگے آگے آتا رہا پھر نہ جانے کدھر سرک گیا ۔ یہ کھڑی کھڑی اسے پکارتی رہی جب رات بھیک گئی اور وہ نہ لوٹا تو یہ بھاگتی ہوئی یہاں چلی آئی ۔ میں نے کہہ دیا کہ جو کیا ہے اس کا پھل بھوگ ۔ ابھانگنی نے میرے لڑکے کو چوہٹ کر دیا ۔ تب سے بیٹھی رو رہی ہے ، اٹھتی ہی نہیں کہتی ہے ۔ اپنے گھر کس منہ سے جاؤں ؟ بھگوان ایسی سنتان سے تو بانجھ ہی رکھے تو اچھا ۔ سیرے ہوتے ہوتے سارے گاؤں میں کاؤں کاؤں مچ جائے گی ۔ ایسا جی ہوتا ہے کہ دس کھالوں ، میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ میں اپنے گھر نہ رکھوں گی ۔ گوبر کو رکھنا ہے تو اپنے سر پر رکھے ، میرے گھر میں ایسوں کے لیے جگہ نہیں اور اگر تم بچ میں بولے تو یا تو تم رہو گے یا میں رہوں گی ۔“

ہوری بولا ”جھ سے بنا نہیں ۔ اسے گھر میں آنے ہی نہ دینا چاہیے تھا ۔“

”سب کچھ کہہ کر ہار گئی تھی ہی نہیں ، دھرتا دیے بیٹھی ہے ۔“

”اچھا چل دیکھو کیسے نہیں اٹھتی ۔ گھسیٹ کر باہر نکال دوں گا ۔“

”داری جار بھولا سب کچھ دیکھ رہا تھا ۔ پر چپ ہی سادھے بیٹھا رہا ۔ باپ بھی ایسے

بے حیا ہوتے ہیں ۔“

”وہ کیا جانتا تھا کہ ان میں کیا کچھڑی پک رہی ہے ۔“

”جانتا کیوں نہیں تھا؟ گوبر رات دن گھبرے رہتا تھا تو کیا اس کی آنکھیں پھوٹ گئیں تھیں؟ سوچنا چاہیے تھا کہ یہاں کیوں دوڑ دوڑ کر آتا ہے۔“

”چل میں تمھیا سے پوچھتا ہوں نا۔“

دونوں جھوپڑی سے نکل کر گاؤں کی طرف چلے۔ ہوری نے کہا ”پانچ گھڑی رات سے اوپر ہو گئی ہوگی۔“

”دھنیا بولی ”ہاں اور کیا۔ مگر کیسا سوتا پڑ گیا ہے کہ کوئی چور آئے تو گاؤں بھر کر لوٹ کر لے جائے۔“

”چور ایسے گاؤں میں نہیں آتے۔ امیروں کے گھر آتے ہیں۔“

دھنیا نے ذرا رک کر ہوری کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی ”دیکھو سونہ چھاپا نہیں سارا گاؤں جاگ اٹھے گا اور بات بھیل جائے گی۔“

”ہوری نے سخت لہجے میں کہا ”میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاتھ پکڑ کر تھیت لاؤں گا اور گاؤں کے باہر کر دوں گا۔ بات تو ایک دن کھلنی ہے پھر آج ہی کیوں نہ کھل جائے؟ وہ میرے گھر آئی کیوں؟ جائے جہاں گوبر ہو۔ اس کے ساتھ کٹرم کیا تو کیا ہم سے پوچھ کر کیا تھا۔“

”دھنیا نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ سے کہا ”تم اس کا ہاتھ پکڑ دے تو چلائے گی۔“

”تو چلایا کرے۔“

”مدا اتنی رات گئے اس اندھیرے، سنائے میں جائے گی کہاں، یہ تو سوچو۔“

”جائے جہاں اس کے گئے ہوں۔ ہمارے گھر میں اس کا کیا رکھا ہے۔“

”ہاں پر اتنی رات گئے گھر سے نکالنا ٹھیک نہیں۔ پاؤں بھاری ہے کہیں ڈر ڈرا جائے تو اور آہٹ ہو۔ ایسی دسامیں کچھ کرتے دھرتے بھی تو نہیں بنتا۔“

”ہمیں کیا کرنا ہے، مرے یا جیے۔ جہاں چاہے جائے۔ کیوں اپنے منہ میں کالکھ

لگاؤں؟ میں تو گوبر کو بھی نکال باہر کروں گا۔“

دھنیا نے بہت متفکر ہو کر کہا ”کالکھ جو گنتی تھی وہ تو لگ گئی۔ وہ تو اب جیتے جی نہیں چھوٹ سکتی۔ گوبر نے ناؤ ڈبا دی۔“

”گوبر نے نہیں ڈبائی، ڈبائی اس نے۔ وہ تو بچہ تھا اس کے بچے میں آگیا۔“

”کسی نے ڈبائی ہو اب تو ڈوب گئی۔“

”دونوں دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ دفعتاً دھنیا نے ہوری کے گلے میں ہاتھ ڈال

کر کہا۔“ دیکھو تمہیں میری سوگند، اس پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ وہ تو آپ ہی رو رہی ہے۔ بھاگ

کی کھوٹی نہ ہوتی تو یہ دن کیوں آتا۔“

ہوری کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دھنیا کی یہ نسوانی محبت اس تاریکی میں بھی گویا چراغ کی

طرح اس کی فکر مند صورت کو منور کر رہی تھی۔ دونوں کے دل میں گویا گزرا ہوا شباب جاگ

اٹھا تھا۔ ہوری کو اس ڈھلی ہوئی عورت میں بھی وہی نرم و نازک دل والی لڑکی نظر آئی جو بچپن

سال پہلے اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ اس گلے گلنے میں کتنا اتھاہ پریم تھا جو سارے

کلنگ، ساری تکلیفوں اور سب ہی رواجی بندشوں کو اپنے اندر سیٹھ لیتا تھا۔

دونوں نے دروازے پر آکر کواڑ کی درازوں سے اندر جھانکا۔ ڈیوٹ پر تیل کی لمبی

جل رہی تھی اور اس کی دھندلی روشنی میں جھنڈا گھٹنے پر سر رکھے، دروازے کی طرف منھ کیے،

اندھیرے میں اس خوشی کو تلاش کر رہی تھی جو ابھی ایک لمحہ قبل اپنا دل فریب جلوہ دکھا کر غائب

ہو گئی تھی۔ وہ آفت کی ماری طفرے کے تیروں سے زخمی اور زندگی کے صدموں سے پریشان کسی

پڑ کی چھاؤں کھوجتی پھرتی تھی اور اسے ایک مکان بھی مل گیا تھا، جس کی پناہ میں وہ خود کو

محفوظ و سرور سمجھ رہی ہے مگر آج وہ مکان اپنے سارے سکھ کا ساز و سامان لیے ہوئے الہ دین

کے شاہی محل کی طرح غائب ہو گیا تھا اور مستقبل ایک خوفناک دیو کی طرح اسے نگل جانے کو

کھڑا تھا۔

دفعتاً دروازہ کھلتے اور ہوری کو آتے دیکھ کر وہ خوف سے کانپتی ہوئی اٹھی اور ہوری کے

قدموں پر گر کر روتی ہوئی بولی ”دادا اب تمہارے سوائے مجھے دوسرا ٹھوہر نہیں ہے۔ چاہے

مارو چاہے کاٹو، مگر اپنے دوارے سے دُر دُراؤ مت!“

ہوری نے جبکہ کر پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔ ”ڈر مت بیٹی، ڈر مت،

تیرا گھر ہے، تیرا دوار ہے، تیرے ہم ہیں۔ آرام سے رہ جیسی تو بھولا کی بیٹی ہے ویسی ہی

میری بیٹی ہے۔ جب تک ہم جیتے ہیں کسی بات کا کھٹکا مت کر ہمارے رہتے کوئی تجھے میڑھی

آنکھ سے نہ دیکھ سکے گا۔ برادری کو بھوج جو لگے گا وہ ہم سب دے دیں گے۔ تیرے لیے

کوئی چٹا کی بات نہیں۔“

جھپیا یہ دلاسا پا کر اور بھی ہوری کے قدموں سے لپٹ گئی اور بولی ”دادا اب تم ہی میرے باپ ہو، اور اماں! تم ہی میری ماں ہو۔ میں اتنا تھ ہوں۔ مجھے سرن دو۔ نہیں تو میرے کا کا اور بھائی مجھے کچا کھا جائیں گے۔“

دھنیا رقت کے جوش کو اب نہ روک سکی۔ بولی ”تو چل گھر میں بیٹھ، میں دیکھ لوں گی کا کا اور بھیا کو۔ سنسار میں ان کا راج نہیں ہے۔ بہت کریں گے اپنے کہنے لے لیں گے۔ پھینک دینا اتار کر!“

ابھی ذرا دیر پہلے دھنیا نے غصے کے جوش میں جھپیا کو ابھائی، کلکتن اور کل منی، نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا تھا۔ جھاڑو مار کر گھر سے نکالنے جاری تھی، اب جو جھپیا نے محبت، عفو اور تسکین سے بھرے یہ کلمے سنے تو ہوری کے پاؤں چھوڑ کر دھنیا کے پاؤں سے لپٹ گئی اور وہی پاک باز عورت جس نے ہوری کے سوا کسی مرد کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہ تھا، اس پاپی جھپیا کو گلے لگائے اس کے آنسوؤں پونچھ رہی تھی اور اس کے دبے ہوئے دل کو اپنی ملائم باتوں سے تسلی دے رہی تھی، جیسے کوئی چڑیا اپنے بچوں کو پروں میں چھپائے بیٹھی ہو!“

ہوری نے دھنیا کو اشارہ کیا کہ اسے کچھ کھلا پلا دے اور جھپیا سے پوچھا۔ ”کیوں بیٹی تجھے کچھ معلوم ہے کہ گوبر کدھر گیا ہے؟“

جھپیا نے سکتے ہوئے کہا ”مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ میرے کارن تمہارے اوپر.....“ یہ کہتے کہتے اس کی آواز آنسوؤں سے رک گئی۔

ہوری اپنی بے چینی نہ چھپا سکا۔

”جب تو نے آج اسے دیکھا وہ کچھ دکھی تھا؟“

”باتیں تو ہنس ہنس کے کر رہے تھے۔ من کا حال رام جانے۔“

”تیرا من کیا کہتا ہے؟ ہے گاؤں ہی میں کہ کہیں باہر چلا گیا؟“

”مجھے تو شک ہوتا ہے کہ کہیں باہر چلے گئے ہیں۔“

”یہی میرا من بھی کہتا ہے۔ کسی نادانی کی۔ ہم اس کے بیری تھوڑے ہی تھے۔ جب بھلی یا بری ایک بات ہو گئی تو اسے ناہنٹا پڑتا ہے۔ اس طرح بھاگ کر تو اس نے ہماری جان شکٹ میں ڈال دی۔“

دھنیا نے جھنیا کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جاتے ہوئے کہا۔ ”منہ چور کہیں کا! جس کی
بانہہ پکڑی اس کا نباہ کرنا چاہیے کہ منہ میں کا لکھ پوت کر بھاگ جانا چاہیے؟ اب تو آوے تو
گھر میں گھسنے نہ دوں۔“

ہوری وہیں پوال پر لیٹا۔ گوبر کہاں گیا؟ یہ سوال اس کے دل کے آسمان میں کسی پرند
کی طرح منڈلانے لگا۔

ایسے غیر معمولی واقعہ پر گاؤں میں جو کچھ ہل چل مچنا چاہیے تھی وہ مچی اور مہینوں تک بچتی رہی۔ جھنڈا کے دونوں بھائی لالھیاں لے کر گوبر کو کھوہتے پھرتے تھے۔ بھولا نے قسم کھائی کی نہ تو جھنڈا کا منہ دیکھیں گے نہ اس گاؤں گا۔ ہوری سے انھوں نے اپنی بیاہ کی جو بات چیت کی تھی وہ اب بند ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنی گائے کے روپے لیں گے اور نقد، اور اس میں دیر ہوئی تو ہوری پر دعویٰ کر کے اس کا گھر بار نیلام کرالیں گے۔ گاؤں والوں نے ہوری کو برادری سے خارج کر دیا۔ کوئی اس کا حقہ نہیں پیتا، نہ اس کے گھر کا پانی پیتا۔ کنوئیں سے پانی بند کر دینے کی کچھ بات چیت تھی مگر دھنیا کا غصہ سب دیکھ چکے تھے۔ بس کسی کو آگے آنے کی ہمت نہ پڑی۔ دھنیا نے سب کو سنا سنا کر کہہ دیا کہ کسی نے اسے پانی بھرنے سے روکا تو اس کا اور اپنا خون ایک کر دوں گی۔

اس للکار نے سبھی کے پتے پانی کر دیے۔ سب سے دکھی ہے جھنڈا جس کے سبب یہ سارا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ اور گوبر کی کوئی کھوج خبر نہ ملنا اس دکھ کو اور بھی بڑھائے دیتا ہے، تمام دن منہ چھپائے گھر میں پڑی رہتی ہے۔ باہر نکلے تو چاروں طرف سے طنزیہ تیروں کی بارش ہوتی ہے کہ جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ دن بھر گھر کا کام دھندا کرتی رہتی ہے اور جب فراغت پاتی ہے تو رو لیتی ہے۔ ہر وقت قہر قہر کا پتی رہتی ہے کہ دھنیا کہیں کچھ کہہ نہ بیٹھے۔ صرف کھانا نہیں پکا سکتی کیونکہ اس کے ہاتھ کا کوئی کھائے گا نہیں، باقی سارا کام اس نے اپنے اوپر لے لیا ہے۔ گاؤں میں جہاں چار عورت مرد جمع ہو جاتے ہیں یہی تذکرہ ہونے لگتا ہے۔

ایک دن دھنیا بازار سے چلی آ رہی تھی کہ راستے میں پنڈت داتا دین مل گئے۔ دھنیا نے سر نیچا کر لیا اور چاہتی تھی کہ کترا کر نکل جائے مگر پنڈت داتا دین جی چھیڑ کا موقع پا کر کہاں چوکنے والے تھے، چھیڑ ہی تو بیٹھے۔ ”گوبر کا کچھ پتہ سندیا ملا کہ نہیں؟ ایسا کپوت نکلا کے گھر کی ساری مرچاد بگاڑ دی۔“

دھنیا کے دل میں خود ہی خیال آتا رہتا تھا۔ اداس من سے بولی ”برے دن آتے ہیں بابا، تو آدمی کی مت ماری جاتی ہے، اور کیا کہوں۔“

داتا دین بولے ”تصیں اس پابن کو گھر میں نہ رکھنا چاہیے تھا۔ دودھ میں کھسی پڑ جاتی ہے تو آدمی اسے نکال کر پھینک دیتا ہے اور دودھ پی جاتا ہے سوچو، کتنی بدنامی اور جگ ہنسائی ہو رہی ہے۔ کھنسی گھر میں نہ رہتی تو کچھ نہ ہوتا۔ لڑکوں سے اس طرح کی بھول چوک ہوتی ہی رہتی ہے۔ جب تک برادری کو بھوج نہ دوگی اور برہمنوں کو نہ کھلاؤ گی تب تک کیسے اڈھار ہوگا۔ اسے گھر میں نہ رکھتے تو کچھ نہ ہوتا۔ ہوئی تو پاگل ہے ہی۔ پر تو کیسے دھوکا کھا گئی۔“

”داتا دین کا لڑکا ماتا دین ایک چھاری سے آشنائی کیسے ہوئے تھا۔ اسے سارا گاؤں جانتا تھا۔ مگر وہ تلک لگاتا تھا، پتھی پترا پڑھتا تھا، کتھا، بھاگوت کہتا تھا اور پرودہتی کا کام کرتا تھا۔ اس کے وقار میں ذرا بھی کمی نہ تھی۔ وہ روزانہ اشنان پوجا کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ کر دیتا تھا۔ دھنیا جانتی تھی کہ جھنیا کو گھر میں رکھنے ہی سے یہ ساری بلا آئی ہے۔ اسے نا جانے کیسے دیا آگئی ورنہ اسی رات جھنیا کو نکال دیتی تو کیوں اتنی بدنامی ہوتی۔ مگر یہ خوف بھی تو تھا تب اس کے لیے کنواں تالاب کے سوا اور ٹھکانا کہاں تھا؟ ایک نہیں بلکہ دو جانوں کی قیمت دے کر وہ اپنے مرجاد کو کیسے بچاتی؟ پھر جھنیا کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ دھنیا ہی کے کلیجہ کا ٹکڑا ہے۔ ہنسی کے ڈر سے اس کی جان کیسے لے لیتی؟ اور پھر جھنیا کی بے کسی اور عاجزی بھی تو اسے متاثر کرتی رہی تھی اور اس کے پیر دھلانے لگتی، اس کا غصہ پانی ہو جاتا۔ بچاری لاج اور دکھ سے آپ ہی دبی ہوئی تھی اسے اور کیا دہائے؟ سرے کو اور کیا مارے؟

اس نے تند لہجہ میں کہا ”ہم کو گھرانے کی مرجاد اتنی پیاری نہیں ہے مہراج! کہ اس کے پیچھے ایک جیو کی ہتیا کر ڈالتے۔ بیاتنا نہ سہی، پر اس کی ہاتھ کی باہنہ تو پکڑی ہے میرے ہی بیٹے نے۔ کس منہ سے نکال دیتی؟ وہی کام بڑے بڑے کرتے ہیں تو ان کی مرجاد دھو جاتی ہے، ناک کٹ جاتی ہے۔ بڑے آدمیوں کو اپنی ناک دوسروں کی جان سے پیاری ہوگی، ہمیں تو اپنی ناک اتنی پیاری نہیں۔“

داتا دین ہار ماننے والے جیو نہ تھے۔ وہ دس گاؤں کے نارد تھے۔ یہاں، وہاں اور وہاں کی یہاں لگانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ چوری تو نہ کرتے تھے۔ اس میں جان جھوکم

کا معاملہ تھا۔ مگر چوری کے مال میں حصہ لینے کے وقت ضرور پہنچ جاتے تھے۔ کہیں پیٹھ میں دھول نہ لگنے دیتے تھے۔ زمیندار کو آج تک لگان کی ایک پائی نہ دی تھی، قرتی آتی تو کنوئیں میں گرنے چلتے، نوکے رام کے کیے دھرے کچھ نہ بنتا۔ مگر آسامیوں کو سود پر قرض دیتے تھے۔ کسی عورت کو کوئی زیور بنواتا ہے تو داتا دین اس کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔

شادی بیاہ طے کرنے میں انھیں بڑا لطف آتا تھا۔ نیک نامی بھی ملتی ہے اور دکھنا بھی۔ بیماری میں علاج معالجے بھی کرتے ہیں اور جھاڑ پھونک میں بھی۔ جیسی مریض کی مرضی ہو اور محبت یافتہ ایسے ہیں کہ جوانوں میں جوان بن جاتے ہیں اور بچوں میں بچے اور بوڑھیوں میں بوڑھے۔ چور کے بھی ساتھی ہیں اور شاہ کے بھی۔ گاؤں میں کسی کو ان پر اعتبار نہیں ہے۔ مگر ان کی باتوں میں کچھ ایسی کشش ہے کہ لوگ بار بار دھوکا کھا کر بھی ان ہی کی پناہ لیتے ہیں۔

سر اور داڑھی ہلا کر بولے۔ ”یہ تو ٹھیک کہتی ہے دھنیا! دھرماتما لوگوں کا یہی دھرم ہے پر ساجی رواج کا نباہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“

اسی طری مشیوری لالا نے ہوری کو چھیڑا۔ وہ گاؤں میں دھرماتما مشہور تھے۔ پورنماش کو ہمیشہ ست ناراین کی کتھا سنتے تھے۔ مگر پنورای ہونے کی وجہ سے اپنے کھیت بیگار میں جتواتے تھے، بیگار میں سینچواتے تھے اور آسامیوں کو آپس میں لڑا کر رقیں مارتے تھے۔ سارا گاؤں ان سے کانپتا تھا۔ غریبوں کو دس دس پانچ پانچ روپے دے کر انھوں نے کئی ہزار بنا لیے تھے۔ فصل کی چیزیں آسامیوں سے لے کر کچھری اور تھانہ کے عملوں کو بھیٹ کرتے رہتے تھے۔ اس سے کل علاقے میں ان کی اچھی دھاگ تھی۔ اگر کوئی ان کے بیٹے نہ چڑھا تو داروغہ گھنڈا سنگھ تھے جو حال ہی میں اس علاقے میں تعینات ہو کر آئے تھے۔ پر اپکاری بھی تھے۔ بخار کے دنوں میں سرکاری کوئین تقسیم کرتے تھے، کوئی بیمار ہو تو اس سے خیر و عافیت پوچھنے ضرور جاتے تھے۔ چھوٹے موٹے بھگڑے آپس ہی میں طے کرا دیتے تھے۔ شادیوں میں پاکی، قالین اور محفل کا سامان منگنی دے کر لوگوں کا کام نکال دیتے تھے۔ یہ سب کرتے ہوئے بھی موقع پر نہ چوکتے تھے مگر جس کا کھاتے تھے اسی کا گاتے بھی تھے۔ بولے ”یہ تم نے کیا روگ پال لیا ہے ہوری؟“

ہوری نے پیچھے پھر کر پوچھا ”تم نے کیا کہا لالا؟ میں نے سنا نہیں۔“

،، بیٹھوڑی پیچھے سے قدم بڑھاتے ہوئے آگے آکر بولے۔ ”کہہ رہا تھا کہ دھنیا کے ساتھ تمھاری عقل بھی گھاس کھا گئی ہے؟ جھنڈیا کو کیوں نہیں اس کے باپ کے یہاں بھیج دیتے؟ ناک اپنی ہنسی کرا رہے ہو۔ نہ جانے کس کا بچہ لے کر آئی ہے اور تم نے گھر میں رکھ لیا ہے۔ ابھی تمھاری دو لڑکیاں بیابنے کو بیٹھی ہوئی ہیں۔ سوچو، کیسے بیڑا پار ہوگا۔“

ہوری اس طرح کی نکتہ چینی اور خیر خواہی کی باتیں سنتے سنتے پک گیا تھا، بولا ”میں یہ سب سمجھتا ہوں لالا پر تمھیں بتاؤ کروں کیا؟ میں جھنڈیا کو نکال دوں تو بھولا اسے رکھ لیں گے؟ اگر وہ راجی ہوں تو آج میں اسے ان کے گھر پہنچا دوں۔ اگر تم انھیں منا لو تو جنم بھر تمھارا اپکار مانوں۔ مگر وہاں تو ان کے دونوں لڑکے بتیا پر اتار دیے ہیں، پھر میں اسے کیسے نکال دوں۔ ایک تو نالایک آدمی ملا کہ اس کی ہانہ پکڑ کر دگا دے گیا، اب میں بھی نکال دوں گا تو وہ کہیں محنت مجوری بھی تو نہ کر سکے گی۔ کہیں جا کر ڈوب مری تو کیسے پاپ لگے گا؟ رہے لڑکیوں کے بیاہ سو بھگوان مالک ہیں۔ جب اس کا سہ آوے گا تب کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آوے گی۔ لڑکی تو ہماری برادری میں آج تک کبھی کنواری نہیں رہی۔ برادری کے ڈر میں بتیارے کا کام نہیں کر سکتا۔“

ہوری منکسر مزاج شخص تھا۔ ہمیشہ سر جھکائے چلتا اور چار باتیں برداشت کر لیتا تھا۔ ہیرا کے علاوہ گاؤں میں کوئی اور اس کا بد خواہ نہ تھا۔ مگر سماج اتنا بڑا ارتھ کیسے سہ لے؟ اور اس کی سرکشی تو دیکھو کہ سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتا۔ عورت مرد دونوں جیسے سماج کو چیلنج دے رہے ہیں کہ دیکھیں ہمارا کوئی کیا کیسے لیتا ہے، تو سماج بھی دکھا دے گا کہ اسے کچھ نہ سمجھنے والے لوگ سکھ کی نیند نہیں سو سکتے۔

اس رات کو اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے گاؤں کے لیڈروں کی نشست ہوئی۔ دادا دین بولے ”میری عادت کسی کی برائی کرنے کی نہیں ہے۔ سنسار میں کیا کیا کرم نہیں ہوتا۔ مجھ سے کیا مطلب؟ مگر یہ راٹھ دھنیا تو مجھ سے لڑنے پر تل گئی۔ بھائیوں کا حصہ دبا کر ہاتھ میں چار پیسے ہو گئے تو اب کپال کے سوا اور کیا سوچے گا؟ نچ جات جہاں پیٹ بھر روٹی کھائی اور ٹیڑھے چلے! اسی سے ساستروں میں کہا ہے کہ نچ ذات لیتائے بھلا۔“

بیٹھوڑی نے ناریل کا کش لگاتے ہوئے کہا ”یہ تو ان میں برائی ہے کہ جہاں چار پیسے دیکھے اور آنکھیں بدلیں۔ آج تو ہوری نے ایسی ہیکڑی جتائی کہ میں اپنا منہ لے کر رہ گیا۔ نہ

جانے اپنے کو کیا سمجھتا ہے۔ اب سوچو، اس بدکاری کا گاؤں میں کیا نتیجہ ہوگا۔ چھٹیا کو دیکھ کر دوسری بدھواؤں کا من بڑھے گا کہ نہیں؟ آج بھولا کے گھر میں یہ بات ہوئی ہے، کل ہمارے تمہارے گھر میں ہوگی۔ ساج تو ڈر کے بل سے چلتا ہے۔ آج ساج کا آئکس جاتا رہے تو پھر دیکھو سنسار میں کیسا کیسا اُرتھ ہونے لگتے ہیں۔“

جھٹکری سنگھ دو بیویوں کے شوہر تھے۔ پہلی بیوی، پانچ لڑکے لڑکیاں چھوڑ کر مری تھی۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً پینتالیس سال تھی۔ مگر آپ نے دوسری شادی کی اور جب اس سے اولاد نہ ہوئی تو تیسرا بیاہ کر ڈالا۔ اب ان کی عمر پچاس سال تھی اور دو جوان بیویاں گھر میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں پھیل رہی تھی، مگر ٹھاکر صاحب کے ڈر سے کوئی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ اور کہنے کی گنجائش بھی تو ہو۔ شوہر کی آڑ میں سب کچھ جائز ہے۔ مصیبت تو اسے ہے جس کی کوئی آڑ نہیں۔ ٹھاکر صاحب عورتوں کی سختی سے مگرانی رکھتے تھے اور انھیں غرور تھا کہ ان کی بیویوں کا گھونگھٹ تک بھی کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ مگر گھونگھٹ کے پردے میں کیا ہوتا ہے اس کی انھیں کیا خبر؟

بولے ”ایسی عورت کا تو سر کاٹ لے۔ ہوری نے اس رٹھی کو گھر میں رکھ کر ساج میں بس بویا ہے۔ ایسے آدمیوں کو گاؤں میں رہنے دینا گاؤں بھر کو بھڑکاتا ہے۔ رائے صاحب کو اس کی اطلاع دینی چاہیے کہ اگر گاؤں میں یہ اُرتھ چلا تو کسی کی آبرو، سلامت نہ رہی گی۔“

پنڈت نوکھے رام کارکن بڑے اعلیٰ درجے کے برہمن تھے۔ ان کے دادا کسی راجا کے دیوان تھے مگر اپنا سب کچھ بھگوان کے چرنوں پر چڑھا کر سادھو ہو گئے تھے۔ ان کے باپ نے بھی رام کی بھگتی میں زندگی کاٹ دی تھی۔ نوکھے رام نے بھی وہی بھگتی ترکہ میں پائی تھی۔ علی الصبح پوجا پر بیٹھ جاتے اور دس بجے تک بیٹھے ہوئے رام نام چپا کرتے تھے۔ مگر بھگوان کے سامنے سے اٹھتے ہی ان کی فطرت اس رکاوٹ سے گزر کر ان کے دل، قول اور عمل سبھی کو زہر آلود بنا دیتی تھی۔ اس تجویز میں ان کی اختیارات کی توہین تھی۔ پھولے ہوئے گالوں میں دھنسی ہوئی آنکھیں نکال کر بولے ”اس میں رائے صاحب سے کیا پوچھنا ہے؟ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ لگا دو سو روپے تادان، آپ گاؤں چھوڑ بھاگے گا۔ ادھر میں بید کھلی بھی دائر کیے دیتا ہوں۔“

”پیشوری نے کہا۔“ مگر لگان تو ادا کر چکا ہے۔“

جھنگری سنگھ نے تائید کی۔ ”ہاں لگان ہی کے لیے تو ہم سے تیس روپے لیے ہیں۔“
نوکھے رام نے غمخیز سے کہا۔ ”لیکن ابھی رسید تو نہیں دی۔ ثبوت کیا ہے کہ ابھی

لگان ادا کر دیا ہے؟“

اتفاق رائے سے یہی طے ہوا کہ ہوری پر سو روپے جرمانہ کیا جائے۔ صرف ایک دن گاؤں کے آدمیوں کو جمع کر کے ان کی منظوری لے لینے کا ناکہ ہونا ضروری تھا۔ ممکن ہے کہ اس میں دس پانچ روز کی دیر ہو جاتی مگر آج ہی رات کو چھپا کے لڑکا پیدا ہوا اور دوسرے ہی روز گاؤں والوں کی پچایت بیٹھ گئی۔ ہوری اور دھنیا دونوں ہی اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے بلائے گئے۔ چوپال میں اتنی بھیڑ تھی کہ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ پچایت نے فیصلہ کیا کہ ہوری پر سو روپے نقد اور تیس من غلے کا تاوان عائد کیا جائے۔

دھنیا بھری سبھا میں بھرے ہوئے گلے سے بولی ”چنچو! گریب کو ستا کر رکھ نہ پاؤ گے اتنا سمجھ لینا۔ ہم تو مٹ جائیں گے، کون جانے اس گاؤں میں رہے نہ رہیں، مگر میرا سراپ تم کو بھی جرور سے جرور لگے گا۔ مجھ پر اتنا کڑا ڈنڈ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ میں نے اپنی بہو کو اپنے گھر میں کیوں رکھا۔ کیوں اسے گھر سے نکال کر سڑک کی بھکارن نہیں بنا دیا، یہی نیاؤ ہے، ایں۔“

پیشوری لالا بولے۔ ”وہ تیری بہو ہے کہ ہر جاتی؟“

ہوری نے دھنیا کو ڈانٹا۔ ”تو کیوں بولتی ہے دھنیا؟ بیچ میں پر میسر رہتے ہیں۔ ان کا جو نیاؤ ہے وہی میرے سر آنکھوں پر۔ اگر بھگوان کی یہی مرجی کہ ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائیں تو ہمارا کیا بس؟ چنچو ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ کھلیان میں ہے، ایک دانہ بھی گھر نہیں آیا۔ جتنا چاہو لے لو۔ سب لینا چاہو تو لے لو، ہمارا بھگوان مالک ہے۔ جتنی کی پڑے اس میں ہمارے تیل لے لینا۔“

دھنیا دانت پیس کر بولی۔ ”میں نہ ایک دانہ اناج دوں گی اور نہ ایک کوڑی۔ جس میں بوتا ہو چل کر مجھ سے لے لے۔ اچھی دل لگی ہے۔ سوچا ہوگا کہ ڈنڈ کے بہانے اس کی سب جیجات لے لو اور نجرانہ لے کر دوسروں کو دے دو۔ باگ گچھا بیچ کر بچے سے ترمال اڑاؤ۔ دھنیا کے جیتے جی یہ نہیں ہونے کا، اور تمہاری لالسا (خواہش) تمہارے من ہی میں رہے

گی۔ ہمیں نہیں رہنا ہے برادری میں۔ برادری میں رہ کر ہماری کھتی نہ ہو جائے گی۔ اب بھی اپنے پسینے کی کماٹی کھاتے ہیں تب بھی اپنے پسینے کی کماٹی کھائیں گے۔“

ہوری نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”دھنیا تیرے پیروں پڑتا ہوں، تو چپ رہ! ہم سب برادری کے چاکر ہیں، اس کے باہر نہیں جاسکتے۔ وہ جو ڈنڈ لگاتی ہے اسے سر جھکا کر مان لے۔ نلو بن کر جینے سے تو گلے میں پھانسی لگا لینا اچھا ہے۔ آج مر جائیں تو برادری ہی تو اس مٹی کو پار لگا دے گی۔ برادری ہی تارے گی تو ترس گے۔ بچو مجھے اپنے جوان بیٹے کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو اگر میرے پاس کھلیان کے اناج کے سوائے اور کوئی جنس ہو۔ میں برادری کو دھوکا نہ دوں گا۔ بچوں کو میرے بال بچوں پر ترس آوے تو ان کی کچھ پردوس کریں۔ نہیں مجھے تو ان کا حکم ماننا ہے۔“

دھنیا جھلا کر وہاں سے چلی گئی اور ہوری پہر رات گئے تک کھلیان سے اناج ڈھو ڈھو کر جھنگری سنگھ کی چوپال میں ڈھیر کرتا رہا۔ بیس من ہو تھا۔ پانچ من گیہوں اور اتنا ہی مٹر۔ تھوڑا سا چنا اور کچھ تلہن بھی تھا اکیلا آدمی اور دو گرسیوں کا بوجھ! یہ جو کچھ ہوا وہ دھنیا کی محنت سے ہوا۔ دھنیا اندر کا سارا کام کر لیتی تھی اور دھنیا اپنی لڑکیوں کے ساتھ کھیتی میں لگ گئی تھی۔ دونوں نے سوچا تھا کہ گیہوں اور تلہن سے لگان کی ایک قسط ادا ہو جائے گی اور ہوسکا تو تھوڑا تھوڑا سود بھی دے دیں گے۔ ہو کھانے کے کام آئے گا۔ جیسے تیسے پانچ چھ مہینے کٹ جائیں تب تک جوار، باجرا، مکا، دھان کے دن آجائیں گے۔ وہ ساری امید مٹی میں مل گئی۔ اناج تو ہاتھ سے گیا ہی، سوروپے کی گٹھری اور سر پر لد گئی۔ اب کھانے کا کہیں ٹھکانہ نہیں اور گوبر کا کیا حال ہوا رام جانے! اگر دل اتنا کچا تھا تو ایسا کام ہی کیوں کیا؟ مگر ہونہار کو کون ٹال سکتا ہے؟ برادری کا وہ خوف تھا کہ اپنے سر پر اناج ڈھو رہا تھا گویا اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہو۔ زمیندار، ساہوکار، سرکار، کس کا اتنا رعب تھا؟ کل بال بچے کیا کھائیں گے، یہ فکر روح کو خشک کیے دیتی تھی۔ مگر برادری کا خوف۔ موت کی طرح سر پر سوار ہو کر کوڑے لگا رہا تھا۔ برادری سے الگ رہ کر جینے کا تو وہ خیال ہی نہ کر سکتا تھا۔ شادی، بیاہ، موٹن، چھیدن، جینا، مرنا سب کچھ برادری کے ہاتھ میں ہے۔ برادری اس کی زندگی میں پیڑ کی طرح جڑ جمائے ہوئے تھی اور اس کے رگ وریشہ میں پیوست ہو رہی تھی۔ برادری سے نکل کر اس کی زندگی کا جامہ تار تار ہو جائے گا۔

جب کھلیان میں صرف ڈیڑھ دو من جو اور رہ گیا تو دھنیا نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”اچھا اب رہنے دو! ڈھو تو پکے برادری کی لاج اب بچوں کے لیے بھی کچھ چھوڑ دو گے کہ سب برادری کی ہی بھاڑ میں جھونک دو گے؟ میں تم سے ہار جاتی ہوں۔ میرے بھاگ میں تمہیں جیسے مورکھ کا ساتھ بدلتا تھا۔“

ہوری نے اپنا ہاتھ چھڑا کر نوکری میں باقی غلہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”یہ نہ ہوگا دھنیا بچوں کی آنکھ بچا کر ایک دانہ بھی رکھ لینا میرے لیے حرام ہے۔ میں لے جا کر سب کا سب وہاں ڈھیر کیے دیتا ہوں۔ پھر بچوں کے من میں دیا ایجے گی تو کچھ میرے بال بچوں کے لیے دے دیں گے، نہیں بھگوان مالک ہیں۔“

دھنیا تملاکر بولی یہ بیچ نہیں ہے رامجس ہیں۔ کچے اور پورے رامجس؟ یہ سب ہماری جگہ جمین چھین کر مال مارنا چاہتے ہیں۔ ڈانٹر باندھ کا تو بہانہ ہے۔ سمجھاتی جاتی ہوں پر تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ تم ان رامجسوں سے دیا کا آسرا رکھتے ہو۔ سوچتے ہو کہ دس پانچ من تمہیں دے دیں گے منہ دھو رکھو!“

جب ہوری نہ مانا اور نوکری سر پر رکھنے لگا تو دھنیا نے دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت کے ساتھ نوکری پکڑی اور بولی۔ ”اسے تو میں نہ لے جانے دوں گی چاہے تم میری جان ہی لے لو۔ مر مر کے ہم نے کمایا، پہر رات تک گئے ہم نے بیچا، تو اسی لیے کہ بیچ لوگ مونچھوں پر تاؤ دے کر بھوک لگا دیں اور ہمارے بچے دانے دانے کو ترسیں؟ تم نے اکیلے ہی تو سب کچھ نہیں کر لیا ہے، میں بھی اپنی لڑکیوں کے ساتھ سستی ہوئی ہوں۔ سیدھے سے نوکری یہیں رکھ دو۔ نہیں آج سدا کے لیے نانا ٹوٹ جائے گا۔ کہے دیتی ہوں۔“

ہوری سوچ بچار میں پڑ گیا۔ دھنیا کا کہنا سچ تھا۔ اسے اپنے بال بچوں کی کمائی چھین کر تادان دینے کا کیا حق ہے؟ وہ گھر کا مالک اس لیے ہے کہ سب کو پالے پوسے اس لیے نہیں کہ ان کی کمائی چھین کر برادری کی نظر میں سرخرو بنے۔ نوکری اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ آہستہ سے بولا۔ ”تو ٹھیک کہتی ہے دھنیا۔ دوسرے کے حصے پر میرا کوئی بس نہیں ہے۔ جو کچھ بچا ہے وہ لے جا۔ میں جا کر بچوں سے کہے دیتا ہوں۔“

دھنیا اتانج کی نوکری گھر میں رکھ کر اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ پوتے کی پیدائش کی خوشی میں گلا پھاڑ پھاڑ کر سوہرگاہ رہی تھی کہ سارا گاؤں سن لے۔ آج یہ پہلا موقع تھا کہ

ایسے مبارک وقت میں برادری کی کوئی عورت وہاں نہ تھی۔ زچہ خانے سے ٹھہیا نے کہلا بھیجا تھا کہ سوہرگاہنے کا کام نہیں ہے مگر دھنیا کب ماننے لگی؟ اگر برادری کو اس کی پرواہ نہیں تو وہ بھی برادری کی پرواہ نہیں کرتی۔

اسی وقت ہوری اپنے گھر کو اتنی روپے پر چھتری سنگھ کے یہاں رہن کر رہا تھا تادان کے روپے کا اس کے سوا اور کوئی بندو بست نہ کر سکتا تھا۔ بیس روپے تلین، گیہوں اور مٹر سے مل گئے باقی کے لیے گھر لکھتا پڑا۔ نوکھے رام تو چاچے تھے کہ تیل بکوالیے جائیں۔ لیکن پیشوری اور داتادین نے اس کی مخالفت کی۔ تیل بک گئے تو ہوری کھیتی کیسے کرے گا؟ برادری اس کی جائداد سے روپے وصول کرے مگر ایسے تو نہ کرے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائے۔ بس اس طرح تیل بچ گئے۔

ہوری رہن نامہ لکھ کر کوئی گیارہ بجے رات کو گھر آیا تو دھنیا نے پوچھا۔ ”اتنی رات تک وہاں کیا کرتے رہے؟“

ہوری نے جلاہے کا غصہ داڑھی پر اتارتے ہوئے کہا۔ ”کرتا کیا رہا، اس کپوت کی کرنی بھرتا رہا! ابھاگا آپ تو آگ لگا کر بھاگ گیا، اب مجھے بھانا پڑ رہا ہے۔ اتنی روپے میں گھر کا رہن کرنا پڑا۔ کرتا کیا؟ اب کھا کھل گیا۔ برادری نے اپرا دھ چھما کر دیا۔“ دھنیا نے ہونٹ چبا کر کہا۔ ”نہ کھا کھلتا تو ہمارا کیا بگڑ جاتا تھا؟ چار پانچ مہینے نہیں کسی کا کھا پیا تو کیا چھوٹے ہو گئے؟ میں کہتی ہوں تم اتنے بھوندو کیوں ہو؟ میرے سامنے تو بڑے گیان والے بنتے ہو۔ پر باہر تمہارا منہ کیوں بند ہو جاتا ہے؟ لے دے کر باپ دادوں کی نسانی ایک گھر بچ رہا تھا، آج تم نے اسی کا دارا نیارا کر دیا۔ اسی طرح کل یہ تین چار بیکھے دھرتی ہے اسے بھی لکھ دینا اور تب گلی گلی بھیک مانگنا۔ میں پوچھتی ہوں کہ تمہاری منہ میں چھ نہ تھی کہ ان پنپوں سے پوچھتے کہ تم کہاں کے بڑے دھرماتما ہو جو دوسروں پر ڈانٹر باندھ لگاتے پھرتے ہو، تمہارا تو منہ دیکھنا بھی پاپ ہے۔“

ہوری نے ڈانٹا۔ ”چپ رہ، بہت بڑھ بڑھ کے نہ بول! برادری کے چکر میں ابھی نہیں ہے پڑی۔ نہیں تو منہ سے بات نہ نکلتی۔“

دھنیا مشتعل ہو گئی۔ ”کون سا پاپ کیا ہے جس کے لیے برادری سے ڈریں؟ کسی کے گھر چوری کی ہے؟ کسی کا مال لوٹا ہے؟ مہریا رکھ لینا پاپ نہیں ہے، ہاں رکھ کر چھوڑ دینا

پاپ ہے۔ آدمی کا بہت سیدھا ہونا بھی برا ہے۔ اس کے سیدھے پن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتے منہ چاٹنے لگتے ہیں۔ آج ادھر تمھاری سرانہا ہو رہی ہوگی کہ برادری کی کیسی مر جاد رکھ لی، میرے بھاگ پھوٹ گئے تھے کہ تم جیسے مرد سے پالا پڑا۔ کبھی سکھ کی روٹی نہ ملی۔“

”میں تیرے باپ کے پاؤں پڑنے گیا تھا؟ وہی تجھے میرے گلے باندھ گیا۔“
 ”پتھر پڑ گیا تھا ان کی سمجھ پر اور انھیں کیا کہوں؟ نہ جانے کیا دیکھ کر لٹو ہو گئے، ایسے کوئی بڑے سندھ بھی تو نہ تھے تم۔“

بحث مذاق میں منتقل ہو گئی۔ ”اسی روپے گئے تو گئے لاکھ روپے کا پوتا مل گیا؟ اسے تو کوئی نہ چھین لے گا۔ گوبر گھر لوٹ آوے، دھنیا الگ جھونپڑی میں سکھی رہے گی۔“

ہوری نے پوچھا۔ ”بچہ کس پر پڑا ہے۔“
 دھنیا نے ہنس کر جواب دیا۔ ”بالکل گوبر پر پڑا ہے بچ!“

”ہنگڑا تو ہے؟“

”ہاں اچھا ہے۔“

رات کو گوبر جھنڈیا کے ساتھ چلا تو ایسا کانپ رہا تھا جیسے اس کی ناک کٹ گئی ہو۔ جھنڈیا کو دیکھتے ہی سارے گاؤں میں کھرام مچ گیا، لوگ ہر طرف سے آکر کیسا دادیلا مچا دیں گے، دھنڈیا کتنی گالیاں دے گی، یہ سوچ سوچ کر اس کے سر پیچھے رہے جاتے تھے۔ ہوری کا تو اسے خوف نہ تھا۔ وہ صرف ایک بار دھاڑیں گے پھر چپ ہو جائیں گے۔ خوف تھا دھنڈیا کا جو زہر کھانے لگے گی اور گھر میں آگ لگانے لگے گی۔ نہیں، اس وقت جھنڈیا کے ساتھ گھر نہیں جاسکتا۔

مگر کہیں دھنڈیا نے جھنڈیا کو گھر میں گھسنے ہی نہ دیا اور جھاڑوں لے کر مارنے دوڑی تو وہ بے چاری کہاں جائے گی؟ اپنے گھر تو لوٹ ہی نہیں سکتی، کہیں کنوئیں میں کود پڑے، یا گلے میں پھانسی لگا لے تو کیا ہو؟ اس نے لمبا سانس لیا بھگوان کے سرن!

مگر اماں اتنی بے درد نہیں کہ مارنے دوڑیں، غصے میں دو چار گالیاں دیں گی۔ مگر جب جھنڈیا ان کے پاؤں پکڑ کر رونے لگے گی تو انھیں دیا آہی جائے گی۔ تب تک وہ آپ کہیں چھپا رہے گا۔ جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تب وہ ایک دن چپکے سے آئے گا اور اماں کو منالے گا۔ اگر اس بچ میں اسے کہیں مجبوری مل جائے اور دو چار روپیہ لے کر گھر لوٹے گا تب تو دھنڈیا کا منہ بند ہی ہو جائے گا۔

جھنڈیا بولی۔ ”میری تو چھاتی دھڑک رہی ہے میں کیا جانتی تھی کہ تم میرے گلے میں یہ روگ باندھ دو گے۔ نہ جانے کس بری ساعت میں تم نے دیکھا تھا نہ تم گائے لینے آتے نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ تم آگے آگے جا کر جو کچھ کہنا سنا ہو وہ کہہ سن لینا۔ میں پیچھے سے آجاؤں گی۔“

گوبر نے کہا۔ ”میں نہیں، پہلے تم جانا اور کہنا کہ میں ہاٹ سے سودا بچ کر گھر جا رہی تھی، رات ہو گئی ہے، اب کیسے جاؤں؟ تب تک میں آجاؤں گا۔“

جھنڈیا نے متشکرانہ کہا۔ ”تمھاری اماں بڑی کسلی ہیں، میرا توجہ کانپتا ہے، کہیں

مجھے مارنے لگیں تو کیا کروں گی۔“

گوبر نے دھیرج دلایا ”اماں کی عادت ایسی نہیں ہے۔ ہم لوگوں تک کو تو کبھی ایک تھپڑ مارا نہیں ہے، تمہیں کیا ماریں گی؟ ان کو جو کچھ کہنا ہوگا مجھے کہیں گی، وہ تم سے تو بولیں گی بھی نہیں۔“

گاؤں قریب آگیا گوبر نے رک کر کہا۔ ”اب تم جاؤ۔“

تھپڑ نے ضد کی۔ ”تم بھی دیر نہ کرنا۔“

”نہیں نہیں، چمن بھر میں آتا ہوں، تو چل تو!“

”میرا جی نہ جانے کیسا ہو رہا ہے، تمہارے اوپر گسہ آتا ہے۔“

”تم اتنی ڈرتی کیوں ہو؟ میں تو آ رہا ہوں۔“

”اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ کسی دوسری جگہ بھاگ چلتے۔“

”جب اپنا گھر ہے تو کیوں کہیں بھاگیں۔ تم ناک ڈر رہی ہو۔“

”جلدی سے آؤ گے نا؟“

”ہاں۔ ہاں، ابھی آتا ہوں!“

”مجھ سے دگا تو نہیں کر رہے ہو کہ مجھے گھر بھیج کر تم کہیں چلتے ہو؟“

”اتنا بچ نہیں ہوں جھوٹا۔ جب تیری بانہہ پکڑی ہے تو مرتے دم تک نباہوں گا۔“

تھپڑ گھر کی طرف چلی۔ گوبر لمبے بھر دبہے میں پڑا ہوا کھڑا رہا پھر یکا یک سر پر منڈ لانے والا لعنت ملامت کا خیال خوفناک شکل اختیار کر کے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کہیں بچ اماں مارنے دوڑیں تو کیا ہوگا؟ اس کے پیر زمین سے چپک گئے۔ اس کے اور اس کے گھر کے درمیان میں صرف آموں کا چھوٹا سا باغ تھا۔ تھپڑ کی کالی پر چھائیں آہستہ آہستہ جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے حواسوں میں بڑی تیزی آگئی تھی۔ اس کے کانوں میں ایسی بھنک پڑی جیسے اماں تھپڑ کو گالیاں دے رہی ہیں۔ اس کے دل کی کچھ ایسی حالت ہو رہی تھی گویا سر پر گنڈاسے کا ہاتھ چلنے والا ہو۔ بدن کا سارا خون جیسے خشک ہو گیا ہو۔ ایک لمحے کے بعد اس نے دیکھا جیسے دھنیا گھر سے نکل کر کہیں جا رہی ہو۔ دادا کے پاس جاتی ہوگی۔ سائت دادا کھانسی کے مزے کے کھیت پر چلے گئے ہوں۔ وہ اس کھیت کی طرف چلا۔ جو اور گہپوں کے کھیتوں کو پکھتا روڈتا اس طرح بھاگا جا رہا تھا۔ گویا پیچھے کوئی دوڑا رہی ہو۔ وہ ہے

دادا کی جھونپڑی! وہ رک گیا اور دبے پاؤں جا کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس کا قیاس ٹھیک نکلا۔ وہ پہنچا ہی تھا کہ دھنیا کی آواز سنائی دی۔ دو کب ہو گیا! اماں اتنی بے درد ہیں! ایک اتاتھ لڑکی پر انھیں کچھ بھی دیا نہیں آتی اور جو میں ابھی سامنے جا کر پھٹکا ر دوں کہ تم کو جھنیا سے بولنے کی کوئی مجال نہیں ہے تو ساری سیکھی نکل جائے۔ اچھا داد بھی بگڑ رہے ہیں۔ کیلے کے لیے آج ٹھیکر بھی تیز ہو گیا۔ میں ان کا ادب کرتا ہوں یہ اسی کا پھل ہے۔ یہ تو دادا بھی وہیں جا رہے ہیں۔ اگر جھنیا کو انھوں نے مارا پٹا تو مجھ سے سہا نہ جائے گا۔ بھگوان! اب تمھارا ہی بھروسہ ہے میں نہ جانتا تھا کہ اس سنگٹ میں جان پڑے گی۔ جھنیا اپنے من میں مجھے کتنا مار، ڈر پوک، اور کمینہ سمجھ رہی ہوگی۔ مگر اسے مار کیسے سکتے ہیں! گھر سے نکال بھی سکتے ہیں؟ کیا گھر میں میرا حصہ نہیں ہے؟ اگر جھنیا پر کسی نے ہاتھ اٹھایا تو آج مہابھارت ہو جائے گا۔ ماں باپ جب تک لڑکوں کی رچھا کریں تب تک ماں باپ ہیں، جب ان میں مانتا نہیں تو کیسے ماں باپ؟“

ہوری جیوں جھونپڑی سے نکلا گوہر بھی دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے چلا، مگر دروازے پر اجالا دیکھ کر اس کے پیر رک گئے۔ اس اجالے کی لیکر کے اندر وہ قدم نہیں رکھ سکتا تھا وہ اندھیرے ہی میں دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا، اس کی ہمت نے جواب دے دیا، ہائے! بے چاری جھنیا پر یہ لوگ جھلا رہے ہیں اور وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے کھیل کھیل میں جو ایک چنگاری پھینک دی تھی وہ سارے کھلیان کو بجسم کر دے گی یہ اس نے نہ سمجھا تھا۔ اور اب اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سامنے آ کر کہے۔ ”ہاں میں نے چنگاری پھینکی تھی۔“ جن سہاروں سے وہ اپنے دل کو سنبھالے ہوئے تھا وہ سب اس زلزلے میں گر پڑے اور وہ جھونپڑا بھی گر پڑا۔ وہ پیچھا لوٹا۔ اب وہ جھنیا کو کیا منہ دکھائے؟

وہ کوئی سو قدم چلا مگر اس طرح جیسے کوئی سپاہی میدان سے بھاگے۔ اس نے جھنیا سے محبت اور وفا کی جو باتیں کہیں تھیں وہ سب یاد آنے لگیں۔ وہ وصال کی میٹھی باتیں یاد آئیں۔ جب وہ اپنے بھوتانہ سانسوں میں، اپنی نشلی چتونوں میں، گویا اپنی جان نکال کر اس کے قدموں میں رکھ دیتا تھا۔ جھنیا کسی مہجور پرند کی طرح اپنے چھوٹے سے گھونسلے میں اپنی تنہائی کی زندگی کاٹ رہی تھی، وہاں نہ کا بھوتانہ اصرار نہ تھا، نہ وہ اہلٹی ہوئی خوشی اور نہ بچوں کی میٹھی آوازیں۔ مگر صیاد کا دام اور فریب بھی تو وہاں نہ تھا۔ گوہر نے اس کی تنہائی والے

کونسلے میں جا کر اسے کچھ سکھ پہنچایا یا نہیں ، یہ کون جانے ۔ مگر اسے عذاب میں تو ڈال ہی دیا تھا۔ وہ سنبھل گیا ۔ بھاگتا ہوا سپاہی گویا اپنے ایک ساتھی کا بڑھاداً سن کر پیچھے لوٹ پڑا !

اس نے دروازے پر آکر دیکھا تو کواڑ بند ہو گئے تھے ۔ کواڑوں کے دروازوں سے روشنی کی شعاعیں باہر نکل رہی تھیں ۔ اس نے ایک دراز سے اندر جھانکا ۔ دھنیا اور جھدیا اندر بیٹھی ہوئی تھیں ۔ ہوری کھڑا تھا ۔ جھدیا کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں ۔ اور دھنیا اسے سمجھا رہی تھی ۔ ” بیٹی تو چل کر گھر میں بیٹھ ؟ میں ترے کا کا اور بھائیوں کو دیکھ لوں گی ۔ جب تک ہم جیتے ہیں کسی بات کی چٹنا نہیں ہے ۔ ہمارے رہتے تھے کوئی ٹیڑھی آنکھ دیکھ بھی نہ سکے گا ۔“

گوبر خوش ہو گیا ۔ آج وہ کسی قابل ہوتا تو دادا اور اماں کو سونے سے منڈھ دیتا اور کہتا ” اب تم کچھ کام نہ کرو ۔ آرام سے بیٹھے بیٹھے کھاؤ اور جتنا دان پن کرنا چاہو کرو ! جھدیا کے متعلق اب اسے کوئی اندیشہ نہیں ہے ۔ وہ اسے جیسا سہارا دینا چاہتا تھا وہ مل گیا تھا ۔ جھدیا اسے دغا باز سمجھتی ہے تو سمجھے وہ تو جب ہی گھر آئے گا ۔ جب وہ پیسے کے زور سے گاؤں بھر کا منہ بند کر سکے اور دادا اور اماں اسے گھر آنے کا کلنگ نہ سمجھ کر گھرانے کا تلک سمجھیں ۔ دل پر جتنا گہرا صدمہ ہوتا ہے وہ اپنے رد عمل کی صورت میں اتنا ہی موثر ہوتا ہے اس بدنامی نے گوبر کے دل کو متھ کر وہ رتن نکال لیا جو ابھی تک چھپا پڑا تھا ۔ آج پہلی مرتبہ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا ، اور اس کے ساتھ ہی اس میں مصمم ارادہ پیدا ہو گیا ۔ اب تک وہ کم سے کم کام کرنا اور زیادہ سے زیادہ کھانا اپنا حق سمجھتا تھا ۔ اس کے دل میں یہ خیال ہی نہ آیا تھا کہ گھر والوں کے ساتھ بھی اس کا کچھ فرض ہے ۔ آج والدین کے اس غصے نے گویا اس کے دل میں نور پیدا کر دیا ۔ جب دھنیا اور جھدیا اندر چلی گئیں تو ہوری کی اسی جھونپڑی میں جا بیٹھا اور آئندہ کے لیے منصوبے باندھنے لگا ۔

شہر میں تیل داروں کو پانچ چھ آنے روز ملتے ہیں ، یہ اس نے سن رکھا تھا ۔ ” اگر چھ آنے روج ملیں اور وہ ایک آنہ روج میں گھر کرے تو پانچ آنہ روز کی بچت ہوگی ۔ مہینے میں دس روپے ہوتے ہیں اور سال میں سوا سو ۔ وہ سوا سو کی قسطی لے کر گھر آئے تو کس کی مجال ہے جو اس کے سامنے منہ کھول سکے ؟ یہی داتا دین اور یہی پیشوری آکر اس کی ہاں میں ہاں

ملائیں گے اور تھکنا تو سمجھنا سے پھول اٹھے گی۔ دو چار سال وہ اسی طرح کھاتا رہے تو گھر کا سارا دکھ درد دور ہو جائے ابھی تو سارے گھر کی کمائی بھی سوا سو نہیں ہوتی اب وہ اکیلا سوا سو کمائے گا۔ لوگ یہی تو کہیں گے کہ مجوری کرتا ہے۔ کہا کریں۔ مجوری کرنا کوئی پاپ تو نہیں ہے۔ اور سدا چھ آنے ہی تھوڑے ملیں گے۔ جیسے جیسے وہ کام میں ہشیار ہوگا۔ دیسے دیسے مجوری بھی تو بڑھے گی۔ جب وہ دادا سے کہے گا۔ ”کہ اب تم گھر میں بیٹھ کر بھگوان کا بھجن کرو۔ اس سمیحتی میں جان کھانے کے سوا اور کیا رکھا ہے؟ سب سے پہلے ایک بچائیں گائے لے گا جو چار پانچ سیر دودھ دے گی اور دادا سے کہے گا کہ تم گنوا ماما کی سیوا کرو جس سے تمہارا لوک بھی بنے گا اور پر لوک بھی۔“

اور کیا ایک آنے میں اس کا گھر آرام سے نہ ہوگا؟ گھر لے کر کیا کرنا ہے! کسی جگہ پڑ رہے گا۔ سیکڑوں مندر اور دھرم سالے ہیں۔ اور پھر وہ جس کی مجوری کرے گا وہ کیا رہنے کی جگہ نہ دے گا؟ آٹا روپے کا دس سیر آتا ہے۔ ایک آنہ کا ڈھائی پاؤ ہوا۔ ایک آنہ کا تو وہ آٹا کھائے گا۔ لکڑی، دال، نم، ساگ یہ سب کہاں سے آئیں گے؟ دونوں جون کے لیے سیر بھر تو آٹا ہی چاہیے۔ اوہ! کھانے کی کچھ نہ پوچھو۔ مٹی بھر پننے سے بھی کام چل سکتا ہے اور حلوا پوری کھا کر بھی کام چل سکتا ہے، جیسی سمائی ہو۔ وہ آدھ سیر آٹا کھا کر دن بھر بچے سے کام کر سکتا ہے۔ ادھر ادھر سے اگلے چن لیے تو لکڑی کا کام چل گیا۔ کبھی ایک پیسے کی دال لے لی اور کبھی آلو۔ آلو بھون کر بھرتا بنا لیا۔ یہاں دن کاٹنا ہے کہ چین کرنا ہے؟ بتل پر آٹا گوندھا ایلوں پر بانٹیاں سینکیں، آلو بھون کر بھرتا بنا لیا اور بچے سے کھا کر سو رہے۔ گھر ہی پر کون دونوں جون روٹی ملتی ہے؟ ایک جون تو چر بن ہی ملتا ہے۔ وہاں بھی ایک جون چر بن پر ہی کاٹیں گے۔“

اسے شک ہوا کہ اگر مجوری نہ ملی تو وہ کیا کرے گا۔ مگر مجوری کیوں نہ ملے گی؟ جب وہ جی توڑ کر کام کرے گا تو سو آدمی اسے بلائیں گے۔ کام سب کو پیارا ہوتا ہے، چام نہیں پیارا ہوتا۔ یہاں بھی تو سکھا پالا پڑتا ہے، اوکھ میں دیکھ لگتی ہے، گیہوں میں گردی لگتی ہے اور سرسوں میں لائی لگ جاتی ہے۔ اسے رات کو کوئی کام مل جائے گا تو اسے بھی نہ چھوڑے گا۔ دن بھر مجوری کی رات کو کہیں چوکیداری کرے گا دو آنے بھی رات کے کام کے مل جائیں گے تو چاندی ہے۔ جب لوٹے گا تو سب کے لیے ساڑھیاں لائے گا۔ تھکنا کے لیے

ہاتھ کا تگن جرور بنوائے گا۔ اور دادا کے لیے منڈا سہ لائے گا۔“

یہی خیالی پلاؤ پکاتا ہوا وہ سو گیا۔ مگر ٹھنڈ میں نیند کہاں؟ کسی طرح رات کاٹی اور تڑکے ہی اٹھ کر کھنڈ کی سڑک پکڑ لی۔ بیس ہی کوس تو ہے، سانجھ (شام) تک پہنچ جائے گا۔ گاؤں کا کون آدمی وہاں پہنچا جاتا ہے اور وہ اپنا پتہ ٹھکانہ ہی کیوں لکھے گا؟ نہیں تو دادا دوسرے ہی دن سر پر سوار ہو جائیں گے۔ اسے کچھ پچھتاوا تھا تو یہی کہ جھنڈا سے کیوں نہ صاف صاف کہہ دیا کہ ابھی تو گھر جا میں تھوڑے دنوں میں کچھ کما دھا کر لوٹوں گا، مگر تب وہ گھر جاتی ہی کیوں، کہتی کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اسے کہاں کہاں باندھے پھرتا؟“

دن چڑھنے لگا۔ رات کو کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوک مگی پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ کہیں بیٹھ کر دم لینے کی خواہش ہوئی۔ بلا کچھ کھائے اب وہ نہیں چل سکتا۔ مگر پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ سڑک کے کنارے جھمر بیر یوں کی جھاڑیاں تھیں۔ اس نے تھوڑے سے بیر توڑ لیے اور پیٹ کو بہلاتا ہوا چلا۔ ایک گاؤں میں گڑ پکنے کی مہک آئی۔ اب جی نہ مانا۔ وہاں جا کر لوٹا ڈور مانگا اور پانی بھر کر چلو سے پینے بیٹھا تو ایک کسان نے کہا ”ارے بھائی کیا یوں ہی پانی پو گے۔ تھوڑا سا گڑ کھالو۔ اب کے اور چلا لیں کو لھو اور بنا لیں کھانڈ، اگلے سال تک مل تیار ہو جائے گی تو ساری اوکھ کھڑی بک جائے گی۔ گڑ اور کھانڈ کے بھاو چینی ملے گی تو ہمارا گڑ کون لے گا۔“ اس نے ایک کنورے میں گڑ کی کئی پنڈیاں لا کر دی۔ گوہر نے گڑ کھا کر پانی پیا۔ ”تما کو تو پیتے ہو گے؟ گوہر نے بہانہ کیا ”ابھی چلم نہیں پیتا۔ بوڑھے نے خوش ہو کر کہا۔ ”بڑا اچھا کرتے ہو بھیا! برادرگ ایک بار پکڑ لے تو پھر جیتے جی نہیں چھوڑتا۔“

انجن کو کوئلہ پانی مل گیا۔ رفتار تیز ہوئی۔ جاڑے کے دن۔ نہ جانے کب دوپہر ہو گئی، ایک جگہ دیکھا کہ ایک نوجوان عورت ایک بیڑ کے نیچے شوہر سے ستیہ گرہ کیے بیٹھی تھی، شوہر سامنے کھڑا اسے منا رہا تھا۔ دو چار راہ گیر تماشا دیکھنے کھڑے ہو گئے تھے گوہر بھی کھڑا ہو گیا۔ مناؤں سے زیادہ دلچسپ زندگی کا اور کون ناٹک ہوگا۔

عورت نے شوہر کی طرف گھور کر کہا۔ ”میں نہ جاؤں گی، نہ جاؤں گی، نہ جاؤں گی۔“

جرو نے گویا الٹی میٹم دیا۔ ”نہ جائے گی؟“

”نہ جاؤں گی۔“

”نہ جائے گی۔“

”نہ جاؤں گی۔“

مرد نے اس کے بال پکڑ کر گھسینا شروع کیا عورت زمین پر لوٹ گئی۔

مرد نے ہار کر کہا۔ ”میں پھر کہتا ہوں کہ اٹھ کر چل۔“

عورت نے اسی استقلال سے کہا ”میں تیرے گھر سات جنم نہ جاؤں گی۔ چاہے بوٹی

بوٹی کاٹ ڈال۔“

”میں تیرا گلا کاٹ لوں گا۔“

”تو پھانسی پاؤ گے۔“

مرد نے اس کے بال چھوڑ دیے اور سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ مردانگی انتہائی حد تک

پہنچ گئی تھی، کہ اس کے آگے اب وہ نہ جاسکتی تھی۔

ایک لمحے میں وہ پھر کھڑا ہوا اور ہاری ہوئی سے آواز میں بولا۔ ”تو چاہتی کیا ہے؟“

عورت بھی اٹھ بیٹھی اور نہ ڈگنے والی آواز میں بولی ”میں یہی چاہتی ہوں تو مجھے

چھوڑ دے۔“

”کچھ منہ سے کہے گی بھی کیا بات ہوئی؟“

”میرے بھائی باپ کو کوئی کیوں گالی دے۔“

”کس نے گالی دی تیرے بھائی باپ کو؟“

”جا کر اپنے گھر میں پوچھ۔“

”چلے گی تبھی تو پوچھوں گا۔“

”تو کیا پوچھے گا؟ کچھ دم بھی ہے۔ جا کر اماں کے آچل میں منہ چمپا کر سورہ ! وہ

تیری ماں ہوگی، میری کوئی نہیں ہے۔ تو اس کی گالیاں سن، میں کیوں سنوں؟ ایک روٹی

کھاتی ہوں تو چار روٹی کا کام کرتی ہوں، کیوں کسی کی دھونس سہوں؟ میں تیرا ایک پوت کا

چھلانہیں جانتی۔“

راہ گیروں کو اس جھگڑے میں ٹانگ کا مزا آرہا تھا۔ مگر اس کے جلد ختم ہونے کی کوئی

امید نہ تھی۔ منزل کھوٹی ہو رہی تھی۔ ایک ایک کر کے لوگ کھٹکنے لگے۔ گوبر کو مرد کی بے رحمی

بری لگ رہی تھی۔ بھیڑ کے سامنے تو کچھ نہ کہہ سکتا تھا، مگر میدان خالی ہوا تو بولا۔ بھائی مرد عورت کے بیچ میں بولنا تو نہ چاہیے تھا، پر اتنی بیدردی بھی اچھی نہیں ہوتی۔“

مرد نے کوڑی سی آنکھیں نکال کر کہا۔ ”تم کون ہو؟“

گوبر نے بلا خوف کہا۔ ”میں کوئی ہوں پر بے جا بات دیکھ کر سبھی کو برا لگتا ہے۔“

مرد نے سر ہلا کر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے ابھی مہریا نہیں آئی تبھی اتنا درد ہے۔“

مہریا آئے گی تو بھی اس کا جھوٹا پکڑ کر نہ کھینچوں گا!“

”اچھا تم اپنی راہ لو۔ میری عورت ہے، میں اسے ماروں گا، کاٹوں گا۔ تم کون

ہوتے ہو بیچ میں بولنے والے؟ چلے جاؤ سیدھے سے یہاں کھڑے مت رہو۔“

گوبر کا گرم خون اور گرم ہو گیا وہ کیوں چلا جائے۔ سڑک سرکاری ہے کسی کے باپ کی

نہیں ہے۔ وہ جب تک چاہے کھڑا رہ سکتا ہے۔ وہاں سے اسے ہٹانے کی مجال کسے ہے۔“

مرد نے ہونٹ چبا کر کہا ”تو تم نہ جاؤ گے، آؤں؟“

گوبر نے انگو چھاکر پر باندھ لیا اور لڑنے کے لیے تیار ہو کر بولا۔ ”تم آؤ یا نہ آؤ پر

میں تو تبھی جاؤں گا جب میری لہجہ ہوگی۔“

”یہ کون جانتا ہے کہ کس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔“

”تو تم نہ جاؤ گے؟“

”نہ۔“

مرد مٹھی باندھ کر گوبر کی طرف جھپٹا۔ اسی وقت عورت نے اس کی دھوتی پکڑ لی اور

اسے اپنی طرف کھینچتی ہوئی گوبر سے بولی۔ ”تم کیوں لڑائی لینے پر اتار دھورہے ہو۔ جی، اپنی

راہ کیوں نہیں جاتے؟ یہاں کوئی تما سا ہے۔ ہمارا پس کا جھگڑا ہے۔ کبھی وہ مجھے مارتا ہے تو

کبھی میں اسے ڈانٹتی ہوں۔ تم سے مطلب؟“

گوبر یہ پھنکار پا کر وہاں سے چل دیا۔ دل میں کہا ”یہ عورت مار کھانے ہی کے

لاٹک ہے۔ گوبر آگے نکل گیا تو عورت نے اپنی شوہر کو ڈانٹ بتائی ”تم سب سے لڑنے

کیوں لگتے ہو۔ اس نے کون سی بری بات کہی تھی کہ تمہارے چوٹ لگ گئی؟ برا کام کرو گے

تو دنیا برا کہے گی ہی، پر ہے وہ کسی بھلے گھر کا اور اپنی برادری کا ہی جان پڑتا ہے۔ کیوں

اسے اپنی بہن کے لیے نہیں ٹھیک کر لیتے۔“

شوہر نے شبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا ”کیا اب تک کنورا بیٹھا ہوگا۔“
 ”تو پوچھ ہی کیوں نہ لو۔“

مرد نے دس قدم دوڑ کر مرد کو آواز دی اور ہاتھ سے ٹھہر جانے کا اشارہ کیا۔ گوبر نے سمجھا شاید پھر اس کے سر پر بھوت سوار ہوا ہے، جب ہی للکار رہا ہے بتا مار کھائے نہ مانے گا۔ اپنے گاؤں میں کتا بھی باگھ بن جاتا ہے۔ اچھا آنے دو۔

مگر اس کے منہ پر لڑائی کی للکار نہ تھی۔ دوستی کا بلاوہ تھا۔ اس نے گاؤں، نام اور ذات پوچھی، گوبر نے ٹھیک ٹھاک بتا دیا۔ اس مرد کا نام کودئی تھا۔

”کودئی نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم دونوں میں دنگا ہوتے ہوتے بچا۔ تم چلے آئے تو میں نے سوچا کہ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں ناک تم سے تن بیٹھا۔ کچھ کھتی باڑی تو گھر میں ہوتی ہے نا؟“

گوبر نے بتایا کہ اس کی سوروٹی پانچ بیگہ کھیت ہیں اور ایک ہل کی کھیتی ہوتی ہے۔
 ”میں نے جو تمہیں برا بھلا کہا اس کی مایہی دو بھائی! اس میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ عورت گمن میں بچھی ہے پر کبھی نہ جانے اس پر کون سا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ اب تمہیں بتاؤ اماں پر میرا کیا بس ہے؟ پیدا تو انہیں نے کیا ہے اور پالا پوسا انہیں نے ہے۔ جب کوئی بات ہوگی تو میں تو جو کچھ کہوں گا تو عورت ہی سے کہوں گا۔ اس پر اپنا بس ہے۔ تمہیں سوچو میں بیجا تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہاں مجھے اس کا جھوٹا پکڑ کر گھسینا نہ تھا۔ مگر عورت جات کوئی تاڑنا دیے بنا بھی تو بس میں نہیں رہتی۔ چاہتی ہے کہ اماں سے الگ ہو جائیں۔ تمہیں سوچو کہ کیسے الگ ہو جاؤں اور کس سے الگ ہو جاؤں؟ اپنی اماں سے؟ جس نے جنم دیا؟ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ چاہے عورت رہے یا جائے۔“

گوبر کو بھی اپنی رائے بدلنی پڑی بولا ”ماتا کا تو آدر کرنا سب ہی کا دھرم ہے بھائی!
 ماتا سے کون اُرن ہو سکتا ہے۔“

کودئی نے اسے اپنے گھر چلنے کو کہا۔ آج وہ کسی طرح لکھنؤ نہیں پہنچ سکتا۔ کوس دو کوس جاتے جاتے سانجھ ہو ہی جائے گی۔ رات کو کہیں نہ کہیں تو ٹکنا ہی پڑے گا۔

گوبر نے مذاق کیا ”لکائی مان گئی؟“
 ”نہ مانے گی تو کیا کرے گی؟“

”مجھے تو اس نے ایسی پہنکار بتائی کہ میں تو لجا گیا۔“

”وہ اب بچھتا رہی ہے۔ چلو نک۔ ماما جی کو سمجھا دینا۔ مجھ سے تو کچھ کہتے نہیں بنتا۔ انہیں بھی سوچنا چاہیے کہ بہو کے باپ بھائی کو گالی کیوں دیتی ہیں۔ ہماری بھی بہن ہے۔ چار دن میں اس کی سگائی ہو جائے گی۔ اس کی ساس ہمیں گالیاں دے گی تو اس سے سنا جائے گا؟ سب دوکھ لگائی ہی کا نہیں، ماما کا بھی دوکھ ہی ہے۔ جب ہر بات میں اپنی بیٹی کا کچھ کرے گی تو ہمیں برا لگے ہی گا۔ اس میں اتنی بات اچھی ہے کہ گھر سے روٹھ کر چلی جائے مگر گالی کا جواب گالی سے نہیں دیتی۔“

گوبر کو رات کے لیے کوئی ٹھکانہ چاہیے تھا۔ کودئی کے ساتھ ہولیا۔ دونوں پھر اسی جگہ آئے جہاں عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اب گھر گرہستن بن گئی تھی۔ ذرا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا اور کچھ لجا رہی تھی کودئی نے مسکرا کر کہا ”یہ تو آتے ہی نہ تھے، کہتے تھے کہ ایسی ڈانٹ سننے کے بعد ان کے گھر کیسے جائیں۔“

عورت نے گھونگھٹ کی آڑ سے گوبر کو دیکھ کر کہا۔ ”اتنی ہی ڈانٹ میں ڈر گئے؟ لگائی آجائے گی تو کہاں بھاگو گے؟“

گاؤں قریب ہی تھا۔ گاؤں کیا تھا، پروا تھا دس بارہ گھروں کا، جو آدھے کھریل کے تھے اور آدھے پھوس کے۔ کودئی نے اپنے گھر پہنچ کر کھٹ نکالی اور اس پر ایک دری بچھادی۔ شربت بنانے کو کہہ کر چلم بھر لایا اور لحد بھر بعد وہی عورت لوٹے میں شربت لے کر آئی اور گوبر کو پانی کا ایک چھینٹا مار کر گویا معافی مانگ لی۔ وہ اب اس کا نندوئی ہو رہا تھا، پھر کیوں، نہ ابھی سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دے؟

گوبر منہ اندھیرے میں اٹھا اور کودتی سے رخصت ہوا۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا بیاہ ہو چکا ہے۔ پس اس سے بیاہ کا کوئی چر چا ہی نہ کیا گیا۔ اس کی بھلمنا بہت نے سارے گھر کو گرویدہ کر لیا تھا۔ کودتی کی ماں کو اس نے ایسے میٹھے لفظوں میں اور اس کے ماں والے درجے کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی عمدہ نصیحت دی کہ اس نے خوش ہو کر دعادی تھی۔

”تم بڑی ہو ماما جی! پوجنے جوگ ہو۔ پتر ماما کا رن سے سو جنم لے کر بھی ارن نہیں ہو سکتا، لاکھ جنم لے کر بھی ارن نہیں ہو سکتا، کروڑ جنم لے کر بھی نہیں.....“

بوزھی اس بے حساب بھگتی پر رگن ہو گئی اس کے بعد گوبر نے جو کچھ کہا اس میں بڑھیا کو اپنی بھلائی دکھائی دی۔

”اب جیسے آج ہی بہو گھر سے روٹھ کر چلی گئی تھی تو کس کی جگہ ہوئی؟ بہو کو کون جانتا ہے کس کی لڑکی ہے۔ کس کی ناتن ہے، کون جانتا ہے؟ ممکن ہے اس کا باپ گھیا را ہی رہا ہو.....“

بڑھیا نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ”گھیا را تو ہے ہی بیٹا، پکا گھیا را تڑکے اس کا منہ دیکھ لو تو دن بھر پانی نہ ملے۔“

گوبر بولا۔ ”تو ایسے آدمی کی ہنسی ہی کیا ہو سکتی ہے، ہنسی ہوئی تمھاری اور تمھارے آدمی کی۔ جس نے پوچھا ”یہی پوچھا کہ کس کی بہو ہے۔ پھر وہ ابھی لڑکی ہے، نا سمجھ اٹھ! بیچ ماں باپ کی لڑکی ہے، اچھی کہاں سے بن جائے؟ تم کو تو جیسے بوڑھے طوطے کو رام نام پڑھا نا پڑے گا۔ مارنے سے تو وہ پڑھے گا نہیں، اسے تو پریم ہی سے پڑھایا جاسکتا ہے۔ تاڑنا دو پر اس کے منہ مت لگو۔ اس کا کچھ نہیں بگڑتا تمھاری ہی جگہ ہوتی ہے۔“

جب گوبر چلنے لگا تو بڑھیا نے کھاڑ اور ستو، ملا کر اسے کھانے کو دیا گاؤں کے اور کئی آدمی مزدوری کی تلاش میں شہر جاتے تھے۔ بات چیت میں راستہ کٹ گیا اور نوجہتے جہتے سب کے سب امین باد کے بازار میں جا پہنچے۔ گوبر حیران تھا کہ اتنے آدمی شہر میں کہاں سے

آگئے؟ آدمی پر آدمی گرا پڑتا تھا۔ اس دن بازار میں چار پانچ سو مزدوروں سے کم نہ تھے۔ معمار، بڑھی، لوہار، بیلدار، کھاٹ بننے والے، نوکری ڈھونے والے اور سنگ تراش سبھی کا مجمع تھا۔ گوہر یہ بھیڑ بھاڑ دیکھ کر نراس ہو گیا۔ اتنے سارے مزدوروں کو کہاں کام مل جاتا ہے؟ اور اس کے ہاتھ میں تو کوئی اوزار بھی نہیں ہے، کوئی کیا جانے گا کہ وہ کون سا کام کر سکتا ہے؟ کوئی اسے کیوں رکھنے لگا؟ بلا اوزار اسے کون پوچھے گا؟

رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے مزدوروں کو کام ملتا جاتا تھا۔ کچھ لوگ مایوس ہو کر گھر لوٹے جارہے تھے۔ زیادہ تر وہ بوڑھے اور نکلے بچ رہے تھے جن کا کوئی پرسان نہ تھا۔ ان ہی میں گوہر بھی تھا مگر ابھی آج اس کے پاس کھانے کو ہے، کوئی غم نہیں۔ یکا یک خورشید نے مزدوروں کے بچ میں آکر اونچی آواز سے کہا جس کو چھ آنے پر آج کام کرنا ہو وہ میرے ساتھ آئے۔ سب کو چھ آنے ملیں گے۔ پانچ بجے چھٹی ملے گی۔

دس پانچ معماروں اور بڑھیوں کے علاوہ سب کے سب ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ چار سو خستہ حالوں کی ایک بڑی فوج سج گئی۔ آگے مرزا تھے۔ کندھے پر موٹا سونا رکھے ہوئے اور پیچھے بھوکوں مرنے والوں کی لمبی قطار تھی جیسے بھیڑیں ہوں۔

ایک بوڑھے نے مرزا سے پوچھا۔ ”کون کام کرنا ہے مالک؟“

مرزا صاحب نے جو کام بتایا اس پر سب اور بھی تعجب میں آگئے، صرف ایک کبڈی کھیلتا! یہ کیا آدمی ہے جو کبڈی کھیلنے کے لیے چھ آنے دے رہا ہے۔ سبکی تو نہیں ہے کوئی؟ بہت دھن پا کر آدمی سبکی ہو جاتا ہے۔ بہت پڑھ لینے سے بھی آدمی سبکی ہو جاتا ہے۔ کچھ کو تو یہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں یہ بخول تو نہیں ہے۔ یہاں سے گھر پر لے جا کر کہہ دے کہ کوئی کام نہیں ہے تو اس کا کوئی کیا کرے گا؟ وہ چاہے کبڈی کھلائے چاہے آنکھ پھولی اور چاہے گلی ڈنڈا، مگر مزدوری پہلے دے دے۔ ایسے جھکی آدمی کا کیا بھروسہ؟

گوہر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”مالک! ہمارے پاس کچھ کھانے کو نہیں ہے، پیسے مل جائیں تو کچھ لے کر کھالوں۔“

مرزا نے فوراً چھ آنے پیسے اس کے ہاتھ میں رکھ دیے اور لٹکار کر بولے ”مزدوری سب کو چلتے چلتے پیشگی دے دی جائے گی اس کی فکر مت کرو۔“

مرزا صاحب نے شہر کے باہر تھوڑی زمین لے رکھی تھی۔ مزدوروں نے جا کر دیکھا تو

ایک بڑا احاطہ گھرا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک صرف ایک چھوٹی سی پھونس کی جمونپڑی تھی۔ جس میں تین چار کرسیاں تھیں اور ایک میز جس پر کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ جمونپڑی بیلوں سے ڈھکی ہوئی بہت عمدہ معلوم ہوتی تھی۔ احاطہ میں ایک طرف آم، لیموں اور امرود کے پودے لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف کچھ پھول، زمین کا زیادہ حصہ پرتی پڑا ہوا تھا۔ مرزا نے سب کو ایک قطار میں کھڑا کر کے سب سے پہلے سب کو اجرت تقسیم کر دی۔ اب کسی کو ان کے پاگل ہونے میں شبہ نہ رہا۔

گو بر پیسے پہلے ہی پاچکا تھا، مرزا نے اسے بلا کر پودے سینچنے کا کام سونپا۔ اسے کبڈی کھیلنے کو نہ ملے گی۔ دل مسوس کر رہ گیا۔ ان بوڑھوں کو اٹھا کر پکلتا۔ مگر کچھ پرواہ نہیں، بہت کبڈی کھیل چکا ہوں پیسے تو پورے مل گئے۔

آج مدت کے بعد ان بوڑھوں کو کبڈی کھیلنا نصیب ہوا۔ بیشتر تو ایسے تھے جنہیں یاد بھی نہ آتا تھا کہ کبھی کھیلی ہے یا نہیں۔ دن بھر شہر میں پتے تھے، پہر رات گئے گھر پہنچتے تھے اور جو کچھ روکھا سوکھا مل جاتا تھا اسے کھا کر پڑ رہتے تھے۔ علی الصباح پھر وہی چرچہ شروع ہو جاتا تھا۔ زندگی بے مزہ اور بے لطف، صرف ایک دھرے پر چلی جا رہی تھی۔ آج جو یہ موقع ملا تو بوڑھے بھی جوان بن گئے ادھ مرے بوڑھے، ٹھٹھریاں لیے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، جاکھوں کے اوپر تک دھوتیاں یا تہمڑے چھائے خم ٹھوک ٹھوک کر اچھل رہے تھے گویا ان کی بوڑھی ہڈیوں میں جوانی سرایت کر گئی ہو۔ جھٹ پٹ پالی بن گئی۔ دو ہیرو بن گئے ساتھیوں کا چناؤ ہونے لگا اور بارہ بجتے بجتے کھیل شروع ہو گیا۔ جازوں کی ٹھنڈی دھوپ ایسے کھیلوں کے لیے بہت خوشگوار ہوتی ہے۔

ادھر احاطہ کے چھانک پر مرزا صاحب تماشاویوں کو نکٹ بانٹ رہے تھے ان پر اس طرح کا خط ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ امیروں سے پیسہ لے کر غریبوں میں بانٹ دینا۔ اس بوڑھی کبڈی کا اشتہار کئی روز سے ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے پوسٹر لگائے گئے تھے۔ نوٹس تقسیم ہوئے تھے۔ یہ کھیل اپنے ڈھنگ کا زالا ہوگا۔ جیسے پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا۔ ہندستان کے بوڑھے آج بھی کیسے جوان مرد ہوتے ہیں۔ جنہیں یہ دیکھنا ہو وہ آئے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے! جس نے یہ تماشا نہ دیکھا وہ پچھتائے گا۔ ایسا نادر موقع پھر نہ ملے گا۔ نکٹ دس آنے سے لے کر دو آنے تک کے تھے۔ تین بجتے بجتے پورا احاطہ بھر گیا۔ موٹرول اور فلوں کا تاننا لگا

ہوا تھا۔ دو ہزار سے کم کا مجمع نہ تھا۔ روسا کے لیے کرسیاں اور بیچوں کا انتظام تھا اور عوام کے لیے صاف ستھری زمین۔

مس مالتی مہتا، کھٹا، بٹخا، اور رائے صاحب سبھی موجود تھے۔

کھیل شروع ہوا تو مرزا نے مہتا سے کہا۔ ”آئیے ڈاکٹر صاحب ایک پالی ہماری اور آپ کی بھی ہو جائے گی۔“

مس مالتی بولیں ”فلاسفر کا مقابلہ تو فلاسفر ہی سے ہو سکتا ہے۔“

مرزا نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ ”تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں فلاسفر نہیں ہوں؟ میرے پاس ڈگری کی ڈم نہیں ہے مگر ہوں میں فلاسفر۔ آپ میرا امتحان لے سکتے ہیں مہتاجی۔“

مالتی نے پوچھا بتائیے کہ آپ آکزیلیسٹ ہیں یا میٹریلیسٹ (روحانیت کے قائل ہیں یا مادیت کے)؟“

”میں دونوں ہوں۔“

”یہ کیوں کر؟“

”بہت اچھی طرح۔ جب جیسا موقع دیکھا دیا بن گیا۔“

”تو آپ کا کوئی طے شدہ اصول نہیں ہے؟“

”جنس بات کا آج تک کبھی تعقید نہ ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔ اس کے متعلق میں بھلا کیا طے کر سکتا ہوں؟ اور لوگ آنکھیں پھاڑ کر کہتا ہیں چاٹ کر جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہاں میں یوں ہی پہنچ گیا۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ کسی فلاسفر نے عقلی گدے لگانے کے سوا اور بھی کچھ کیا ہے۔“

ڈاکٹر مہتا نے اچکن کے ٹن کھولتے ہوئے کہا ”تو چلیے آپ کی اور ہماری ہو جائے۔ اور کوئی مانے یا نہ مانے میں آپ کو فلاسفر مانتا ہوں۔“

مرزا نے کھٹا سے پوچھا۔ ”آپ کے لیے بھی کوئی جوڑ ٹھیک کریں؟“

مالتی ”ہاں۔ ہاں انھیں ضرور لے جائیے، مسٹر ٹٹخا کے ساتھ۔“

کھٹا چھپتے ہوئے بولے۔ ”جی نہیں مجھے معاف کیجیے۔“

مرزا نے رائے صاحب سے پوچھا۔ ”آپ کے لیے کوئی جوڑ لاؤں؟“

رائے صاحب بولے۔ ”میرا جوڑ تو اونکار ناتھ کا ہے۔ مگر وہ آج نظر نہیں آتے۔“
مرزا اور مہتا بھی برہنہ بدن، صرف جاکھیا پہنے ہوئے میدان میں پہنچ گئے تھے۔ ایک ادھر
دوسرا ادھر کھیل شروع ہو گیا۔

عوام ان بوزمی کلیوں پر ہنستے تھے، تالیاں بجاتے تھے، گالیاں دیتے تھے لٹکارتے تھے
اور بازیاں لگاتے تھے۔ واہ، ذرا ان بوڑھے بابا کو تو دیکھو کس شان سے جارہے ہیں جیسے
سب کو مار کر ہی لوٹیں گے۔ اچھا، دوسری طرف سے بھی ان کے بڑے بھائی بٹکلے۔ دونوں
کیسے پینترے بدل رہے ہیں۔ ان ہڈیوں میں ابھی بڑا جیوٹ ہے بھائی! ان لوگوں نے جتنا
تھکی کھایا ہے، اتنا تو ہمیں اب پانی بھی میسر نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندستان دولت مند
ہو رہا ہے۔ ہوتا ہوگا۔ ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ ان بوزھوں جیسے جیوٹ کے جوان بھی آج کل
مشکل سے نکلیں گے وہ ادھر والے بوڑھے نے اسے دبوچ لیا۔ بے چارہ چھوٹے کے لیے
کتنا زور مار رہا ہے مگر اب نہیں جاسکتا بچہ۔ ایک کو تین لپٹ گئے۔ اس طرح لوگ اپنی
دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی ساری توجہ میدان پر تھی۔ کھلاڑیوں کے دھکے مکے، ادھیل
کود، دھر پکڑ اور ان کے مرنے جینے میں بھی سبھی محو ہو رہے تھے۔ کبھی چاروں طرف سے قہقہے
اٹھتے، کبھی کوئی بے انصافی یا دھوکے کی بات دیکھ کر لوگ ”چھوڑ دو، کا شور برپا کرتے اور
کچھ لوگ تو طیش میں آکر پالی کی ہی طرف دوڑ پڑتے۔ لیکن تھوڑے سے لوگ پنڈال میں
اٹلی درجے کے ٹکٹ لے کر بیٹھے تھے انھیں اس کھیل میں کچھ زیادہ مزہ نہ آرہا تھا۔ وہ اس
سے زیادہ اہمیت کی گفتگو میں مصروف تھے۔

کھانا نے جنجر کا گلاس خالی کر کے سگار جلایا اور رائے صاحب سے بولے۔ ”میں
نے آپ سے کہہ دیا کہ بینک اس سے کم سود پر کسی طرح منظوری نہ دے گا۔ اور یہ
رعایت بھی میں نے آپ کے ساتھ کی ہے۔ کیونکہ آپ سے گھر کا معاملہ ہے۔“ رائے
صاحب نے مونچھوں کے اندر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر گھر والوں کو اب لٹے چھرے سے
حلال کرنا چاہیے۔“

”یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ سورج پر تاپ سنگھ سے آپ نے صرف سات فیصدی لیا ہے،
مجھ سے نو فیصد مانگ رہے ہیں اور اس پر احسان بھی رکھتے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔“

کھنانے قہقہہ لگایا۔ گویا یہ بات ہنسنے کے ہی لائق تھی۔ ان شرطوں پر میں آپ سے بھی وہی سود لے لوں گا۔ ہم نے ان کی جائداد رہن رکھ لی ہے اور شاید وہ جائداد پھر ان کے ہاتھ نہ جائے گی۔“

”میں بھی اپنی کوئی جائداد نکال دوں گا۔ نوئی صدی سے کہیں بہتر ہے کہ فالتو جائداد الگ کر دوں، میری جیکسن روڈ والی کٹھی آپ نکلوا دیں۔ کمیشن لے لیجیے گا۔“

”اس کٹھی کا آسانی سے نکھنا ذرا مشکل ہے۔ آپ جانتے ہیں وہ جگہ ہستی سے کتنی دور ہے۔ مگر خیر دیکھوں گا۔ آپ اس کی قیمت کا کیا اندازہ کرتے ہیں؟“

رائے صاحب نے ایک لاکھ پچیس ہزار بتائے۔ پندرہ کچھ زمین تو ہے اس کے ساتھ۔ کھتا متغیر ہو گئے۔ بولے۔ ”آپ آج کی پندرہ سال پہلے کا خواب دیکھ رہے ہیں، رائے صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ادھر جائدادوں کی قیمت میں پچاس فی صدی کی کمی ہو گئی ہے۔“

رائے صاحب نے برا مان کر کہا۔ ”جی نہیں پندرہ سال پہلے اس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ تھی۔“

”میں خریدار کی تلاش میں رہوں گا۔ مگر میرا کمیشن پانچ فی صدی ہوگا آپ سے۔“

”اوروں سے شاید دس فی صدی ہو، کیوں؟ کیا کرو گے اتنے روپے لے کر؟“

”آپ جو چاہے دے دیجیے گا۔ اب تو راضی ہوئے۔ شکر کے حصے ابھی تک آپ نے نہ خریدے۔ اب بہت تھوڑے بچ رہے ہیں، ہاتھ ملتے رہ جائیے گا۔ بیرہ کی پالیسی آپ نے نہ لی آپ میں ٹال مٹول کی بڑی عادت ہے۔ جب اپنے نفع کی باتوں میں اتنا ٹال مٹول ہے تو دوسروں کو آپ لوگوں سے کیا نفع ہو سکتا ہے۔ اسی سے کہتے ہیں کہ ریاست آدی کی عقل چر جاتی ہے۔ میرا بس چلے تو تعلقداروں کی ریاستیں ضبط کر لوں۔“

مسٹر منٹھا، مالتی پر جال پھینک رہے تھے۔ مالتی نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ چنڈا کے جھیلے میں نہیں پڑنا چاہتی۔ مگر منٹھا اتنی آسانی سے ہار ماننے والے آدی نہ تھے۔ آکر کہنیوں کے بل میز پر ٹیک لگا کر بولے۔ ”آپ ذرا اس معاملے پر غور کریں۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا موقع شاید آپ کو پھر نہ ملے۔ رانی صاحبہ چندا کو آپ کے مقابلہ میں روپے میں ایک آنہ چانس بھی نہیں ہے۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ کونسل میں صرف ایسے آدی جائیں جنہوں

نے زندگی میں کچھ تجربہ حاصل کیا ہو اور عوام کی کچھ خدمت بھی کی ہو۔ جس عورت نے عیش و عشرت کے سوا کچھ جانا ہی نہیں جس نے عوام کو ہمیشہ موٹر کا پٹرول سمجھا۔ جس کی سب سے قیمتی خدمات وہ پارٹیاں ہیں جو گورنروں اور سکریٹریوں کو دی جاتی ہیں۔ اس کے لیے کونسل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ نئی کونسلوں میں بہت کچھ اختیار نمائندوں کے ہاتھ میں ہوگا اور میں نہیں چاہتا کہ وہ اختیار نامستحقوں کے ہاتھ میں جائے۔“

مالتی نے گلا جھڑانے کے لیے کہا۔ ”لیکن صاحب، میرے پاس دس بیس ہزار الگشن میں خرچ کرنے کے لیے کہاں ہے؟ رانی صاحبہ تو دوچار لاکھ خرچ کر سکتی ہیں۔ مجھے بھی سال میں ہزار پانچ سو روپے ان سے مل جاتے ہیں، یہ رقم بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

”پہلے آپ یہ بتا دیں کہ آپ جانا چاہتی ہیں یا نہیں؟“

”جانا تو چاہتی ہوں بشرطیکہ کہ فری پاس مل جائے۔“

”تو یہ میرا ذمہ رہا۔ آپ کو فری پاس مل جائے گا۔“

”جی نہیں معاف کیجیے میں ہار کی ذلت نہیں اٹھانا چاہتی۔ جب رانی صاحبہ روپے کی تھیلیاں کھول دیں گی اور ایک ایک دوٹ پر ایک ایک اشرنی چڑھنے لگے گی تو شاید آپ بھی ادھر ہی دوٹ دیں گے۔“

”آپ کے خیال میں چناؤ محض روپے سے جیتا جاسکتا ہے۔“

”جی نہیں۔ شخصیت بھی ایک چیز ہے۔ لیکن میں نے صرف ایک مرتبہ جیل جانے کے سوا اور عوام کی کیا خدمت کی ہے؟ اور سچ پوچھیے تو اس بار میں بھی اپنے مطلب سے گئی تھی، اسی طرح جیسے رائے صاحب اور کھٹا گئے تھے۔ اس نئے تمدن کی بنیاد دولت ہے۔ علم اور خدمت، خاندان اور ذات، سب دولت کے سامنے ہچ ہیں۔ کبھی کبھی تاریخ میں ایسے موقع آجاتے ہیں جب دولت کو تحریک کے مقابلے میں نیچا دیکھنا پڑتا ہے۔ مگر اسے مستثنیات میں سمجھیے۔ میں اپنی ہی بات کہتی ہوں کوئی غریب دواخانے میں آجاتی ہے تو اس سے بولتی تک نہیں، مگر کوئی عورت موٹر پر آگئی تو دروازے تک جا کر استقبال کرتی ہوں اور ایسی ناز و برداری کرتی ہوں گویا وہ مجسم دیوی ہو۔ میرا اور رانی صاحبہ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ جیسی کونسلیں بن رہی ہیں ان کے لیے رانی صاحبہ ہی زیادہ موزوں ہیں۔“

ادھر میدان میں مہتا کی ٹیم کمزور پڑتی جاتی تھی۔ نصف سے زیادہ کھیلانڈی مر چکے

تھے۔ مہتا نے اپنی زندگی میں کبھی کبڈی نہ کھیلی تھی۔ مرزا اس فن میں استاد تھے۔ مرزا کی تعطیلیں ٹانگ کی مشق میں گزرتی تھیں، بھیس بنانے میں وہ اچھے اچھوں کو متوجہ کر دیتے تھے۔ مرزا کی ساری دلچسپی اکھاڑے میں تھی، پہلوانوں کے بھی اور پریوں کے بھی!

”مالتی کا دھیان ادھر ہی لگا ہوا تھا۔ اٹھ کر رائے صاحب سے بولی۔ ”مہتا کی پارٹی تو بری طری پٹ رہی ہے۔“

رائے صاحب اور کھانا میں بیمہ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ رائے صاحب اس سے اکتائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مالتی نے گویا گلو خلاصی دے دی۔ اٹھ کر بولے ”جی ہاں پٹ تو رہی ہے۔ مرزا پکا کھلاڑی ہے۔“

”مہتا کو یہ کیا سنک سوچھی۔ مفت اپنی بھد کر رہا ہے۔“

”اس میں کاہے کی بھد۔ دل لگی ہی تو ہے۔“

مہتا کی طرف سے جو باہر نکلتا ہے وہی مرجاتا ہے۔“

”ایک لمحہ بعد اس نے پوچھا ”کیا اس کھیل میں ہاف ٹائم نہیں ہوتا۔“

کھانا کو شرارت سوچھی بولے ”آپ چلے تھے مرزا سے مقابلہ کرنے، سمجھے تھے کہ یہ بھی فلسفہ ہے۔“

”میں پوچھتی ہوں اس کھیل میں ہاف ٹائم نہیں ہوتا؟“

کھانا نے پھر چڑھایا۔ ”اب کھیل ہی ختم ہوا جاتا ہے۔ مزہ آئے گا جب مرزا صاحب مہتا کو دیوچ کر گزریں گے اور مہتا صاحب چیں بولیں گے۔“

”میں تم سے نہیں پوچھتی رائے صاحب سے پوچھتی ہوں۔“

رائے صاحب بولے۔ ”اس کھیل میں کیسا ہاف ٹائم؟ ایک ہی ایک آدمی کر کے تو سامنے آتا ہے۔“

”اچھا مہتا کا ایک آدمی اور مر گیا۔“

کھانا بولے۔ ”آپ دیکھتی رہیے۔ اسی طرح سب مرجائیں گے۔ اور آخر میں مہتا صاحب بھی مرے گے۔“

مالتی جل گئی۔ ”آپ کی تو ہمت نہ پڑی باہر نکلنے کی۔“

”میں دیہاتی کھیل نہیں کھیلتا۔ میرے لیے ٹینس ہے۔“

”نفس میں بھی میں تمہیں سیکڑوں تلم دے چکی ہوں۔“

”آپ سے جیتنے کا مجھے دعویٰ ہی کب ہے؟“

”اگر دعویٰ ہو تو میں تیار ہوں۔“

مالتی انہیں پھنکار بٹا کر پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ کسی کو مہتا سے ہمدردی نہیں ہے۔ کوئی صاحب یہ نہیں کہتے کہ اب کھیل ختم کر دیا جائے۔ مہتا بھی عجیب احمق آدمی ہیں، کچھ دھاندلی کیوں نہیں کر بیٹھتے؟ یہاں بھی اپنی انصاف پسندی دکھا رہے ہیں۔ ابھی ہار کر لوٹیں گے تو چاروں طرف سے تالیاں پڑیں گی۔ اب شاید میں آدمی اور ان کی طرف ہوں گے اور لوگ کتنے خوش ہو رہے ہیں!“

جیوں جیوں خاتمہ قریب آتا جاتا تھا، لوگ بیتاب ہوتے جاتے اور پالی کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ رسی کا جو ایک کلکھر سا بنایا گیا تھا وہ توڑ دیا گیا۔ والظیر روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس شوق کے نشے میں ان کی ایک بھی نہ چلتی تھی حتیٰ کہ بڑھاؤ آخری حد تک آپہنچا اور مہتا تباہی مچ گئے۔ اب انہیں گونگے کے پارٹ کھیلنا پڑے گا اب سارا دارو مدار ان ہی پر ہے اگر وہ بچ کر اپنی پالی میں لوٹ آتے ہیں تو ان کی پارٹی کی خیر ہے ورنہ شکست کی ساری ذلت و ندامت لیے ہوئے انہیں لوٹنا پڑتا ہے۔ وہ دوسرے طرف کے جتنے آدمیوں کو چھوڑ کر اپنی پالی میں آئیں گے وہ سب مرجائیں گے اور اتنے ہی آدمی ان کی طرف جی انہیں گے۔ سب کی آنکھیں مہتا پر لگی ہوئی تھیں وہ مہتا چلے! لوگوں نے چاروں طرف سے آکر پالی کو گھیر لیا۔ انتہائی محویت تھی۔ مہتا کتنے اطمینان سے دشمنوں کی طرف جارہے ہیں اور ان کی ہر حرکت لوگوں پر منعکس ہوتی جاتی ہے۔ کسی کی گردن میڑھی ہوتی چلی جاتی ہے تو کوئی آگے جھکا پڑتا ہے فضا گرم ہو گئی ہے۔ پارہ حرارت کے انتہائی نقطے تک پہنچ گیا ہے۔ مہتا مخالف جماعت میں داخل ہوئے وہ جماعت پیچھے ہٹتی جاتی ہے ان کا سنگٹھن اتنا مضبوط ہے کہ مہتا کی پکڑ میں کوئی نہیں آ رہا ہے۔ بہتوں کو جو امید تھی کہ مہتا کم سے کم اپنی پارٹی کے دس پانچ آدمیوں کو جلا ہی دیں گے وہ مایوس ہوتے جارہے ہیں۔

دفعتاً مرزا ایک چھلانگ مارتے ہیں اور مہتا کی کمر پکڑ لیتے ہیں۔ مہتا اپنے چھڑانے کے لیے زور لگا رہے ہیں۔ مرزا کو پالی کی طرف کھینچنے لیے آ رہے ہیں۔ لوگ پاگل ہوئے جاتے ہیں۔ اب اس کا پتہ چلنا مشکل ہے کہ کون کھلاڑی ہے اور کون تماشائی۔ سب ایک

میں مل جل گئے ہیں ، مرزا اور مہتا میں کشتی ہو رہی ہے ۔ مرزا کے کئی بڑے مہتا کی طرف لپکے اور ان سے لپٹ گئے ۔ مہتا زمین پر چپ چاپ پڑے ہوئے ہیں ۔ اگر وہ کسی طرح کھینچ کر دو ہاتھ اور لے جائیں تو ان کے پچاسوں آدمی جی اٹھتے ہیں مگر وہ ایک انج بھی نہیں کھسک سکتے ۔ مرزا ان کی گردن پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔ مہتا کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے ، آنکھیں سیر بہوٹی بنی ہوئی ہیں ۔ پسینہ ٹپک رہا ہے اور مرزا اپنے موٹے جسم کا بوجھ لیے ان کی پیٹھ پر اچھل رہے ہیں ۔ مالتی نے قریب جا کر جوش میں کہا ”مرزا خورشید یہ فیصہ نہیں ہے ، بازی ڈران رہی ۔“

خورشید نے مہتا کی گردن پر ایک رگڑا لگا کر کہا ۔ ”جب تک یہ جیس نہ بولیں گے میں ہرگز نہ چھوڑوں گا ۔ کیوں نہیں جیس بولتے ؟“

مالتی اور آگے بڑھی ۔ ”جیس بلانے کے لیے آپ اتنا جبر نہیں کر سکتے ۔“
مرزا نے مہتا کی پیٹھ پر اچھل کر کہا ”بیک کر سکتا ہوں ۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ جیس بولیں ، میں ابھی اٹھا جاتا ہوں ۔“

مہتا نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر مرزا نے ان کی گردن دبا دی ۔
مالتی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔ ”یہ کھیل نہیں دشمنی ہے ۔“
”دشمنی ہی سہی ۔“

”آپ نہ چھوڑیں گے ؟“

اسی وقت جیسے کوئی زلزلہ آگیا ۔ مرزا صاحب زمین پر پڑے ہوئے تھے اور مہتا دوڑے ہوئے پالی کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور ہزاروں آدمی پاگلوں کی طرح ٹوپیاں ، گچڑیاں ، اور چھڑیاں اچھال رہے تھے ۔ کیسے یہ کایا پلٹ ہوئی ، کوئی نہ سمجھ سکا ۔
مرزا نے مہتا کو گود میں اٹھالیا اور لیے ہوئے شامیانے تک آئے ۔ ہر شخص کی زبان پر یہ الفاظ تھے ۔ ”ڈاکٹر صاحب نے بازی مار لی ۔“ ایک ہر ایک شخص اس ہاری ہوئی بازی کی ایکبارگی پلٹ جانے پر متعجب تھا ۔ سبھی مہتا کے جیوٹ اور دم اور استقلال کی تعریف کر رہے تھے ۔

حردوروں کے لیے پہلے ہی سے نارنگیاں منگائی گئی تھیں انھیں ایک ایک نارنگی دے کر رخصت کیا گیا ۔ شامیانے میں مہمانوں کی چائے پانی کا انتظام تھا ۔ مہتا اور مرزا ایک ہی میز

پر آنے سامنے بیٹھے، مالتی مہتا کے پاس بیٹھی۔

مہتا نے کہا۔ ”مجھے آج ایک نیا تجربہ ہوا۔ عورت کی ہمدردی ہار کو جیت بنا سکتی ہے۔“

مرزا نے مالتی کی طرف دیکھا۔ ”اچھا تو یہ بات تمہی تھی تو مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ

آپ یکا یک ادھر کیسے آ گئے۔“

مالتی شرم سے سرخ ہوئی جاتی تھی بولی۔ ”آپ بڑے بے مروت آدمی ہیں مرزا جی،

مجھے آج معلوم ہوا۔“

”قصو ران کا تھا۔ یہ کیوں چھیں نہیں بولتے تھے۔“

”میں تو چھیں نہ بولتا چاہے آپ میری جان ہی لے لیتے۔“

کچھ دیر دوستوں میں غپ شپ ہوتی رہی۔ پھر شکریہ اور مبارک بعد کی تقریریں ہوئیں

اور مہمان رخصت ہوئے۔ مالتی کو بھی ایک مریض کے لیے جانا تھا۔ پس وہ بھی چلی گئی۔ صر

ف مرزا اور مہتا رہ گئے۔ انھیں ابھی نہانہ تھا۔ مٹی میں لت پت ہو رہے تھے۔ کپڑے کیسے

پہنتے؟ گوبر پانی کھینچ لایا اور دونوں نہانے لگے۔

”مرزا نے پوچھا۔“ شادی کب تک ہوگی؟“

مہتا نے حیرت سے پوچھا۔ ”کس کی؟“

”آپ کی۔“

”میری شادی کس کے ساتھ؟“

”واہ آپ تو ایسا اڑا رہے ہیں گویا یہ بھی کوئی چھپانے کی بات ہے۔“

”نہیں نہیں، میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے بالکل خبر نہیں ہے۔ کیا میری شادی ہونے

جاری ہے؟“

”اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ مس مالتی آپ کی رفیق بن کر رہیں گی۔“

مہتا متانت سے بولے۔ ”آپ کا قیاس بالکل غلط ہے مرزا جی! مس مالتی خوبصورت

ہیں، خوش مزاج ہیں، سمجھدار ہیں؟ روشن خیال ہیں اور بھی ان کی کتنی ہی خوبیاں ہیں۔ مگر

میں اپنی زندگی کی ریفقہ میں جو بات دیکھتا چاہتا ہوں وہ ان میں نہیں ہے اور نہ شاید ہو سکتی

ہے۔ میرے ذہن میں عورت وفا اور ایثار کی صورت ہے جو اپنی بے زبانی اور اپنی قربانی سے

اپنے کو بالکل مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ قالب مرد کا رہتا ہے مگر جان

عورت کی ہوا کرتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ مرد اپنے کو کیوں نہیں مٹاتا عورت ہی سے کیوں یہ امید کرتا ہے۔ مرد میں وہ سکت ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے کو مٹائے گا تو کچھ نہ رہ جائے گا۔ وہ کسی ٹکھا میں جانیٹھے گا اور وصال حق کا خواب دیکھنے لگے گا۔ اس میں جلال کی زیادتی ہے اور وہ اپنے گھمنڈ میں یہ سمجھ کر کہ وہ عقل کا پتلا ہے، سیدھا خدا میں جذب ہو جانے کا تصور کیا کرتا ہے۔ عورت زمین کی طرح صبر اور سکون اور برداشت والی ہے۔ مرد میں عورت کے اوصاف آجاتے ہیں تو وہ مہاتما بن جاتا ہے اور عورت میں مرد کے گن آجائے تو وہ بدکردار بن جاتی ہے۔ مرد راغب ہوتا ہے اس عورت کی طرف جو ہمہ وجوہ مکمل ہو۔ مالتی نے ابھی مجھے راغب نہیں کیا۔ میں آپ سے کن الفاظ میں کہوں کہ عورت میری نگاہوں میں کیا ہے۔ دنیا میں جو کچھ خوبصورت ہے اسی کے مجسمہ کو میں عورت کہتا ہوں۔ میں اس سے امید رکھتا ہوں کہ میں اسے مار بھی ڈالوں تو اس کے دل میں بدی کا خیال تک نہ آئے۔ اگر میں اس کی آنکھوں کے سامنے کسی عورت کو پیار کروں تو بھی وہ حسد نہ کرے ایسی عورت پا کر میں اس کے قدموں پر گر پڑوں گا اور اس پر اپنے آپ کو نچاؤ کر دوں گا۔“

مرزا نے سر ہلا کر کہا۔ ”ایسی عورت آپ کو اس دنیا میں تو شاید ہی ملے۔“

مہتا نے ہاتھ مار کر کہا۔ ”ایک نہیں ہزاروں! ورنہ دنیا دیران ہو جاتی۔“

”ایسی ایک ہی مثال دیجیے۔“

”سبز کھنا ہی کو لیجیے۔“

”لیکن کھنا۔“

”کھنا بد نصیب ہیں جو ہیرا پا کر اسے کانچ کا ٹکڑا سمجھ رہے ہیں۔ سوچے کتنا ایثار ہے اور اس کے ساتھ ہی کتنی محبت ہے۔ کھنا کے صورت پرست دل میں شاید اس کے لیے ذرا بھی جگہ نہیں ہے مگر آج کھنا پر کوئی آفت آجائے تو وہ خود کو ان پر قربان کر دے گی۔ کھنا آج اندھے اور کوڑھی ہو جائیں تو بھی اس کی وفاداری میں فرق نہ آئے گا! ابھی کھنا اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں مگر آپ دیکھیں گے کہ ایک دن وہ اس کے پیر دھو دھو کر پیئیں گے۔ میں ایسی بیوی نہیں چاہتا جس سے میں پروفیسر آئنسٹائن کے اصولوں پر بحث کر سکوں یا جو میری کتابوں کے پُر دف دیکھا کرے۔ میں ایسی عورت چاہتا ہوں جو میری زندگی کو پاک اور روشن بنا دے اپنی محبت اور قربانی سے۔“

خورشید نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے کوئی بھولی بات یاد کر کے کہا۔ ”آپ کا خیال بہت درست ہے۔ مسٹر مہتا ایسی عورت کہیں مل جائے تو میں بھی شادی کر لوں، مگر امید نہیں ہے کہ مجھے ملے۔“

مہتا نے ہنس کر کہا۔ ”آپ بھی کھوج میں رہیے اور میں بھی ہوں۔ شاید قسمت جاگ اٹھے۔“

”مگر مس مالتی آپ کو چھوڑنے والی نہیں۔ کیسے لکھ دوں۔“

”ایسی عورتوں سے صرف میں دل بہلاؤ کر سکتا ہوں، بیاہ نہیں۔ بیاہ تو خود کو سراپا نذر کر دیتا ہے اگر بیاہ یہی ہے تو محبت کیا ہے۔“

”محبت جب اسی نذر کی صورت پکڑ لیتی ہے۔ جب ہی بیاہ ہے اور اس کے قبل عیاشی ہے۔“

مہتا نے کپڑے پہنے اور رخصت ہو گئے۔ شام ہو گئی تھی۔ مرزا نے جاکر دیکھا تو گوبر ابھی تک پیڑوں کو سینچ رہا تھا۔ مرزا نے خوش ہو کر کہا۔ ”جاؤ اب تمہاری چھٹی ہے۔ کل پھر آؤ گے؟“

گوبر نے عاجزی سے کہا۔ ”میں کہیں نوکری کرنا چاہتا ہوں مالک!،“

”نوکری کرنا ہے تو ہم تجھے رکھ لیں گے۔“

”کتنا ملے گا مالک؟“

”جتنا تو مانگے۔“

”میں کیا مانگوں، آپ جو چاہیں دے دیں۔“

”ہم تمہیں پندرہ روپے دیں گے اور خوب کس کر کام لیں گے۔“

گوبر محنت سے نہیں ڈرتا۔ اسے روپے ملیں تو آٹھوں پہر کام کرنے کو تیار ہے۔ پندرہ روپے ملیں تو کیا پوچھنا وہ تو جان بھی دے دے گا۔ بولا۔ ”میرے لیے ایک کوٹھری مل جائے تو یہیں پڑا رہوں گا۔“

”ہاں۔ ہاں جگہ کا انتظام میں کر دوں گا۔ اسی جھونپڑی میں ایک طرف تم بھی پڑ رہنا۔“

گوبر کو جیسے بیلکٹھ مل گیا۔

ہوری کی پوری فصل جرمانے کے نذر ہو چکی تھی۔ بیساکھ تو کسی طرح کٹ گیا مگر جیٹھ لگتے لگتے گھر میں غلے کا ایک دانہ نہ رہا۔ پانچ پانچ آدمی کھانے والے اور گھر میں غلہ ندارد۔ دونوں وقت نہ ملے تو ایک وقت تو ملنا چاہیے۔ پیٹ بھر نہ ملے تو آدھا پیٹ ہی سہی فالتے سے کوئی کتنی دن رہ سکتا ہے۔ ادھار لے تو کس سے؟ گاؤں کے سبھی چھوٹے موٹے مہاجنوں سے تو منہ چراتا پڑتا تھا۔ مزدوری بھی کرے تو کس کی؟ جیٹھ میں تو اپنا ہی کام ڈھیروں تھا۔ اکٹھ میں پانی لگا ہوا تھا مگر خالی پیٹ منت بھی کیسے ہو۔

شام ہو گئی تھی۔ چھوٹا بچہ رو رہا تھا۔ ماں کو کھانا نہ ملے تو دودھ کہاں سے ہو؟ سونا یہ سب بات سمجھتی تھی مگر ردپا کیا سمجھے؟ بار بار روٹی روٹی چلا رہی تھی۔ دن بھر تو کچی امیوں سے دل بہلایا مگر اب تو کوئی ٹھوس چیز چاہیے۔ ہوری دلاری سینھانی سے اتاج ادھار مانگنے گیا تھا مگر وہ دوکان بند کر کے بازار چلی گئی تھی۔ مگر دشاہ نے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ ڈانٹ بھی بتائی۔ ”ادھار مانگنے چلے ہیں تین سال سے دھیلا بیاج کا نہیں دیا۔ اس پر ادھار دیے جاؤ۔ اب دوسرے جنم میں دیں گے! کھوٹی نیت ہو جاتی ہے تو یہی حال ہوتا ہے۔ بھگوان سے بھی یہ کھوٹائی دیکھی نہیں جاتی۔ کارندے کی ڈانٹ پڑی تو کیسے چپ سے روپے اگل دیے۔ میرا روپیہ تو روپیہ ہی نہیں ہے۔ اور گھر والی ہے تو اس کا بچا ہی نہیں ملتا۔“

وہاں سے آبدیدہ ہو کر لوٹا اور اداس بیٹھا ہوا تھا کہ پٹیا آگ لینے آئی۔ رسوئی کے وقت دروازے پر جا کر دیکھا تو اندھیرا پڑا ہوا تھا۔ بولی ”آج روٹی نہیں بنا رہی ہو کیا بھابھی جی؟ اب تو ہیرا ہو گئی ہے۔“

جب سے گوبر بھاگا تھا، پٹیا اور دھنیا میں بول چال ہو گئی تھی۔ پٹیا ہوری کا احسان بھی ماننے لگی تھی۔ ہیرا کو اب وہ گالیاں دیتی تھی۔ ”ہتیارا گنو ہتیا کر کے بھاگا۔ منہ میں کالکھ لگی ہے، گھر کیسے آوے؟ اور آوے تو گھر میں پاؤں نہ رکھنے دوں گی۔ گنو ہتیا کر کے اسے لاج بھی نہ آئی۔ بہت اچھا ہوتا کہ پولیس باندھ کر لے جاتی اور چکی پھواتی۔“

دھنیا کوئی حیلہ نہ کر سکی بولی۔ ”روٹی کہاں سے بنے گی گھر میں دانہ تو ہے ہی نہیں۔ تیرے مہتو نے برادری کا پیٹ بھر دیا، بال بچے مرے یا جنیں۔ اب برادری جھاگتی تک نہیں۔“

پنیا کی فصل اچھی ہوئی تھی اور وہ مانتی تھی کہ یہ ہوری کی بدولت ہے۔ ہیرا کے ہاتھوں کبھی اتنی برکت نہ ہوئی تھی بولی۔ ”اناج میرے گھر سے کیوں نہیں منگوا لیا۔ وہ بھی تو مہتو کی کمائی ہے کہ کسی اور کی ہے؟ سکھ کے دن آوے تو لا لینا، دکھ تو ساتھ ساتھ رونے ہی سے کتنا ہے۔ میں کیا ایسی اندھی ہوں کہ آدمی کا دل نہیں پہچانتی؟ مہتو نے نہ سنبھالا ہوتا تو آج مجھے کہاں ٹھکانا تھا؟“ وہ اٹے پاؤں لوٹی اور سونا کو بھی ساتھ لیتی گئی۔ ایک لمحے میں دو بڑے ٹوکڑے اناج سے بھرے ہوئے لاکر آنگن میں رکھ دیے۔ دامن سے کم جو نہ تھا۔ دھنیا ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ پھر وہ چل دی اور لمحہ بھر میں ایک بڑی سی ٹوکری ارہر کی دال سے بھری ہوئی لاکر رکھ دی اور بولی ”چلو میں چولھا جلائے دیتی ہوں۔“

دھنیا نے دیکھا تو جو کے اوپر ایک چھوٹی سی ڈلیا میں چار پانچ سیر آنا بھی تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ وہ مغلوب ہوئی۔ آنکھوں میں محبت اور شکرے کے آنسوں بھر کر بولی۔ ”سب کا سب اٹھا لائی کہ گھر میں بھی کچھ چھوڑا؟ کہیں بھاگا جاتا تھا!“

آنگن میں بچہ کھٹولے پر پڑا رو رہا تھا۔ پنیا اسے گود میں لے کر دلار کرتی ہوئی بولی۔ ”تمھاری دیا سے ابھی بہت ہے بھابی جی! پندرہ من تو جو ہے اور دس من گیہوں اور پانچ من مٹر، کیا چھپانا؟ دونوں گھروں کا کام چل جائے گا۔ دتین مہینے میں پھر مکا ہو جائے گی آگے بھگوان مالک ہیں۔“

جھدیا نے آکر آنچل سے چھوٹی ساس کے چرن چھوئے۔ پنیا نے ایس دی۔ سونا آگ جلانے چلی اور روپا نے پانی کے لیے گھڑا اٹھایا۔ رکی ہوئی گاڑی چل پڑی۔ پانی میں رکاوٹ کے سبب جو بھنور تھا، جھاگ تھا، شور تھا بہاؤ کی تیزی تھی، وہ رکاوٹ ہٹ جانے سے آہستہ آہستہ میٹھے راگ کے ساتھ برابر ہو کر بہہ چلا!

پنیا بولی۔ ”مہتو کو ڈانٹر دینے کی ایسی جلدی کیا پڑی تھی؟“

دھنیا نے کہا۔ ”برادری میں اجاگر کیسے ہوتے۔“

”بھابھی برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔“

”کہہ برا کیوں مانوں گی؟“
 ”نہ کہوں گی، کہیں تم بگڑنے لگو۔“
 ”کہتی ہوں کہ کچھ نہ بولوں گی کہہ تو۔“
 ”ضمیمیں جھٹیا کو گھر میں نہ رکھنا چاہیے تھا۔“
 ”تب کیا کرتی؟ وہ ڈوبی مرتی تھی۔“
 ”میرے گھر میں رکھ دیتیں، تب تو کوئی کچھ نہ کہتا۔“
 ”یہ تو تو آج کہتی ہے۔ اس دن بھیج دیتی تو جھاڑو لے کر دوڑتی۔“
 ”اتنے کھرچ میں تو گوبر کا بیاہ ہو جاتا۔“

”ہونہار کو کون ٹال سکتا ہے، پگلی؟ ابھی اتنے ہی سے گلا نہیں جھوٹا۔ بھولا اب اپنی
 گائے کے دام مانگ رہا ہے تب تو گائے دی تھی کہ میری سگائی کہیں کر دو، اب کہتا ہے کہ
 مجھے سگائی نہیں کرنی میرے روپے دے دو۔ اس کے دونوں بیٹے لاشی لیے گھومتے ہیں۔
 ہمارے کون بیٹھا ہے جو ان سے لڑے؟ اس ستیا ناسی گائے نے تو آکر گھر ہی چوہٹ کر دیا۔“
 کچھ اور باتیں کر کے پٹیا آگ لے کر چلی گئی۔ ہوری سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اندر آ کر
 بولا۔ ”پٹیا دل کی سا پھ ہے۔“
 ”ہیرا بھی تو دل کا سا پھ تھا؟“

دھنیا نے اناج تو رکھ لیا تھا مگر دل میں نادم ہو رہی تھی۔ یہ دنوں کا پھیر ہے آج اسے
 یوں نیچا دیکھنا پڑا۔

”تو کسی کا اوپکار نہیں مانتی یہی تجھ میں برائی ہے۔“
 ”اوپکار کیوں مانوں؟ میرا آدمی اس کی گڑبستی کے پیچھے جان دے رہا ہے؟ پھر میں
 نے دان تھوڑے ہی لیا ہے۔ ایک ایک دانہ بھر دوں گی۔“

مگر پٹیا اپنی جھٹانی کے خیالات سمجھ کر بھی ہوری کے احسان کا بدلہ چکاتی جاتی تھی۔
 جب یہاں اناج ختم ہو جاتا تو من دو من دے جاتی۔ مگر جب چوماسہ آگیا اور برکھا نہ ہوئی تو
 مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا۔ ساون کا مہینہ آگیا تھا اور چاروں طرف گولے اٹھ رہے تھے۔
 کنوؤں کا پانی بھی سوکھ گیا تھا اور اکیچھ دھوپ سے جلی جاتی تھی۔ ندی میں تھوڑا تھوڑا پانی ملتا
 تھا اس کے لیے آئے دن لاکھیاں ٹپکتی رہتی تھیں، یہاں تک کہ ندی نے بھی جواب دے دیا

- جگہ جگہ چوریاں ہونے لگیں اور ڈاکے پڑنے لگے۔ علاقے بھر میں کہرام مچ گیا۔ آخر خیرت ہوئی کہ بھادوں میں پانی برس پڑا اور کسانوں کے دل ہرے ہو گئے۔ کتنی خوشی تھی اس دن! پیاسی زمین گویا آسودہ ہی نہ ہوئی تھی اور پیاسے کسان اس طرح اچھل رہے تھے گویا پانی نہیں، اشرفیاں برس رہی ہیں! سیٹ لو جتنا سینٹہ بنے! کھیتوں میں جہاں جگولے اٹھتے تھے وہاں ہل چلنے لگے، لڑکے گھروں سے نکل نکل کر تالابوں اور گڑھیوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ اوہو! تالاب تو آدھا بھر گیا! اور وہاں سے گڑھیا کی طرف دوڑے۔

مگر اب کتنا ہی پانی برسے! کچھ تو ختم ہوگئی۔ ہاتھ ہاتھ بھر کی ہو جائے گی۔ مکا، جوار اور کودوں سے لگان تھوڑی ہی چکے گا؟ مہاجن کا پیٹ تھوڑے ہی بھرا جائے گا؟ ہاں مویشیوں کے لیے چارہ ہو گیا۔ اور آدمی جی گیا۔

جب ماگھ گزرا گیا اور بھولا کے روپے نہ ملے تو ایک روز جھلایا ہوا ہوئی کے گھر آدھکا اور بولا۔ ”یہی ہے تمہارا وعدہ؟ اسی منہ سے تم نے اوکھ پیل کر میرے روپے دینے کا یجن دیا تھا؟ اب تو اوکھ پیل چکے، لاؤ روپے میرے ہاتھ میں۔“

ہوئی جب اپنی پتا سنا کر اور منت و ساجت کر کے ہار گیا اور بھولا دروازے سے نہ ہٹا تو اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تو مہتو ابھی تو میرے پاس روپے نہیں ہیں اور نہ ہی مجھے کہیں ادھار مل سکتے ہیں۔“ میں کہاں سے لاؤں؟ دانے دانے تنگی ہو رہی ہے بسواس نہ ہو تو گھر میں جا کر دیکھ لو۔ جو کچھ ملے اٹھالے جاؤ۔“

بھولانے بے مروتی سے کہا۔ ”میں تمہارے گھر میں کیوں تلاسی لینے جاؤں؟ اور نہ مجھے اس سے واسطہ ہے کہ تمہارے پاس روپے ہیں کہ نہیں۔ تم نے اوکھ پیل کر روپے دینے کہا تھا اور اوکھ پیل چکے تو اب میرے روپے میرے حوالے کرو۔“

”تو پھر جو کہو وہ کروں۔“

”میں کیا کہوں؟“

”میں تم ہی پر چھوڑتا ہوں۔“

”میں تمہارے دونوں تیل کھول لے جاؤں گا۔“

ہوئی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا گویا اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر سر جھکا کر رہ گیا۔ بھولا کیا اسے بھکاری بنا کر چھوڑ دینا چاہتا ہے؟ دونوں تیل چلے گئے تب تو

اس کے دونوں ہاتھ ہی کٹ جائیں گے۔ عاجزی سے بولا۔ ”دونوں تیل لے لو گے تو میرا تو سب سواہا ہو جائے گا۔ اگر تمہارا دھرم یہی کہتا ہے تو کھول لے جاؤ۔“
 تمہارے بنے بگڑنے کی مجھے پرواہ نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے روپے چاہئیں۔“
 ”اور جو میں کہہ دوں کہ میں نے روپے دے دیے ہیں؟“

بھولا سناٹے میں آگیا اسے بھی اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہوا۔ ہوری اتنی بڑی بے ایمانی کر سکتا ہے، یہ ممکن نہیں۔ تیز ہو کر بولا۔ ”اگر تم ہاتھ میں گنگا جل لے کر کہہ دو کہ میں نے روپیہ دے دیا تو صبر کر لوں گا۔“

”کہنے کا من تو چاہتا ہے، مرنے کیا نہ کرتا، پر کہوں گا نہیں۔“
 ”تم کہہ ہی نہیں سکتے۔“

”ہاں بھیا میں کہہ نہیں سکتا۔ ہنسی کر رہا تھا۔“

ایک لمحے وہ دبے میں پڑا رہا پھر بولا۔ ”تم مجھ سے اتنا بیر کیوں پال رہے ہو، بھولا بھائی؟ تمہیں میرے گھر میں آگنی تو مجھے کون سا بیکٹھ مل گیا؟ لڑکا ہاتھ سے گیا، دو سو روپیہ ڈنڈ الگ بھرتا پڑا، میں تو کہیں کا نہ رہا۔ اور اب تم بھی میری جڑ کھود رہے ہو۔ رام جانتے ہیں، میں بالکل نہ جانتا تھا کہ لوٹا کیا کر رہا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ گانا سننے جاتا ہوگا۔ مجھے تو اس دن پتہ چلا جب آدمی رات کو تمہیں گھر میں آئی۔ اس بکھٹ میں گھر میں نہ رکھتا تو سوچو کہاں جاتی کس کی ہو کر رہتی۔“

تمہیں بروٹھے کے دروازے پر چھپ کر کھڑی ہوئی یہ باتیں سن رہی تھی۔ باپ کو اب وہ باپ نہیں بیری سمجھتی تھی۔ ڈری کہ کہیں ہوری بیلوں کو دے نہ دیں۔ جاکر روپا سے بولی۔ ”اماں کو جلدی بلا لا، کہنا کہ بڑا کام ہے دیر نہ کرو۔“

دھنیا کھیت میں گوبر پھینکتے گئی تھی۔ بہو کا سندیہ سنا تو آکر بولی۔ ”کاہے کو بلایا ہے۔ بہو میں تو گھبرا گئی۔“

”کا کا کو تم نے دیکھا ہے نا؟“

”ہاں دیکھا ہے، کسائی کی طرح باہر بیٹھا ہوا ہے۔ میں تو بولی ہی نہیں۔“

”ہمارے دونوں تیل مانگ رہے ہیں دادا سے۔“

”دھنیا کے پیٹ کی آنتیں اندر سمٹ گئیں بولی۔“ دونوں مانگ رہے ہیں!“

”ہاں کہتے ہیں یا تو ہمارا روپیہ دو یا دونوں تیل کھول لے جائیں گے۔“

”تیرے دادا نے کیا کہا؟“

”انھوں نے کہا کہ تمہارا دھرم کہتا ہو تو کھول لے جاؤ۔“

”تو کھول لے جائے، پر اسی دوارے پر آکر بھیک نہ مانگیں تو میرے نام پر تھوک

دینا۔ ہمارے لہو سے اس کی چھاتی ٹھنڈی ہو تو ٹھنڈی کر لے۔“

وہ اسی طیش میں باہر آکر ہوئی سے بولی۔ ”مہتو دونوں تیل مانگ رہے ہیں تو دے

کیوں نہیں دیتے؟ ان کا پیٹ بھرے، ہمارے رام مالک ہیں۔ ہمارے ہاتھ تو نہیں کاٹ

لیں گے؟ اب تک اپنی مجوری کرتے ہیں اب دوسروں کی مجوری کریں گے۔ بھگوان کی مرضی

ہوگی تو تیل بدھیا ہو جائیں گے۔ اور مجوری ہی کرتے رہے تو کون برائی ہے؟ سوکھا پالا اور

لگان کا بوجھ تو نہ رہے گا۔ میں نہ جانتی تھی کہ یہ ہمارے پیری ہیں نہیں تو گائے لے کر اپنے

سر پر بلا کیوں باندھتی۔ اس ٹھوڑی کا تو را جس دن سے آیا گھر تیس نہیں ہو گیا۔“

بھولا نے اب تک جس ہتھیار کو چھپا رکھا تھا اب اسے نکالنے کا وقت آگیا اسے یقین

ہو گیا کہ بیلوں کہ سوا ان سب کے پاس اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ بیلوں کو بچانے کے لیے یہ

لوگ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ اچھے نشانے باز کی طرح دل کو ٹھہرا کر بولا۔ ”اگر

تم چاہتے ہو کہ ہمارے بے ہمتی ہو اور تم چین سے بیٹھو تو یہ نہ ہوگا۔ تم اپنے سو دس روپے

کو روتے ہو اور یہاں لاکھ روپے کی آبرو بگڑ گئی۔ تمہاری کسل اسی میں ہے کہ جیسے تھنیا کو

گھر میں رکھا تھا ویسے ہی اسے گھر سے نکال دو۔ پھر نہ تو ہم تیل مانگیں گے اور نہ گائے کے

دام لیں گے۔ اس نے ہماری ناک کٹوائی ہے تو میں بھی اسے ٹھوکریں کھاتے دیکھنا چاہتا

ہوں وہ یہاں رانی بنی بیٹھی رہے اور ہم منہ میں کالکھ پوتے اس کے نام کو روتے رہیں، میں

یہ نہیں دیکھ سکتا۔ وہ میری بیٹی ہے، میں نے اسے گود میں کھلایا ہے اور بھگوان سا کبھی ہیں کہ

میں نے اسے کبھی بیٹوں سے کلم نہیں سیکھا، پر آج اسے بھیک مانگتے اور ٹھوڑے پر دانے چنتے

دیکھ میری چھاتی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ جب باپ ہو کر میں نے اپنا دل اتنا کھٹور بنا لیا ہے تب

سوچو میرے دل پر کتنی بڑی چوٹ پڑی ہوگی؟ اس منہ جلی نے سات بیڑی کا نام ڈبا دیا اور

تم اسے گھر میں رکھے ہوئے ہو، یہ میری چھاتی پر موگ دانا نہیں تو اور کیا ہے؟“

دھنیا نے جیسے پتھر کی لکیر کھینچتے ہوئے کہا۔ ”تو مہتو، میری بھی سن! جو بات تم چاہتے

ہو وہ نہ ہوگی، سو جنم نہ ہوگی۔ تھنیا ہماری جان کے ساتھ ہے۔ تم تیل ہی تو لے جانے کہتے ہو سو لے جاؤ۔ اگر اس سے تمہاری کٹی ہوئی ناک جڑتی ہو تو جوڑلو، پرکھوں کی آبرو بچتی ہو تو بچالو۔ تھنیا سے برائی جرور ہوئی۔ جس دن اس نے میرے گھر میں پاؤں رکھا میں جھاڑو لے کر مارنے اٹھتی تھی۔ مگر جب اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو گرنے لگے تو مجھے اس پر ترس آگیا۔ تم اب بوڑھے ہو گئے ہو مہتو، پر آج بھی تمہیں بیاہ کی دھن سوار ہے، پھر وہ تو ابھی بچہ ہے۔“

بھولانے اپیل بھری آنکھوں سے ہوری کو دیکھا۔ ”سنئے ہو ہوری اس کی باتیں! اب میرا دوکھ نہیں، میں بنا تیل لیے نہ جاؤں گا۔“
 ہوری نے استقلال سے کہا ”لے جاؤ۔“
 ”پھر رونا مت کے میرے تیل کھول لیے گئے۔“
 ”نہیں روؤں گا۔“

بھولا بیلوں کی رسیاں کھول ہی رہا تھا کہ تھنیا پیوند دار ساڑی پہنے اور بچے کو گود میں لیے نکل کر باہر آگئی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کا کا لو میں اس گھر سے نکل جاتی ہوں اور جیسا تم چاہتے ہو اسی طرح بھیک مانگ کر اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پالوں گی اور جب بھیک بھی نہ ملے تو کہیں ڈوب مروں گی۔“

بھولا کھسا کر بولا۔ ”دور ہو میرے سامنے سے! بھگوان نہ کرے مجھے تیرا منہ دیکھنا پڑے، کھنٹی کہیں کی! اب تیرے لیے ڈوب ہی مرنا ٹھیک ہے۔“
 تھنیا نے اس کی طرف تাকা کا بھی نہیں۔ اس میں وہ غصہ تھا جو خود کو نگل جاتا چاہتا ہے۔ جس میں ہنسا نہیں، بلدان ہے۔ دھرتی اس وقت منہ کھول کر اسے نگل لیتی تو وہ اپنے آپ کو کتنا دھنیا مانتی۔ اس نے آگے قدم بڑھایا۔

مگر وہ دو قدم بھی نہ گئی تھی کہ دھنیا نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور سختی بھری محبت سے بولی۔ ”تو کہاں جاتی ہے بہو؟ چل گھر میں! یہ تیرا گھر ہے، ہمارے جیتے جی اور ہمارے مرنے پر بھی۔ ڈوب مرے وہ جسے اپنی اولاد سے بیر ہو! اس بھلے آدمی کو منہ سے ایسی بات نکالنے لاج بھی نہیں آتی۔ مجھ پر دھونس جماتا ہے۔ بچ لے جا بیلوں کا کھون لی.....“
 تھنیا روتی ہوئی بولی۔ ”اماں جب اپنا باپ ہو کے مجھے دھکار رہا ہے تو مجھے ڈوب ہی

مرنے دو۔ مجھ ابھائی کے کارن تو تمہیں دکھ ہی ملا جب سے آئی، تمہارا گھر مٹی میں مل گیا۔ تم نے اتنے دن مجھے جس پریم سے رکھا ماں بھی نہ رکھتی، بھگوان مجھے پھر جنم دیں تو تمہارے کوکھ سے دیں یہی میری اچھا ہے۔“

دھنیا اسے اپنی طرف کھینچتی ہوئی بولی۔ ”وہ تیرا باپ نہیں ہے۔ تیری بیوی ہے ہیتارا۔ ماں ہوتی تو اسے درد ہوتا۔ کرسگائی، مہریا جوتوں سے نہ پیٹے تو پھر کہنا!“

دھنیا ساس کے پیچھے پیچھے گھر میں چلی گئی۔ ادھر بھولا نے جاکر دونوں بیلوں کو کھونٹوں سے کھولا اور ہانپتا ہوا گھر چلا جیسے کسی نیتے میں آکر پوریوں کے عوض جوتے پڑے ہوں۔ ”اب کروکھیتی اور بجاؤ ہنسی، میری بے اجتی کرنا چاہتے ہیں سب نہ جانے کب کی عداوت نکال رہے ہیں، نہیں تو ایسی لڑکی کی کون بھلا آدمی اپنے گھر میں رکھے گا؟ سب کے سب بے سرم ہو گئے ہیں، لونڈے کا کہیں بیاہ نہ ہوتا تھا اسی سے اور اس رائٹ دھنیا کی ڈھٹائی دیکھو کہ آکر میرے آگے کھڑی ہو گئی۔ دوسری لڑکی ہوتی تو منہ نہ دکھاتی۔ آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔ سب کے سب دشت اور مورکھ ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ دھنیا اب ہماری ہو گئی۔ یہ نہیں جانتے کہ جو اپنے باپ کے گھر نہ رہی وہ کسی کے گھر نہ رہے گی۔ بکھٹ برا ہے نہیں تو بچ بچار میں اس چیزیل دھنیا کے جھوٹے پکڑ کر گھینتا۔ مجھے کتنی گالیاں دیتی تھی۔“

پھر اس نے دونوں بیلوں کو دیکھا۔ کتنے تیار ہیں۔ اچھی جوڑی ہے جہاں چاہوں سو روپے میں بچ سکتا ہوں۔ میرے اسی روپے کھرے ہو جائیں گے۔ ”ابھی وہ گاؤں کے باہر بھی نہ نکلا تھا کہ پیچھے سے داتا دین، بیٹھوری، سو بھا اور دس بیس آدمی اور دوڑے آتے دکھائی دیے۔ بھولا کا لہو سرد ہو گیا۔ اب فوجداری ہوئی۔ تیل بھی چھن جائیں گے، مار بھی پڑے گی۔ وہ رک گیا کمر کس کر۔ مرنے تو لڑکر مرے گا۔“

داتا دین نے پاس جا کر کہا۔ ”یہ تم نے کیا انرتھ کیا بھولا؟ اس کے تیل کھول لائے اور وہ کچھ بولا نہیں اسی سے تم سیر ہو گئے۔ سب لوگ اپنے اپنے کام میں لگے تھے کسی کو کھبر بھی نہ ہوئی۔ ہوری نے تنک سا اسارا کیا ہوتا تو تمہارا ایک ایک بال دن جاتا۔ بھلا چاہتے ہو تو لے چلو تیل! کچھ بھی بھٹنسی نہیں ہے تم میں۔“

بیٹھوری بولے۔ ”یہ اس کے سیدھے پن کا پھل ہے۔ تمہارے روپے اس پر آتے ہیں تو جاکر دیوانی میں دھوئی کرو اور ڈگری کراؤ۔ تیل کھول لانے کا تمہیں کیا اختیار ہے

ابھی چھو جداری میں دعویٰ کر دے تو بندھے بندھے پھرو۔“
 بھولا نے دب کر کہا ”تو لالہ صاحب ہم کچھ جبر دتی تھوڑے ہی کھول لائے ہو ری
 نے آپ دیے۔“

پنشیوری نے سو بھا سے کہا۔ ”تم بیلوں کو لوٹا دو سو بھا! کسان اپنے تیل کھسی سے
 دے دے گا تو بل میں کن کو جوتے گا؟“
 بھولا بیلوں کے سامنے کھڑا ہو گیا ”ہمارے روپے دلوا دو ہمیں بیلوں کو لے کر
 کیا کرتا ہے؟“

”ہم تیل لیے جاتے ہیں۔ اپنے روپے کے لیے دعویٰ کرو اور نہیں تو مار کر گرا دیے
 جاؤ گے روپے دیے تھے نگد تم نے؟ ایک منخوس گائے پیارے کے سر منڈھ دی اور اب اس
 کے تیل کھولے لیے جاتے ہو۔“

بھولا بیلوں کے سامنے سے نہ ہٹا۔ کھڑا رہا گم صم اور مضبوطی سے جما ہوا، جیسے مرکز
 ہی بٹے گا۔ پنواری سے جھٹ کر کے وہ کیسے پیش پاتا؟

داتا دین نے ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی جھکی کر سیدھا کر کے لٹکارا ”تم سب کھڑے
 تاکتے کیا ہو؟ مار کے بھگا دو اس کو! ہمارے گاؤں سے تیل کھول لے جائے گا؟“
 بنسی طاقتور جوان تھا۔ اس نے بھولا کو زور سے دھکا دیا۔ بھولا سنبھل نہ سکا، گر پڑا۔
 اٹھنا چاہتا تھا کہ بنسی نے پھر ایک گھونہ جمایا۔

ہوری دوڑتا ہوا آ رہا تھا بھولا نے اس کی طرف دس قدم بڑھ کر پوچھا ”ایمان سے
 کہنا ہو ری مہتو! میں نے تیل جبر دتی کھول لیے؟“

داتا دین نے اس کا مطلب یوں نکالا ”یہ کہتے ہیں کہ ہو ری نے اپنی کھسی سے تیل
 مجھے دیے ہمیں الو بناتے ہیں۔“

ہوری نے لباتے ہوئے کہا۔ ”یہ مجھ سے کہنے لگے کہ یا تو جھینیا کو گھر سے نکال دو یا
 میرے روپے دے دو، نہیں میں تیل کھول لے جاؤں گا۔ میں نے کہا میں بہو کو تو نہ نکالوں
 گا اور نہ میرے پاس روپے ہیں مگر تمہارا دھرم کہے تو تیل کھول لو۔ میں نے ان کے دھرم پر
 چھوڑ دیا اور انھوں نے تیل کھول لیے۔“

پنشیوری نے اداس ہو کر کہا۔ ”جب تم نے دھرم پر چھوڑ دیا تب کا ہے کی جبر دتی؟

اس کے دھرم نے کہا تو لیے جاتا ہے۔ لے جاؤ بھیا نیل تمہارے ہیں۔“
داتا دین نے تائید کی ”ہاں دھرم کی بات آگئی تو کوئی کیا کہے؟“
سب کے سب ہوری کو حقارت سے دیکھتے ہوئے ہار کر لوٹ پڑے اور فتح مند بھولا
شان سے گردن اٹھائے ہوئے بیلوں کو لے چلا۔

مالتی ظاہر میں تھلی ہے مگر باطن میں شہد کی مکھی۔ اس کی زندگی میں ہنسی ہی ہنسی نہیں ہے۔ صرف گڑکھا کر کون جی سکتا ہے؟ اور جیسے بھی تو وہ کوئی سکھ کی زندگی نہ ہوگی۔ وہ ہنستی ہے اس لیے کہ اسے اس کی بھی قیمت ملتی ہے۔ اس کا چمکنا اور چمکنا اس لیے نہیں ہے کہ وہ چمکنے اور چمکنے ہی کو زندگی سمجھتی ہے یا اس نے اپنے آپ کو اپنی آنکھوں میں اتنا بڑا بنا لیا ہے وہ جو کچھ کرے اپنے ہی لیے کرے۔ نہیں، وہ اس لیے چمکتی ہے اور مذاق کرتی ہے کہ اس سے اس کے فرض کا بار کسی قدر ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کے باپ ان عجیب آدمیوں میں تھے جو صرف زبان کی مدد سے لاکھوں کے دارے نیارے کرتے تھے۔ بڑے بڑے زمینداروں اور رئیسوں کی جائیدادیں فروخت کرانا، انھیں قرض دلانا یا ان کے معاملوں کو افراد سے مل کر طے کر دینا یہی ان کا کاروبار تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ دلال تھے۔ اس طبقے کے لوگ بڑے طباع ہوتے ہیں۔ جس کام سے کچھ فتنے کی امید ہو اسے اٹھالیں گے اور کسی نہ کسی طرح اسے پورا بھی کر دیں گے۔ کسی راجا کی شادی کسی راجبگاری سے طے کرادی اور دس بیس ہزار مار لیے۔ یہی دلال جب چھوٹے سودے کرتے ہیں تو ”ٹاؤٹ“ کہے جاتے ہیں اور ہم ان سے نفرت کرتے ہیں۔ بڑے بڑے کام کر کے وہی ٹاؤٹ راجاؤں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے اور گورنروں کی میز پر چائے پتا ہے۔ مشرکول ان ہی خوش نصیبوں میں تھے۔ ان کے تین لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ تینوں کو انگلستان بھیج کر تعلیم کی چوٹی تک پہنچا دیں۔ اور بہت سے بڑے آدمیوں کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ وہاں تعلیم پا کر آدمی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ شاید وہاں کی آب و ہوا میں ذہن کو تیز کر دینے کی کوئی طاقت ہے مگر ان کی یہ خواہش ایک تہائی سے زیادہ پوری نہ ہوئی۔ مالتی انگلستان ہی میں تھی کہ ان پر فالج گرا جو انھیں کھٹا بنا گیا۔ اب بڑی مشکل سے دو آدمیوں کے سہارے اٹھتے بیٹھتے تھے۔ زبان تو بالکل بند ہی ہو گئی تھی، اور جب زبان ہی بند ہو گئی تو آمدنی بھی بند ہوئی۔ جو کچھ تھی زبان ہی کی کمائی تھی۔ کچھ بچا رکھنے کی عادت نہ تھی۔ غیر مقررہ آمدنی تھی اور ویسا ہی

خرج تھا ، پس ادھر کئی سال سے تنگ حال ہو رہے تھے۔ کل ذمہ داری مالتی پر آپڑی تھی ۔ مالتی کے چار پانچ سو روپیوں میں وہ ٹھاٹھ باٹ تو کیا نہجتا ، ہاں اتنا تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم ہوتی جاتی تھی اور بھلے مانسوں کی طرح زندگی بسر ہو رہی تھی ۔ مالتی صبح سے پہر رات تک دوڑتی رہتی تھی ۔ چاہتی تھی کہ والد پر ہیز سے رہیں مگر والد صاحب کو کباب و شراب کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ کسی طرح گلا نہ چھوٹتا تھا ۔ کہیں سے کچھ نہ ملتا تو ایک مہاجن سے اپنے بنگلے پر پُڈنوٹ لکھ کر ہزار دو ہزار لے لیتے تھے ۔ مہاجن ان کا پرانا دوست تھا ۔ جس نے ان کی بدولت لین دین میں لاکھوں پیدا کیے تھے اور مروت کی وجہ سے کچھ بولتا نہ تھا ۔ اس کے پچیس ہزار ہو چکے تھے اور جب چاہتا قرقی کرا سکتا تھا ۔ مگر دوستی کی لاج نبھاتا جاتا تھا ۔ خود پرستوں میں جو بے غیرتی آجاتی ہے وہ مسٹر کول میں بھی تھی ۔ تقاضے ہوا کریں انھیں پرواہ نہ تھی ۔ مالتی ان کی فضول خرچی پر جھنجھلاتی رہتی تھی مگر ان کی ماں جو مجسم دیوی تھی اور اس زمانے میں بھی شوہر کی خدمت کرنا نسوانی زندگی کا مقصد سمجھتی تھی ، اسے سمجھا دیتی تھی ۔ اس لیے خانہ جنگی کی نوبت نہ آتی تھی ۔

شام ہو گئی تھی ۔ ہوا میں ابھی تک گرمی تھی ۔ آسمان پر دھند چھایا ہوا تھا ۔ مالتی اور اس کی دونوں بہنیں بنگلے کے سامنے گھاس پر بیٹھی ہوئی تھیں ۔ پانی نہ پانے کے سبب وہاں دوب جل گئی تھی اور اندر کی مٹی باہر نکل آئی تھی ۔ مالتی نے پوچھا ”مالی کیا بالکل پانی نہیں دیتا ؟“
 مٹھلی بہن سرودج نے کہا ۔ ”پڑا پڑا سویا کرتا ہے سُر ۔ جب کہو تو بیس بہانے بنانے لگتا ہے ۔“

سرودج بی۔ اے۔ میں پڑھتی تھی ، دہلی ، بمبئی ، زرد ، خشک اور تلخ مزاج۔ اسے کسی کی کوئی بات پسند نہ آتی تھی ، ہمیشہ عیب نکالتی رہتی تھی ۔ ڈاکٹر دوں کی صلاح تھی کہ وہ کوئی محنت کا کام نہ کرے اور پہاڑ پر رہے ، مگر گھر کی حالت ایسی نہ تھی کہ اسے پہاڑ پر بھیجا جاسکتا ۔

سب سے چھوٹی ذردا کو سرودج سے اس لیے مغائرت تھی کہ سارا گھر سرودج کو ہاتھوں ہاتھ لیے رہتا تھا وہ چاہتی تھی کہ جس بیماری میں اتنا آرام ہے وہ اسے ہی کیوں نہیں ہو جاتی ؟ گوری سی مغرور و تندرست اور شوخ آنکھوں والی لڑکی تھی ۔ چہرے پر فہم و فراست کی جھلک تھی ۔ سرودج کے سوا اسے کل دنیا سے ہمدردی تھی ۔ سرودج کی بات کی مخالفت کرنا اس کا

خاصہ تھا۔ بولی ”دن بھر دادا جی بازار بھیجتے رہتے ہیں، فرصت ہی کہاں پاتا ہے؟ مرنے کی چھٹی تو ملتی نہیں، پڑا پڑا سونے گا؟“

سروج نے ڈانٹا ”دادا جی اسے کب بازار بھیجتے ہیں ری؟ جھوٹی کہیں کی؟“

”روز بھیجتے ہیں روز۔ ابھی تو آج ہی بھیجا تھا۔ کہو تو بلوا کر پچھوا دوں؟“

”پچھوئے گی بلواؤں؟“

”مالتی ڈری۔ دونوں گتھ جائیں گی تو بیٹھنا مشکل کر دیں گی۔ بات بدل کر بولی۔“

اچھا خیر ہوگا آج ڈاکٹر مہتا کی تمھارے یہاں تقریر ہوئی تھی، سروج۔“

سروج نے ناک سیکڑ کر کہا ”ہاں ہوئی تو تھی، مگر کسی نے پسند نہیں کی۔ آپ فرمانے

لگے کہ دنیا میں عورتوں کا دائرہ مردوں سے بالکل الگ ہے، اور عورتوں کا مردوں کے

دائرے میں آنا اس جگہ کا ایک کلنگ ہے۔ سب لڑکیوں نے تالیاں اور سیٹیاں بجاتی شروع

کیں۔ بچارے شرمندہ ہو کر بیٹھ رہے۔ کچھ عجیب سے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے

یہاں تک کہہ ڈالا کہ پریم صرف شاعروں کا تصور ہے۔ نفوس زندگی میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔

لیڈی بکوں نے ان کا خوب مضحکہ اڑایا۔“

مالتی نے اعتراض کیا ”لیڈی بکوں نے؟ اس بارے میں وہ بھی کچھ بولنے کی ہمت

رکھتی ہیں! تمہیں ڈاکٹر صاحب کا لیکچر شروع سے آخر تک سننا چاہیے تھا۔ انھوں نے دل میں

لڑکیوں کو کیا سمجھا ہوگا؟“

”پورا لیکچر سننے کی برداشت کسے تھی؟ وہ تو جیسے زخم پر نمک چھڑک رہے تھے۔“

”تو پھر انھیں بلایا ہی کیوں تھا؟ آخر انھیں عورتوں سے کوئی بیر تو ہے نہیں۔ جس

بات کو ہم سچ سمجھتے ہیں وہی تو وہ بھی کہتے ہیں۔ عورتوں کو خوش کرنے کے لیے وہ ان کی سی

کہنے والوں میں نہیں ہیں، اور پھر ابھی یہ کون جانتا ہے کہ عورتیں جس راستے پر چلنا چاہتی

ہیں وہی ٹھیک ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر اپنی رائے بدلتی پڑے۔“

اس نے فرانس اور جرمنی اور اٹلی کی عورتوں کی زندگی کا معیار بتلایا اور کہا کہ ”جلد ہی

ویمنس لیگ (مجلس نسواں) کی طرف سے مہتا کا لیکچر ہونے والا ہے۔“

سروج کو تعجب ہوا۔ بولی ”مگر آپ بھی تو کہتی ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق

مساوی ہونے چاہئیں۔“

”اب بھی کہتی ہوں، لیکن مخالف پارٹی والے کیا کہتے ہیں یہ بھی تو سننا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ہم ہی غلطی پر ہوں۔“ یہ لیگ اس شہر کی نئی انجمن ہے اور مالتی کی کوشش سے قائم ہوئی ہے۔ شہر کی سب سے تعلیم یافتہ خواتین اس میں شریک ہیں۔ مہتا کی اول تقریر نے عورتوں میں بڑی ہل چل مچادی تھی اور لیگ نے طے کیا تھا کہ انھیں خوب دندان شکن جواب دیا جائے۔ مالتی ہی پر یہ بار ڈالا گیا تھا۔ مالتی کئی روز تک اپنی بات کی حمایت میں دلائل اور ثبوت تلاش کرتی رہی۔ اور بھی کئی عورتیں اپنی تقریریں لکھ رہی تھیں اس دن جب مہتا شام کو لیگ کے ہال میں پہنچے تو معلوم ہوتا تھا ہال پھٹ جائے گا۔ انھیں فخر ہوا کہ ان کی تقریر سننے کے لیے اتنا شوق! اور وہ شوق صرف چہرے پر اور آنکھوں میں نہ تھا! آج سبھی عورتیں سونا اور ریشم سے لدی ہوئی تھیں گویا کسی بارات میں آئی ہوں۔ مہتا کو مغلوب کرنے کے لیے پوری طاقت سے کام لیا گیا تھا، اور یہ کون کہہ سکتا تھا کہ جگہ گاہٹ طاقت کا جزو نہیں ہے؟ مالتی نے تو آج کے لیے نئے فیشن کی ساڑی نکالی تھی، نئی کاٹ کے جہیز بنوائے تھے اور رنگ روشن اور پھولوں سے خوب بچی ہوئی تھی جیسے اس کا بیاہ ہو رہا ہو۔ لیگ میں اتنی دھوم دھام اور کبھی نہ ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مہتا تنہا تھے، پھر بھی دیویوں کے دل کانپ رہے تھے۔ سچائی کی ایک چنگاری جھوٹ کے ایک پہاڑ کو جلا کر خاک کر سکتی ہے۔

سب سے پیچھے کی صف میں مرزا اور کھنا اور اڈیٹر صاحب بھی موجود تھے۔ رائے صاحب لیکچر شروع ہونے کے بعد آئے اور پیچھے کھڑے ہو گئے۔

مرزانے کہا ”آجائے آپ بھی کھڑے کب تک رہیے گا؟“

رائے صاحب بولے ”نہیں بھئی وہاں میرا دم گھٹنے لگے گا۔“

”تو میں کھڑا ہوتا ہوں آپ بیٹھیے۔“

رائے صاحب نے ان کے کندھے دبائے ”تکلف کی ضرورت نہیں بیٹھے رہیے میں تمک جاؤں گا تو آپ کو اٹھا دوں گا اور میں بیٹھ جاؤں گا۔ اچھا مس مالتی جلدی کی صدر ہوئی ہیں۔ کھنا صاحب کچھ انعام دلوائے۔“

کھنا نے ردنی صورت بنا کر کہا ”اب تو مسٹر مہتا پر نگاہ ہے، میں تو گر گیا۔“

مہتا کی تقریر شروع ہوئی۔ ”دیویوں جب میں اس طرح آپ کو مخاطب کرتا ہوں تو آپ کو کوئی بات کھلتی نہیں۔ آپ اس عزت کو اپنا حق سمجھتی ہیں۔ مگر کیا آپ نے کسی عورت

کو مردوں کے لیے دیوتا استعمال کرتے سنا ہے؟ آپ اسے دیوتا کہیں تو وہ سمجھے گا کہ آپ اسے بنا رہی ہیں۔ آپ کے پاس دان کے لیے دیا ہے، بھگتی اور تیاگ ہے۔ مرد کے پاس دان کے لیے کیا ہے؟ وہ دیوتا نہیں، لیوتا ہے۔ وہ حقوق کے لیے ہنسا کرتا ہے، لڑتا ہے، اور فتنہ فساد اٹھاتا رہتا ہے۔“ تالیاں بھیں۔ رائے صاحب نے کہا۔ ”عورتوں کو خوش کرنے کا اس نے کتنا اچھا ڈھنگ نکالا ہے۔“

بجلی کے ایڈیٹر کو برا لگا ”کوئی نئی بات نہیں، میں کتنی ہی بار یہی کہہ چکا ہوں۔“ مہتا آگے بڑھے۔ ”اس لیے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہماری ترقی یافتہ دیویاں بھگتی اور تیاگ کی زندگی سے اتنا کر لڑائی اور فساد اور ہنسا کی زندگی کی طرف دوڑ رہی ہیں اور سمجھ رہی ہیں کہ اسی میں سکھ ہے تو میں انہیں مبارکباد نہیں دے سکتا۔“

مسز کھانا نے ماتلی کی طرف غرور سے دیکھا۔ ماتلی نے گردن جھکالی۔

خورشید بولے۔ ”اب کہیے۔ مہتا دلیر آدمی ہے۔ سچ بات کہتا ہے اور منہ پر۔“
بجلی کے ایڈیٹر نے ناک سکیڑی ”اب وہ دن لد گئے جب دیویاں ان چکموں میں آجاتی تھیں۔ ان کے حقوق ہضم کرتے جاؤ اور کہتے جاؤ کہ آپ دیوی ہیں، ماتا ہیں، کچھی ہیں۔“

مہتا آگے بڑھے ”عورت کو مرد کے بھیس میں مردانہ کاموں میں مشغول دیکھ کر مجھے اسی طرح دکھ ہوتا ہے جیسے مرد کو عورت کے روپ میں زنانہ کام کرتے ہوئے دیکھ کر۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے مردوں کو آپ اپنی محبت اور عقیدت کا مستحق نہیں سمجھتیں۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسی عورتیں بھی مرد کی عقیدت و محبت کی مستحق نہیں بن سکتیں۔“

کھانا کے چہرے پر دل کی خوشی چمک اٹھی۔

رائے صاحب نے چنگلی لی۔ ”آپ بہت خوش ہیں کھنا جی!“

کھنا بولے ”ماتلی ملے تو پوچھوں کہ اب کہیے۔“

مہتا آگے بڑھے ”میں انسانی ارتقاء میں عورت کے درجے کو مرد کے درجے سے بہتر سمجھتا ہوں، اسی طری جیسے پریم، تیاگ اور بھگتی کو ہنسا اور شر و فساد سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر ہماری دیویاں پیدائش اور پرورش کے پاک مندر کو چھوڑ کر ہنسا اور لڑائی کے خون ریز میدان میں آنا چاہتی ہیں تو اس سے سناج کا بھلا نہ ہوگا۔ میں اس بارے میں مستقل ہوں۔ مرد نے

اپنے گھمنڈ میں اپنی شیطانی شہرت کو زیادہ اہمیت دی ہے اور وہ اپنے بھائی کا حق چھین کر اور اس کا خون بہا کر سمجھنے لگا کہ اس نے بڑی فتح پائی۔ جن بچوں کو دیویوں نے اپنے خون سے پیدا کیا اور پالا انھیں بموں اور مشین گنتوں اور ٹینکوں کا شکار بنا کر وہ خود کو فاتح سمجھتا ہے۔ اور جب ہماری ہی مائیں ان کی پیشانی پر زعفرانی ٹیکا لگا کر اور انھیں اپنی دعاؤں کی زرہ پہنا کر خونی میدان میں بھیجتی ہیں تو کیا عجب کہ مرد نے خوزیری ہی کو دینوی فلاح کی چیز سمجھی اور اس کی خونی رغبت روز بروز بڑھتی گئی! اور آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ شیطنت زور پکڑ کر کل دنیا کو روندتی، جانداروں کو کچلتی، ہری بھری کھیتوں کو جلانی اور آباد بستیوں کو اجاڑتی چلی جاتی ہے۔ دیویو! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اس شیطنت میں مدد دے کر اس میدان جنگ میں کود کر دنیا کی بھلائی کریں گی؟ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ تباہ کاروں کو اپنا کام کرنے دیجیے اور آپ اپنے دھرم پر نگاہ رکھیے۔“

کھنا بولے ”مالتی کی گردن ہی نہیں اٹھتی۔“

رائے صاحب نے ان خیالات کی تائید کی۔ ”مہتا کہتے تو ٹھیک ہی ہیں۔“

بجلی کے ایڈیٹر بگڑے ”مگر کوئی نئی بات تو نہیں کہی۔ تحریک نسواں کے مخالفین ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتوں کا سہارا لیا کرتے ہیں۔ میں یہ مانتا ہی نہیں کہ تیاگ اور پرہیز سے دنیا نے ترقی کی۔ دنیا نے ترقی کی ہے جواں مردی سے، محنت سے، عقل سے اور دبدبہ سے!“

خورشید نے کہا۔ ”اچھا سننے دیجیے گا یا اپنی ہی گائے جانیے گا؟“

مہتا کی تقریر جاری تھی ”دیویو! میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو کہتے ہیں کہ عورت اور مرد میں مساوی طاقت و رغبت ہے اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس سے زیادہ بھیانک جھوٹ کا میں خیال بھی نہیں کر سکتا۔ یہ وہ جھوٹ ہے جو پشہا پشت کے حاصل کیے ہوئے تجربے کو اسی طرح ڈھک لینا چاہتا ہے جیسے بادل کا ایک ٹکڑا سورج کو ڈھک لیتا ہے۔ میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ آپ اس جال میں نہ پھنسیں، عورت مرد سے اتنی ہی برتر ہے جتنی روشنی تاریکی سے، انسان کے لیے چھما دیا، تیاگ اور اپنا زندگی کے اعلیٰ ترین معیار ہیں۔ عورت اس معیار پر پہنچ چکی ہے۔ مرد دھرم اور روحانیت اور رشتوں کا سہارا لے کر اس معیار پر پہنچنے کے لیے صدیوں سے زور لگا رہا ہے مگر اب تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں کہتا ہوں اس کی ساری روحانیت ایک طرف اور عورتوں کا ایثار ایک طرف۔“

تالیاں بھیں اور سارا ہال ہل اٹھا ، رائے صاحب نے خوش ہو کر کہا ” مہتا وہی کہتے ہیں جو ان کے دل میں ہے ۔“

اونکار ناتھ یہ تنقید کی ” لیکن باتیں سبھی پرانی ہیں ، بالکل سڑی ہوئی ۔“

” پرانی بات بھی روحانی طاقت کے ساتھ کہی جاتی ہے تو نئی ہو جاتی ہے ۔“

” جو ایک ہزار روپے ہر مہینے لے کر عیش و عشرت میں اڑاتا ہو اس میں روحانیت جیسی شے رہ نہیں سکتی یہ صرف پرانے خیال والی عورتوں اور ویسے ہی مردوں کے خوش کرنے کے ڈھنگ ہیں ۔“

کھنا نے ماتی کی طرف دیکھا ۔ ” یہ کیوں پھولی جا رہی ہیں ؟ انھیں تو شرمنا چاہیے ۔“
خورشید نے کھنا کو اکسایا ۔ ” اب تم بھی ایک لیکچر دے ڈالو ۔ کھنا ، ورنہ مہتا تمھیں اکھاڑ پھینکے گا ۔ نصف میدان تو اس نے ابھی مار لیا ہے ۔“

کھنا کھیا کر بولے ” میری نہ کہیے ، میں نے ایسی کتنی ہی چڑیوں کو پھانس کر چھوڑ دیا ہے ۔“

رائے صاحب نے خورشید کی طرف آنکھیں مار کہا ۔ ” آج کل آپ عورتوں کے سماج کی طرف بہت آتے جاتے ہیں ۔ سچ کہنا ، کتنا چندہ دیا ؟ ،،
کھنا جھینپ گئے ۔ ” میں ایسے سماجوں کو چندہ نہیں دیا کرتا جو ہنر بازی کا ڈھونگ کر کے بدکاری پھیلاتے ہیں ۔“

مہتا کی تقریر جاری تھی ۔ ” مرد کہتا ہے کہ جتنے فلسفے اور سائنس کے موجد ہوئے وہ سب مرد تھے ۔ جتنے بڑے بڑے مہاتما ہوئے وہ سب مرد تھے ۔ سبھی سورما ، سبھی سیاسی ماہر بڑے بڑے جہاز راں اور بڑے بڑے سب کچھ مرد ہی تھے ۔ مگر ان بڑوں کی جماعت نے مل کر کیا کیا ؟ مہاتماؤں اور مذہبی بانٹوں نے دنیا میں خون کی ندیاں بہانے اور نفرت کی آگ بھڑکانے کے سوا اور کیا کیا ؟ سورماؤں نے بھائیوں کی گردن کاٹنے کے سوا اور کیا یادگار چھوڑی ؟ سیاسی ماہروں کے نشانات اب صرف مٹی ہوئی سلطنتوں کے کھنڈر رہ گئے ہیں ۔ اور موجدوں نے انسان کو مشین کا غلام بنا دینے کے سوا اور کون سا مسئلہ حل کر دیا ؟ مردوں کے بنائے ہوئے تمدن میں سکون کہاں ہے ، تعاون کہاں ہے ؟“

اونکار ناتھ اٹھ کر جانے کو تیار ہوئے ” رئیسوں کے منہ سے بڑی بڑی باتیں سن کر بدن

میں آگ لگ جاتی ہے۔“

خورشید نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھایا ”آپ بھی ایڈیٹر صاحب پورے پونٹکا ہی رہے۔
اجی یہ دنیا ہے جس کے جی میں جو آتا ہے بکتا ہے۔ کچھ لوگ سنتے ہیں اور تالیاں بجاتے
ہیں۔ چلیے قصہ ختم۔ ایسے ایسے بے شمار مہتا آئیں گے اور چلے جائیں گے اور دنیا اپنی چال
چلتی رہے گی۔ یہاں مگڑنے کی کون سی بات ہے؟“
”جھوٹ سن کر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔“

رائے صاحب نے بڑھاوا دیا۔ ”فاحشہ کے منہ سے سٹیوں کی سی بات سن کر کس کا جی
نہ جھلے گا؟“

اونکار ماتھ پھر بیٹھ گئے۔ مہتا کی تقریر جاری تھی۔ ”میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا باز
کو چڑیوں کا شکار کرتے دیکھ کر ہنس کو یہ زیب دے گا کہ وہ مانر دور کی پرسکون فضا کو چھوڑ
کر چڑیوں کا شکار کرنے لگے؟ اگر وہ شکاری بن جائے تو کیا آپ اسے مبارک باد دیں گی؟
ہنس کے پاس اتنی تیز چونچ نہیں ہے، اتنے تیز چنگل نہیں ہیں، اتنی تیز آنکھیں نہیں ہیں،
اتنے تیز پر نہیں ہیں اور اتنی تیز خون کی پیاس نہیں ہے۔ ان آلات کو اکٹھا کرنے میں اسے
صدیاں لگ جائیں گی، پھر بھی وہ باز بن سکے گا یا نہیں اس میں شک ہے۔ مگر باز بنے یا نہ
بنے، وہ ہنس نہ رہ جائے گا، وہ ہنس جو موتی چھتا ہے!“

خورشید نے تنقید کی ”یہ تو شاعروں کی سی دلیلیں ہیں۔ مادہ باز بھی اسی طرح شکار کرتی
ہے۔ جیسے نزد باز۔“

اونکار ماتھ خوش ہو گئے۔ ”اس پر آپ فلاسفر بنتے ہیں، ایسی ہی دلیلوں کے بل
بوتے پر!“

کھنا نے دل کا غبار نکالا ”فلاسفر نہیں تو فلاسفر کی دم ہیں۔ فلاسفر وہ ہے
جو.....“

اونکار ماتھ نے بات پوری کی ”جو سچائی سے بے بھر بھی نہ ڈرے۔“
کھنا کو یہ بات پسند نہ آئی۔ میں سچائی چھائی نہیں جانتا، میں تو فلاسفر اسے کہتا ہوں
جو سچا فلاسفر ہو۔“

مہتا آگے بڑھے۔ ”میں نہیں کہتا کہ عورتوں کو علم کی ضرورت نہیں ہے۔ ہے اور

مردوں سے زیادہ - میں نہیں کہتا کہ عورتوں کو طاقت کی ضرورت نہیں ہے - ہے اور مردوں سے زیادہ لیکن وہ علم نہیں اور وہ طاقت نہیں جس سے مرد نے دنیا کو میدان جنگ بنا ڈالا ہے۔ اگر وہی علم اور وہی طاقت آپ بھی لیں گی تو دنیا ریگستان بن جائے گی۔ آپ کا علم اور آپ کا اقتدار تشدد اور بردباری میں نہیں، پیدائش اور پرورش میں ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ دونوں سے انسان کو نجات ہوگی یا دفتروں اور عدالتوں میں زبان اور قلم چلانے سے ادھار ہو جائے گا؟ ان نقلی غیر قدرتی اور تباہ کن حقوق کے لیے آپ ان حقوق کو چھوڑ دینا چاہتی ہیں جو آپ کو قدرت نے عطا کیے ہیں؟“

سروج اب تک بڑی بہن کے ادب سے ضبط کیے بیٹھی تھی۔ اب رہا نہ گیا۔ پکار اٹھی۔ ”ہمیں دوٹ چاہیے مردوں کے برابر۔“

اور کئی نوعمر عورتوں نے نعرے لگائے۔ ”دوٹ دوٹ!“

اونکار تاتھ نے کھڑے ہو کر زور سے کہا ”نسوانی طبقے کے مخالفوں کی پگڑی نیچی ہو!“
 ہالتی نے میز پر ہاتھ پٹک کر کہا ”چپ رہو جو لوگ موافقت یا مخالفت میں کچھ کہنا چاہیں گے انھیں موقع دیا جائے گا۔“

مہتا بولے ”دوٹ نئے جگ کا جال ہے، فریب ہے، کلنک ہے، دھوکا ہے۔ اس کے چکر میں پڑ کر آپ نہ ادھر کی ہوں گی نہ ادھر کی۔ کون کہتا ہے کہ آپ کا دائرہ عمل محدود ہے اور اس میں آپ کو جو ہر نمائی کا موقع نہیں ملتا۔ ہم سبھی پہلے انسان ہیں، بعد کو اور کچھ۔ ہماری زندگی ہمارا گھر ہے۔ وہیں ہماری پیدائش ہوتی ہے، وہیں ہماری پرورش ہوتی ہے۔ اور وہیں زندگی کے سارے کاروبار ہوتے ہیں۔ اگر یہ دائرہ محدود ہے تو لامحدود کون سا ہے؟ کیا وہ کشمکش کی جگہ جہاں باقاعدہ چھینا چھٹی ہے؟ جس کارخانے میں انسان اور اس کا نصیب بنتا ہے اسے چھوڑ کر آپ ان کارخانوں میں جانا چاہتی ہیں جہاں انسان پیسا جاتا ہے، جہاں اس کا خون نکالا جاتا ہے!“

مرزا نے ٹوکا ”مردوں کے ظلم ہی نے تو ان میں بغاوت کی اسپرٹ پیدا کر دی ہے۔“
 مہتا بولے ”پیشک مردوں نے یہ بے انصافی کی ہے مگر اس کا یہ جواب نہیں ہے بے انصافی کو مٹائیے مگر خود کو مٹا کر نہیں۔“

ہالتی بولی ”عورتیں اس لیے حقوق چاہتی ہیں کہ ان کا استعمال کریں اور مردوں کو ان

کے بے جا استعمال سے باز رکھیں۔“

مہتا نے جواب دیا ”دنیا میں سب سے بڑے حقوق خدمت اور قربانی سے ملتے ہیں اور وہ آپ کو ملے ہوئے ہیں۔ ان حقوق کے سامنے ووٹ کوئی چیز نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ہماری بہنیں مغرب کی بات لے رہی ہیں جہاں عورتوں نے اپنا مرتبہ کھودیا ہے اور مالک کے درجے سے گر کر شوق و پسند کی چیز بن گئی ہیں۔ مغرب کی عورت آزاد ہونا چاہتی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عیش کر سکے۔ ہماری ماؤں کا یہ معیار کبھی نہیں رہا۔ انھوں نے صرف خدمت کے حقوق سے ہمیشہ گرتی چلائی۔ مغرب میں جو چیزیں عمدہ ہیں وہ ان سے لیجیے۔ تمدن میں ہمیشہ لین دین ہوتا آیا ہے مگر کورانہ تھلید تو دماغی کمزوری ہی کی علامت ہے۔ مغرب کی عورت آج گھر کی مالک نہیں رہنا چاہتی۔ عیش و عشرت کی زبردست خواہش نے اسے بالکل آزاد بنا دیا ہے۔ اس نے اپنی شرم اور بزرگی کو جو اس کی سب سے بڑی پونجی تھی شونی اور تفریح کی پسندی پر قربان کر دیا ہے۔ جب میں وہاں کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو اپنی شکل کی یا اپنے بھرے ہوئے گول بازوؤں کی یا اپنی عریانی کی نمائش کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ ان کی خواہشوں نے انھیں اتنا مغلوب کر دیا کہ وہ اپنی لاج کا بچاؤ بھی نہیں کر سکتیں۔ عورت کی اس سے زیادہ اور کیا گراؤٹ ہو سکتی ہے؟

رائے صاحب نے تالیاں بجا کیں۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا جیسے پٹاخوں کی بازھیں چھوٹ رہی ہوں۔ مرزا صاحب نے اڈیٹر سے کہا ”اس کا جواب تو آپ کے پاس بھی نہ ہوگا؟“

اڈیٹر نے بے پروائی سے کہا۔ ”ساری تقریر میں انھوں نے یہی ایک بات کچ کھی ہے۔“

”تب تو آپ بھی مہتا کے مرید ہوئے۔“

”جی نہیں، ہم لوگ کسی کے مرید نہیں ہوتے۔ میں اس کا جواب کھوج نکالوں گا۔ بجلی

میں دیکھیے گا۔“

”اس کے معنی یہ ہے کہ آپ حق کی تلاش نہیں کرتے صرف اپنی بات کے لیے لڑنا

چاہتے ہیں۔“

رائے صاحب نے آڑے ہاتھوں لیا ”اسی پر آپ کو اپنی حق پسندی کا غرہ ہے؟“

اڈیٹر صاحب مستقل رہے۔ ”دکیل کا کام اپنے موکل کا بھلا دیکھنا ہے سچ یا جھوٹ کی

جای ہیں۔“

”تو یوں کہیے کہ آپ عورتوں کے وکیل ہیں۔“

”میں ان سب ہی لوگوں کا وکیل ہوں جو کمزور ہیں یکس ہیں اور مظلوم ہیں۔“

مہتاجی کہہ رہے تھے۔ ”اور یہ مردوں کی سازش ہے۔ عورتوں کو اونچی چوٹی سے گھسیٹ کر اپنے برابر بنانے کے لیے، ان مردوں کے برابر جو بزدل ہیں، جن میں ازدواجی زندگی کی ذمہ داری سنبھالنے کی قابلیت نہیں ہے جو آزادانہ نفس پرستی کی لہر میں سائڈوں کی طرح دوسروں کے ہرے بھرے کھیتوں میں منہ مار کر اپنی کمینہ خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ مغرب میں ان کی سازش کامیاب ہوگئی اور عورتیں تتلیاں بن گئیں۔ مجھے یہ کہتے شرم آتی ہے کہ اس تیاگ اور تپسیا کی سر زمین ہندستان میں بھی کچھ وہی ہوا بہہ چلی ہے خصوصاً ہماری تعلیم یافتہ بہنوں پر وہ جادو بڑی تیزی سے چڑھ رہا ہے۔ وہ گریست عورت کے دھرم کو چھوڑ کر تتلیاں کا رنگ پکڑ رہی ہیں۔“

سروج بھڑک کر بولی۔ ”ہم مردوں کی صلاح نہیں مانگتے۔ اگر وہ اپنے بارے میں آزاد ہیں تو عورتیں بھی اپنے لیے آزاد ہیں۔ لڑکیاں اب شادی کو پیشہ نہیں بنانا چاہتیں۔ اب تو وہ صرف پریم کے ناتے بیاہ کریں گی۔“

زور سے تالیاں بجیں، خاص کر اگلی قطاروں میں جہاں عورتیں تھیں۔

مہتا نے جواب دیا ”جیسے تم پریم کہتی ہو وہ دھوکا ہے، بھڑکی ہوئی خواہش کا گبڑا ہوا روپ۔ اسی طرح جیسے سنیاں صرف بھیک مانگنے کی مہذب شکل ہے۔ وہ پریم اگر ازدواجی زندگی میں کم ہے تو آزادانہ عیش میں بالکل نہیں۔ بچی خوشی، سچا سکون، صرف خدمت میں ہے۔ وہی حقوق کا منبع ہے۔ وہی طاقت کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔ خدمت ہی وہ سینٹ ہے جو زن و شوہر کو تمام عمر محبت اور باہمی امداد کے رشتے میں جوڑے رکھتا ہے۔ جس پر بڑے بڑے صدمہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جہاں خدمت نہیں ہے وہیں طلاق ترک اور باہمی بد اعتقادی ہے اور آپ پر مردانہ زندگی کی کشتی کا ناخدا ہونے کے سبب زیادہ ذمہ داری ہے۔ آپ چاہیں تو کشتی کو آندھی اور طوفان میں بھی پار لگا سکتی ہیں اور آپ نے غفلت کی تو کشتی ڈوب جائے گی اور اس کے ساتھ آپ بھی ڈوبنے سے نہ بچ سکیں گی۔“

تقریر ختم ہو گئی۔ مسئلہ بحث طلب تھا اور کئی عورتوں نے اجازت مانگی مگر دیر بہت ہو گئی

تھی، اس لیے مالتی نے مہتا کا شکریہ ادا کر کے جلسہ برخاست کر دیا۔ ہاں یہ اطلاع دے دی گئی ہے کہ اگلے اتوار کو اس موضوع پر کئی دیویاں اپنے خیالات کا اظہار کریں گی۔

رائے صاحب نے مہتا کو مبارک باد دی ”آپ نے میرے جی کی باتیں کہیں، مسٹر مہتا! میں آپ کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں۔“

مالتی ہنسی ”آپ کیوں نہ مبارک باد دیں گے، چور چور موسیرے بھائی ہوتے ہیں۔ مگر سارا اپدیش غریب عورتوں کے ہی سر پر کیوں تھوپا جاتا ہے ان ہی کے سر پر کیوں معیار اور ایثار پر عمل کرنے کی ذمہ داری لادی جاتی ہے۔؟“

مہتا بولے ”اس لیے کہ وہ بات کو سمجھتی ہیں۔“
کھنا نے مالتی کی طرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر گویا اس کے دل کی بات سمجھتے ہوئے کہا ”ڈاکٹر صاحب کے یہ خیالات بھی تو کوئی سو سال سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں۔“

مالتی نے ترش رو ہو کر پوچھا ”کون سے خیالات؟“
”یہی خدمت اور فرض وغیرہ کے۔“

”اگر آپ کو یہ خیالات سو سال بچھڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں تو مہربانی کر کے اپنے تازہ خیالات بتلائیے عورت کیسے مرد کیسے سکھی رہ سکتے ہیں۔ اس کا کوئی تازہ نسخہ آپ کے پاس ہے؟“

کھنا کھینٹے۔ بات کہی تھی مالتی کو خوش کرنے کے لیے وہ اور مگر اٹھی بولے ”یہ نسخہ مہتا صاحب کو معلوم ہوگا۔“

”ڈاکٹر صاحب نے بتلادیا اور آپ کے خیال میں وہ سو سال پرانا ہے تو نیا نسخہ آپ کو بتلانا چاہیے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ دنیا میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو کبھی پرانی ہوئی نہیں سکتیں۔ سماج میں اس طرح کے مسئلہ ہمیشہ اٹھتے رہتے ہیں اور ہمیشہ اٹھتے رہیں گے۔“

مسز کھنا برآمدے میں چلی گئی تھیں۔ مہتا نے ان کے پاس جا کر پرنام کرتے ہوئے پوچھا ”میری تقریر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

مسز کھنا نے آنکھیں جھکا کر کہا ”اچھی تھی بہت اچھی۔ مگر ابھی آپ کنوارے ہیں جبھی عورتیں دیویاں ہیں، برتر ہیں اور زندگی کے جہاز کی ناخدا ہیں۔ بیاہ کر لیجیے پھر پوچھوں

گی عورتیں کیا ہیں اور بیاہ آپ کو کرنا پڑے گا کیونکہ آپ بیاہ سے منہ پھرانے والے مردوں کو
بزدل کہہ چکے ہیں۔“

مہتا نے ”اسی کے لیے تو زمین تیار کر رہا ہوں۔“

”مس مانتی کا جوڑ بھی اچھا ہے۔“

”شرط یہی ہے کہ وہ کچھ دن آپ کے چرنوں میں بیٹھ کر آپ سے استریوں کا
دھرم سیکھیں۔“

”وہی سوار تھی مردوں کی بات! آپ نے مردوں کے فرائض سیکھ لیے ہیں؟“

”یہی سوچ رہا ہوں کہ کس سے سیکھوں،“

”مسٹر کھنا آپ کو بہت اچھی طرح سیکھا سکتے ہیں۔“

مہتا نے قہقہہ مارا ”نہیں وہ فرض بھی آپ ہی سے سیکھوں گا۔“

اچھی بات ہے مجھی سے سیکھیے پہلی بات یہی ہے کہ بھول جائیے کہ عورت برتر ہے اور
ساری ذمہ داری اسی پر ہے۔ برتر مرد ہے اور اسی پر گرتی کا سارا بار ہے۔ عورت میں خودی
اور نفس کشی اور فرض کی ادائیگی کا احساس سب کچھ وہی پیدا کر سکتا ہے۔ اگر اس میں یہ باتیں
نہیں ہیں تو عورت میں بھی نہ آئیں گی۔ عورتوں میں جو آج یہ بغاوت ہے اس کا سبب مرد
میں ان اوصاف کا نہ ہونا ہے۔“

مرزا صاحب نے مہتا کو گود میں اٹھا لیا اور بولے ”مبارک!“

مہتا نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا ”آپ کو میری تقریر پسند آئی؟“

”تقریر تو خیر جیسی تھی ویسی تھی مگر کامیاب خوب رہی۔ آپ نے پری کو شیشے میں اتار

لیا۔ اپنا بھاگ سراہیے کہ جس نے آج تک کسی کو منہ نہیں لگایا وہ آپ کا کلمہ پڑھ رہی ہے۔“

مسٹر کھنا نے دبی زبان سے کہا ”جب نشہ ٹھہر جائے تو کہیے۔“

مہتا نے بے پروائی سے کہا ”مجھ جیسے کتاب کے کیڑے کو کون عورت پسند کرے گی،

دیوی جی؟ میں تو پکا معیار پرست ہوں۔“

مسٹر کھنا نے اپنے شوہر کو موٹر کی طرف جاتے دیکھا تو ادھر چلیں گئیں، مرزا بھی باہر

نکل گئے۔ مہتا نے پلیٹ فارم سے اپنی چھری اٹھائی اور باہر جانا چاہتے تھے کہ مانتی نے آکر

ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اصرار کرتی ہوئی بولی۔ ”آپ ابھی نہیں جاسکتے چلیے پاپا سے آپ کی

ملاقات کراؤں اور آج وہیں کھانا بھی کھائیے؟“

مہتا نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”نہیں مجھے معاف کیجیے۔ وہاں سروج میری جان کھا جائے گی۔ میں ان لڑکیوں سے بہت گھبراتا ہوں۔“

”نہیں، نہیں میں ذمہ لیتی ہوں جو منہ بھی کھولے۔“

”اچھا آپ چلیے میں ذرا دیر میں آجاؤں گا۔“

”جی، نہیں یہ نہ ہوگا۔ میرا موٹر سروج کو لے کر چل دیا۔ آپ مجھ کو پہنچانے تو چلیں گے ہی۔“

دونوں مہتا کے موٹر میں بیٹھے۔ موٹر چلا۔ لمحہ بھر بعد مہتا نے پوچھا ”میں نے سنا ہے کہ کھنا جی اپنی بیوی کو مارتے ہیں۔ جب سے مجھے اس کی صورت سے نفرت ہو گئی ہے۔ جو آدمی اتنا بے رحم ہو اسے میں انسان نہیں سمجھتا۔ اس پر آپ عورتوں کی بڑی خیر خواہ بنتی ہیں! تم نے کبھی انھیں سمجھایا نہیں؟“

مالتی ذرا گبڑک بولی۔ ”تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بچتی ہے، یہ آپ بھول رہے ہیں۔“

”میں ایسے کسی سبب کا خیال ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی مرد اپنی عورت کو مارے۔“

”خواہ عورت کتنی ہی بد زبان ہو۔“

”ہاں کتنی ہی۔“

”تو آپ ایک نئی قسم کی آدمی ہیں۔“

”اگر مرد بد زبان ہو تو تمھاری رائے میں اس مرد پر ہنڑوں کی بوچھاڑ کرنی چاہیے، کیوں؟“

”عورت میں جتنی چھما ہو سکتی ہے اتنی مرد میں نہیں۔ آپ نے خود آج بات تسلیم کی ہے۔“

”تو عورت کی چھما ہی کا یہ صلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم کھنا کو منہ لگا کر اسے اور بھی شہد دیتی ہو۔ تمھاری وہ جتنی عزت کرتا ہے، تم سے اسے جتنی عقیدت ہے اس کے سبب تم بڑی آسانی سے اسے سیدھا کر سکتی ہو۔ مگر تم اس کی صفائی دے کر، خود اس قصور میں شریک ہو جاتی ہو۔“

مالتی برا فروخت ہو کر بولی۔ ”تم نے اس وقت یہ تذکرہ فضول ہی چھیڑ دیا میں کسی کی برائی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر ابھی آپ نے گوبندی دیوی کو پہچانا نہیں۔ آپ نے ان کی بھولی بھالی، سیدھی سادی صورت دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ دیوی ہیں۔ میں انھیں اتنا اونچا درجہ نہیں دینا چاہتی۔ انھوں نے مجھے بدنام کرنے کی جتنی کوشش کی ہے۔ مجھ پر جیسے جیسے حملے کیے ہیں، وہ بیان کروں تو آپ دنگ رہ جائیں گے اور تب آپ کو ماننا پڑے گا کہ ایسی عورت کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔“

”آخر انھیں آپ سے جو اتنی نفرت ہے اس کا کوئی سبب تو ہوگا؟“

”سبب ان سے پوچھیے۔ مجھے کسی کے دل کا حال کیا معلوم؟“

”ان سے بلا پوچھے بھی قیاس کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے۔ اگر کوئی مرد میرے اور میری عورت کے درمیان میں آنے کی ہمت کرے تو میں اسے گولی مار دوں گا اور اسے نہ مار سکوں گا تو اپنے سینے میں مار لوں گا۔ اسی طرح اگر میں کسی عورت کو اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان میں لانا چاہوں تو میری بیوی کو بھی حق ہے کہ وہ جو چاہے سو کرے۔ اس بارے میں میں کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہ غیر سائنٹیفک جذبہ ہے جو ہم نے اپنے وحشی آبا و اجداد سے پایا ہے اور آج کل کچھ لوگ اسے نامہذب اور غیر مجلسی سلوک کہیں گے۔ لیکن میں ابھی تک اس جذبہ پر فتح نہیں پاسکا اور نہ پانا چاہتا ہوں۔ اس بارے میں قانون کی پروا نہیں کرتا۔ میرے گھر میں میرا قانون ہے۔“

مالتی نے تند لہجے میں پوچھا ”مگر آپ نے یہ قیاس کیسے کر لیا کہ میں آپ کے لفظوں میں کھنا اور گوبندی کے بیچ میں آنا چاہتی ہوں؟ آپ ایسے قیاس سے میری تو چین کر رہے ہیں۔ میں کھنا کو اپنی جوتیوں کی نوک کے برابر بھی نہیں سمجھتی۔“

مہتا نے بے اعتباری کے لہجے میں کہا ”یہ آپ دل سے نہیں کہہ رہی ہیں۔ مس مالتی! کیا آپ ساری دنیا کو بیوقوف سمجھتی ہیں؟ جو بات سبھی سمجھ رہے ہیں اگر وہی بات مزہ کھنا بھی سمجھیں تو میں انھیں الزام نہیں دے سکتا۔“

مالتی نے مجبور کر کہا۔ ”دنیا کو دوسروں کے بدنام کرنے میں مزا آتا ہے۔ یہ اس کا خاصہ ہے۔ میں اس کا خاصہ کیسے بدل دوں؟ لیکن یہ مفت کی بدنامی ہے۔ ہاں میں اتنی بے مروت نہیں ہوں کہ کھنا کو اپنے پاس آنا دیکھ کر دھکار دیتی۔ میرا کام ہی ایسا ہے کہ مجھے

سبھی کی آؤ بھگت کرنا پڑتی ہے اگر کوئی اس کا کچھ اور مطلب نکالتا ہے تو وہ
وہ.....

مالتی کا گلا بھر آیا اور اس نے منہ پھیر کر رومال سے آنسو پونچھے۔ پھر ایک لمحہ بعد بولی۔
 اوروں کے ساتھ تم بھی مجھے مجھے اس کا رنچ ہے مجھے تم سے ایسی امید نہ
 تھی۔“

پھر شاید اسے اپنی کمزوری پر افسوس ہوا۔ وہ تیز ہو کر بولی۔ ”آپ کو مجھ پر حملہ کرنے کا
 کوئی حق نہیں ہے۔ اگر آپ بھی انھیں مردوں میں ہیں جو کسی عورت مرد کو ساتھ دیکھ کر ان پر
 انگلی اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے تو شوق سے اٹھائیے۔ مجھے ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ اگر کوئی عورت
 آپ کے پاس بار بار کسی حیلے سے آئے، آپ کو اپنا دیوتا سمجھے، ہر ایک بات میں آپ سے
 صلاح لے، آپ کے پیروں تلے آنکھیں بچھائے، آپ کا اشارہ پاتے ہی آگ میں کود پڑنے
 کو تیار ہو جائے تو میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ اس سے بے رخی نہ کریں گے۔ اگر آپ
 اسے ٹھکرا سکتے ہیں تو آپ انسان نہیں ہیں۔ اس کے خلاف آپ کتنے ہی دلائل لا کر رکھ دیں
 میں مانوں گی نہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ بے رخی تو دور رہی ٹھکرانے کی تو بات ہی کیا۔ آپ اس
 عورت کے پیر دھو دھو کر پیسے گے، اور بہت دن گزرنے کے قبل ہی وہ آپ کے دل کی رانی
 ہوگی۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ میرے ساجنے کھنا کا کبھی نام نہ لیجیے گا۔“
 مہتا نے اس لپٹ میں گویا ہاتھ سینکتے ہوئے کہا ”شرط یہی کہ میں کھنا کو آپ کے ساتھ نہ
 دیکھوں۔“

”میں انسانیت کا خون نہیں کر سکتی۔ وہ آئیں گے تو میں انھیں بھگاؤں گی نہیں۔“
 ”ان سے کہیے کہ اپنی اہلیہ کے ساتھ انسانیت سے پیش آئیں۔“
 ”میں کسی کے نجی معاملے میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتی اور نہ ہی مجھے اس کا حق ہے۔“
 ”تو آپ کسی کی زبان بھی نہیں بند کر سکتیں۔“

مالتی کا ہنسنے لگا۔ موٹر رکی۔ مالتی اتر پڑی اور بلا ہاتھ ملائے چلی گئی۔ وہ یہ بھی بھول گئی
 کہ اس نے مہتا کو کھانے کی دعوت دی ہے۔ وہ تخیلہ میں جا کر خوب رونا چاہتی ہے۔ گو بندی
 نے پہلے بھی حملے کیے ہیں۔ مگر آج اس نے جو حملہ کیا وہ بہت سخت اور دل شکن ہے۔“

رائے صاحب کو جب خبر ملی کے علاقے میں ایک واردات ہو گئی اور ہوری سے گاؤں کے بچوں نے جرمانہ وصول کر لیا ہے تو وہ فوراً نوکھے رام کو بلا کر جواب طلب کیا۔ انھیں اس کی اطلاع نہیں دی گئی؟ ایسے نمک حرام اور دغا باز آدمی کے لیے ان کے دربار میں جگہ نہیں ہے۔

نوکھے رام نے اپنی گالیاں کھائیں تو ذرا گرم ہو کر بولے۔ میں اکیلا تھوڑے ہی تھا۔ گاؤں کے اور بچے بھی تو تھے۔ میں اکیلا کیا کر سکتا تھا؟“

رائے صاحب نے ان کی توند کی طرف برچھی کی سی نوک دار نگاہوں سے دیکھا، ”مت بکو جی! تمہیں اسی وقت کہنا چاہیے تھا کہ جب تک سرکار کو اطلاع نہ ہو جائے میں بچوں کو جرمانہ نہ وصول کرنے دوں گا۔ بچوں کو میرے اور میری رعایا کے درمیان میں دخل دینے کا حق ہی کیا ہے؟ اس ڈانٹر باندھ کے سوا علاقے میں اور کون سی آمدنی ہے؟“

وصولی سرکار کے گھر گئی، بتایا اسامیوں نے دہالیا۔ اور میں کہاں جاؤں؟ کیا کھاؤں؟ تمہارا سر؟ یہ لاکھوں روپے سال کا خرچ کہاں سے آئے؟ افسوس ہے کہ دو پشتوں سے کارندے کا کام کرتے رہنے پر بھی مجھے آج تمہیں یہ بات بتلانی پڑتی ہے۔ کتنے روپے وصول ہوئے تھے ہوری سے؟

نوکھے رام نے شپٹا کر کہا۔ ”اسی روپے۔“

”نقد؟“

”نقد اس کے پاس کہاں تھے سرکار؟ کچھ اناج دیا، کچھ میں اپنا گھر لکھ دیا۔“

رائے صاحب نے اپنی غرض کو چھوڑتے ہوئے ہوری کی طرف داری کی۔

”اچھا تو آپ نے اور آپ کے بگلا بھگت پنڈت نے مل کر ایک معتبر اسامی کو تباہ کر دیا! میں پوچھتا ہوں تم لوگوں کو کیا حق تھا کہ میرے علاقے میں مجھے اطلاع دیے بغیر میرے اسامی سے جرمانہ وصول کرتے؟ اگر میں چاہوں تو اسی بات پر آپ کو اور اس جھلے پنواری

اور اس مکار پھڑت کو سات سات سال کے لیے جیل بھجوا سکتا ہوں۔ آپ نے سمجھ لیا کہ آپ ہی علاقے کے بادشاہ ہیں۔ میں کہے دیتا ہوں کہ آج شام تک جرمانے کی پوری رقم میرے پاس پہنچ جائے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں ایک ایک سے چلی پھوڑا کر چھوڑ دوں گا۔ جائے، ہاں ہوری اور اس کے لڑکے کو میرے پاس بھیج دیجیے گا۔“

نوکھے رام نے دبی زبان سے کہا ”اس کا لڑکا تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے جس رات کو یہ واردات ہوئی اسی رات کو بھاگا تھا۔“

رائے صاحب نے غصہ سے کہا ”جھوٹ مت بکوتھیں معلوم ہے کہ جھوٹ سے میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں نے آج تک نہیں سنا کہ کوئی نوجوان اپنے جیتی کو اس کے گھر سے لاکر پھر خود بھاگ جائے۔ اگر اسے بھاگنا ہی ہوتا تو وہ اس لڑکی کو لاتا ہی کیوں؟ تم لوگوں کی اس میں بھی کوئی شرارت ہے۔ تم گنگا میں ڈوب کر بھی اپنی صفائی دو تو میں ماننے کا نہیں۔ تم لوگوں نے اپنے سانج کی پیاری مر جاد کی حفاظت کے لیے اسے دھکایا ہوگا بے چارا بھاگ نہ جاتا تو کیا کرتا؟“

نوکھے رام اس کی مخالفت نہ کر سکے۔ مالک جو کچھ کہیں سب ٹھیک ہے۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکے کہ آپ خود چل کر جھوٹ سچ کی جانچ کر لیں۔ بڑے آدمیوں کا غصہ پوری پوری اطاعت چاہتا ہے اپنے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔

بچوں نے رائے صاحب کا یہ فیصلہ سنا تو نشہ ہرن ہو گیا۔ غلہ تو ابھی جیوں کا تیوں پڑا ہوا تھا مگر روپے تو کب کے غائب ہو چکے تھے۔ ہوری کا مکان رہن لکھا گیا تھا۔ مگر اس مکان کو دیہات میں کون پوچھتا؟ جیسے ہندو عورت شوہر کے ساتھ ہی گھر کی مالک ہے اور شوہر کے گھر چھوڑ دینے پر کہیں کی نہیں رہتی اسی طرح یہ گھر ہوری کے لیے تو لاکھ روپے کا ہے مگر اس کی اصلی قیمت تو کچھ بھی نہیں، اور ادھر رائے صاحب روپے لیے بغیر ماننے کے نہیں۔ یہی ہوری جاکر روایا ہوگا۔ بیٹھوری لال سب سے زیادہ خائف تھے۔ ان کی تو نوکری چلی جائے گی۔ چاروں آدمی اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے مگر کسی کی عقل کام نہ کرتی تھی؟ ایک دوسرے کو الزام دیتا تھا۔ پھر خوب جھگڑا ہوا۔

بیٹھوری نے اپنی لمبی گردن ہلا کر کہا ”میں منع کرتا تھا کہ ہوری کے معاملے میں ہمیں چپ ہو کر رہ جانا چاہیے۔ گائے کے معاملے میں سب کو تاوان دینا پڑا۔ اب اس

معاملے میں تاوان ہی سے گھلا نہ چھوٹنے کا بلکہ نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مگر تم لوگوں کو روپے کی پڑی تھی نکالو بیس بیس روپے۔ اب بھی کسل ہے۔ کہیں رائے صاحب نے رپٹ کر دی تو سب کے سب بندھ جاؤ گے۔“

داتا دین نے اپنا برہمنی جلال دکھا کر کہا ”میرے پاس بیس روپے تو کیا، بیس پیسے بھی نہیں ہیں۔ برہمنوں کو بھوج دیا گیا، ہوم ہوا، کیا اس میں کچھ لگا ہی نہیں؟“

”رائے صاحب کی ہمت ہے کہ مجھے جہل لے جائیں۔ برہمن بن کر گھر کا گھر معا دو لگا۔ ابھی انھیں کسی برہمن سے پالنا نہیں پڑا۔“

جھنگری سنگھ نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی۔ وہ رائے صاحب کے نوکر نہیں ہیں۔ انھوں نے ہوری کو مارا نہیں، پینا نہیں، اس پر کوئی دباؤ ڈالا نہیں، ہوری اگر پراحت کرنا چاہتا تھا تو انھوں نے اس کا موقع دیا۔ اس کے لیے انھیں کوئی دکھ نہیں دے سکتا۔ مگر نوکھے رام کی گردن اتنی آسانی سے نہ چھوٹ سکتی تھی۔ یہاں مزے سے بیٹھے بیٹھے راج کرتے تھے۔ مشاہرہ تو دس روپے سے زیادہ نہ تھا مگر ایک ہزار سالانہ سے زائد آمدنی نہ تھی۔ صدہا آدمیوں پر حکومت، چار چار پیادے حاضر، پیگار میں سارا کام ہو جاتا تھا، تھانیدار تک کرسی دیتے تھے۔ یہ چین انھیں اور کہاں تھا؟ اور پیشوری تو نوکری کی بدولت مہاجن بنے ہوئے تھے۔ کہاں جاسکتے تھے؟ دو تین روز اسی تردد میں پڑے رہے کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات ہو۔ آخر انھیں ایک راستہ سوچھ گیا۔ کبھی کبھی پچہری میں انھیں ”بجلی“ دیکھنے کو مل جاتی تھی۔ اگر ایک گنام خط اس کے ایڈیٹر کے خدمت میں بھیج دیا جائے کہ رائے صاحب کس طرح اسامیوں سے جرمانہ وصول کرتے ہیں تو بچہ کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ نوکھے رام بھی متفق ہو گئے دونوں نے مل کر کسی طرح ایک خط لکھا اور رجسٹری سے بھیج دیا۔

ایڈیٹر اونکار ناتھ تو ایسے خطوں کی تاک میں رہتے تھے۔ خط پاتے ہی فوراً رائے صاحب کو اطلاع دی۔ انھیں ایک ایسی خبر ملی جس پر اعتبار کرنے کو ان کا جی نہیں چاہتا مگر نامہ نگار نے ایسے ثبوت دیے ہیں کہ یکا یک بے اعتباری بھی نہیں کی جاسکتی۔ کیا یہ سچ ہے کہ رائے صاحب نے اپنے علاقے کے ایک اسامی سے اسی روپے تاوان اس لیے وصول کیا کہ اس کے لڑکے نے ایک بیوہ کو اپنے گھر رکھ لیا تھا؟ ایڈیٹر کا فرض انھیں مجبور کرتا تھا کہ وہ اس معاملے کی جانچ کریں اور عوام کی بھلائی کے لیے اسے چھاپ دیں۔ رائے صاحب اس کے

متعلق جو کہنا چاہیں اسے بھی وہ چھاپ دیں گے۔ ایڈیٹر صاحب دل سے چاہتے ہیں کہ یہ خبر غلط ہو لیکن اس میں کچھ بھی سچائی ہوئی تو اسے شائع کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ دوستی انھیں فرض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔

رائے صاحب کو یہ خبر ملی تو انھوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ پہلے تو انھیں یہ تحریک ہوئی کہ جا کر اونکار ناتھ کو پچاس ہنسر گن کر لگائیں کہ جہاں وہ خط چھاپنا وہیں یہ حال بھی چھاپ دینا۔ لیکن اس کا انجام سوچ کر دل کو ٹھنڈا کیا اور فوراً ان سے ملنے چلے۔ اگر دیر کی اور اونکار ناتھ نے وہ حال چھاپ دیا تو ان کی ساری نیک نامی پر پانی بھر جائے گا۔

اونکار ناتھ سیر کر کے لوٹے تھے اور کل کے اخبار کے لیے ایڈیٹر کی لکھنے کی فکر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر دل چڑے کی طرح اڑا اڑا پھرتا تھا۔ ان کی اہلیہ نے رات میں انھیں کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالی تھیں جو ابھی تک کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ انھیں کوئی مفلس کہہ لے، بد نصیب کہہ لے، بیوقوف کہہ لے، وہ ذرا بھی برا نہیں مانتے تھے مگر یہ کہنا کہ ان میں مردیت نہیں ہے، ان کی برداشت سے باہر تھا۔ اور پھر اپنی بیوی کو یہ کہنے کا کیا حق ہے؟ اس سے تو یہ امید کی جاتی ہے کہ کوئی ایسا کہے تو اس کا منہ بند کر دے۔ بیشک وہ ایسی خبریں نہیں چھاپتے، ایسے نوٹ نہیں لکھتے کہ سر پر کوئی آفت آجائے۔ بھونک بھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ ان سیاہ قانونوں کے زمانے میں وہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟ مگر کیوں وہ کیوں سانپ کے بل میں ہاتھ نہیں ڈالتے، اسی لیے تو کہ ان کے گھر والوں کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے اور ان کی اس برداشت کا انھیں یہ صلہ مل رہا ہے۔ کیا اندھیر ہے! ان کے پاس روپے نہیں تو بناری ساڑھی کہاں سے منگا کر دیں؟ ڈاکٹر سینھ اور پروفیسر بھانیا اور نہ جانے کس کس کی بیویاں بناری ساڑھی پہنتی ہیں تو وہ کیا کریں؟ کیوں ان کی بیوی ان ساڑھی والیوں کو اپنی کھدر کی ساڑھی سے نادم نہیں کرتی؟ ان کی خود تو یہ عادت ہے کہ کسی بڑے آدمی سے ملنے جاتے ہیں تو موٹے سے موٹے کپڑے پہن لیتے ہیں اور کوئی کچھ رائے زنی کرے تو وہ اس کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کی بیوی میں کیا وہی خودداری نہیں ہے؟ وہ دوسروں کا ٹھٹھا باٹ دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے؟ اسے سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک محبت وطن کی بیوی ہے جس کے پاس حب الوطنی کے سوا اور کون سی پونجی ہے؟ اسی کو آج افتتاحیہ مضمون بنانے کا خیال کرتے کرتے ان کا دھیان رائے صاحب کے معاملے پر جا پھنچا۔ رائے

صاحب اس اطلاع کا کیا جواب دیتے ہیں ، یہ دیکھنا ہے ۔ اگر وہ اپنی صفائی دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو کوئی بات نہیں ، ورنہ اگر وہ یہ سمجھیں کہ اونکار ناتھ دباؤ، خوف یا مروت میں آکر اپنے فرض سے منہ موڑ لیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہے ۔ اس ساری تمیہ کا بدلا انھیں اس کے سوا اور کیا ملتا ہے کہ موقع ملنے پر وہ ان قانونی ڈاکوؤں کی کروت کھول دیں ۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ رائے صاحب بڑے بااثر آدمی ہیں ۔ کونسل کے ممبر ہونے کے علاوہ حکام میں بھی ان کا کافی رسوخ ہے ۔ وہ چاہیں تو ان پر جھوٹے مقدمے چلوا سکتے ہیں ، اپنے غنڈوں سے انھیں راہ چلتے پٹوا سکتے ہیں ، مگر اونکار ناتھ ان باتوں سے نہیں ڈرتا ۔ جب تک اس کے جسم میں جان ہے وہ ظالموں کی خبر لیتا ہی رہے گا ۔

دفعتاً موٹر کی آواز سن کر وہ چونک پڑے اور فوراً کاغذ لے کر اپنا مضمون شروع کر دیا ۔ ایک ہی لمحہ میں رائے صاحب ان کے کمرے میں داخل ہوئے ۔

اونکار ناتھ نے نہ ان کا خیر مقدم کیا ، نہ مزاج پرسی کی اور نہ کرسی دی ۔ انھیں اس طرح دیکھا گویا کوئی ظلم ان کی عدالت میں آیا ہو اور رعب کی آواز میں پوچھا ” آپ کو میرا پرزہ مل گیا تھا ؟ میں خط لکھنے کے لیے مجبور نہ تھا ، میرا فرض تو یہ تھا کہ خود اس کی تحقیقات کرتا مگر مروت میں اصولوں کا کچھ نہ کچھ تو خون کرنا ہی پڑتا ہے ۔ کیا اس خبر میں کچھ سچائی ہے ؟“

رائے صاحب اس کی سچائی سے انکار نہ کر سکے اگرچہ ابھی تک انھیں جرمانے کے روپے نہ ملے تھے ۔ اور وہ اس کے ملنے سے صاف انکار کر سکتے تھے مگر وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ کس پہلو پر چلتے ہیں ۔

اونکار ناتھ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ” تب تو میرے لیے اس خبر کو چھاپ دینے کے سوا اور کوئی چارا نہیں ہے ، مجھے اس کا افسوس ہے کہ مجھے اپنے ایک بڑے خیر خواہ دوست کے متعلق کچھ لکھنا پڑ رہا ہے مگر فرض کے مقابلے میں شخص کوئی چیز نہیں ۔ ایڈیٹر اگر اپنا فرض نہ پورا کر سکے تو اسے اس جگہ پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔“

رائے صاحب کرسی پر بیٹھ گئے اور پان کے بیڑے منہ میں ڈال کر بولے ” لیکن یہ آپ کے حق میں اچھا نہ ہوگا مجھے تو جو کچھ ہونا ہے وہ بعد کو ہوگا مگر آپ کو فوراً سزا مل جائے گی ۔ اگر آپ دوستوں کی پرواہ نہیں کرتے تو میں بھی اسی پالیسی کا آدمی ہوں ۔“

اونکار ناتھ نے ایک شہید کی عظمت اختیار کرتے ہوئے کہا ”اس کا تو مجھے کبھی ڈر نہیں ہوا۔ جس روز میں نے ایڈیٹر ہونے کی ذمہ داری لی اسی روز اپنی جان کا موہ چھوڑ دیا اور میرے نزدیک ایڈیٹر کی سب سے شاندار موت یہی ہے کہ وہ حق و انصاف پر اپنے کو قربان کر دے۔“

”اچھی بات ہے میں آپ کا چیلنج منظور کرتا ہوں۔ میں اب تک آپ کو اپنا دوست سمجھتا آیا تھا مگر اب آپ لڑنے کو تیار ہیں تو لڑائی ہی سہی۔ آخر میں آپ کے اخبار کا پانچ گنا چندہ کیوں دیتا ہوں؟ صرف اس لیے کہ یہ میرا غلام بنا رہے۔ مجھے ایڈیٹر نے رئیس بنایا ہے۔ آپ کے بنانے سے نہیں بنا ہوں۔ معمولی چندہ پندرہ روپے ہیں اور میں محکمہ روپے دیتا ہوں تو اسی لیے آپ کا منہ بند رہے۔ جب آپ گھانٹے کا رونا روتے ہیں اور امداد کے لیے اپیل کرتے ہیں اور ایسی شاید ہی کوئی سہ ماہی جاتی ہو جب آپ کی اپیل نہ نکلے، تو میں ایسے ہر موقع پر آپ کی کچھ نہ کچھ امداد کر دیتا ہوں کس لیے؟ دیوالی دسہرہ اور ہولی میں آپ کے یہاں سوغات بھیجتا ہوں اور سال میں پچیس مرتبہ آپ کی دعوت کرتا ہوں۔ کس لیے؟ آپ رشوت اور فرض دونوں کو ساتھ ساتھ نہیں بھا سکتے۔“

اونکار ناتھ گرم ہو کر بولے ”میں نے کبھی رشوت نہیں لی۔“

رائے صاحب نے پھٹکارا ”اگر یہ رشوت نہیں ہے تو رشوت کیا ہے؟ ذرا مجھے سمجھا دیجیے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے علاوہ اور سب گدھے ہیں۔ جو بے غرضانہ آپ کا گھانا پورا کرتے ہیں؟ نکالے اپنا کھانا اور مجھے بتائیے کہ اب تک آپ کو میری ریاست سے کتنا مل چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہزاروں کی رقم نکلے گی۔ اگر آپ کو سودیشی سودیشی چلا کر بدیشی دواؤں اور چیزوں کا اشتہار چھاپنے میں شرم نہیں آتی تو میں کیوں اپنے آسامیوں سے تادان اور جرمانہ لینے میں شرم کروں؟ یہ نہ سمجھیے کہ آپ ہی کسانوں کے بہبود کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ مجھے کسانوں کے ساتھ جلتا مرنا ہے، مجھ سے بڑھ کر دوسرا ان کا ہی خواہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میرا گزر کیسے ہو؟ افسروں کو دعوتیں کہاں سے دوں؟ سرکاری چندے کہاں سے دوں؟ خاندان کے صدا ہا آدمیوں کی ضرورتیں کیسے پوری کروں؟ میرا گھر کا کیا خرچ ہے، یہ شاید آپ جانتے ہیں۔ تو کیا میرے گھر میں روپے پھلتے ہیں؟ آئیں گے تو آسامیوں کے ہی گھر سے۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ زمیندار اور تعلقدار دنیا بھر کا سکھ لوٹ رہے ہیں۔ ان

کی اصلی حالت کا آپ کو پتہ نہیں۔ اگر وہ دھرماتما بن کر رہیں تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔ حکام کو ڈالیاں نہ دیں تو جیل گھر ہو جائے۔ ہم کچھ نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ سب کو ڈنک مارتے پھریں اور نہ غریبوں کا گلا دہانا کوئی بڑی خوشی کی بات ہے مگر رواجوں کو تو نبھانا پڑتا ہے۔ جس طرح آپ میرے رئیس ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اسی طرح اور سب لوگ ہمیں سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھتے ہیں۔ آئیے میرے بنگلے پر تو دکھا دوں کہ صبح سے شام تک کتنے نشانے مجھ پر پڑتے ہیں۔ کوئی کشمیر سے شال دو شالے لیے چلا آتا ہے، کوئی گراموفون لیے سر پر سوار ہے اور کوئی کچھ۔ چندے والے تو بے شمار، کیا سب کے سامنے اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ جاؤں؟ کیا یہ لوگ میرے دروازے پر دکھڑا سننے آتے ہیں؟ آتے ہیں مجھے آلو بنا کر مجھ سے کچھ اینٹھنے کے لیے۔ آج رواج کا خیال چھوڑ دوں تو تالیاں پٹنے لگیں۔ حکام کو ڈالیاں نہ دوں تو باغی سمجھا جاؤں۔ تب آپ اپنے مضامین سے میری حفاظت نہ کریں گے۔ کانگریس میں شریک ہوا، اس کا تاوان ابھی تک دیتا جاتا ہوں۔ کالی کتاب میں نام درج ہو گیا۔ میرے سر پر کتنا قرض ہے یہ بھی کبھی آپ نے پوچھا؟ اگر کبھی مہاجن ڈگریاں کرائیں تو میرے ہاتھ کا پھلنا تک بک جائے گا۔ آپ کہیں گے کیوں یہ جھگڑے پالتے ہو؟ سات پشتوں سے جن حالات میں رہتا آیا ہوں ان سے اب نکل نہیں سکتا۔ گھاس چھیلنا اب میرے لیے ناممکن ہے۔ آپ کے پاس زمین نہیں، جائیداد نہیں، رواجی بندش نہیں، آپ بے خوف ہو سکتے ہیں مگر آپ بھی دُم دبائے بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کو کچھ خبر ہے کہ عدالتوں میں کتنی رشوت چل رہی ہے، کتنے غریبوں کا خون ہو رہا ہے، کتنی عورتیں بد راہ ہو رہی ہیں۔ ہے بوتہ لکھنے کا؟ مثال میں دیتا ہوں مع ثبوت کے۔“

اونکار ہاتھ کچھ نرم ہو کر بولے۔ ”جب کبھی ایسا موقع آیا میں نے قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔“ رائے صاحب بھی کچھ نرم ہوئے ”ہاں میں مانتا ہوں کہ دو ایک موقعوں پر آپ نے جواں مردی دکھائی مگر آپ کی نظر ہمیشہ اپنے فائدے پر رہی، عوام کے فائدے پر نہیں۔ آنکھیں نہ نکالے اور نہ چہرہ سرخ بنائے۔ جب کبھی آپ میدان میں آئے اس کا اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی عزت اور آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اگر میرے ساتھ بھی آپ وہی چال چل رہے ہوں تو میں آپ کی خاطر کرنے کو تیار ہوں۔ روپے نہ دوں گا کیونکہ وہ رشوت ہے، آپ کی اہلیہ کے لیے کوئی زیور ہوا دوں گا۔ ہے منظور؟ اب میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ

آپ کو جو خبر ملی ہے وہ غلط ہے، مگر یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اپنے سبھی بھائیوں کی طرح میں بھی اسامیوں سے جرمانہ لیتا ہوں اور سال میں دس پانچ ہزار روپے میرے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ اگر آپ میرے منہ سے یہ لقمہ چھیننا چاہیں گے تو آپ گھائے میں رہیں گے۔ آپ بھی دنیا میں آرام سے رہنا چاہتے ہیں اور میں بھی رہنا چاہتا ہوں۔ اس سے کیا فائدہ کہ آپ انصاف اور فرض کا ڈھونگ کر کے مجھے زیر باز کریں اور خود بھی زیر بار ہوں۔ دل کی بات کہیں۔ میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔ آپ کے ساتھ کتنے ہی بار ایک چوکے میں، ایک میز پر کھا چکا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ تکلیف میں ہیں۔ آپ کی حالت میری حالت سے بھی بدتر ہے۔ ہاں اگر آپ نے ستیہ ہریش چندر بننے کی قسم کھالی ہے تو آپ کی خوشی۔ اب میں چلتا ہوں۔“

رائے صاحب کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اونکار ناتھ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مصالحتانہ انداز سے کہا۔ ”نہیں نہیں، ابھی آپ کو بیٹھنا پڑے گا۔ میں اپنی پوزیشن صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ نے میرے ساتھ جو سلوک کیے ہیں ان کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں۔ مگر یہاں اصول کی بات آگئی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اصول جان سے بھی زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔“

”رائے صاحب کرسی پر بیٹھ کر ذرا بیٹھے لہجے میں بولے۔“ اچھا ابھی جو چاہے لکھو۔ میں تمہارے اصولوں کو توڑنا نہیں چاہتا۔ اور تو کیا ہوگا بدنامی ہوگی۔ ہاں کہاں تک نام کے پیچھے مردوں؟ کون ایسا تعلقدار ہے جو آسامیوں کو تھوڑا بہت نہیں ستاتا؟ کتا ہڈی کی حفاظت کرے تو کھائے کیا؟ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آئندہ آپ کو اس طرح کی کوئی شکایت نہ ملے گی۔ اگر آپ کو مجھ پر یقین ہے تو اس دفعہ معاف کیجیے۔ کسی دوسرے ایڈیٹر سے میں ایسی خوشامد نہ کرتا۔ اسے سرے بازار پھوٹا۔ لیکن مجھ سے آپ کو دوستی ہے پس مجھے بننا ہی پڑے گا۔ یہ اخباروں کا زمانہ ہے۔ سرکار تک ان سے دہتی ہے، میری ہستی کیا؟ آپ جسے چاہیں بنادیں اور جسے چاہیں بگاڑیں۔ خیر یہ جھگڑا ختم کیجیے۔ کیسے آج کل اخبار کی کیا حالت ہے؟ کچھ گا کھ بڑھے؟“

اونکار ناتھ نے ناراضماندی سے کہا ”کسی نہ کسی طرح کام چلا جاتا ہے اور موجودہ حالت میں میں اس سے زیادہ امید نہیں رکھتا۔ میں اس طرف دولت اور آرام کی خواہش لے

کر نہیں آیا تھا۔ اس لیے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں پبلک کی خدمت کرنے آیا تھا اور حتیٰ الامکان کیے جاتا ہوں۔ ملک وقوم کا بھلا ہو، یہی میری خواہش ہے۔ ایک شخص کے دکھ سکھ کی کوئی قیمت نہیں۔“

رائے صاحب نے ذرا اور ملائم ہو کر کہا ”یہ سب ٹھیک ہے بھائی صاحب، لیکن خدمت کے لیے بھی جینا ضروری ہے۔ مالی افکار میں مبتلا ہوتے ہوئے آپ یکسوئی کے ساتھ خدمت بھی تو نہیں کر سکتے۔ کیا گاہکوں کی تعداد بالکل نہیں بڑھ رہی؟“

بات یہ ہے کہ میں اپنے اخبار کا معیار کم نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں بھی آج سنیما کے اشاروں کی تصاویر اور ان کی سوانح عمریاں چھاپے لگوں تو گاہک بڑھ سکتے ہیں۔ مگر اپنا تو یہ شعار نہیں۔ اور بھی کتنے ہی ایسے پھٹکنڈے ہیں جن سے اخبار کے ذریعے روپیہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن میں انہیں برا سمجھتا ہوں۔“

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج آپ کی اتنی عزت ہے۔ میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں، معلوم نہیں آپ اسے منظور کریں گے یا نہیں۔ آپ میری جانب سے سو آدمیوں کے نام مفت پرچہ جاری کر دیجیے اور قیمت میں دے دوں گا۔“

اونکار ناتھ نے ممنوعیت سے سر جھکا کر کہا ”میں شکریہ کے ساتھ آپ کا دان قبول کرتا ہوں۔ افسوس یہی ہے کہ اخباروں کی جانب سے لوگوں میں بڑی بے توجہی ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور مندروں کے لیے پیسے کی کمی نہیں ہے مگر آج تک ایک بھی ایسا سختی نہ نکلا جو اخباروں کی اشاعت کے لیے دان دیتا۔ حالانکہ تعلیمی مقصد جتنے کم خرچ میں اخباروں سے پورا ہو سکتا ہے اتنا اور کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جیسے تعلیم گاہوں کو مختلف انجمنوں سے امداد ملتی ہے اسی طرح اگر اخبار نویسوں کو بھی ملنے لگے تو ان غریبوں کو اپنا جتنا وقت اور جتنی جگہ اشتہاروں کی نذر کرنا پڑتی ہے وہ کیوں کرنا پڑے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔“

رائے صاحب رخصت ہو گئے۔ اونکار ناتھ کے چہرے پر خوشی کی جھلک نہ تھی۔ رائے صاحب نے کسی طرح کی شرط نہ کی تھی، کوئی بندش نہ لگائی تھی، مگر اونکار ناتھ آج اتنی بڑی نصیحت پا کر بھی اس امداد کو نامنظور نہ کر سکے۔ حالت ایسی تھی کہ انہیں نجات کی کوئی تدبیر ہی نہ سوجھ رہی تھی۔ پریس کے ملازموں کی تین مہینے کی تنخواہ باقی تھی۔ کانغڈ والے کو ایک ہزار سے زیادہ دینا تھا۔ یہی کیا کم تھا کہ انہیں ہاتھ نہیں پھیلا نا پڑا۔

ان کی اہلیہ گومتی نے آکر خنگی سے کہا - ”کیا ابھی کھانے کا وقت نہیں آیا؟ یا یہ بھی کوئی قاعدہ ہے کہ جب تک ایک نہ بچ جائے جگہ سے نہ اٹھو۔ کب تک کوئی چولہا تاکتا رہے؟“

اونکار ناتھ نے غمگین آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ گومتی کی خنگی غائب ہو گئی۔ وہ ان کی مشکلات کو سمجھتی تھی۔ دوسری عورتوں کے زیور کپڑے کو دیکھ کر کبھی کبھی اس کے دل میں مخالفت کا جذبہ جاگ اٹھتا تھا اور وہ شوہر کو دوچار کھری کھوٹی سنا جاتی تھی۔ مگر اصل میں یہ غصہ ان پر نہیں بلکہ خود اپنی بد قسمتی پر تھا اور اس کی تھوڑی آنچ خواہ مخواہ اونکار ناتھ تک پہنچ ہی جاتی تھی۔ وہ ان کی ریاضت دیکھ کر دل میں کڑھتی بھی تھی۔ اور ان سے ہمدردی بھی رکھتی تھی۔ بس انھیں تھوڑا سا خبیثی سمجھتی تھی۔ ان کا اداس چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

”کیوں اداس ہو، پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے کیا؟“

اونکار ناتھ کو مسکراتا پڑا۔ ”کون اداس ہے؟ میں! مجھے تو آج جتنی خوشی ہے اتنی تو اپنے بیاہ کے دن بھی نہ ہوئی تھی۔ آج صبح صبح پندرہ سو کا سودا ہوا ہے، کسی اچھے کامیاب دیکھا تھا۔“

گومتی کو یقین نہ آیا بولی۔ ”جھوٹے ہو۔ تمہیں پندرہ سو کہاں ملے جاتے ہیں؟ ہاں پندرہ کہو تو مانے لیتی ہوں۔“

”نہیں، نہیں تمہاری سر کی قسم، پندرہ سو مارے، ابھی رائے صاحب آئے تھے، سو گاہوں کا چندہ اپنی طرف سے دینے کا وعدہ کر گئے ہیں۔“

گومتی کا چہرہ اتر گیا ”تو مل چکے!،“

”نہیں رائے صاحب وعدے کے پکے ہیں۔“

”میں نے کسی تعلقدار کو وعدہ کا پکا دیکھا ہی نہیں۔ دادا ایک تعلقدار کے نوکر تھے۔ سال سال بھر تنخواہ نہ ملتی تھی۔ اسے چھوڑ کر دوسرے کی نوکری کی۔ اس نے دو سال تک ایک پائی نہ دی۔ ایک بار دادا گرم ہو پڑے تو مار بھگا دیا۔ ان کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں۔“

”میں آج ہی مل بھیجتا ہوں۔“

”بھجوا کر دو۔ کہہ دیں گے کہ کل آنا اپنے علاقے پر چلے جائیں گے اور تین مہینے میں لوٹیں گے۔“

اونکار ناتھ شک میں پڑ گئے۔ کہیں رائے صاحب بعد کو کمر گئے تو وہ کیا کر لیں گے؟ پھر بھی دل کڑا کر کے بولے ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم رائے صاحب کو میں ایسا دھوکے باز نہیں سمجھتا۔ میرا ان کے یہاں کچھ باقی نہیں ہے۔“

گومتی نے اسی مشکوک انداز سے کہا ”اسی سے تو میں تمہیں بدھو کہتی ہوں۔ ذرا کسی نے ہمدردی دکھائی اور تم پھول اٹھے۔ یہ مونٹے رئیس ہیں۔ ان کے پیٹ میں ایسے کتنے ہی وعدے ہضم ہو سکتے ہیں۔ جتنے وعدے کرتے ہیں اگر سب پورا کرنے لگیں تو بھیک مانگنے کی نوبت آجائے گی میرے گاؤں کے ٹھاکر صاحب تو دو دو تین تین سال تک بیویوں کا حساب نہ کرتے تھے۔ نوکروں کی تنخواہ تو برائے نام دیتے تھے۔ سال بھر کام لیا اور جب نوکروں نے تنخواہ مانگی تو مار کر نکال دیا۔ کئی بار اسی نادہندی میں ان کے لڑکوں کے نام اسکول سے کٹ گئے۔ آخر انھوں نے لڑکوں کو گھر بلالیا۔ ایک بار ریل کا ٹکٹ بھی ادھار مانگا تھا۔ یہ رائے صاحب بھی تو ان کے بھائی بند ہیں چلو کھانا کھاؤ اور چکی پیسو، جو تمہارے بھاگ میں لکھا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ یہ بڑے آدمی تمہیں پھنکارتے رہیں وہی اچھا ہے۔ یہ اگر تمہیں ایک پیسہ دیں گے تو اس کا چوگنا اپنے آسامیوں سے وصول کر لیں گے۔ ابھی ان کے بارے میں جو کچھ چاہتے ہو لکھتے ہو مگر تب تو ٹھکر سہاتی ہی کہنی پڑے گی۔“

پنڈت جی کھا رہے تھے مگر لقمہ منہ میں پھنسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آخر دل کا بوجھ ہلکا کیے بغیر کھانا مشکل ہو گیا۔ بولے ”اگر روپے نہ دیے تو ایسی خبر لوں گا کہ یاد کریں گے۔ ان کی چوٹی میرے ہاتھ میں ہے۔ گاؤں کے لوگ جھوٹی خبر نہیں دے سکتے سچی خبر دیتے تو ان کی جان نکلتی ہے، جھوٹی کیا دیں گے؟ رائے صاحب کے خلاف ایک رپورٹ میرے پاس آئی ہے۔ چھاپ دوں تو بچہ کو گھر سے نکلتا مشکل ہو جائے گا۔ مجھے وہ خیرات نہیں دے رہے ہیں، بڑے دباؤ میں پڑ کر اس راہ میں آئے ہیں۔ پہلے دھمکیاں دے رہے تھے، جب دیکھا کہ یوں کام نہ چلے گا تو یہ چارا پھینکا۔ میں نے بھی سوچا کہ ایک ان کے ٹھیک ہو جانے سے تو ملک سے ظلم مٹا جاتا نہیں تو پھر کیوں نہ اس دان کو قبول کر لوں؟ میں اپنے معیار سے گر گیا ہوں ضرور، لیکن اتنے پر بھی رائے صاحب نے دعا کی تو میں بھی شرارت پر اتر آؤں گا۔ جو غریبوں کو لوٹتا ہے اسے لونٹنے کے لیے اپنے ضمیر کو بہت سمجھانا بھجانا پڑے گا۔“

گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ رائے صاحب نے بچوں کو بلا کر خوب ڈانٹا اور ان لوگوں نے جتنے روپے وصول کیے تھے وہ سب ان کے پیٹ سے نکال لیے۔ وہ ان لوگوں کو جیل بھجوا رہے تھے لیکن ان لوگوں نے ہاتھ پاؤں جوڑے، تھوک کر چانا، تب جا کر چھٹکارا ملا۔ دھنیا کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا، گاؤں میں گھوم گھوم کر بچوں کو نادم کرتی پھرتی تھی ”آدمی نہ سنے مگر بیوں کی پکار، بھگوان تو سنتے ہیں۔ لوگوں نے سوچا تھا کہ ان سے ڈانٹر لے کر بچے سے پھلوریاں کھائیں گے پر بھگوان نے ایسا تمانچہ لگایا کہ پھلوریاں منہ سے باہر نکل پڑیں۔ ایک ایک کے دو دو بھرنے پڑے۔ اب چالو میرا گھر لے کر!“

مگر بیلوں کے بغیر کھیتی کیسے ہو؟ گاؤں میں بوائی شروع ہو گئی کاتک کے مینے میں کسان کے تیل مر جائیں تو ان کے دونوں ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔ ہوری کے دونوں ہاتھ کٹ گئے تھے۔ اور سب لوگوں کے کھیتوں میں بیل چل رہے تھے، بیج ڈالے جا رہے تھے، کہیں کہیں گیت کی تانیں سنائی دیتی تھیں مگر ہوری کے کھیت کسی بیکس عورت کے گھر کی طرح سونے پڑے تھے۔ پنیا کے پاس بھی گوتی تھی، سو بھا کے پاس بھی گوتی تھی۔ مگر انھیں اپنے کھیتوں کی بوائی سے فرصت کہاں کہ ہوری کے کھیت بوئیں؟ ہوری دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔ کہیں اس کے کھیت میں جا بیٹھتا کہیں اس کی بوائی کرا دیتا۔ اس طرح کچھ اناج مل جاتا۔ دھنیا، سونا، روپا، سبھی دوسروں کی بوائی میں لگی رہتی تھیں۔ جب تک بوائی رہی، پیٹ کی روٹیاں ملتی گئیں اور کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی۔ دماغی تکلیف تو ضرور ہوتی تھی مگر کھانے بھر کو مل جاتا تھا۔ رات کو روز میاں بیوی میں تھوڑی سی لڑائی ہو جاتی تھی۔

یہاں تک کے کاتک بیت گیا اور گاؤں میں مزدوری کا ملنا مشکل ہو گیا۔ اب سارا دار و مدار اکیہ پر تھا جو کھیتوں میں کھڑی تھی۔

رات کا وقت تھا، سردی خوب پڑ رہی تھی۔ ہوری کے گھر میں آج کچھ کھانے کو نہ تھا۔ دن کو تھوڑا سا بھنا ہوا مٹر مل گیا تھا مگر اس وقت چولہا جلنے کا کوئی ڈول نہ تھا۔ روپا

بھوک سے بے حال تھی اور دروازے پر الاؤ کے آگے بیٹھی رو رہی تھی مگر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ہے تو کیا مانگے کیا کہے؟

جب بھوک نہ برداشت ہوئی تو وہ آگ مانگنے کے بہانے پٹیا کے گھر گئی وہ باجرے کی روٹی اور بتھوے کا ساگ پکا رہی تھی۔ مہک سے روپا کے منہ میں پانی بھر آیا۔

”کیا ابھی تیرے گھر میں آگ نہیں جلی رہی؟“

روپا نے عاجزی سے کہا ”آج تو گھر میں کچھ تھا ہی نہیں کہاں سے آگ جلتی؟“

”تو پھر آگ کا ہے کو مانگنے آئی ہے؟“

”دادا تما کو بیٹیں گے۔“

پٹیا نے ایلے کی آگ اس کی طرف پھینک دی مگر روپا نے آگ اٹھائی نہیں اور پاس جا کر بولی ”تمھاری روٹیاں مہک رہی ہیں، کاکی! مجھے باجرے کی روٹیاں بڑی اچھی لگتی ہیں۔“

پٹیا نے مسکرا کر پوچھا ”کھائے گی؟“

”اماں ڈانٹیں گی۔“

”اماں سے کون کہنے جائے گا؟“

روپا نے پیٹ بھر روٹیاں کھائیں اور جوٹھے منہ بھاگی ہوئی گھر چلی گئی۔

ہوری اداس بیٹھا تھا کہ پنڈت داتا دین نے آکر پکارا۔ ہوری کا سینہ دھڑکنے لگا۔ کیا کوئی نئی مصیبت آنے والی ہے؟ آکر ان کے پیر چھوئے اور الاؤ کے سامنے ان کے لیے مہاچی رکھ دی۔

داتا دین نے بیٹھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا ”اب کی تو تمھارے کھیت پرتی پڑ گئے ہوری۔ تم نے گاؤں میں کسی سے کچھ کہا ہی نہیں نہیں تو بھولا کی مجال تھی کہ تمھارے دوارے سے تیل کھول لے جاتا۔ یہیں لوتھ گر جاتی۔ میں تم سے جیو ہاتھ میں لے کر کہتا ہوں ہوری، کہ میں نے تمھارے اوپر ڈانٹر نہ لگایا تھا۔ دھنیا مجھے ناکھ بدنام کرتی پھرتی ہے۔ یہ سب پیشوری لالہ اور جھنگری سنگھ کی کارستانی ہے۔ میں تو لوگوں کے کہنے سے چنچیت میں بیٹھ بھر گیا تھا۔ وہ لوگ تو اور کڑا ڈانٹر لگا رہے تھے، میں نے کہہ سن کر کم کرایا۔ مگر اب سب لوگ سر پر ہاتھ دھرے رو رہے ہیں۔ سمجھتے تھے کہ یہاں ان ہی کا راج ہے۔ یہ نہ جانتے تھے

کہ گاؤں کا راجا کوئی اور ہے۔ تو اب اپنے کھیتوں کی بوائی کا کیا بندوبست کر رہے ہو؟“
 ہوری نے رندھے گلے سے کہا۔ ”کیا بتاؤں مہراج! پرتی رہیں گے۔“
 ”پرتی رہیں گے! یہ تو بڑا اڑتھ ہوگا۔“
 ”بھگوان کی یہی مرضی ہے تو اپنا کیا بس؟“

”میرے ہوتے تمہارے کھیت کیسے پرتی رہیں گے۔ کل میں تمہاری بوائی کرا دوں گا! ابھی کھیتوں میں کچھ تری ہے۔ آج دس دن پیچھے ہوگی، اس کے سوا اور کوئی بات نہیں۔ تمہارا ہمارا آدھا سا جہا رہے گا۔ اس میں نہ قصیں کوئی گھانا ہے نہ ہمیں۔ میں نے آج بیٹھے بیٹھے سوچا تو جی بڑا دکھی ہوا کہ مجھے بجائے کھیت پرتی پڑے جاتے ہیں۔“
 ہوری سوچ میں پڑ گیا۔ ”چوسا بھران کھیتوں میں کھاد ڈالی، جوتا اور آج صرف بوائی کے لیے آدھی فصل دینی پڑ رہی ہے۔ اس پر احسان کیسا جتا رہے ہیں۔ مگر اس سے تو اچھا ہی ہے کہ کھیت پرتی پڑ جائیں اور کچھ نہ ملے گا تو لگان تو نکل ہی آئے گا۔ نہیں اب کے ادا نہ ہوا تو بید کھلی آئی دھری ہے۔“
 اس نے یہ تجویز منظور کر لی۔

داتا دین خوش ہو کر بولے ”تو چلو، میں ابھی بیچ تول دوں جس میں سیرے کا منجھٹ نہ رہے۔ روٹی تو کھالی ہے نا؟“
 ہوری نے جلاتے ہوئے آج گھر میں چولہا نہ جلنے کی بات کہی۔

داتا دین نے بیٹھے الہنے کے انداز سے کہا ”ارے تمہارے گھر میں چولہا نہیں جلا تو تم نے مجھ سے کہا بھی نہیں! ہم تمہارے ہیری تو نہیں تھے۔ اسی بات پر تم سے میرا جی کڑھتا ہے۔ ارے بھلے آدمی، اس میں لاج سرم کی کون سی بات ہے؟ ہم سب ایک ہی تو ہیں۔ تم شور ہوئے تو کیا۔ ہم براہمن ہوئے تو کیا، ہیں تو سب ایک ہی گھر کے۔ دن سب کے برابر نہیں جاتے۔ کون جانے کل میرے ہی اوپر کوئی سنگٹ آپڑے تو میں تم سے اپنا دکھ نہ کہوں گا تو کس سے کہوں گا؟ اچھا جو ہوا سو ہوا، چلو بوائی کے اتاج کے ساتھ قصیں من دو من کھانے کو بھی تول دوں گا۔“

آدھے گھنٹے میں ہوری من بھر جو کا ٹوکرا سر پر رکھے آیا اور گھر کی چکی چلنے لگی۔ دھنیا روتی تھی اور سونا کے ساتھ پیستی تھی۔ بھگوان اسے کس پاپ کا یہ ڈنڈ دے رہے ہیں۔

دوسرے دن بوائی شروع ہوئی۔ ہوری کا سارا کنبہ اس طرح کام میں لگا ہوا تھا جیسے سب کچھ اپنا ہی ہے۔ کئی دن کے بعد سچائی بھی اسی طرح ہوئی وانا دین کو مفت کے مزدور مل گئے۔ اب کبھی کبھی ان کا لڑکا ماتا دین بھی گھر میں آنے لگا۔ جوان آدمی تھا، بڑا عیاش اور بات چیت کا میٹھا۔ وانا دین جو کچھ چھین جھپٹ کر لاتے تھے وہ اسے بھنگ بوٹی میں اڑاتا تھا۔ ایک چماری سے اس کی آشنائی ہو گئی تھی اس لیے ابھی تک بیاہ نہ ہوا تھا۔ وہ رہتی الگ تھی مگر سارا گاؤں یہ بھید جانتے ہوئے بھی کچھ بول نہ سکتا تھا۔ ہمارا دھرم ہے کھانا۔ کھانا پاک رہے پھر ہمارے دھرم پر کوئی آج نہیں آسکتی۔ روٹیاں ڈھال بن کر بے دھرمی سے ہمیں بچاتی ہیں۔

اب ساجھے کی کھیتی ہونے سے ماتا دین کو چھینا سے گفتگو کرنے کا موقع ملنے لگا۔ وہ ایسے وقت آتا جب گھر میں چھینا کے سوا اور کوئی نہ ہوتا، کبھی کسی بہانے سے، کبھی کسی بہانے سے۔ چھینا ٹکلیل نہ تھی لیکن جوان تھی اور اس کی چماری سے بہتر تھی۔ کچھ دن شہر میں رہ چکی تھی۔ پہننا اور اوڑھنا، بول چال، وغیرہ سے واقف تھی۔ اور حیا دار بھی تھی۔ جو عورت میں سب سے زیادہ کشش کی چیز ہے۔ ماتا دین کبھی کبھی اس کے بچے کو گود میں اٹھا لیتا اور پیار کرتا۔ چھینا خوش ہو جاتی تھی۔

ایک دن اس نے چھینا سے کہا ”تم کیا دیکھ کر گوبر کے ساتھ آئیں، جھوٹا؟“
چھینا نے لجاتے ہوئے کہا۔ ”بھاگ کھینچ لایا مہراج، اور کیا کہوں؟“
ماتا دین نے افسوس سے کہا ”بڑا بیوقوف آدمی ہے تم جیسی بچی کو چھوڑ کر نہ جانے کہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔ منچلا آدمی ہے اس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ کہیں اور نہ پھنس گیا ہو۔ ایسے آدمیوں کو تو گولی مار دینی چاہیے آدمی کا دھرم ہے کہ جس کی ہانہ پکڑے اسے نباہے۔ یہ کیا کہ ایک آدمی کی جنگی بگاڑ دی اور آپ دوسرا گھر جھانکنے لگے۔“
عورت رونے لگی۔ ماتا دین نے ادھر ادھر تاک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سمجھانے لگا۔

”تم اس کی کیوں پروا کرتی ہو، جھوٹا! چلا گیا تو چلا جانے دو۔ تمہارے لیے کس بات کی کمی ہے؟ روپیہ پیسہ، گہنا کپڑا؟ جو چاہو مجھ سے لو۔“

چھینا نے آہستہ سے ہاتھ چھڑا لیا اور پیچھے ہٹ کر بولی ”سب تمہاری دیا ہے مہراج! میں تو کہیں کی نہ رہی۔ گھر سے بھی گئی اور یہاں سے بھی گئی۔ نہ مایا ملی نہ رام ہی ملے۔ دنیا

کا رنگ ڈھنگ نہ جانتی تھی۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں سن کر جال میں پھنس گئی۔“
 ماتادین نے گوبر کی برائی کرنی شروع کی ”وہ تو پورا لہجنگا ہے، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا!
 جب دیکھو، ماں باپ سے لڑائی۔ کہیں پیسہ پا جائے تو فوراً جوا کھیل ڈالے گا۔ جس اور
 گانجے میں اس کی جان بستی تھی۔ سہدوں لہجوں کے ساتھ گھومنا، بہو، بیٹیوں کو پھینرنا، یہی
 اس کا کام تھا۔ تھانیدار صاحب بد معاشی میں اس کا چالان کرنے والے تھے، ہم لوگوں نے
 بڑی ہفتی کی جب جا کر چھوڑا۔ دوسروں کے کھیت کھلیان سے اناج اڑا لیا کرتا تھا۔ وہ کئی بار
 پکڑا گیا مگر گاؤں گھر کا سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔“

سونا نے باہر سے آکر کہا۔ ”بھابھی، اماں نے کہا ہے کہ اناج نکال کر دھوپ میں ڈال
 دو، نہیں تو چوکر بہت لٹکے گا۔ پنڈت نے جیسے بگھار میں پانی ڈال دیا ہو۔“
 ماتادین نے اپنی صفائی دی ”معلوم ہوتا ہے کہ تیرے گھر میں برسات نہیں ہوئی۔
 چوہائے میں لکڑی تک گیلی ہو جاتی ہے، اناج تو اناج ہی ہے۔“
 یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔ سونا نے آکر اس کا کھیل بگاڑ دیا۔
 سونا نے جھنڈیا سے پوچھا ”ماتادین کیا کرنے آئے تھے؟“
 جھنڈیا نے ماتھا سیڑ کر کہا ”پگھنی مانگ رہے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ یہاں
 نہیں ہے۔“

”یہ سب بھانہ ہے۔ بڑا برا آدمی ہے۔“
 ”مجھے تو بڑا بھلا آدمی لگتا ہے۔ کیا برائی ہے اس میں؟“
 ”تم نہیں جانتیں۔ سلیا چمارن کو رکھے ہے۔“
 ”تو اسی سے برا آدمی ہو گیا؟“
 ”اور کا ہے سے آدمی برا کہا جاتا ہے؟“
 ”تمہارے بھیا بھی تو مجھے لائے ہیں۔ وہ بھی برے آدمی ہیں؟“
 سونا نے اس کا جواب نہ دے کر کہا ”میرے گھر میں پھر کبھی آئے گا تو
 دنگار دوں گی۔“

”اور جو اس نے تمہارا بیاہ ہو جائے؟“
 سونا شرما گئی ”تم تو بھابھی گالی دیتی ہو۔“

”کیوں اس میں گالی کی کیا بات ہے؟“

”مجھ سے بولے تو منہ مجلس دوں۔“

”تو کیا تمہارا بیاہ کسی دیوتا سے ہوگا؟ گاؤں میں ایسا سندر سمیلا جوان دوسرا

کون سا ہے؟“

”تو تم چلی جاؤ اس کے ساتھ، سلیا سے لاکھ در بے اچھی ہو۔“

”میں کیوں چلی جاؤں؟ میں تو ایک کے ساتھ چلی آئی، چاہے وہ اچھا ہو یا برا۔“

”تو میں بھی جس کے ساتھ بیاہ ہوگا اس کے ساتھ چلی جاؤں گی، اچھا ہو یا برا۔“

”اور جو کسی بوڑھے کے ساتھ بیاہ ہو گیا؟“

سونا ہنسی ”میں اس کے لیے نرم نرم روٹیاں بناؤں گی، اس کی دوائیاں کوٹوں چھانوں

گی، اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤں گی اور جب مرجائے گا تو منہ ڈھانک کر روؤں گی۔“

”اور جو کسی جوان کے ساتھ ہو؟“

”جب تمہارا سر، ہاں نہیں تو!،،

”اچھا بتاؤ تمہیں بوڑھا اچھا لگتا ہے کہ جوان؟“

”جو اپنے کو چاہے وہی جوان ہے، جو نہ چاہے وہی بوڑھا ہے۔“

”بھگوان کرے کہ تمہارا بیاہ کسی بوڑھے سے ہو جائے تو دیکھوں کہ تم اسے کیسے چاہتی

ہو۔ تب تو مناؤ گی کہ یہ گھوڑا کسی طرح مرجائے تو کسی جوان کو لے کر بیٹھ جاؤں۔“

”مجھے تو اس بوڑھے پر دیا آوے۔“

اس سال ادھر شکر کا ایک مل کھل گیا تھا۔ اس کے کارندے اور دلال گاؤں گاؤں گھوم

کر کسانوں کی کھڑی ایکھ مول لیتے تھے۔ یہ وہی مل تھا جسے مسٹر کھنانے کھولا تھا۔ ایک دن

کارندہ اس گاؤں میں بھی آیا۔ کسانوں نے جو اس سے مول تول کیا تو معلوم ہوا کہ گڑ بنانے

میں کوئی بچت نہیں ہے۔ جب گھر میں ایکھ پتل کر بھی یہی دام بچتے ہیں، تو پتلے کی زحمت

کیوں اٹھائی جائے۔ سارا گاؤں کھڑی ایکھ بیچنے کو تیار ہو گیا۔ اگر کچھ کم ہی ملے تو پر دواہ

نہیں، فوراً تو ملے گا۔ کسی کو پتل لینا تھا، کسی کو لگان دینا تھا، اور کوئی مہاجن سے گلا چھڑانا

چاہتا تھا۔ ہوری کو پتل لینے تھے۔ اب کے ایکھ کی پیداوار اچھی نہ تھی، پس یہ بھی اندیشہ تھا

کہ مال نہ پڑے گا۔ اور جب گڑ کے بھاؤ مل کی چینی ملے گی تو گڑ لے ہی گا کون؟ سبھی نے

بیجانے لے لیے۔ ہوری کو لم از م ایک سو روپے کی امید تھی۔ اسنے میں ایک معمولی جوڑا آجائے گی۔ لیکن مہاجنوں کو کیا کرے؟ داتا دین، منگرو، دلاری، جھنگری سنگھ، سبھی تو جان کھارے تھے۔ اگر مہاجنوں کو دینے لگے تو سو روپے سود بھر کو بھی نہ ہوں گے۔ کوئی ایسی حکمت نہ سوچتی تھی کہ اکیہ کے روپے آجائیں اور کسی کو خبر نہ ہو۔ جب بیل گھر آجائیں گے تب کوئی کیا کرے گا؟ گاڑی تلے گی تو سارا گاؤں دیکھے ہی گا۔ تول پر جو روپے ملیں گے وہ سب کو معلوم ہی ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ منگرو اور داتا دین ہمارے ساتھ ساتھ رہیں۔ ادھر روپے ملے اور ادھر انھوں نے گردن دہائی۔

شام کو گردھر نے پوچھا ”تمھاری اوکھ کب تک جائے گی، ہوری کا کا؟“ ہوری نے جھانسنہ دیا۔ ”ابھی تک تو کچھ ٹھیک نہیں ہے بھائی تم کب تک لے جاؤ گے؟“

گردھر نے بھی جھانسنہ دیا ”ابھی تو میرا بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے، کا کا!“

اور لوگ بھی اسی طرح باتیں کرتے تھے، کسی کو کسی پر اعتبار نہ تھا۔ جھنگری سنگھ کے سبھی قرض دار تھے اور سب یہی چاہتے تھے کہ اس کے ہاتھ روپے نہ جانے پائیں ورنہ وہ سب کا سب ہضم کر جائے گا۔ اور جب دوسرے دن اسامی پھر روپیہ مانگنے جائے گا تو نیا کاغذ، نیا نذرانہ اور نئی تحریر!

دوسرے دن سو بھا آکر بولا ”دادا کوئی ایسی تدبیر کرو کہ جھنگری کو مری آجائے۔ ایسا گرے کہ پھر نہ اٹھے۔“

ہوری نے مسکرا کر کہا۔ ”کیوں، اس کے بال بچے نہیں ہیں؟“

”اس کے بال بچوں کو دیکھیں کہ اپنے بال بچوں کو؟ وہ تو دو دو عورتوں کو آرام سے رکھتا ہے اور یہاں تو ایک ہی کو روکھی روٹی بھی نہیں ملتی۔ ساری جمع لے لے گا، ایک پیسہ بھی گھر نہ لانے دے گا۔“

”میری تو حالت اور بھی بری ہے بھائی۔ اگر روپے ہاتھ سے نکل گئے تو مٹ جاؤں گا۔ کوئی کے پنا تو کام نہ چلے گا۔“

”ابھی تو دو تین دن اوکھ ڈھوتے لگیں گے۔ جیوں ہی ساری اوکھ پہنچ جائے، جعدار سے کہیں کہ بھیا کچھ لے لے مگر اوکھ جھٹ پٹ تول لے دام پیچھے دینا۔ ادھر جھنگری سے کہہ دیں گے کہ ابھی روپے نہیں ملے۔“

ہوری نے سوچ کر کہا ”جھنگری ہم سے تم سے کئی گنا چالاک ہے سو بھا۔ جا کر منیم سے ملے گا اور اسی سے روپے لے لے گا۔ ہم تم تاکتے ہی رہ جائیں گے۔ جن کھنا بابو کا مل ہے ان ہی کی مہاجنی کوٹھی بھی ہے۔ دونوں ایک ہیں۔“

سو بھا نراس ہو کر بولا ”نہ جانے ان مہاجنوں سے کبھی پنڈ چھوٹے گا کہ نہیں؟“
ہوری بولا ”اس جنم میں تو کوئی آس نہیں ہے بھائی! ہم راج پاٹ، سکھ چین، نہیں چاہتے؟ ہاں جھوٹا موٹا پہننا اور موٹا جھوٹا کھانا اور مر جاد کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی نہیں ہوتا۔“

سو بھانے شیطیت سے کہا ”میں تو دادا ان سبوں کو چمکا دوں گا۔ جعدار کو کچھ دے دلا کر اس بات پر راضی کر لوں گا کہ روپے کے لیے ہمیں خوب دوڑائیں جھنگری کہاں تک دوڑیں گے؟“

ہوری نے ہنس کر کہا ”یہ سب کچھ نہ ہوگا بھیا۔ کسل اسی میں ہے جھنگری سنگھ کے ہاتھ پاؤں جوڑو۔ ہم جال میں پھنسے ہوئے ہیں، جتنا ہی پھڑ پھڑائیں گے اتنا ہی اور پھنستے جائیں گے۔“

”تم تو دادا، بوڑھوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ لکھڑے میں پھنسے بیٹھے رہنا تو مردی نہیں ہے۔ پھندا اور جکڑ جائے تو جکڑ جانے پر گلا چھڑانے کے لیے بل تو لگاتا ہی پڑے گا۔ یہی تو ہوگا کہ جھنگری گھر دواریلا کرائیں گے، کرائیں نیلام! میں تو چاہتا ہوں کہ ہمیں کوئی روپیہ نہ دے، ہمیں بھوکوں مرنے دے، لاتیں کھانے دے، ایک پیسہ بھی ادھار نہ دے تو بیاج کہاں سے پاویں؟ ایک ہمارے اوپر دعویٰ کرتا ہے تو دوسرا ہمیں کچھ کم بیاج پر روپیہ دے کر اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔ میں تو اسی دن روپیہ لینے جاؤں گا جس دن جھنگری کہیں چلا گیا ہوگا۔“

ہوری کا دل بھی پھر گیا، بولا یہ ٹھیک ہے۔“
”اوکھ تلوادیں گے، پھر روپیہ اپنی گھات دیکھ کر لائیں گے۔“
”بس بس، یہی چال چلو۔“

دوسرے دن بڑے سویرے گاؤں کے کئی آدمیوں نے اکیہ کا ثنا شروع کیا، ہوری بھی اپنے کھیت میں گنڈا سے لے کر پہنچا۔ ادھر سے سو بھا بھی اس کی مدد کو آگیا۔ پٹیا، دھنیا،

جھپٹا، سوتا، کبھی کھیت میں پہنچ گئیں۔ کوئی اکھ کاٹتا تھا، کوئی چھیلتا تھا، کوئی گٹھے باندھتا تھا۔ مہاجنوں نے جو اکھ کھلتے دیکھا تو پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ ایک طرف سے دلاری دوڑی، دوسری طرف سے منگرو ساہ، تیسری طرف سے دامادین اور پیشوری اور جھنگری کے پیادے۔ دلاری ہاتھ میں موٹے موٹے چاندی کے کڑے پہنے، کانوں میں سونے کے جھوکے ڈالے، آنکھوں میں کاجل لگائے، بوڑھے شباب کو رنگے اور سنوارے ہوئے آکر بولی ”پہلے میرے روپے دو پھر اوکھ کاٹنے دوں گی۔ میں جتنا ہی گم کھاتی ہوں اتنا ہی تم سیر ہو جاتے ہو۔ دو سال سے ایک دھیلا بیاج نہیں دیا۔ پچاس تو میرے بیاج ہی کے ہوتے ہیں۔“

ہوری نے کھکھیا کر کہا ”بھابھی اوکھ کاٹ لینے دو، اس کے روپے ملتے ہیں تو جتنا ہو سکے تمہیں بھی دوں گا۔ نہ گاؤں چھوڑ کر بھاگا جاتا ہوں، نہ اتنی جلدی مرا جاتا ہوں۔ کھیت میں کھڑی کھڑی تو اوکھ روپے نہ دے گی۔“

دلاری نے اس کے ہاتھ سے گنڈاسہ چھین کر کہا ”نیت اتنی کھوٹی ہے تم لوگوں کی تبھی تو برکت نہیں ہوتی۔“

آج پانچ سال ہوئے ”ہوری نے دلاری سے تیس روپے لیے تھے۔ تین سال میں تیس کے سو ہو گئے۔ اس وقت اسٹامپ لکھا گیا۔ دو سال میں اس پر پچاس روپے سود چڑھ گیا تھا۔

ہوری بولا۔ ”سیٹھانی، نیت تو کبھی نہیں بگاڑی، اگر بھگوان چاہیں گے تو ایک ایک پائی چکا دوں گا۔ ہاں آج کل تنگ ہو گیا ہوں، جو چاہے کہہ لو۔“

سیٹھانی کو جاتے دیر نہ ہوئی تھی کہ منگرو ساہ آ پہنچے۔ سیاہ رنگ تو ند کر کے نیچے لٹکتی ہوئی۔ دو بڑے بڑے دانت سامنے جیسے کاٹ کھانے کو نکلے ہوئے، سر پر ٹوپی، گلے میں چادر، عمرا بھی پچاس سے زیادہ نہیں مگر لاشی کے سہارے چلتے تھے۔ گھٹیا کا عارضہ تھا۔ کھانسی بھی آتی تھی۔ لاشی ٹیک کر کھڑے ہو گئے اور ہوری کو ڈانٹ بتائی ”پہلے ہمارے روپے دے دو ہوری، تب اوکھ کاٹو۔ ہم نے روپے ادھار دیے تھے، دان نہیں دیا تھا۔ تین تین سال ہو گئے نہ سود نہ بیاج۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تم میرے روپے جہم کر جاؤ گے میں تمہارے مردے سے بھی وصول کر لوں گا۔“

سوبھا مسخرا تھا بولا ”تب کاہے کو گھبراتے ہو ساہ جی ؟ ان کے مردے سے وصول کر لینا۔ نہیں ایک دو سال کے آگے پیچھے دونوں ہی سرگ میں پہنچو گے تب وہیں بھگوان کے آگے اپنا حساب چکا لینا۔“

منگرو نے سوبھا کو بہت برا بھلا کہا ’جمع مار ، بے ایمان ، وغیرہ۔“ لینے کی بھر تو دم ہلاتے ہو اور جب دینے کی باری آتی ہے تو ٹراتے ہو۔ مگر بکوالوں کا، نبل بدھئے نیلام کرا لوں گا۔“

سوبھا نے پھر چھیڑا ”اچھا ایمان سے بناؤ ساہ جی‘ کتنے روپے دیے تھے جس کے اب تین سو ہو گئے ہیں؟“

”جب تم سال کا سال سو نہ دو گے تو آپ ہی بڑھیں گے۔“

”پہلے پہل کتنے روپے دیے تھے تم نے ؟ پچاس ہی تو؟“

”کتنے دن ہوئے یہ بھی تو دیکھ۔“

”پانچ چھ سال ہوئے ہوں گے۔“

”دس سال ہو گئے پورے ! گیارہواں جا رہا ہے۔“

”پچاس روپے سے تین سو لیتے ہو، تمہیں تنگ بھی سرم نہیں آتی ؟،،

”سرم کیسی ؟ روپے دیے ہیں کہ کھیرات مانگتے ہیں۔“

ہوری نے انہیں بھی منت ساجت کر کے رخصت کیا۔ داتا دین نے ہوری کی شرکت میں کھیتی کی تھی۔ بیج دے کر آدمی فصل لے لیں گے۔ اس وقت کچھ چھیڑ چھاڑ کرنا مصلحت کے خلاف تھا۔ جھنگری سنگھ نے مل کر مینجر سے پہلے ہی سب کچھ کہہ سن رکھا تھا۔ ان کے پیادے گاڑیوں پر اوکھ لدوا کر ناؤ پر پہنچا رہے تھے۔ ندی ناؤ سے نصف میل پر تھی۔ ایک گاڑی دن بھر میں سات آٹھ چکر کر لیتی تھی اور ناؤ ایک کھیوے میں پچاس گاڑیوں کا بوجھ لاد دیتی تھی۔ اس طرح بڑی کفایت ہوتی تھی۔ اس سہولت کا بندوبست کر کے جھنگری سنگھ نے سارے علاقے کو اپنا ممنون بنا لیا تھا۔

تول شروع ہوتے ہی جھنگری نے مل کے چھانک پر آسن جمالیا۔ ہر ایک کی اکھ تولا تے تھے، قیمت کا پرزہ لیتے تھے، خزانچی سے روپے وصول کرتے تھے اور اپنی یافتنی کاٹ کر اسامی کو دے دیتے تھے۔ اسامی کتنا ہی روئے، چھپے، مگر وہ کسی کی نہ سنتے تھے۔ مالک

کا یہی حکم تھا، ان کا کیا بس؟

ہوری کو ایک سو بیس روپے ملے۔ اس میں سے جھنگری نے اپنے کل روپے مع سود کاٹ کر کوئی پچیس روپے ہوری کے حوالے کیے۔

ہوری نے روپے کی طرف بے غرضانہ انداز سے دیکھ کر کہا ”یہ لے کر میں کیا کروں گا خاکر؟ یہ بھی تم ہی لے لو۔ میرے لیے مجوری بہت ملے گی۔“

جھنگری نے پچیسویں روپے زمین پر پھینک کر کہا ”لو یا پھینک دو، تمہاری خوشی تمہارے کارن مالک کی گھڑیاں کھائیں اور ابھی رائے صاحب سر پر سوار ہیں کہ ڈنڈے کے روپے ادا کرو۔ تمہاری گرجی پر ترس کھا کر اتنے روپے دیے دیتا ہوں، نہیں ایک دھیلا بھی نہ دیتا۔ اگر رائے صاحب نے کڑائی کی تو اٹلے اور گھر سے دینے پڑیں گے۔“

ہوری نے چپکے سے روپے اٹھالے اور باہر نکلا کہ نوکے رام نے لکارا ہوری نے جا کر پچیسویں روپے ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے اور بلا کچھ کہے فوراً بھاگ گیا اس کا سر چکر رہا تھا۔

سو بھا کو بھی اتنے ہی روپے ملے تھے وہ باہر نکلا تو پیشوری نے آگھیرا۔

سو بھا بدل پڑا، بولا ”میرے پاس روپے نہیں ہیں، تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر لو۔“
پیشوری نے گرم ہو کر کہا ”اوکھ پٹی ہے کہ نہیں؟“

”ہاں پٹی ہے۔“

”تمہارا یہی وعدہ تو تھا کہ اوکھ بیچ کر روپیہ دوں گا؟“

”ہاں تھا تو۔“

”پھر کیوں نہیں دیتے؟“

”میرے پاس اب جو کچھ بچا ہے وہ بال بچوں کے لیے ہے۔“

پیشوری نے دھما کر کہا ”تم تو روپے دو گے سو بھا، ہاتھ جوڑ کر اور آج ہی۔ ابھی بتنا چاہو بہک لو۔ ایک رہٹ میں جاؤ گے چھ مہینے کو۔ ایک دن کم نہ زیادہ۔ یہ جو روج جوا کھیلے ہو، وہ ایک رہٹ میں نکل جائے گا۔ میں جمیندار یا مہاجن کا نوکر نہیں ہوں۔ میں سرکار بہادر کا نوکر ہوں، جس کا دنیا بھر میں راج ہے، اور جو تمہارے مہاجن جمیندار دونوں کا مالک ہے۔“

بیشوری لال آگے بڑھ گئے۔ سوہا اور ہوری کچھ دور چپ چاپ چلے گویا اس دمکی نے انہیں بدحواس کر دیا ہو۔ پھر ہوری نے کہا ”سوہا اس کے روپے دے دو سمجھ لو کہ ادھ میں آگ لگ گئی۔ میں نے بھی یہی سوچ کر جی کو سمجھا لیا ہے۔“

سوہا نے چوٹ کھائے ہوئے لہجہ سے کہا ”ہاں دے دوں گا دادا۔ نہ دوں گا تو جاؤں گا کہاں؟۔“

سامنے سے گردھر تازی پیچے ہوئے جھومتا چلا آتا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر بولا۔

”جھنگڑیا نے سب کا سب لے لیا، ہوری کا کاچینا کو بھی ایک پیسہ نہ چھوڑا ہتیارا کہیں کا! رویا؟ گزر گیا مگر اس پانی کو دیا نہ آئی۔“

سوہا نے کہا ”تازی تو پیچے ہوئے ہو، اس پر کہتے ہو کہ ایک پیسہ نہ چھوڑا۔“

گردھر نے پیٹ دکھا کر کہا ”سانجھ ہو گئی جو پانی کی بوند بھی گلے کے نیچے گئی ہو! ایک اکئی منہ میں دہالی تھی سو اسی کی تازی پی لی۔ سوچا کہ سال بھر پسینہ بہایا ہے تو ایک دن تازی تو پی لوں۔ مگر سچ کہتا ہوں کہ نہ نہیں ہے۔ ایک آنے میں نہ کیا ہوگا؟ ہاں جھوم رہا ہوں جس میں لوگ سمجھیں کہ بہت پیچے ہوئے ہے۔ بڑا اچھا ہوا کا کا، بیبا کی ہو گئی۔ بیس لیے تھے جس کے کچھ ایک سو ساٹھ بھرے، کچھ حد ہے!“

ہوری گھر پہنچا تو روپا پانی لے کر دوڑی، سونا چلم لائی، دھنیا نے چربن اور نمک لاکر رکھ دیا اور سبھی اسی بھری آنکھوں سے اس کی طرف تاکنے لگیں۔ جھینیا بھی چھوٹ پر آکھڑی ہوئی تھی۔ ہوری اداس بیٹھا تھا، کیسے منہ ہاتھ دھوئے؟ کیسے چربن چبائے؟ ایسا نام اور ملول تھا گویا خون کر کے آیا ہو۔ دھنیا نے پوچھا ”کتنے کی تول ہوئی؟“

”ایک سو بیس ملے۔ پر وہیں لٹ گئے۔ دھیلا بھی نہ بچا۔“

دھنیا سر سے ہیر تک جل گئی۔ دل میں ایسا اشتعال ہوا کہ اپنا منہ نوچ ڈالے بولی ”تم جیسا بدھو آدمی بھگوان نے کیوں بنایا؟ کہیں ملنے تو ان سے پوچھتی تمہارے ساتھ ساری جندگی مٹی ہو گئی۔ بھگوان موت بھی نہیں دیتے کہ اس خجال سے جی چھوٹے اٹھا کر سب روپے اپنے بہنوئیں کو دے دیے، اب اور کون آمدنی ہے جس سے گوئی آدے گی؟ ہل میں کیا مجھے جو تو گے یا آپ جو گے؟ میں کہتی ہو کہ تم بوڑھے ہوئے اور تمہیں اتنی اکل بھی نہ آئی کہ گوئی بھر گئے روپے نکال لیتے۔ کوئی تمہارے ہاتھ سے چھین تھوڑے ہی لیتا۔ پوس کی یہ

سردی ہے اور کسی کے تن پر لٹا نہیں ہے۔ لے جاؤ سب کو ندی میں ڈبا دو! رو رو کر مرنے سے تو ایک دن مرجانا اچھا ہے۔ کب تک پوال میں ٹھس کر رات کاٹیں گے؟ اور پوال میں ٹھس بھی رہیں تو پوال کھا کر رہا تو نہ جائے گا۔ تمہاری بچھا ہو گا اس ہی کھاؤ پر ہم سے گھاس نہ کھائی جائے گی۔“

یہ کہتے کہتے وہ مسکرا پڑی۔ اتنی دیر میں اس کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی تھی کہ مہاجن جب سر پر سوار ہو جائے اور اپنے ہاتھ میں روپے ہوں اور مہاجن جانتا ہو کہ اس کے پاس روپے ہیں تو اسی اپنی جان کیسے بچا سکتا ہے؟

ہوری سر جھکائے اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ دھنیا کا مسکراتا اسے نہ دکھائی دیا بولا ”مجوری تو ملے گی۔ مجوری کر کے کھائیں گے۔“

دھنیا نے پوچھا ”کہاں ہے اس گاؤں میں مجوری؟ اور کون منہ لے کر مجوری کر دے؟ مہتو نہیں کہلاتے!“

ہوری نے حقے کے کئی کش لگا کر کہا ”مجوری کرنا کوئی پاپ نہیں ہے۔ مجور بن جائے تو کسان ہو جاتا ہے اور کسان بگڑ جائے تو مجور ہو جاتا ہے۔ مجوری کرنا بدانا نہ ہوتا تو یہ سب بہت کیوں آتی؟ کیوں گائے مرقی؟ کیوں لڑکا ٹالا ایک نکل جاتا؟“

دھنیا نے بہو بیٹیوں کی طرف دیکھ کر کہا ”تم سب کی سب کیوں گھیرے کھڑی ہو جا کر اپنا کام دیکھو۔ وہ اور ہیں جو باہر سے آتے ہیں تو بال بچوں کے لیے دو چار پیسے کا کچھ لیے آتے ہیں۔ یہاں تو یہ لالچ لگ رہا ہو گا کہ روپیہ تزا دیں کیسے؟ ایک کم نہ ہو جائے گا! اسی سے ان کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی جو کھرچ کرتے ہیں انھیں ملتا ہے۔ جو نہ کھا سکیں، نہ پہن سکیں انھیں روپیہ ملے ہی کیوں؟ دھرتی میں گاڑنے کے لیے؟“

ہوری نے ہنس کر پوچھا ”کہاں ہے وہ گڑی ہوئی جمع؟“

”جہاں رکھی ہے وہیں ہوگی۔ رونا تو یہی ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی پیسے کے لیے مرتے ہو! چار پیسے کا کچھ لاکر بچوں کے ہاتھ پر رکھ دیتے تو پانی میں نہ پڑ جاتے۔ جھنگری سے تم کہہ دیتے کہ ایک روپیہ مجھے دے دو، نہیں تو میں تمہیں ایک پیسہ نہ دوں گا، جا کر عدالت میں لیتا، تو وہ جرور دیتا۔“

ہوری شرمندہ ہو گیا۔ اگر وہ جھلا کر بچیسوں روپے نو بکے رام کو نہ دے دیتا تو وہ کیا کر

لیتے؟ بہت ہوتا تو بتایا پر دو چار آنہ سود لے لیتے۔ مگر اب تو بھول ہو گئی۔
 حمید نے اندر جا کر سوتا سے کہا ”مجھے تو دادا پر بڑی دیا آتی ہے بے چارے دن بھر
 کے تھکے ماندے گھر آئے تو اماں کو سننے لگیں۔ مہاجن گھا دہائے تھا تو کیا کرتے؟“
 ”تو بتیل کہاں سے آویں گے؟“

”مہاجن اپنے روپے چاہتا ہے۔ اسے تمہارے گھر کے دکڑوں سے کیا مطلب؟“
 اماں وہاں ہوتیں تو مہاجن کو جا چکھا دیتیں۔ ابھا گا روکر رہ جاتا۔“
 حمید نے مذاق کیا ”تو یہاں روپیوں کی کون کی ہے؟ تم مہاجن سے تنگ نس کر
 بول دو پھر دیکھو کہ وہ سارے روپے چھوڑ دیتا ہے کہ نہیں۔ سچ کہتی ہوں کہ دادا کا سب دکھ
 درد دور ہو جائے۔“

سوتا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ دبا کر کہا ”بس چپ ہی رہنا، نہیں کہے دیتی
 ہوں۔ ابھی جا کر اماں سے مادین کی ساری بات کھول دوں تو رونے لگو۔“
 حمید نے پوچھا ”کیا کہہ دو گی اماں سے؟ کہنے کی کوئی بات بھی ہو۔ جب وہ کسی
 بہانے سے گھر میں آجاتے ہیں تو کیا کہہ دوں کہ نکل جاؤ؟ پھر مجھ سے کچھ لے تو نہیں
 جاتے، کچھ اپنا ہی دے جاتے ہیں۔ سوائے میٹھی میٹھی باتوں کے وہ حمید سے کچھ نہیں پاسکتے
 اور اپنی میٹھی باتوں کو مہنگے داموں بیچنا بھی مجھے آتا ہے۔ میں ایسی نادان نہیں ہوں کہ کسی
 کے جھاننے میں آجاؤں۔ ہاں جب جانوں گی کہ تمہارے بھیا نے وہاں کسی کو رکھ لیا ہے۔
 تب کی نہیں چلاتی۔ تب میرے اوپر کسی کا کوئی بندھن نہ رہے گا۔ ابھی تو مجھے بسواس ہے کہ
 وہ میرے ہیں اور میرے ہی کارن انہیں گلی گلی ٹھوکر کھانا پڑ رہا ہے۔ ہنسنے بولنے کی بات اور
 ہے، پر میں ان سے بسواس گھات نہ کروں گی۔ جو ایک سے دو کا ہوا وہ کسی کا نہیں رہتا۔“
 سو بھانے آکر ہو ری کو پکارا اور پیشوری کے روپے اس کے ہاتھ میں رکھ کر بولا ”بھیا
 تم جا کر یہ روپے لالا کو دے دو۔ مجھے اس گھڑی نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔“

ہوری روپے لے کر اٹھا ہی تھا کہ سنگھ کی آواز کانوں میں آئی۔ گاؤں کے دوسرے
 سرے پر دھیان سنگھ نامی ایک ٹھاکر رچے تھے۔ فوج میں لوکر تھے اور کئی دن ہوئے کہ دس
 سال بعد رخصت لے کر آئے تھے۔ بغداد، عدن، سنکا پور، برما، چاروں طرف گھوم چکے تھے۔
 اب بیاہ کرنے کی فکر تھی۔ اسی لیے پوجا پارٹ کر کے برہمنوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔

ہوری نے کہا ”معلوم ہوتا ہے کہ ساتوں ادھیائے پورے ہو گئے۔ آرتی ہو رہی ہے۔“

سو بھا بولا ”ہاں معلوم تو ہوتا ہے، چلو آرتی لے لیں۔“

ہوری نے متفکرانے لہجے میں کہا ”تم جاؤ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ دھیان سنگھ جس دن آئے تھے سب کے گھر سیر سیر بھر مٹھائی بانٹن میں بھیجی تھی۔ ہوری سے جب کبھی راستے میں مل جاتے تو خیر وعافیت پوچھتے۔ ان کی کتھا میں جا کر آرتی میں کچھ نہ دینا ذلت کی بات تھی۔

آرتی کا تھال ان ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ ان کے سامنے ہوری کیسے خالی ہاتھ آرتی لے گا۔ اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ وہ کتھا میں جائے ہی نہیں۔ اتنے آدمیوں میں انھیں کیا یاد آئے گی کہ ہوری نہیں آیا۔ کوئی رجسٹر لیے تو بیٹھا نہیں کہ کون آیا۔ وہ جا کر چار پائی پر لیٹ رہا۔

مگر وہ دل مسوس مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ تانے کا ایک پیسہ! آرتی کے پن اور مہاتم کا اسے بالکل دھیان نہ تھا۔ بات تھی صرف بیوہار کی۔ ٹھاکر جی کی آرتی ہو تو وہ صرف اپنی بھگتی کی بھینٹ دے سکتا تھا، مگر رواج کیسے توڑے؟ سب کی نگاہوں میں پوچھ کیسے بنے؟

دفعۃً وہ اٹھ بیٹھا۔ کیوں رواج کی غلامی کرے؟ رواج کے لیے آرتی کا پن کیوں چھوڑے؟ لوگ نہیں گے تو ہنس لیں؟ اسے پروا نہیں ہے۔ بھگوان اسے برے کاموں سے بچائے رکھیں، اور وہ کچھ نہیں چاہتا۔ وہ ٹھاکر کے گھر کی طرف چل پڑا۔

کھنا اور گوبندی میں نہیں بنتی۔ کیوں نہیں بنتی، یہ بتانا مشکل ہے۔ نجوم کے نقطہ خیال سے ان کے ستاروں میں کوئی مخالفت ہے، حالانکہ شادی کے وقت ان سب کی پوری مطابقت کر لی گئی تھی۔ لوک شاستر کے حساب سے اس ان بن کا کوئی اور بھید ہو سکتا ہے اور نفسیات والے کچھ اور ہی سبب کھوج سکتے ہیں۔ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان میں نہیں بنتی۔ کھنا دولت مند ہیں، حسن پرست ہیں، ملنسار ہیں، شکیل ہیں، خاصے پڑھے لکھے ہیں اور شہر کے خاص لوگوں میں ہیں۔ گوبندی حور نہ ہو مگر خوبصورت ضرور ہے۔ گندی رنگ، شرمیلی آنکھیں جو سامنے ایک بار اٹھ کر بھٹک جاتی ہیں، رخساروں پر سرخی نہ ہو مگر چمکا ہٹ ہے، نازک بدن، اعضا کا تناسب درست، گول گول بازو، چہرے پر ایک طرح کی بدمزگی جس میں کچھ غرور کی جھلک بھی ہے، گویا دنیا کے کاروبار کو ہیچ سمجھتی ہے۔ کھنا کے پاس عیش کے ظاہری سامانوں کی کمی نہیں۔ اعلیٰ درجے کا بنگلہ ہے، اعلیٰ درجے کا فرنیچر اعلیٰ درجے کا موٹر، اور بے انتہا دولت، مگر گوبندی کی نظر میں گویا ان اشیاء کی کوئی وقعت نہیں۔ اس کھارے سمندر میں وہ پیاسی پڑی رہتی ہے۔ بچوں کی پرورش و پر وخت اور گرتی کے چھوٹے موٹے کام ہی اس کے لیے سب کچھ ہیں۔ وہ ان میں اتنی منہمک رہتی ہے کہ عیش و عشرت کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ کشش کیا چیز ہے اور وہ کیسے پیدا ہو سکتی ہے اس پر اس نے کبھی غور نہیں کیا۔ وہ مرد کا کھلونا نہیں، نہ اس کی لطف آفرینی کی چیز ہے، پھر کیوں دلکش بننے کی کوشش کرے؟ اگر مرد اس کا اصلی حسن دیکھنے کے لیے آنکھیں نہیں رکھتا، حسیوں کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے تو یہ اس کی بد قسمتی ہے۔ وہ اسی محبت اور اسی لگن سے شوہر کی خدمت کیے جاتی ہے گویا نفرت اور رغبت کے جذبات کو مغلوب کر لیا ہو۔ اور یہ بے انتہا دولت تو جیسے اس کی روح کو کچلتی رہتی ہے، اور دہاتی رہتی ہے۔ اس نمود و نمائش سے چمکا رہا پانے کے لیے اس کا جی ہمیشہ للچایا کرتا ہے۔ اپنی سادہ اور قدرتی زندگی میں وہ کتنا خوش رہ سکتی تھی، اس کا وہ ہمیشہ خواب دیکھتی رہتی ہے۔ تب کیوں مالتی اس کی راہ میں آکر حائل ہو جاتی، کیوں طوائفوں

کے مجرے ہوتے ، کیوں یہ شک اور قنصع اور بے اطمینانی اس کی زندگی کے راستے میں کانٹا بننے ؟ بہت پہلے جب وہ بالکاوددیا لیلہ میں پڑھتی تھی ، اسے شاعری کا روگ لگ گیا تھا جس میں درد و غم ہی زندگی کا ماحصل ہے۔ دولت اور عشرت تو صرف اس لیے ہیں کہ ان کی ہولی جلائی جائے ، جو انسان کو لغویت اور پریشانی کی طرف لے جاتی ہیں ۔ وہ اب بھی کبھی کبھی شعر کہتی تھی مگر سنائے کسے ؟ اس کی نظم صرف دل کی لہر اور تخیل کی اڑان نہ تھی بلکہ اس کے ایک ایک لفظ میں اس کی زندگی کا درد اور اس کے آنسوؤں کی ٹھنڈی جلن بھری ہوتی تھی ۔ کسی ایسی جگہ جا بسنے کی خواہش تھی جہاں وہ ظاہر داریوں اور غیبتوں سے دور رہ کر اپنی پرسکون کٹی میں قدرتی مسرت کا لطف اٹھائے ۔ کھنا اس کے اشعار دیکھتے تو معجزہ اڑاتے اور کبھی کبھی پھاڑ کر پھینک بھی دیتے ۔ اور دولت کی یہ دیوار روز بروز بلند ہوتی جاتی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے سے دور اور جدا کرتی جاتی تھی ۔ کھنا اپنے گاہکوں کے ساتھ جتنا ہی بیٹھا اور نرم تھا گھر میں اتنا ہی تلخ اور سخت ۔ اکثر غصے میں گوبندی کو بری بات کہہ بیٹھتا ، خوش خلقی اس کے لیے صرف دنیا کو ٹھنکے کا ایک ذریعہ تھی ، انسانی سرشت نہیں ۔ ایسے موقعوں پر گوبندی اپنے سونے کے کمرے میں جا بیٹھتی اور رات کی رات رویا کرتی اور کھنا دیوان کھانے میں مجرا سنتا یا کلب میں جا کر شراب کی بوتلیں خالی کرتا ۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے پر بھی کھنا اس کے سب کچھ تھے ۔ وہ پامال اور ذلیل ہو کر بھی کھنا کی لونڈی تھی ۔ اس سے لڑے گی ، جلے گی ، روئے گی ، مگر رہے گی ان ہی کی ۔ اس سے جدا گانہ زندگی کا وہ کوئی خیال ہی نہ کر سکتی تھی ۔

آج مسٹر کھنا کسی برے کامند دیکھ کر اٹھے تھے ۔ سویرے ہی اخبار کھولا تو ان کے کئی اسٹاکوں کا نرخ گھٹ گیا تھا جس میں انھیں کئی ہزار کا نقصان ہوتا تھا ۔ شکر مل کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی اور فساد کرنے پر آمادہ تھے ۔ نفع کی امید پر چاندی خریدی تھی مگر اس کا بھاؤ آج اور بھی زیادہ گر گیا تھا ۔ رائے صاحب سے جو سودا ہو رہا تھا اور جس میں انھیں بڑے نفع کی امید تھی وہ کچھ دنوں کے لیے نلتا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ پھر رات کو زیادہ لپی جانے کے سبب اس وقت درد سر اور اعضا ٹھنکی کا غلبہ تھا ۔ ادھر شو فر نے موٹر کے انجن میں کچھ خرابی پیدا ہو جانے کی بات کہی تھی اور لاہور میں ان کے بینک پر ایک دیوانی مقدمہ دائر ہو جانے کی خبر بھی ملی تھی ۔ بیٹھے ہوئے دل میں جھنجھلا رہے تھے کہ اسی وقت گوبندی نے کہا ” ہمیشہ

کا بخار آج بھی نہیں اترا۔ کسی ڈاکٹر کو بلا لو۔“

بیمہ ان کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا اور پیدائشی کمزور ہونے کے سبب اسے روز ہی ایک نہ ایک شکایت رہا کرتی تھی۔ آج کھانسی ہے تو کل بخار، کبھی پھل پھل رہی ہے کبھی ہرے پیلے دست آرہے ہیں۔ دس مہینے کا ہو گیا تھا مگر لگتا تھا پانچ چھ مہینے ہی کا۔ کھانے سوچ لیا تھا کہ یہ لڑکا بچے کا نہیں۔ بس اس کی طرف سے بے پرواہ رہتے تھے مگر گوبندی اسی وجہ سے اس کو اور سب بچوں سے زیادہ چاہتی تھی۔

کھانا نے پدرانہ شفقت ظاہر کرتے ہوئے کہا ”بچوں کو دواؤں کا عادی بنا دینا ٹھیک نہیں اور تھیں دوا دیتے رہنے کا مرض ہے۔ ذرا کچھ ہوا اور ڈاکٹر بلاؤ۔ ایک روز اور دیکھو، آج تیسرا ہی دن تو ہے، شاید آج خود بخود اتر جائے۔“

گوبندی نے اصرار کیا ”تین دن سے نہیں اترا۔ خانگی دوائیں کر کے ہار گئی۔“
کھانا نے پوچھا ”اچھی بات ہے، بلائے دیتا ہوں کسے بلاؤں؟“
”بلاؤ ڈاکٹر ناگ کو۔“

”اچھی بات ہے ان ہی کو بلاتا ہوں، مگر یہ سمجھ لو کہ نام ہو جانے ہی سے کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں ہو جاتا۔ ناگ فیس خواہ کتنی ہی لے لیں مگر ان کی دوا سے کسی کو شفا پاتے نہیں دیکھا۔ وہ تو مریضوں کو جنت ہی بھیجنے کے لیے مشہور ہیں۔“

”تو جسے چاہو اسے بلا لو۔ میں نے ناگ کو اس لیے کہا تھا کہ وہ کئی بار آچکے ہیں۔“
”مس مالتی کو کیوں نہ بلاؤں؟ فیس بھی کم اور بچوں کا حال لیڈی ڈاکٹر جیسا سمجھے گی ویسا کوئی مرد ڈاکٹر نہیں سمجھ سکتا۔“

گوبندی نے جمل کر کہا ”میں مس مالتی کو ڈاکٹر نہیں سمجھتی۔“
کھانا نے تیز تیز دیکھتے ہوئے کہا ”تو وہ انگلستان گھاس کھودنے گئی تھیں اور آج ہزاروں آدمیوں کی جان بچا رہی ہیں یہ سب کچھ چیز نہیں ہے؟“

”ہوگا مجھے ان پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ مردوں کے دل کا علاج کر لیں اور کسی کی دوا ان کے پاس نہیں ہے۔“ بس ٹھن گئی۔ کھانا گرج اٹھا۔ گوبندی برس پڑی۔ ان کے درمیان مالتی کا نام آ جانا ہی گویا اعلان جنگ تھا۔

کھانا نے سارے کاغذات زمین پر پھینک کر کہا ”تمہارے ساتھ زندگی تلخ ہو گئی۔“

گوبندی نے جھپٹی ہوئی آواز میں کہا ” تو مالتی سے بیاہ کر لو نا ! ابھی کیا بگڑا ہے ، اگر وہاں دال گلے؟“
 ” تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟“

” یہی کے مالتی تم جیسوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے ، مالک بنا کر نہیں ۔“
 تمھاری نگاہ میں میں اتنا ذلیل ہوں !،،

اور انھوں نے اس کے خلاف ثبوت دینا شروع کیا ۔ مالتی جتنی ان کی عزت کرتی اتنی شاید ہی کسی کی کرتی ہو ۔ رائے صاحب اور راجا صاحب کو منہ تک نہ لگاتی ، مگر ان سے ایک دن بھی ملاقات نہ ہو تو شکایت کرتی ہے ۔.....

گوبندی نے ان ثبوتوں کو ایک پھونک میں اڑا دیا ” اسی لیے کہ وہ تمھیں سب سے زیادہ آنکھوں کا اندھا سمجھتی ہے ، دوسروں کو اتنی آسانی سے بیوقوف نہیں بنا سکتی ۔“
 کھنا نے ڈیگ ماری ۔ ” چاہوں تو آج مالتی سے بیاہ کر سکتا ہوں ۔ آج ، ابھی.....،،

مگر گوبندی کو بالکل یقین نہیں ہے ، تم سات جنم تک ناک رگڑو تو بھی وہ تم سے بیاہ نہ کرے گی ۔ تم اس کے ٹٹو ہو ، گھاس کھلائے گی ، کبھی کبھی تمھارا منہ سہلائے گی ، تمھارے پٹھوں پر ہاتھ پھیرے گی ، مگر اسی لیے کے تمھارے اوپر سواری کسے ۔ تم جیسے ایک ہزار احق اس کی جیب میں ہیں ۔“

گوبندی آج بہت بڑھی جاتی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج وہ ان سے لڑنے کو تیار ہو کر آئی ہے ۔ ڈاکٹر کو بلانے کا صرف ایک حیلہ تھا ۔ کھنا اپنی قابلیت ، اہلیت اور مردیت پر اتنا بڑا حملہ کیسے نہ سکتے تھے بولے ” تمھارے خیال میں میں احق اور نادان ہوں تو یہ ہزاروں کیوں میرے دروازے پر ناک رگڑتے ہیں ؟ کون راجا یا تعلقدار ہے جو مجھے سجدہ نہیں کرتا ۔ سیکڑوں کو اتو بنا کر چھوڑ دیا ۔“

” یہی تو مالتی کی خاصیت ہے کہ جو اور دل کو سیدھے استرے سے موٹتا ہے اسے وہ الٹے چھرے سے موٹتی ہے ۔“

” تم مالتی کی چاہے جتنی برائی کرو ، تم اس کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہو ۔“
 ” میری نظر میں تو وہ بیسواؤں سے گئی گزری ہے کیونکہ وہ پردے کی آڑ سے شکار کھیلتی

ہے ۔“

دونوں نے اپنے اپنے آتشیں تیر سر کیے۔ کھانے گوہندی کو کوئی دوسری سخت سے سخت بات کہی ہوتی تو اسے اتنی بری نہ لگتی، مگر مالٹی سے اس کا یہ نفرت انگیز مقابلہ اس کی برداشت کے باہر تھا۔ گوہندی نے بھی کھنا کو خواہ جو کچھ کہا ہوتا وہ اتنے گرم نہ ہوتے لیکن مالٹی کی یہ تحقیر وہ نہیں سہہ سکتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے کمزور مقامات سے واقف تھے۔ دونوں کے نشانے ٹھیک بیٹھے اور دونوں تڑپ اٹھے۔ کھانے کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ گوہندی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کھنا جوش میں اٹھے اور اس کے دونوں کان پکڑ کر زور سے مل دیے اور پھر تین چار طمانچے بھی لگا دیے۔ گوہندی روتی ہوئی اندر چلی گئی۔

ذرا دیر میں ڈاکٹر ناگ آئے اور سول سرجن مسٹر ڈاڈ آئے اور وید راج نیلکنٹھ شاستری آئے۔ مگر گوہندی اپنے بچے کو لیے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کس نے کیا کہا، کیا تنقید کی اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ جس مصیبت کا وہ خیال کر رہی تھی وہ آج اس پر آگئی۔ کھانے کو کیا آج اس سے نانا توڑ لیا، جیسے اسے گھر سے نکال کر دروازہ بند کر لیا۔ جو حسن کا بازار لگا کر بیٹھتی ہے، جس کا سایہ بھی وہ اپنے اوپر نہیں پڑنے دینا چاہتی، وہ..... وہ اس پر در پردہ حکومت کرے، یہ نہ ہوگا! کھانا اس کے شوہر ہیں، ان کو اسے سمجھانے بجھانے کا حق ہے، ان کی مار بھی وہ سہہ سکتی ہے مگر مالٹی کی حکومت ناممکن! لیکن بچے کا بخار جب تک اتر نہ جائے وہ ہل نہیں سکتی۔ خودداری کو بھی فرض کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔

دوسرے روز بچے کا بخار اتر گیا تھا۔ گوہندی نے ایک ٹانگہ منگوا اور گھر سے نکلی۔ جہاں اس کی اتنی بے عزتی ہو وہاں وہ اب نہیں رہ سکتی۔ صدمہ اتنا سخت تھا کہ بچوں کی محبت بھی دور ہو گئی تھی۔ ان کے متعلق اس کا جو فرض تھا اسے وہ پورا کر چکی ہے، باقی جو کچھ ہے وہ کھنا کا فرض ہے۔ ہاں گود کے بچے کو وہ کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ اس کی جان کے ساتھ ہے۔ اور وہ اس گھر سے صرف اپنی جان لے کر نکلے گی اور کوئی چیز اس کی نہیں ہے۔ انھیں یہ دعویٰ ہے کہ اس کی پرورش کرتے ہیں، گوہندی دکھا دے گی کہ ان کے آسرے سے الگ ہو کر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ تینوں بچے اس وقت کھیلنے گئے تھے۔ گوہندی کا جی چاہا کہ ایک مرتبہ انھیں پیار کر لے۔ مگر وہ کہیں بھاگی تو نہیں جاتی، بچوں کو اس سے محبت ہوگی تو اس کے پاس جائیں گے، اس کے گھر میں کھیلیں گے۔ جب وہ ضرورت سمجھے گی تو خود بچوں کو دیکھ جایا کرے گی۔ صرف کھنا کا سہارا نہیں لینا چاہتی۔

شام ہوگئی تھی۔ پارک میں خوب چہل پہل تھی۔ لوگ ہری گھاس پر لیٹے ہوئے ہوا خوری کا لطف اٹھا رہے تھے۔ گوبندی حضرت گنج سے ہوتی ہوئی چڑیا گھر کی طرف مڑی تھی کہ موٹر پر مالتی اور کھنا سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اسے معلوم ہوا کہ کھانے اس کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا اور مالتی مسکرائی۔ نہیں، شاید یہ اس کا وہم ہو۔ کھنا مالتی سے اس کی بھونہ کریں گے۔ مگر کتنی بے شرم ہے سنا ہے کہ اس کی اچھی پریکٹس ہے، گھر کی بھی مالدار ہے، پھر بھی یوں خود کو فروخت کرتی پھرتی ہے۔ نہ جانے کیوں بیاہ نہیں کر لیتی؟ مگر اس سے بیاہ کرے ہی گا کون؟ نہیں، یہ بات نہیں۔ مردوں میں ایسے بہت سے گدھے ہیں جو اسے پا کر خود کو خوش نصیب سمجھیں گے، لیکن مالتی خود تو کسی کو پسند کرے۔

اور بیاہ میں کون سا سکھ رکھا ہوا ہے؟ بہت اچھا کرتی ہے جو بیاہ نہیں کرتی۔ ابھی سب ان کے غلام ہیں تب وہ ایک کی لونڈی ہو کر رہ جائے گی۔ بہت اچھا کر رہی ہے۔ ابھی تو یہ حضرت بھی اس کے تلوے چاٹتے ہیں۔ شادی بعد معاملہ الٹا ہو جائے گا۔ اور سوسائٹی میں دو چار ایسی عورتیں بھی رہیں تو اچھا۔ مردوں کے کان تو گرم کرتی رہیں گی۔

آج گوبندی کے دل میں مالتی سے بڑی ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ مالتی پر حملہ کر کے اس کے ساتھ بڑی بے انصافی کر رہی ہے۔ کیا میری حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں نہ کھلتی ہوں گی؟ ازدواجی زندگی کی درگت اپنی آنکھوں دیکھ کر اگر وہ اس جال میں نہیں پھنستی تو کیا برا کرتی ہے؟

چڑیا گھر میں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گوبندی نے ٹانگہ روک دیا اور بچے کو لیے ہوئے ہری دوب کی طرف چلی۔ مگر دو ہی تین قدم چلی تھی کہ چپل پانی میں تر ہو گئے۔ ابھی ذرا دیر ہی پہلے لان سینچا گیا تھا اور گھاس کے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ بجلت میں اس نے پیچھے مڑ کر ایک قدم اور آگے رکھا تو پیر کیچڑ میں سن گئے۔ اس نے پیر کی طرف دیکھا۔ اب یہاں دھونے کا پانی کہاں ملے گا؟ اس کی ساری پریشانی کا فور ہوگئی اور پیر دھونے صاف کرنے کی نئی فکر پیدا ہوئی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ رک گیا۔ جب تک پیر نہ صاف ہو جائیں وہ کچھ سوچ نہیں سکتی۔

دفعتاً ایک لمبا پائپ گھاس میں چھپا نظر آیا جس میں سے پانی نکل رہا تھا۔ اس نے جا کر پیر دھوئے، ہاتھ منہ دھویا، تھوڑا سا پانی چلو میں لے کر پیا اور پائپ کے اس خشک

زمین پر جا بیٹھی۔ اواسی میں موت کی یاد فوراً آ جاتی ہے۔ کہیں وہ یہیں بیٹھے بیٹھے مر جائے تو کیا ہو؟ ٹانگہ والا فوراً جا کر کھنا کو خبر دے گا۔ کھنا سنتے ہی خوش ہو جائیں گے مگر دنیا کو دکھانے کے لیے آنکھوں پر رومال رکھ لیں گے۔ بچوں کے لیے کھلونے اور قماشے ماں سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہ ہے اس کی زندگی، جس کے لیے کوئی دو بوند آنسو بہانے والا بھی نہیں! پھر اسے وہ دن یاد آیا جب اس کی ساس زندہ تھی اور کھنا بدراہ نہ ہوئے تھے۔ اس وقت اسے ساس کا بات بات پر بگڑنا برا لگتا تھا۔ آج اسے ساس کی اس ففگی میں محبت کی مٹاس کھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت وہ ساس سے روٹھ جاتی تھی۔ اور ساس اسے دلار سے مناتی تھی۔ آج وہ مہینوں روٹھی پڑی رہے تو کسے پرواہ؟ یکا یک اس کا من اڑ کر ماں کے چہروں میں جا پہنچا۔ ہائے، آج اماں ہوتیں تو کیوں اس کی یہ درگت ہوتی؟ اس کے پاس اور کچھ نہ تھا تو ماں کی محبت بھری گود تو تھی، پیار بھرا آنچل تو تھا، جس میں منہ ڈال کر وہ رولیتی! لیکن نہیں، وہ روئے گی نہیں۔ اس دیوی کو سورگ میں دکھی نہ بنائے گی۔ میرے لیے وہ جو کچھ زیادہ سے زیادہ کر سکتی تھیں وہ کر گئیں، میرے نصیبے کا ساتھی ہونا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اور وہ کیوں روئے؟ وہ اب کسی کی ماتحت نہیں ہے، وہ اپنا گزر بسر کرنے کے لیے کما سکتی ہے وہ کل ہی گاندھی آشرم سے چیزیں لے کر بیچنا شروع کر دے گی۔ شرم کس بات کی؟ یہی تو ہوگا کہ لوگ انگلی اٹھا کر کہیں گے کہ وہ جارہی ہے کھنا کی بیوی! لیکن اس شہر میں رہوں کیوں؟ کسی دوسرے شہر میں کیوں نہ چلی جاؤں جہاں مجھے کوئی جانتا ہی نہ ہو؟ دس بیس روپے کما لینا ایسا کیا مشکل ہے۔ اپنے پسینے کی کماٹی تو کھاؤں گی، پھر تو کوئی مجھ پر رعب نہ جمائے گا۔ یہ حضرت تو اسی لیے اتنا مزاج کرتے ہیں کہ وہ میری پرورش کرتے ہیں۔ میں خود اب اپنی پرورش کروں گی۔

دفن اس نے مہتا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اسے ابھمن ہوئی۔ اس وقت تو بالکل تنہا رہتا چاہتی تھی۔ کسی سے بولنے کی طبیعت نہ تھی۔ مگر یہاں بھی ایک صاحب آئی گئے۔ اس پر بچہ بھی رونے لگا تھا۔

مہتا نے پاس جا کر تعجب سے پوچھا ”آپ اس وقت یہاں کیسے آگئیں؟“
گوبندی نے بچے کو چپ کراتے ہوئے کہا ”اسی طرح جیسے آپ آگئے۔“ مہتا نے مسکرا کر کہا ”میری بات نہ چلائیے، دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ لائیے میں بچے کو

چپ کرا دوں۔“

”آپ نے یہ ہنر کب سیکھا؟“

”مشق کرنا چاہتا ہوں، اس کا امتحان جو ہوگا۔“

”اچھا، امتحان کے دن قریب آگئے؟“

”یہ تو میری تیاری پر ہے۔ جب تیار ہوں گا، بیٹھ جاؤں گا۔ چھوٹی چھوٹی سندوں کے

لیے ہم پڑھ پڑھ کر آنکھیں پھوڑا کرتے ہیں، پھر یہ تو زندگی کے کاروبار کا امتحان ہے۔“

”اچھی بات ہے، میں بھی دیکھو گی کہ آپ کس ڈویژن میں پاس ہوتے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے بچے کو ان کی گود میں دے دیا۔ انھوں نے اسے کئی بار اچھا لا

تو وہ چپ ہو گیا۔ بچوں کی طرح ڈینگ مارتے ہوئے بولے ”دیکھا آپ نے، کیسا منتر کے

زور سے چپ کرا دیا! اب میں بھی کہیں سے ایک بچہ لاؤں گا۔“

گوبندی نے مذاق کیا ”بچہ بھی لائیے گا یا اس کی ماں بھی؟“ مہتا نے مذاقہ مایوسی

سے سر ہلا کر کہا ”ایسی عورت تو کہیں ملتی ہی نہیں۔“

”کیوں، مس مالٹی نہیں ہیں؟ خوبصورت، تعلیم یافتہ، ہنرمند و لفریب! اور آپ کیا

چاہتے ہیں؟“

”مس مالٹی میں وہ ایک بات بھی نہیں ہے جو میں اپنی اہلیہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

گوبندی نے اس مزمت کا مزالیتے ہوئے کہا ”ان میں کیا برائی ہے، سنو تو۔

بھونے ہمیشہ منڈلاتے رہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آج کل مردوں کو بھی ایسی عورتیں

پسند آتی ہیں۔“

مہتا نے بچے کے ہاتھوں سے اپنی مونچھیں بچاتے ہوئے کہا ”میری بیوی کچھ اور ہی

قماش کی ہوگی۔ وہ ایسی ہوگی جس کی میں پوجا کھ سکوں گا۔“

گوبندی اپنی ہنسی نہ روک سکی ”تو آپ عورت نہیں کوئی عورت چاہتے ہیں۔ عورت تو

ایسی آپ کو شاید ہی کہیں ملے۔“

”جی نہیں، ایسی ایک دیوی تو اسی شہر میں ہے۔“

”ج! ذرا میں بھی اس کے درشن کرتی، اور اسی طرح بننے کی کوشش کرتی۔“

”آپ اسے خوب جانتی ہیں۔ وہ ایک لکھ پتی کی بیوی ہے مگر عیش و عشرت کو بچ سمجھتی

ہے، جو بے رخی اور بے عزتی سے کربھی اپنے فرض سے منحرف نہیں ہوتی جو مادریت کی قربان گاہ پر خود کو چڑھا دیتی ہے، جس کے لیے ایثار ہی سب سے بڑا حق ہے اور جو اس قابل ہے کہ اس کی مورت بنا کر پوجی جائے۔“

گوبندی کے دل میں خوشی کی لہر اٹھی۔ سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کا بہانہ کرتی ہوئی بولی ”ایسی عورت کی آپ تعریف کرتے ہیں مگر میری نظر میں وہ رحم کے قابل ہے!“

مہتا نے تعجب سے کہا ”رحم کے قابل! آپ اس کی توہین کرتی ہیں۔ وہ مکمل عورت ہے، اور جو مکمل عورت ہو سکتی ہے وہی مکمل بیوی بھی ہو سکتی ہے۔“

”لیکن وہ معیار موجودہ زمانے کے لیے نہیں ہے۔“

”وہ معیار بدی اور لافانی ہے۔ انسان اسے منا کر خود کو منا رہا ہے۔“

گوبندی کا دل شکستہ ہوا جا رہا تھا۔ ایسی لرزشیں دہاں کبھی نہ ہوئی تھیں۔ جن لوگوں سے اس کا تعارف تھا ان میں مہتا کا درجہ سب سے اونچا تھا۔ ان کی زبان سے یہ حوصلہ افزائی پا کر وہ متوالی ہوئی جا رہی تھی۔ اسی نشہ میں بولی ”تو چلیے مجھے اس کے درشن کرا دیجیے۔“

مہتا نے بچے کے رخساروں میں منہ چھپا کر کہا ”وہ تو یہیں بیٹھی ہوئی ہیں۔“

”کہاں؟ میں تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔“

”میں اسی دیوی سے بول رہا ہوں۔“

گوبندی نے زور سے قہقہہ لگایا ”آپ نے آج مجھے بنانے کی ٹھان لی ہے، کیوں؟“

مہتا نے عقیدت سے کہا ”دیوی جی آپ میرے ساتھ نا انصافی کر رہی ہیں اور مجھ سے زیادہ خود اپنے ساتھ۔ دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جن سے میری دلی عقیدت ہو۔ ان ہی میں ایک آپ ہیں۔ آپ کا تحمل، ایثار، اخلاق، سب بے نظیر ہیں۔ میں اپنی زندگی میں سب سے بڑے سکھ کا جو تصور کر سکتا ہوں وہ آپ جیسی کسی دیوی کے چہروں کی سیوا ہے۔ جس نسائیت کو میں مکمل مانتا ہوں آپ اس کی زندہ مثال ہیں۔“

گوبندی کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہ نکل پڑے۔ اس عقیدت کی زرہ کو پہن کر وہ کسی آفت کا مقابلہ نہ کر سکے گی؟ اس کے روئیں روئیں سے جیسے ایک ٹیلے گیت کا راگ جاری ہو گیا۔

اس نے اپنی نسوانی خوشی کو ضبط کر کے کہا ”آپ فلسفی کیوں ہوئے مہتابی؟ آپ کو تو شاعر ہونا چاہیے تھا۔“

مہتابی سادگی سے ہنس کر بولے ”کیا آپ سمجھتی ہیں کہ فلسفی ہوئے بغیر ہی کوئی شاعر ہو سکتا ہے؟ فلسفہ تو محض ایک درمیانی منزل ہے۔“

”تو ابھی آپ شاعری کی راہ میں ہیں۔ مگر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ شاعر کو دنیا میں کبھی آرام نہیں ملتا؟“

”جسے دنیا رنج کہتی ہے وہی شاعر کے لیے راحت ہے۔ دولت اور شہرت، حسن اور طاقت، علم اور عقل، یہ برکتیں دنیا کو خواہ کتنا ہی فریفتہ کر لیں مگر شاعر کے لیے ان میں ذرا بھی کشش نہیں ہے۔ اس کی کشش دوسرے کی چیز تو مری ہوئی امیدیں، مٹی ہوئی یادگاریں اور ٹوٹے دلوں کے آنسو ہیں۔ جس دن ان چیزوں سے اسے محبت نہ رہے گی، اس دن وہ شاعر نہ رہ جائے گا۔ فلسفہ زندگی کے ان بھیدوں سے صرف کھیلتا ہے، مگر شاعر ان میں جذب ہو جاتا ہے۔ میں نے آپ کی دو چار نظمیں پڑھی ہیں اور ان میں جتنا سرور، جتنی لرزش، جتنا میٹھا درد اور جتنی رلائی والی دیوانگی ملی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ قدرت نے ہمارے ساتھ کتنی بڑی بے انصافی کی ہے کہ اس نے آپ جیسی کوئی دوسری دیوی نہیں بنائی۔“

گوبندی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا ”نہیں مہتابی! یہ آپ کا خیال ہے۔ ایسی عورتیں یہاں آپ کو جگہ جگہ ملیں گی اور میں تو ان سب سے گئی گزری ہوں۔ جو عورت اپنے مرد کو خوش نہ رکھ سکے، خود کو اس کی طبیعت کے موافق نہ بنا سکے، وہ بھی کوئی عورت ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ مالتی سے یہ ہنر سیکھوں۔ جہاں میں ناکامیاب ہوں وہاں وہ کامیاب ہے۔ میں اپنے کو بھی اپنا نہیں بنا سکتی۔ وہ دوسروں کو بھی اپنا بنا لیتی ہے۔ کیا یہ اس کے لیے فخر کی بات نہیں ہے؟“

مہتابی نے منہ بنا کر کہا ”شراب اگر لوگوں کو پاگل کر دیتی ہے تو کیا اسے پانی سے بہتر سمجھا جائے، جو پیاس بجھاتا ہے، جلاتا ہے اور تسکین دیتا ہے؟“

گوبندی نے مذاق سے کہا ”کچھ بھی ہو، میں دیکھتی ہوں کہ پانی مارا مارا پھرتا ہے اور شراب کے لیے گھر بار بکھ جاتا ہے۔ اور شراب جتنی ہی تیز اور نشیلی ہو، اتنی ہی اچھی! میں تو سنتی ہوں کہ آپ کو بھی شراب کا شوق ہے۔“

گوبندی مایوسی کی اس حالت میں پہنچ گئی تھی۔ جب انسان کو سچائی اور دھرم میں بھی شبہ ہونے لگتا ہے مگر مہتا کا دھیان ادھر نہ گیا۔ ان کا دھیان تو آخری فقرے پر جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ اپنی شراب نوشی پر انھیں جتنی ندامت اور پشیمانی آج ہوئی اتنی بڑی بڑی نصیحتوں سے بھی نہ ہوئی تھی۔ دلائل کا ان کے پاس جواب تھا اور دندان شکن، مگر اس میٹھی چٹکی کا انھیں کوئی جواب نہ سوجھا، وہ پچھتائے کہ کہاں سے کہاں انھیں شراب کی بات سوجھی بھی۔ انھوں نے خود مالتی کی مشابہت شراب سی کی تھی مگر ان کا وار الٹ کر کے سر پر پڑا۔ نادم ہو کر بولے ”ہاں دیوی جی میں مانتا ہوں کہ مجھ میں وہ شوق ہے۔ میں اپنے لیے اس کی ضرورت بتا کر اور اس کی تخیل افزا اوصاف کا ثبوت دے کر عذر گناہ نہ کروں گا، جو گناہ سے بھی بدتر ہے۔ البتہ آج آپ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ اب شراب کا ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے نہ جانے دوں گا۔“

گوبندی نے سنائے میں آکر کہا ”یہ آپ نے کیا کیا، مہتا جی! ایٹور گواہ ہے میرا یہ مطلب نہ تھا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔“

”نہیں، آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ نے ایک شخص کا ادھار کر دیا۔“

”میں نے آپ کا ادھار کر دیا! میں تو خود آپ سے اپنے ادھار کی التجا کرنے جا رہی

ہوں۔“

”مجھ سے؟ زہے نصیب!“

گوبندی نے رقعہ سے کہا ”ہاں آپ کے سوا مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جسے میں اپنی کہانی سناؤں۔ دیکھیے یہ بات اپنے ہی تک رکھیے گا، حالانکہ آپ سے ایسا کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اب اپنی زندگی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ مجھ سے اب تک جتنی تپیا ہو سکی وہ میں نے کی، لیکن اب نہیں سہا جاتا۔ مالتی مجھے ہر طرح مٹائے ڈالتی ہے۔ میں اپنے کسی ہتھیار سے اس پر فتح نہیں پاسکتی۔ آپ کا اس پر بہت کچھ اثر ہے۔ وہ جتنی آپ کی عزت کرتی ہے، شاید اور کسی مرد کی نہیں کرتی۔ اگر آپ کسی طرح مجھے اس کے پنجے سے چھڑا دیں تو عمر بھر آپ کا احسان مانوں گی۔ اس کے ہاتھوں میرا سہاگ لٹا جا رہا ہے۔ آپ اگر مجھے بچا سکتے ہیں تو بچائیے۔ میں آج گھر سے یہ سوچ کر چلی تھی کہ پھر واپس نہ جاؤں گی۔ میں نے بڑا زور مارا کہ موت کی ساری بندشوں کو توڑ کر پھینک دوں لیکن عورت کا دل بڑا کمزور

ہے مہتابی! محبت اس کی جان ہے۔ زندہ رہتے ہوئے محبت تو زنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ میں نے آج تک اپنا دکھ اپنے دل میں رکھا مگر میں آج آپ سے آنچل پھیلا کر بھیک مانگتی ہوں۔ مالتی سے مجھے چھٹکارا دلائے۔ میں اس جادو گرئی کے ہاتھوں مٹی جا رہی ہوں

.....

اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ زار قطار رونے لگی۔

مہتاب اپنی نظروں میں کبھی اتنا اونچا نہ اٹھے تھے۔ اس وقت بھی نہیں، جب ان کی تصنیف کو فرانس کی اکیڈمی نے موجودہ صدی کی بہترین تصنیف قرار دیا تھا اور انھیں مبارک باد دی تھی۔ جس صورت کی وہ سچے دل سے پوجا کرتے تھے جسے دل میں وہ اپنی عبادت کی دیوی سمجھتے ہوئے تھے اور زندگی کے ناقابل فہم معاملات میں جس سے ہدایت پانے کی امید رکھتے تھے وہ آج ان سے بھیک مانگ رہی تھی! انھیں اپنے میں ایسی طاقت کا احساس ہوا کہ وہ پہاڑ کو بھی چکنا چور کر سکتے ہیں اور سمندر کو بھی تیر کر پار کر سکتے ہیں۔ ان پر نشہ سا چھا گیا جیسے بچہ کسی چوبی گھوڑے پر چڑھ کر یہ سمجھ رہا ہو کہ وہ ہوا میں اڑا جا رہا ہے۔ کام کتنا مشکل ہے، اس کی خبر نہ رہی۔ اپنے اصولوں کا کتنا خون کرنا پڑے گا، اس کا بالکل خیال نہ رہا۔ تسکین کے لہجے میں بولے ”آپ مالتی کی طرف سے بے فکر رہیں۔ وہ آپ کی راہ سے ہٹ جائے گی۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ آپ اس کے سبب سے اتنی دکھی ہیں۔ میری عقل کا قصور آنکھوں کا قصور، خیال کا قصور، اور کیا کہوں؟ ورنہ آپ کو اتنی تکلیف کیوں سہنی پڑتی۔“

گوبندی کو شک ہوا۔ بولی ”مگر شیرنی سے اس کا شکار چھیننا سہل نہیں ہے، یہ سمجھ لیجیے۔“

مہتاب نے استقلال سے کہا ”عورت کا دل زمین کی طرح ہے جس سے شیرینی بھی مل سکتی ہے اور تلخی بھی، اس کے اندر پڑنے والے خم میں جیسی تاثیر ہو۔“

”آپ پچھتا رہے ہوں گے کہ کہاں سے کہاں آج اس سے بھینٹ ہو گئی؟“

”میں اگر کہوں کہ آج ہی مجھے زندگی کا حقیقی لطف ملا ہے تو شاید آپ کو یقین

نہ آئے۔“

”میں نے آپ کے سر پر اتنا بڑا بار رکھ دیا۔“

مہتاب نے عقیدت کے لہجے میں کہا ”آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں دیوی جی! میں کہہ

چکا کہ میں آپ کا خادم ہوں۔ آپ کے فائدے کے لیے میری جان بھی چلی جائے تو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ اسے شاعرانہ جذبہ نہ سمجھیے۔ یہ میری زندگی کی سچائی ہے۔ میری زندگی کا کیا معیار ہے، آپ سے یہ بتا دینے کی خواہش میں ضبط نہیں کر سکتا۔ میں قدرت کا پجاری ہوں اور انسان کو اس کی قدرتی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو خوش ہو کر ہنستا ہے، غمگین ہو کر روتا ہے اور غصے میں آکر مار ڈالتا ہے۔ جو دکھ اور سکھ دونوں کو دباتے ہیں جو رونے کو کمزوری اور ہنسنے کو سکی سمجھتے ہیں ان سے میرا کوئی لگاؤ نہیں۔ زندگی میرے لیے خوشی بھرا کھیل ہے، سادہ اور کھلا ہوا، جہاں برائی، حسد اور جلن کے لیے کوئی محتاج نہیں۔ میں ماضی کی فکر نہیں کرتا اور نہ مستقبل کی پرواہ کرتا ہوں میرے لیے حال ہی میں سب کچھ ہے۔ مستقبل کی فکر ہمیں بزدل بنا دیتی ہے، ماضی کا بوجھ ہماری کمر توڑ دیتا ہے۔ ہم میں زندگی کی طاقت اتنی کم ہے کہ ماضی اور مستقبل میں پھیلا دینے سے وہ اور بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ ہم مفت کا بوجھ اپنے اوپر لا کر رواجوں اور عقیدوں اور تاریخوں کے بلبے کے نیچے دبے پڑے ہیں، اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ وہ طاقت ہی نہیں رہی۔ جو طاقت، جو عقل، انسانی فرائض کے پورا کرنے میں لگنی چاہیے تھی، باہمی امداد میں اور بھائی چارے میں، وہ پرانی عداوتوں کا بدلہ لینے اور آباد اجداد کا قرضہ ادا کرنے میں تمام ہو جاتی ہے۔ اور جو یہ ایثار اور مکتی کا چکر ہے اس پر تو مجھے ہنسی ہی آتی ہے۔ یہ مکتی بھگتی تو انتہائی خودی ہے جو ہماری انسانیت کب تباہ کیے ڈالتی ہے۔ جہاں زندگی ہے، کھیل ہے، چہک ہے، پریم ہے، دہیں ایثار ہے، اور زندگی کو سکھی بنانا ہی عبادت ہے اور نجات ہے!۔ گیان والا کہتا ہے کہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ آئے، آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ میں کہتا ہوں اگر تم ہنس نہیں سکتے تو تم انسان نہیں ہو، پتھر ہو۔ وہ گیان جو انسانیت کو پیس ڈالے گیان نہیں ہے، کولھو ہے۔ مگر معاف کیجیے میں تو ایک پورا لیکچر ہی دے گیا۔ اب دیر ہو رہی ہے، چلیے میں آپ کو پہنچا دوں۔ بچہ بھی میری گود میں سو گیا۔“

گوبندی نے کہا ”میں تو مانگہ لائی ہوں۔“

”مانگے کو ہمیں سے رخصت کیے دیتا ہوں۔“

لہتا مانگے کے پیسے دے کر لوٹے تو گوبندی نے کہا ”لیکن آپ مجھے کہاں لے جائیں گے؟“

”مہتا نے چونک کر پوچھا ”کیوں، آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔“
 ”وہ میرا گھر نہیں ہے، مہتا جی!“
 ”اور کیا مسٹر کھنا کا گھر ہے؟“

”یہ بھی کیا پوچھنے کی بات ہے۔ اب وہ گھر میرا نہیں رہا۔ جہاں بے عزتی اور فضیلت ہو اسے میں اپنا گھر نہیں سمجھتی اور نہ سمجھ سکتی ہوں۔“

مہتا نے درد بھری آواز میں جن کا ایک ایک حرف دل سے نکل رہا تھا کہا ”نہیں دیوی جی، وہ گھر آپ کا ہے اور سدا رہے گا۔ اس گھر کو آپ نے بنایا ہے، اس کے رہنے والوں کو آپ نے رچایا ہے، اور جس طرح جان جسم کو چلاتی ہے ویسے ہی آپ نے اسے چلایا ہے۔ جان نکل جائے تو جسم کی کیا حالت ہوگی؟ ماں کا درجہ بہت بڑی عظمت کا ہے، دیوی جی! اور ویسے درجے کی بے عزتی اور فضیلت کہاں نہیں ہوئی؟ ماں کا کام حیات افزائی ہے۔ جس کے ہاتھوں میں ایسی بے مثل طاقت ہے اسے اس کی کیا پرواہ کہ اس سے کون روٹتا ہے یا کون بگڑتا ہے؟ جان کے بغیر جیسے جسم نہیں رہ سکتا ویسے ہی جان کے لیے جسم ہی موزوں ترین ممکن ہے۔ میں آپ کو دھرم اور تیاگ کا کیا اپدیش دوں؟ آپ تو اس کی جیتی جاگتی مورت ہی ہیں!۔ میں تو یہی کہوں گا.....“

گوبندی نے بے صبری سے کہا ”لیکن میں صرف ایک ماں تو ہوں نہیں ایک عورت بھی ہوں۔“

مہتا نے ایک منٹ تک چپ رہنے کے بعد کہا ”ہاں، ہیں! لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عورت صرف ماں ہے اور اس کے علاوہ وہ جو کچھ ہے وہ سب اسی کا محض ابتدائی ظہور ہے۔ ماں ہونا دنیا کی سب سے بڑی ریاضت، سب سے بڑا ایثار اور سب سے بڑی فحش ہے۔ میں ایک لفظ میں اسے زندگی کا، شخصیت کا اور انسانیت کا جذب ہو جانا کہوں گا۔ آپ مسٹر کھنا کے بارے میں اتنا ہی سمجھ لیں کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے یا کرتے ہیں وہ جنون کی حالت میں۔ مگر اس جنون کے رفع ہونے میں بہت دن نہ لگیں گے اور وہ وقت جلد آئے گا جب وہ آپ کو اپنی پرستش کی چیز سمجھیں گے۔“

گوبندی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ آہستہ آہستہ موٹر کی طرف چلی، مہتا نے بڑھ کر موٹر کا دروازہ کھول دیا اور گوبندی اندر جا بیٹھی۔ موٹر چلا مگر دونوں خاموش تھے۔

گو بندی جو اپنے دروازے پر پہنچ کر گاڑی سے اتری تو مہتا نے برقی روشنی میں دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں ۔

بچے گھر سے نکل آئے اور ”اماں ، اماں “ کہتے ہوئے ماں سے لپٹ گئے ۔ گو بندی کے چہرے پر مادرانہ عظمت کا نور چمک اٹھا ۔

اس نے مہتا سے کہا ” اس تکلیف کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ “ اور سر نیچا کر لیا ۔ آنسو کا ایک قطرہ اس کے رخسار پر ڈھلک آیا تھا ۔

مہتا کی آنکھیں بھی آنکھ آلود ہو گئیں ۔ اس شان و شوکت اور عیش و عشرت کے سامانوں کے درمیان میں بھی اس عورت کا دل کتنا مغموم ہے !

(۱۹)

مرزا خورشید کا احاطہ کلب بھی ہے، کچہری بھی اور اکھاڑا بھی۔ دن بھر بھیڑ لگی رہتی ہے۔ محلے میں اکھاڑے کے لیے کہیں جگہ نہ ملتی تھی۔ مرزا نے ایک چھپر ڈلو کر اکھاڑا بنوا دیا ہے وہاں روز سو پچاس کشتی باز جمع ہو جاتے ہیں۔ مرزا بھی ان کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہیں۔ محلے کی پنچائیں بھی یہیں ہوتی ہیں۔ میاں بیوی ساس بہو اور بھائی بھائی کے جھگڑوں کبھیڑوں کا یہیں نپنارا ہوتا ہے۔ محلے کی سوشل زندگی کا یہی مرکز ہے اور سیاسی تحریک کا بھی۔ آئے دن سبائیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہیں والٹیر ٹھہرتے ہیں، یہیں ان کا پروگرام بنتا ہے، یہیں شہر کی سیاسی تحریک چلائی جاتی ہے۔ پچھلے جلے میں ملتی شہری کانگریس کمیٹی کی صدر جن لی گئی ہے جب سے اس مقام کی رونق اور بڑھ گئی ہے۔

گوبر کو یہاں رہتے سال بھر ہو گیا ہے۔ اب وہ سیدھا سادھا دیہاتی نوجوان نہیں ہے۔ اس نے بہت کچھ دیکھ لی ہے۔ اس کے رنگ ڈھنگ بھی کچھ کچھ بگھنے لگا ہے۔ اصل میں تو وہ اب بھی دیہاتی ہے، پیسے کو دانت سے پکڑتا ہے، مطلب کو کبھی نہیں چھوڑتا اور محنت سے جی نہیں چراتا، نہ کبھی ہمت ہارتا ہے مگر شہر کی ہوا بھی اسے لگ گئی ہے۔ اس نے پہلے مہینے تو صرف مزدوری کی اور آدھے پیٹ کھا کر تھوڑے روپے بچا لیے۔ پھر وہ کچالو اور دہی بڑے کے خوانچے لگانے لگا۔ ادھر زیادہ منافع دیکھا تو نوکری چھوڑ دی۔ گرمیوں میں شربت اور برف کی دوکان کھول دی۔ لیکن دین میں کھرا تھا بس اس کی ساکھ جم گئی۔ جاڑا آیا تو اس نے شربت کی دوکان بند کر دی اور گرم چائے پلانے لگا۔ اب اس کی روزانہ آمدنی ڈھائی تین روپے سے کم نہیں ہے۔ اس نے انگریزی فیشن کے بال کٹا لیے ہیں باریک دھوتی اور پمپ شو پہنتا ہے، ایک سرخ اونٹنی چادر خرید لی ہے اور پان سگریٹ کا بھی شوق ہو گیا ہے۔ جلموں میں آنے جانے سے اسے کچھ سیاسی واقفیت بھی ہو چلی ہے۔ قوم اور فرقہ کا مطلب سمجھنے لگا ہے۔ سوشل رواجوں کا خیال اور دینی ملامت کا خوف اب اسے بہت کم رہ گیا تھا۔ آئے دن کی چٹائوں نے اسے ٹر بنا دیا۔ جس بات کے پیچھے وہ یہاں گھر سے

دور منہ چھپائے پڑا ہوا ہے اسی طرح کی بلکہ اس سے بھی زیادہ بری باتیں یہاں روز ہوا کرتی ہیں اور کوئی کہیں بھگتا نہیں۔ پھر وہی کیوں اتنا ڈرے اور من چرائے؟

اتنے دنوں میں اس نے ایک پیسہ بھی گھر نہیں بھیجا۔ وہ والدین کو روپے پیسے کے معاملے میں اتنا ہوشیار نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ تو روپیہ پاتے ہی آسمانوں میں اڑنے لگیں گے۔ دادا کو تو فوراً یکیتہ کرنے اور اماں کو گھبنے بنوانے کی دھن سوار ہو جائے گی۔ ایسے فضول کاموں کے لیے اس کے پاس روپے نہیں ہیں۔ اب وہ چھوٹا موٹا مہاجن ہے۔ پڑوس کے یکہ اور گاڑی والوں اور دھویوں کو سود پر روپیہ قرض دیتا ہے۔ ان دس گیارہ مہینوں ہی میں اس نے اپنی محنت اور کفایت سے اپنی جگہ بنالی ہے اور اب جھلیا کو یہیں رکھنے کی بات سوچ رہا ہے۔ تیسرے پہر کا وقت ہے، وہ سڑک کے قتل پر نہا کر آیا ہے اور شام کے لیے آلو اوبال رہا ہے کہ مرزا خورشید آکر دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ گوہر اب ان کا نوکر نہیں ہے مگر ادب اسی طرح کرتا ہے اور ان کے لیے جان دینے کو تیار رہتا ہے۔ دروازے پر آکر پوچھا ”کیا حکم ہے سرکار؟“

مرزا نے کھڑے کھڑے کہا ”تمہارے پاس کچھ روپے ہوں تو دے دو۔ آج تین دن سے بوتل خالی پڑی ہوئی ہے، طبیعت بہت بے چین ہو رہی ہے۔“

گوہر نے اس سے پہلے بھی مرزا کو روپے دیے تھے مگر اب تک وصول نہ کر سکا تھا۔ تقاضا کرتے ڈرتا تھا مگر مرزا صاحب روپے لے کر دینا نہ جانتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں روپیہ رکنا ہی نہ تھا۔ ادھر آیا اور ادھر غائب۔ یہ تو نہ کہہ سکا کہ میں روپے نہ دوں گا یا میرے پاس روپے نہیں ہیں، شراب کی برائی کرنے لگا ”آپ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے سرکار؟ کیا اس کے پینے سے کچھ بچاؤ ہوتا ہے؟“

مرزا نے کوٹھری کے اندر آکر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم سمجھتے ہو کہ میں چھوڑنا نہیں چاہتا اور شوق سے پیتا ہوں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم اپنے روپیوں کے لیے نہ ڈرو، میں ایک ایک کوڑی ادا کر دوں گا۔“

گوہر مستقل رہا ”میں سچ کہتا ہوں مالک، میرے پاس اس سے روپے نہیں ہیں۔ روپیہ ہوتا تو آپ سے انکار نہ کرتا۔“

”دو روپے بھی نہیں دے سکتے؟“

”اس سے تو نہیں ہیں۔“

”میری انگلی گروی رکھ لو۔“

گوبر کا جی لپٹا اٹھا مگر بات کیسے بدلے؟ بولا ”یہ آپ کیا کہتے ہیں مالک روپے ہوتے تو آپ کو دے دیتا، انگلی کی کون بات تھی؟“

مرزا نے عاجزانہ اصرار سے کہا ”میں تم سے بھر کبھی نہ مانگوں گا گوبر مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ اس شراب کی بدولت میں نے لاکھوں کی حیثیت بگاڑ دی اور بھکاری بن گیا۔ اب مجھے بھی ضد پڑ گئی ہے کہ خواہ بھیک ہی مانگنی پڑے مگر اسے چھوڑوں گا نہیں۔“

جب گوبر نے اب کے بھی انکار کیا تو مرزا صاحب مایوس ہو کر چلے گئے۔ شہر میں ان کے ہزاروں ملنے والے تھے۔ کتنے ہی ان کی بدولت بن گئے تھے کتنوں کی ہی انھوں نے آڑے وقت میں مدد کی تھی مگر ایسوں سے وہ ملنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ انھیں ہزاروں لکے معلوم تھے جن سے وہ وقتاً فوقتاً روپیوں کے ڈھیر لگا سکتے تھے مگر روپے کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ ان کے ہاتھ میں روپے جیسے کاٹتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح اڑا کر ہی ان کا دل سکون پاتا تھا۔

گوبر آلو چھیلنے لگا۔ سال ہی بھر کے اندر وہ اتنا چالاک ہو گیا تھا اور پیسے جوڑنے میں اتنا ہوشیار کہ تعجب ہوتا تھا۔ جس کوٹھری میں وہ رہتا ہے وہ مرزا صاحب نے ہی دی ہے۔ اس کوٹھری اور برآمدے کا کرایہ بڑی آسانی سے پانچ روپیہ مل سکتا ہے۔ گوبر تقریباً سال بھر سے اسی میں رہتا ہے، لیکن نہ کبھی مرزا نے کرایا مانگا نہ اس نے دیا۔ انھیں شاید یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس کوٹھری کا کچھ کرایہ بھی مل سکتا ہے۔

ذرا دیر میں ایک پلہ والا روپیہ مانگنے آیا۔ الہ دین نام تھا، سرمندا ہوا، داڑھی کھجڑی اور کانٹا۔ اس کی لڑکی رخصت ہو رہی تھی۔ اور پانچ روپے کی اسے بڑی ضرورت تھی۔ گوبر نے ایک آنہ سود پر روپے دے دیے۔

الہ دین نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ”بھیا اب بال بچوں کو بلا لو۔ کب تک ہاتھ سے ٹھونکتے رہو گے؟“

گوبر نے شہر کے خرچ کا رونا رویا ”تھوڑی آمدنی میں گریستی کیسے چلے گی؟“ الہ دین بیڑی جلاتے ہوئے بولا ”آمدنی اللہ دے گا! بھیا! سوچو کتنا آرام ملے گا۔ میں تو کہتا ہوں

کہ جتنا تم اکیلے خرچ کرتے ہو اسی میں گرتی چل جائے گی۔ عورت کے ہاتھ میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ خدا قسم، جب میں اکیلا یہاں رہتا تھا تو چاہے جتنا ہی کماؤں مگر سب کھاپی کر برابر ہو جاتا تھا۔ بیڑی تماکھو کو بھی پیسہ نہ تھا۔ اس پر حیرانی الگ۔ تھکے ماندے آؤ تو گھوڑے کو شللاؤ اور کھلاؤ، پھر تانبائی کی دوکان پر دوڑو۔ ناک میں دم آگیا۔ جب سے بیوی آگئی ہے، اسی کمائی میں اس کی روٹیاں بھی نکل آتی ہیں اور آرام بھی ملتا ہے۔ آخر آدمی آرام ہی کے لیے کماتا ہے۔ جب جان کھپا کر بھی آرام نہ ملا تو زندگی ہی برباد ہوگئی۔ میں تو کہتا ہوں کہ تمھاری کمائی بڑھ جائے گی بھیا۔ جتنی دیر میں آلو اور مٹر ابلتے اتنی دیر میں چار پیالے چائے بچ لو گے۔ اب چائے بارہوں مہینے چلتی ہے رات کو لیٹو گے تو عورت پاؤں دبائے گی۔ ساری تھکاوٹ مٹ جائے گی۔“

یہ بات گوبر کے دلنشین ہوگئی۔ جی اچاٹ ہو گیا۔ اب تو وہ جھنڈا کو لا کر ہی رہے گا۔ آلو چولھے پر چڑھے رہ گئے اور اس نے گھر جانے کی تیاری کر دی۔ مگر یاد آیا کہ ہولی آرہی ہے، اس لیے ہولی کا سامان بھی لیتا چلے۔ بخیلوں میں خوشی کے موقعوں پر دل کھول کر خرچ کرنے کی جو ایک عادت ہوتی ہے۔ اس نے گوبر کو بھی اکسایا۔ آخر اسی دن کے لیے تو کوڑی کوڑی جوڑ رہا تھا۔ وہ ماں، بہنوں اور جھنڈا سب کے لیے ایک ایک جوڑ ساڑی لے جائے گا۔ موری کے لیے ایک دھوٹی اور ایک چادر سونا کے لیے ایک شیشی تیل لے جائے گا اور ایک جوڑ چپل۔ روپا کے لیے جاپانی گڑیا اور جھنڈا کے لیے ایک پٹاری جس میں تیل، سیندور اور آئینہ ہوگا۔ بچے کے لیے ٹوپ اور فراک جو بازار میں تیار ملتا ہے۔ اس نے روپے نکالے اور بانہار چلا۔ دوپہر تک سب چیزیں آگئیں۔ بستر بندھ گیا۔ محلے والوں کو خبر ہوگئی کہ گوبر گھر جا رہا ہے۔ کئی مرد عورت اسے رخصت کرنے آئے۔ گوبر نے انھیں اپنا گھر سپرد کرتے ہوئے کہا ”تمھیں لوگوں پر گھر چھوڑے جاتا ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو ہولی کے دوسرے دن آجاؤں گا۔“

ایک نوجوان عورت نے مسکرا کر کہا ”مہریا کو لیے بنا نہ آتا، نہیں گھر میں نہ مھنرے پاؤ گے۔“

دوسری زیادہ عمر والی نے نصیحت کی ”ہاں اور کیا، بہت دنوں چولھا پھونک چکے۔ ٹھکانے سے روٹی تو ملے گی۔“

گوبر نے سب کو ”رام رام“ کیا۔ ہندو بھی تھے، مسلمان بھی کبھی میں دوستانہ تھا، سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک تھے۔ روزہ رکھنے والے روزہ رکھتے تھے، ایکادشی رکھنے والے ایکادشی۔ کبھی کبھی مذاق میں ایک دوسرے پر چھیٹنے بھی اڑا لیا کرتے تھے۔ گوبر الہ دین کی نماز کو ”اٹھا بیٹھی کہتا تو الہ دین پتیل کے نیچے والے سیکڑوں چھوٹی بڑی شیو کی صورتوں کو“ ہلکھڑے بتاتا، مگر فرقہ وارانہ تعصب کا نام بھی نہ تھا۔

گوبر گھر جا رہا تھا اور سب ہنسی خوشی سے رخصت کرنا چاہتے ہیں۔

اتنے میں بھورے یکہ لے کر آگیا۔ ابھی دن بھر گشت لگا کر آیا تھا خبر ملی کہ گوبر گھر جا رہا ہے، ویسے ہی یکہ ادھر پھیر دیا۔ گھوڑے نے احتجاج کیا۔ اسے کئی چابک لگائے۔ گوبر نے یکہ پر سامان رکھا۔ یکہ بڑھا۔ بھیجنے والے گلی کے موڑ تک پہنچانے گئے تب گوبر نے سب کو ”رام رام“ کیا اور یکے پر بیٹھ گیا۔ سڑک پر یکہ سر پٹ دوڑا جا رہا تھا، گوبر گھر جانے کی خوشی میں مست تھا، بھورے اسے گھر پہنچانے کی خوشی میں مست تھے۔ اور گھوڑا تھا پانی دار، اڑا چلا جا رہا تھا۔ بات کی بات میں ایشین آگیا۔

گوبر نے خوش ہو کر ایک روپیہ کمر سے نکال کر بھورے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”لو گھر والی کے لیے مٹائی لیتے جانا۔“

بھورے نے تشکرانہ حقارت سے اس کی طرف دیکھا ”تم مجھے گیر سمجھتے ہو بھیا؟ ایک دن یکے پر بیٹھ گئے تو میں تم سے انعام لوں گا! جہاں تمہارا پسینہ گرے وہاں اپنا لہو گرانے کو نیا ہوں۔ اتنا چھوٹا دل نہیں پایا ہے اولہ لے بھی لوں تو گھر والی جیتا چھوڑے گی؟“

گوبر نے پھر کچھ نہ کہا، شرمندہ ہو کر اپنا اسباب اتارا اور نکلتے چلا۔

پھاگن اپنی جھولی میں نئی زندگی کی پونجی لے کر آ پہنچا تھا۔ آم کے بیڑ دونوں ہاتھوں سے بور کی مہک بکھیر رہے تھے اور کوئل آم کی ڈالیوں میں چھپی ہوئی اپنے راگوں کی خفیہ خیرات تقسیم کر رہی تھی۔

گاؤں میں اکیچہ کی بوائی شروع ہو گئی تھی۔ ابھی دھوپ نہیں نکلی مگر ہوری کھیت میں پہنچ گیا ہے۔ دھنیا، سونا، روپا، تینوں تلیا سے اکیچہ کے بھیتے ہوئے نتھے نکال نکال کر کھیت میں لا رہی ہے اور ہوری گنڈا سے اکیچہ کے نکلے کر رہا ہے۔ اب وہ داتا دین کی مزدوری کرنے لگا ہے۔ کسان نہیں، مزدور ہے۔ داتا دین سے اب اس کا پردہت اور جہان کا ناتا نہیں، بلکہ مالک اور مزدور کا رشتہ ہے۔

داتا دین نے آکر ڈانٹا ”ہاتھ اور پھرتی سے چلاؤ ہوری! اس طرح تو تم دن بھر نہ کاٹ سکو گے۔“

ہوری نے زخم کھائے ہوئے تکبر کے ساتھ کہا ”چلا ہی تو رہا ہوں مہراج، بیٹھا تو نہیں ہوں۔“

داتا دین مزدوروں سے کس کر کام لیتے تھے۔ اسی لیے کوئی مزدور ان کے یہاں ٹھہرتا نہ تھا۔ ہوری ان کے مزاج سے واقف تھا مگر جاتا کہاں؟ پنڈت اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولے ”چلانے چلانے میں پھرک ہے۔ ایک چلانا وہ ہے کہ گھڑی بھر میں کام تمام، دوسرا چلانا وہ ہے کہ دن بھر میں بھی ایک بوجھ نہ کئے۔“

ہوری نے زہر کا گھونٹ پی کر زیادہ تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کیا۔ ادھر مہینوں سے اسے پیٹ بھر کھانا نہ ملتا تھا۔ عموماً ایک وقت تو جہ بن ہی پر کٹتا تھا اور دوسرے وقت بھی کبھی آدھے پیٹ کھانا ملا، کبھی فاقہ ہو گیا۔ کتنا ہی چاہتا تھا کہ ہاتھ جلد جلد اٹھے، مگر ہاتھ جواب دے رہا تھا۔ اس پر داتا دین سر پر سوار تھے۔ لمحہ بھر دم لے لینے پاتا تو تازہ ہو جاتا مگر دم کیسے لے؟ جھڑکیاں پڑنے کا ڈر تھا۔

دھنیا اور دونوں لڑکیاں اکیکھ کے گٹھے لیے بھیگی ساڑیوں سے لت پت ، کچڑ میں سنی ہوئی آئیں اور گٹھے پک کر ذرا ستانے لگیں کہ داتا دین نے ڈانٹ بتائی ” یہاں تمسا کیا دیکھتی ہے دھنیا ، جا اور اپنا کام کر ۔ پیسے سنت میں نہیں آتے ۔ پھر بھر میں تو ایک گٹھا لائی ہے ، اس حساب سے تو دن بھر میں اوکھ نہ ڈھل پائے گی ۔“

دھنیا نے تیوری بدل کر کہا ” کیا تک دم بھی نہ لینے دو گے مہراج ؟ ہم بھی آدمی ہیں ۔ تمھاری مجوری کرنے سے بیل تو نہیں ہو گئے ۔ جرا کھوپڑی پر ایک گٹھا لاد کر لاؤ تو پتہ چلے ۔“

داتا دین بگڑ اٹھے ” پیسے دیتے ہیں کام کرنے کے لیے ، دم لینے کے لیے نہیں ۔ دم لینا ہے تو گھر میں جا کر دم لو ۔“

دھنیا کچھ کہنے ہی جاری تھی کہ ہوری نے ڈانٹ ” تو جاتی کیوں نہیں دھنیا ، کیوں جھت کر رہی ہے ؟“

دھنیا نے بندھنے کو اٹھاتے ہوئے کہا ” جا تو رہی ہوں ، پر چلتے ہوئے بیل کو آدگی نہ لگانا چاہیے ۔“

داتا دین نے سرخ آنکھیں نکال کر کہا ” معلوم ہوتا ہے ابھی مزاج ٹھنڈا نہیں ہوا تبھی دانے دانے کو ترستے ہو ۔“

دھنیا بھلا کیوں چپ رہنے لگی ، بولی ” تمھارے دوارے پر بھیک مانگنے تو نہیں جاتی ؟“

داتا دین نے تیز لہجے میں کہا ” اگر یہی حال ہے تو بھیک بھی مانگو گی ۔“

دھنیا کے پاس جواب تیار تھا مگر سونا اسے کھینچ کر تلیا کی طرف لے گئی ورنہ بات بڑھ جاتی ۔ لیکن آواز کی پہنچ کے باہر جا کر اس نے دل کی بھڑاس نکالی ” بھیک مانگو تم جو بھکمکوں

کی جات ہو ، ہم تو مجبور ٹھہرے ، جہاں کام کریں گے وہیں چار پیسے پائیں گے ۔“

سونا نے حقارت سے کہا ” اماں ، جانے بھی دو ۔ تم تو بکھت نہیں دیکھتیں ، بات بات پر لڑنے لگ جاتی ہو ۔“

ہوری پاگلوں کی طرح سر سے اوپر گنڈا سہ اٹھا اٹھا کر اکیکھ کے ککڑے ڈھیر کرتا جاتا تھا ۔ اس کے اندر جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی ۔ اس میں غیر قدرتی طاقت آگئی تھی ۔ اس میں

جو پشہا پشت سے بہتا ہوا پانی تھا وہ اس وقت گویا بھاپ بن کر اس کو مشین کی سی کورانہ طاقت دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ سر چکرانے لگا۔ پھر اس کے ہاتھ مشین کی رفتار سے ہلا تھکے اور بلا رکے اٹھ رہے تھے۔ اس کے بدن سے پسینہ ٹپک رہا تھا، منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور سر میں دھماکے کی آواز ہو رہی تھی، مگر اس پر جیسے کوئی بھوت سوار ہو گیا ہو۔

دفعاً اس کی آنکھوں میں بالکل اندھیرا چھا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ زمین میں دھنسا جا رہا ہے۔ اس نے سنبیلے کی کوشش میں خالی ہاتھ پھیلا دیے اور بے ہوش ہو گیا۔ گنڈاسہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اسی وقت دھنیا اکیہ کا گٹھالے آئی، دیکھا تو کئی آدمی ہوئی کو گھیرے کھڑے ہیں۔ ایک بلواہا داتا دین سے کہہ رہا تھا،، مالک! تمہیں ایسی بات نہ کہنی چاہیے جو کہ آدمی کو لگ جائے۔ پانی مرتے ہی مرتے تو مرے گا۔“

دھنیا اکیہ کا گٹھا پنک کر پاگلوں کی طرح دوڑی ہوئی ہوئی کے پاس گئی اور اس کا سر اپنی جانگھ پر رکھ کر زور زور سے رونے چلانے لگی۔ ”تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو؟ ارے سونا، دوڑ کر پانی لا اور جا کر سو بھاسے کہہ دے کہ دادا بے حال ہیں۔ ہائے رام! اب میں کہاں جاؤں۔ اب کس کی ہو کر رہوں گی؟ کون مجھے دھنیا کہہ کر پکارے گا.....؟“

لالہ ہیشوری بھاگے ہوئے آئے اور محبت بھری سختی سے بولے ”کیا کرتی ہے دھنیا، ہوش سنبھال! ہوئی کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ گرمی سے بیہوش ہو گئے ہیں۔ ابھی ہوش آیا جاتا ہے۔ دل اتنا کچا کرے گی تو کیسے کام چلے گا؟“

دھنیا نے ہیشوری کے پیر پکڑ لیے اور روتی ہوئی بولی ”کیا کروں لالا، جی نہیں مانتا۔

بھگوان نے سب کچھ ہر لیا میں صبر کر گئی۔ اب دھیرج نہیں ہوتا ہائے میرا ہیرا!،،
سونا پانی لائی ہیشوری نے ہوئی کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ کئی آدمی اپنے آنکھو چھوں سے ہوا دے رہے تھے۔ ہوئی کا بدن سرد پڑ گیا تھا۔ ہیشوری کو بھی تشویش ہوئی۔ مگر دھنیا کو وہ برابر دلا سا دیے جاتے تھے۔

دھنیا نے بے صبری سے کہا ”ایسا کبھی نہیں ہوا تھا لالا، کبھی نہیں!“

ہیشوری نے پوچھا ”رات کچھ کھایا تھا؟“

دھنیا بولی ”ہاں روٹیاں بنائی تھیں، پر آج کل ہمارے اوپر جو بیت رہی ہے وہ کیا تم

سے چھپا ہے؟ مہینوں سے پیٹ بھر روٹی نہیں نصیب ہوئی۔ کتنا سمجھاتی ہوں کہ جان رکھ کر کام کرو مگر آرام تو ہمارے بھاگ میں لکھا ہی نہیں ہے۔“

دھنیا ہوری نے آنکھیں کھول دیں اور اڑتی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

دھنیا جیسے جی اٹھی۔ بے قرار ہو کر اس کے گلے سے لپٹ کر بولی ”اب کیسا جی ہے تمہارا؟ میری تو جان نہوں (ناخونوں) میں آگئی تھی۔“

ہوری نے کمزور آواز میں کہا ”اچھا ہوں۔ نہ جانے کیسا جی ہو گیا تھا۔“

دھنیا نے محبت بھرے شکوے سے کہا ”دسنبہ میں دم تو ہے نہیں اور کام کرتے ہو جان ہوم کر! لڑکوں کا بھاگ تھا کہ بچ گئے، نہیں تو تم لے ہی ڈوبے تھے۔“

پیشوری نے ہنس کر کہا ”دھنیا تو روپیٹ رہی تھی۔“

ہوری نے بے صبری سے پوچھا ”سچ بچ تو روتی تھی دھنیا؟“

دھنیا نے پیشوری کو پیچھے ڈھکیل کر کہا ”انھیں بکنے دو تم۔ پوچھو کے یہ کیوں کا گد چھوڑ کر گھر سے دوڑے آئے تھے۔“

پیشوری نے چڑھایا ”تو ہی بہرا بہرا، کہہ کر روتی تھی۔ اب لاج کے مارے مکتی ہے۔ چھاتی پیٹ رہی تھی۔“

ہوری نے دھنیا کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا ”بگلی ہے اور کیا! اب نہ جانے کون سا سکھ دیکھنے کے لیے مجھے جلائے رکھنا چاہتی ہے۔“

دو آدمی ہوری کو سہارا دے کر گھر لے گئے اور چار پائی پر لٹا دیا۔ داتا دین تو کڑھ رہے تھے کہ بوائی میں دیر ہوئی جاتی ہے، مگر داتا دین اتنا بے رحم نہیں تھا وہ دوڑ کر گھر سے گرم دودھ لایا اور ایک شیشی میں گلاب کا عرق بھی۔ دودھ پی کر ہوری میں جان سی آگئی۔

اسی وقت گوہر ایک مزدور کے سر پر اپنا سامان لادے ہوئے آتا دکھائی دیا۔

گاؤں کے کتے پہلے تو بھوکتے ہوئے اس کی طرف دوڑے، پھر دم ہلانے لگے۔ روپا نے کہا ”بھیا آئے، بھیا آئے، اور تالیاں بجاتی ہوئی دوڑی۔ سونا بھی دو تین قدم آگے بڑھی مگر اپنی خوشی کو ضبط کر گئی۔ ایک سال میں اس کا شباب کچھ اور شرمیلا ہو گیا تھا۔ چھپا بھی گھونکتھ نکالے دروازے پر کھڑی ہوئی۔

گوہر نے والدین کے پیر چھوئے اور روپا کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ دھنیا نے اسے

اپس دی اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر گویا اپنے ماں ہونے کا صلہ پا گئی۔ اس کا دل غرور سے اٹھا پڑتا تھا۔ آج تو وہ رانی ہے۔ اس پٹھے حال میں بھی رانی ہے! کوئی اس کا منہ دیکھے! رانی بھی لجا جائے گی۔ گوبر کتنا بڑا ہو گیا اور بہن اوڑھ کر کتنا بھلا آدمی سا لگتا ہے۔ دھنیا کے دل میں کبھی بدشگونی کا اندیشہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ گوبر خیریت سے ہے اور خوش ہے۔ آج اسے آنکھوں دیکھ کر گویا اس کی زندگی کی خاک میں گم شدہ جواہر مل گیا۔ مگر ہوری نے منہ پھیر لیا تھا۔ گوبر نے پوچھا ”دادا کو کیا ہوا ہے، اماں؟“

دھنیا گھر کا حال سنا کر اسے رنجیدہ نہ کرنا چاہتی تھی، بولی ”کچھ نہیں ہے بیٹا، ذرا سر میں درد ہے۔ چلو، کپڑے اتارو، ہاتھ منہ دھو۔ کہاں تھے تم اتنے دن؟ بھلا کوئی اس طرح گھر سے بھاگتا ہے؟ اور کبھی ایک چٹنی تک نہ بھیجی۔ آج سال بھر کے پیچھے جا کر سدھ لی ہے۔ تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پھوٹ گئیں۔ یہی آسرا لگا رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے گا اور کب تمہیں دیکھوں گی۔ کوئی کہتا تھا کہ مرج بھاگ گیا اور کوئی ڈمرانا پو بتاتا تھا۔ میری تو سن سن کے جان سوکھی جاتی تھی۔ کہاں رہے اتنے دن؟“

گوبر نے شرماتے ہوئے کہا ”کہیں دور نہیں گیا تھا اماں، یہیں لکھنؤ میں تھا۔“
 ”اور اتنے پاس رہ کر بھی کبھی چٹنی تک نہ لکھی!“

ادھر سونا اور روپا گوبر کا سامان کھول کر چیزیں آپس میں بانٹنے لگی تھیں۔ مگر جھدیا دور کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر آج رکھائی کا شوخ رنگ جھلک رہا ہے۔ گوبر نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے آج وہ اس کا بدلہ لے گی۔ اسامی کو دیکھ کر مہاجن اس سے دو روپے وصول کرنے بھی بے چین ہو رہا ہے جو اس نے بٹے کھاتے میں ڈال دیے تھے۔ بچہ ان چیزوں کی طرف لپک رہا تھا اور چاہتا تھا کہ سب کے سب ایک ساتھ منہ میں بھر لے۔ مگر جھدیا اسے گود سے نہ اتارتی تھی۔

سونا بولی ”بھیا تمہارے لیے آئینہ اور کنگھی لائے ہیں، بھابھی۔“

جھدیا نے رکھائی سے کہا ”مجھے آئینہ کنگھی نہ چاہیے، اپنے پاس رکھے رہیں۔“

روپا نے بچے کی چمکدار ٹوپی نکالی ”اوہو یہ تو چنوک کی ٹوپی ہے!“ اور اسے بچے کے سر پر رکھ دیا۔

جھدیا نے ٹوپی اتار کر پھینک دی اور یکا یک گوبر کو اندر آتے دیکھ کر وہ بچے کو لیے

ہوئے اپنی کوفٹری میں چلی گئی۔

گوبر نے دیکھا کہ سارا سامان کھلا پڑا ہے۔ اس کا جی تو چاہتا ہے کہ پہلے تھنیا سے مل کر اپنا قصور معاف کرائے مگر اندر جانے کی ہمت نہیں پڑی۔ وہیں بیٹھ گیا اور چیزیں نکال نکال کر ہر ایک کو دینے لگا۔ مگر روپا اس لیے پھول گئی کہ اس کے لیے چنل کیوں نہیں آئے، اور سونا اسے چڑھانے لگی ”تو کیا کرے گی چنل لے کر اپنی گڑیا کھیل۔ ہم تیری گڑیا دیکھ کر نہیں روتے، پھر تو میرا چنل دیکھ کر کیوں روتی ہے؟“

مٹھائی بانٹنے کی ذمہ داری دھنیا نے اپنے اوپر لی۔ اتنے دنوں کے بعد لڑکا کسل سے گھر آیا ہے۔ وہ گاؤں بھر میں بائن نہائے گی۔ ایک گلاب جامن روپا کے لیے اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہانڈی میں سامان رکھ دی جائے اور وہ کود کود کر کھائے۔

اب صندوق کھلا اور اس میں سے ساڑھیاں نکلنے لگیں۔ سبھی کنارے دار تھیں۔ جیسی بیٹیواری لالا کے گھر میں پہنی جاتی ہیں۔ مگر ہے بڑی ہلکی! ایسی باریک ساڑھیاں بھلا کتنے دن چلیں گی؟ بڑے آدمی چاہے جتنی باریک ساڑھیاں پہنیں، ان کی عورتوں کو بیٹھنے اور سونے کے سوا اور کون کام ہے؟ یہاں تو کھیت کھلیاں کبھی کچھ ہے! اچھا، ہواری کے لیے دھوتی کے سوا ایک ڈوپٹہ بھی ہے!

دھنیا خوش ہو کر بولی ”یہ تم نے بڑا اچھا کیا بیٹا۔ ان کا دوپٹہ بڑا تار تار ہو گیا تھا۔“ گوبر کو اتنی دیر میں گھر کی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ دھنیا کی ساڑی میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ سونا کی ساڑی سر پر پھٹی ہوئی تھی اور اس میں سے بال دکھائی دے رہے تھے۔ روپا کی دھوتی میں چاروں طرف جھالری لٹک رہی تھی۔ کبھی کے چہرے روکھے سوکھے تھے، چکنائٹ کا بدن پر کہیں نام نہ تھا۔ جدھر دیکھو، افلاس کا دور دورہ تھا۔

لڑکیاں تو ساڑیوں میں مگن تھیں، دھنیا کو لڑکے کے لیے کھانے کی فکر ہوئی۔ گھر میں تھوڑا سا جو کا آٹا شام کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس وقت تو چر بن پر گزر رہا تھا، مگر گوبر اب وہ گوبر تھوڑے ہی ہے۔ اس سے جو کا آٹا کھائے بھی جائے گا؟ پردیس میں نہ جانے کیا کیا کھاتا پیتا رہا ہوگا۔ جا کر دلاری کی دکان سے گیہوں کا آٹا، چاول اور گھی ادھار لائی۔ ادھر مہینوں سے دلاری ایک پیسے کی چیز بھی ادھار نہ دیتی تھی مگر آج اس نے ایک بار بھی نہ پوچھا

کہ پیسے کب دوگی۔

اس نے پوچھا ”گوبر تو کھوب کما کر لایا ہے نا؟“

دھنیا بولی ”ابھی تو کچھ نہیں کھلا دیدی۔ ابھی میں نے بھی کچھ کہنا ٹھیک نہیں سمجھا۔ ہاں سب کے لیے کنارے دار ساڑیاں لایا ہے۔ تمہاری آسیس سے اچھی طرح لوٹ آیا؛ میرے لیے تو یہی بہت ہے۔“

دلاری نے دعا دی ”بھگوان کریں وہ جہاں رہے کسل سے رہے۔ ماں باپ کو اور کیا چاہیے؟ لڑکا سمجھدار ہے اور لڑکوں کی طرح اڑاؤ نہیں ہے۔ ہمارے روپے ابھی نہ ملے تو بیاج تو دے دو۔ دن دن بوجھ بڑھ ہی تو رہا ہے۔“

ادھر سونا چنوکو اس کا فراک اور ٹوپ اور جوتا پہنا کر ”راجا“ بنا رہی تھی۔ بچہ ان چیزوں کو پہننے سے زیادہ ہاتھ میں لے کر کھیلنا اور کھانا پسند کرتا تھا۔ اندر گوبر اور دھنیا میں روٹھنے اور منانے کا ٹانک ہو رہا تھا۔

دھنیا نے حقارت سے دیکھ کر کہا ”مجھے لاکر یہاں بیٹھا دیا، آپ پردیس کی راہ لی۔ پھر نہ کھوج نہ کھبر، کہ مرنے کا وقت ہے یا جیتی ہے۔ سال بھر بعد اب جا کر تمہاری نیند ٹوٹی ہے۔ کتنے بڑے کپڑے ہو تم۔ میں تو سوچتی ہوں کہ تم میرے پیچھے پیچھے آرہے ہو گے اور آپ اڑے تو سال بھر کے پیچھے لوٹے۔ مردوں کا بسواس ہی کیا؟ کہیں کوئی اور تاک لی ہوگی۔ سوچا ہوگا کہ ایک گھر کے لیے ہے، ایک باہر کے لیے بھی ہو جائے۔“

گوبر نے صفائی دی ”دھنیا میں بھگوان کو ساکھی دے کر کہتا ہوں جو میں نے کبھی کسی کی طرف تاکا بھی ہو۔ لاج اور ڈر کے مارے گھر سے بھاگا تو، مگر تیری یاد ایک منٹ کے لیے بھی من سے نہ اترتی تھی۔ اب تو میں نے طے کر لیا ہے کہ تجھے بھی لیتا جاؤں گا۔ اسی لیے آیا ہوں۔ تیرے گھر والے تو بہت بگڑے ہوں گے۔“

”دادا تو میری جان ہی لینے پر اتار دیتے تھے۔“

”جی!“

”تینوں آدمی یہاں چڑھ آئے تھے۔ پر اماں نے ایسی پھنکار بتائی کہ منہ لے کر رہ گئے۔ ہاں ہمارے دونوں بیل کھول لے گئے۔“

”اتنی بڑی جبر دستی اور دادا کچھ بولے نہیں؟“

”دادا اکیلے کس کس سے لڑتے؟ گاؤں کے لوگ تو نہیں لے جانے دیتے تھے پر دادا ہی اپنی بھلمنسی میں آگئے تو اور لوگ کیا کرتے؟“

”تو اب کھیتی باڑی کیسے ہو رہی ہے؟“

”کھیتی باڑی سب ٹوٹ گئی۔ تھوری سی پنڈت مہراج کے ساتھ میں ہے اور اوکھ بولی ہی نہیں گئی۔“

گو بر کی کمر میں اس وقت دوسو روپے تھے۔ اس کی گرمی یوں ہی کم نہ تھی۔ یہ حال سن کر تو اس کے بدن میں آگ ہی لگ گئی بولا ”تو پھر پہلے میں ان ہی سے سمجھتا ہوں۔ ان کی یہ مجال کے میرے دوارے پر سے بیل کھول لے جائیں! یہ ڈاکہ ہے، کھلا ہوا ڈاکہ!۔ تین تین سال کو چلے جائیں گے تینوں۔ یوں نہ دیں گے تو عدالت سے لوں گا۔ سارا گھمنڈ توڑ دوں گا۔“

وہ اسی جوش میں چل پڑا تھا کہ جھینا نے پکڑ لیا اور بولی ”تو چلے جانا، ابھی ایسی جلدی کا ہے کی ہے؟ کچھ آرام کر لو، کچھ کھاپی لو۔ سارا دن تو پڑا ہے، یہاں بڑی بڑی بچائیت ہوئی۔ بچائیت نے اتنی روپے تادوان لگایا اور تیس من اناج اوپر سے اسی میں تو اور تباہی آگئی۔“

سونا بچے کو جوتے اور کپڑے پہنا کر لائی۔ کپڑے پہن کر وہ جیسے بچ راجا ہو گیا تھا۔ گو بر نے اسے گود میں لے لیا۔ مگر اس وقت بچے کے پیار میں اسے خوشی نہ ہوئی۔ اس کا خون ابل اٹھا اور کمر کے روپے آنچ کو زیادہ تیز کر رہے تھے۔ وہ ایک ایک سے سمجھ گیا۔ بچوں کو اس پر تادوان لگانے کا حق ہی کیا ہے؟ کون ہوتا ہے کوئی اس کے بچ میں بولنے والا؟ اس نے ایک عورت رکھ لی تو بچوں کے باپ کا کیا بگڑا؟ اگر اسی بات پر وہ فوجداری میں دعویٰ کر دے تو لوگوں کے ہاتھوں میں جھکڑی پڑ جائیں ساری گرتی تہس نہس ہو گئی۔ کیا سمجھ لیا ہے اسے ان لوگوں نے؟

بچہ اس کی گود میں ذرا سا مسکرایا، پھر زور سے چیخ اٹھا جیسے کوئی ڈراونی چیز دیکھ لی ہو۔ جھینا نے بچے کو اس کی گود سے لے لیا اور بولی ”اب جا کر نہا دھولو۔ کس سوچ میں پڑ گئے؟ یہاں سب سے لڑنے لگو تو ایک دن نباہ نہ ہو۔ جس کے پاس پیسہ ہے وہی بڑا آدمی ہے، وہی بھلا آدمی ہے۔ پیسہ نہ ہو اس پر کبھی رعب جھاتے ہیں۔“

”میرا گدھا پن تھا کہ گھر سے بھاگا ، نہیں تو دیکھتا کہ کیسے کوئی ایک ڈھیلا ڈنڈ لیتا ہے۔“

”شہر کی ہوا کھا آئے ہو تب یہ باتیں سوچنے لگی ہیں ، نہیں گھر سے بھاگتے ہی کیوں؟“

”یہی جی چاہتا ہے کہ لاشی اٹھاؤں اور پیٹھوری ، داتا دین بھنگری ، سب سالوں کو مار گرا دوں اور ان کے پیٹ سے روپے نکال لوں۔“

”روپے کی بہت گرمی چڑھی ہوئی ہے سائت ، لاؤ نکالو ، دیکھوں تو کہ اتنے دن میں کیا کمالائے ہو۔“

اس نے گوبر کی کمر میں ہاتھ لگایا ۔ گوبر کھڑا ہو کر بولا ”ابھی کیا کیا؟ ہاں اب تم چلوگی تو کماؤں گا۔ سال بھر تو سہر کے رنگ ڈھنگ پہچاننے ہی میں لگ گئے۔“

”اماں جانے دیں گی تب تو۔“

”اماں کیوں نہ جانے دیں گی ، ان سے مطلب؟“

”واہ ، میں ان کی راجی بنا کہیں نہ جاؤں گی۔ تم تو چھوڑ کر چلتے بنے اور میرا کون تھا یہاں؟ وہ اگر گھر میں گھسنے نہ دیتیں تو میں کہاں جاتی؟ جب تک جیوں گی ان کا جس گاؤں گی اور تم بھی کیا پردیس ہی کرتے رہو گے؟“

”اور یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا؟ کماؤ اور بھرو ، اس کے سوائے یہاں اور کیا دھرا ہے؟ تھوڑی سی سمجھ ہو اور آدمی کام کرنے سے نہ ڈرے تو وہاں بھوکوں نہیں مر سکتا۔ یہاں تو سمجھ کچھ کام ہی نہیں کرتی۔ دادا کیوں مجھ سے منہ پھلائے ہوئے ہیں؟“

”اپنا بھاگ سرا ہو کہ منہ پھلا کر رہے جاتے ہیں۔ تم نے اپرا دھ تو اتنا بڑا کیا تھا کہ اسی بس میں پا جاتے تو منہ لال کر دیتے۔“

”تو تمہیں بھی بہت گالیاں دیتے ہوں گے؟“

”کبھی نہیں ، بھول کے بھی نہیں!۔ اماں تو پہلے مجڑی تمہیں ، پر دادا نے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ جب بلاتے ہیں تو بڑے پیار سے۔ میرا سر بھی دکھتا ہے تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ اپنے باپ کو دیکھتے تو میں انہیں دیوتا سمجھتی ہوں۔ اماں کو سمجھایا کرتے ہیں کہ بہو کو کچھ نہ کہنا۔ تمہارے اوپر سیکڑوں بار مجڑ چکے ہیں کہ اسے گھر میں بیٹھا کر آپ نہ جانے کہاں

بھاگ گیا۔ آج کل پیسے پیسے کی تنگی ہے۔ اوکھ کے روپے باہر ہی باہر اڑ گئے۔ اب تو مجوری کرنی پڑتی ہے۔ آج بے چارے کھیت میں کام کرتے کرتے بیہوش ہو گئے۔ رونا پینا مچ گیا۔ تب سے پڑے ہیں۔“

گوبر منہ ہاتھ دھو کر بالوں کو خوب سنوار کر گاؤں فتح کرنے نکلا۔ دنوں چچاؤں کے گھر جاکر ”رام رام“ کر آیا۔ پھر اور دوستوں سے ملا۔ گاؤں میں کوئی خاص تبدیلی نہ تھی۔ ہاں پیٹھوری کی ننی بیٹھک بن گئی تھی اور جھنگری سنگھ نے دروازے پر نیا کنواں کھدوایا تھا۔ گوبر کے دل میں مخالفت اور بھی خم ٹھونکنے لگی۔ جس سے ملا اس نے اس کی خاطر کی اور نوجوانوں نے تو اسے اپنا ہیرو بنا لیا اور اس کے ساتھ لکھنؤ جانے کو تیار ہو گئے۔ سال ہی بھر میں وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

دفعۃً جھنگری سنگھ اپنے کنوئیں پر نہاتے ہوئے مل گئے۔ گوبر نکلا مگر نہ سلام کیا نہ بولا۔ وہ ٹھا کر کو دکھا دینا چاہتا تھا کہ میں تمہیں کچھ نہیں سمجھتا۔ جھنگری سنگھ نے خود ہی پوچھا ”کب آئے گوبر؟ بچے میں تو رہے؟ کہیں نوکر تھے لکھنؤ میں؟“

گوبر نے رعوت سے کہا ”لکھنؤ گلامی کرنے نہیں گیا تھا۔ نوکری ہے تو گلامی میں۔ بیوپار کرتا تھا۔“

ٹھا کرنے تعجب سے اسے سر سے پیر تک دیکھا ”کتنا روج کھاتے تھے؟“ گوبر نے چھری کو بھالا بنا کر اس کے اوپر چلایا ”یہی کوئی ڈھائی تین روپے مل جاتے تھے۔ کبھی چمک گئی تو چار بھی مل گئے۔ اس سے بیسی نہیں۔“

جھنگری بہت نوج کھسوٹ کر کے بھی پچیس تیس سے زیادہ نہیں کمپاتے تھے اور یہ منوار لونڈا سو روپے کمانے لگا۔ ان کا سر جھک گیا۔ اب وہ کس دعویٰ سے اس پر رعب جما سکتے ہیں؟ ذات میں وہ ضرور اونچے ہیں مگر ذات کون دیکھتا ہے، اس سے مقابلہ کرنے کا یہ وقت نہیں، اب تو اس کی منت ہی کر کے کچھ کام نکالا جاسکتا ہے بولے ”اتنی کمائی کم نہیں بیٹا، جو کھرج کرتے بنے۔ گاؤں میں تو تین آنے بھی نہیں ملتے بھوانی (ان کے بڑے لڑکے کا نام تھا) کو بھی کہیں کام دلادو تو بھیج دوں۔ نہ پڑھے نہ لکھے، ایک نہ ایک جھگڑا کیے رہتا ہے۔ کہیں مینمی خالی ہو تو کہنا، نہیں تو ساتھ ہی لیتے جانا۔ تمہارا تو ساتھی ہے۔

طلب تھوری ہو' کچھ بات نہیں ہاں چار پیسے کی اوپری گنجائش ہو۔“

گوبر نے گھمنڈ بھری ہنسی کے ساتھ کہا ”یہی اوپری آمدنی کی چاٹ تو آدمی کو بگاڑ دیتی ہے ٹھاکر! پر ہم لوگوں کی عادت ایسی بگڑ گئی ہے کہ جب تک بے ایمانی نہ کریں، پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ لکھنؤ میں منہمی مل سکتی ہے مگر ہر ایک مہاجن ایماندار اور چوکس آدمی چاہتا ہے۔ میں بھوانی کو کسی کے گلے باندھ تو دوں پر پیچھے انھوں نے کہیں ہاتھ لپکایا تو وہ میری گردن پکڑے گا۔ دنیا میں علم کی پوچھ نہیں ہے، ایمان کی پوچھ ہے۔

یہ طمانچہ لگا کر گوبر آگے بڑھ گیا۔ جھنگری دل موس کر رہ گئے۔ ”لوٹنا کتنے گھمنڈ کی باتیں کرتا ہے جیسے دھرم کا اوتار ہی ہو۔“

اسی طرح گوبر نے داتا دین کو بھی رگڑا۔ وہ کھانا کھانے جا رہے تھے کہ گوبر کو دیکھ کر خوش ہو کر بولے ”مجھے میں تو رہے گوبر؟ سنا کہ وہاں کوئی اچھی جگہ پا گئے ہو۔ داتا دین کو بھی کہیں حیلے سے لگا دو نا؟ بھنگ لپی کر پڑے رہنے کے سوائے اور کون کام ہے؟“

گوبر نے بنایا ”تمہارے گھر میں کس بات کی کمی ہے مہراج؟ جس جہان کے یہاں جا کر کھڑے ہو جاؤ' کچھ نہ کچھ مار ہی لاؤ گے۔ پیدا ہونے میں لو، مرنے میں لو، سادی میں لو، گمی میں لو، کھیتی کرتے ہو، لین دین کرتے ہو، دلالی کرتے ہو۔ کسی سے کچھ بھول چوک ہو جائے تو ڈانڈ باندھ لگا کر اس کا گھر لوٹ لیتے ہو، اتنی کمائی میں پیٹ نہیں بھرتا؟ کیا کرو گے بہت سادھن بنو کر؟ کہ ساتھ لے جانے کی کوئی جگت نکالی ہے؟“

داتا دین نے دیکھا کہ گوبر کتنی ڈھٹائی سے بول رہا ہے، ادب لحاظ جیسے بالکل بھول سا گیا ہو۔ ابھی شاید نہیں جانتا کہ باپ میری مجوری کر رہا ہے سچ ہے۔ چھوٹی ندی کو اٹتے دیر نہیں لگتی۔ مگر چہرے پر کدورت نہ آنے دی جیسے بڑے بوڑھے بچوں سے مونچھیں اکھڑا کر بھی ہنستے ہیں، انھوں نے بھی اس طعنہ کو ہنسی میں لیا اور ہنستے ہوئے کہا ”لکھنؤ کی ہوا کھا کے تو بڑا چنٹ ہو گیا ہے گوبر! لا، کیا کما کے لایا ہے؟ کچھ نکال! سچ کہتا ہوں گوبر، تمہاری یاد بہت آتی تھی۔ اب تو رہو گے کچھ دن؟“

”ہاں ابھی تو رہوں گا کچھ دن، ان پنچوں پر دعویٰ کرنا ہے جنھوں نے ڈنڈ کے بہانے میرے ڈیزھ سو روپے ہڑپ لیے ہیں۔ دیکھوں، کون میرا حاکم پانی بند کرتا ہے اور کون برادری مجھے جات باہر کرتی ہے۔“

یہ دھمکی دے کر وہ آگے بڑھا۔ اس کی تمکنت نے اس کے نوجوان عقیدت مندوں کو مرعوب کر دیا تھا۔

ایک نے کہا ”کرو دعویٰ گوہر بھیا! بڑھا کالا سانپ ہے، جس کے کانٹے کا منتر نہیں۔ تم نے اچھی ڈانٹ بتائی۔ پٹواری کے کان بھی ذرا گرم کر دو۔ بڑا پاجی ہے باپ بیٹے میں آگ لگا دے، بھائی بھائی میں آگ لگا دے۔ کارندے سے مل کر آسامیوں کا گلا کاٹا ہے۔ اپنے کھیت پیچھے جوتو، پہلے اس کے کھیت جوت دو۔ اپنی سینچائی پیچھے کرو، پہلے اس کی سینچائی کر دو۔“

گوہر نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”مجھ سے کیا کہتے ہو بھائی، سال بھر میں بھول تھوڑے ہی گیا ہوں۔ یہاں مجھے رہنا ہی نہیں ہے، نہیں تو ایک ایک کو نچا کر چھوڑتا۔ ایک بکے ہوئی دھوم دھام سے مناد اور ہولی کا سوانگ بنا کر ان سیوں کو خوب بھگو بھگو کر لگاؤ۔“

ہولی کا پروگرام بننے لگا۔ خوب بھنگ گھنے، دودھیا بھی اور نمکین بھی۔ اور رنگوں کے ساتھ کالکھ بھی بنے اور کھیوں کے منہ پر کالکھ ہی پوتی جائے۔ ہولی میں کوئی بول ہی کیا سکتا ہے؟ پھر سوانگ نکلے اور پنچوں کی خوب بھد کی جائے روپے پیسے کی کوئی پرواہ نہیں، گوہر بھائی کما کر آئے ہیں۔

گوہر کھانا کھا کر بھولا سے ملنے چلا۔ جب تک اپنی جوڑی لا کر اپنے دروازے پر نہ باندھے، اسے چین نہیں۔ وہ لڑنے مرنے پر آمادہ تھا۔

ہوری نے عاجزانہ لہجے میں کہا ”جھگڑا مت بڑھاؤ بیٹا! بھولا گوئی لے گئے، بھگوان ان کا بھلا کرے! پر روپے تو آتے ہی تھے۔“

گوہر نے بھڑک کر کہا ”دادا، تم بیچ میں نہ بولو، ان کی گائے پچاس کی تھی۔ ہماری جوڑی ڈیڑھ سو میں آئی تھی۔ تین سال ہم نے جوتی۔ پھر بھی سو کی تو تھی ہی۔ وہ اپنے روپے کے لیے دعویٰ کرتے، ڈگری کراتے یا جو چاہتے کرتے، ہمارے دوارے سے جوڑی کیوں کھول لے گئے؟ اور تمہیں کیا کہوں؟ ادھر گوئی کھو بیٹھے اور ادھر ڈیڑھ سو روپے تاوان کے بھرے۔ یہ ہے سدھائی کا پھل! میرے سامنے جوڑی لے جاتے تو دیکھتا۔ تینوں کو بیس دھرتی پر سلا دیتا۔ اور پنچوں سے تو بات تک نہ کرتا۔ دیکھتا کہ کون مجھے برادری سے الگ کیے دیتا ہے۔ مگر تم بیٹھے تاکتے رہے۔“

ہوری نے خطاوار کی طرح سر جھکا لیا مگر دھنیا یہ زیادتی کیسے دیکھ سکتی تھی؟ بولی ”بیٹا تم بھی تو اندھیر کرتے ہو۔ حکہ پانی بند ہو جاتا تو گاؤں میں نباہ ہوتا؟ جوان لڑکی بیٹھی ہے؟ اس کا بھی کہیں ٹھکانا لگتا ہے کہ نہیں؟ مرنے جینے میں آدمی برادری.....“

گوبر نے بات کاٹی ”حکہ پانی سب تو تھا، برادری میں آدمی بھی تھا، پھر میرا بپاہ کیوں نہیں ہوا؟ بولو۔ اس لیے کہ گھر میں روٹی نہ تھی۔ روپے ہوں تو نہ حکہ پانی کا کام ہے نہ بھائی برادری کا۔ دنیا پیسے کی ہے، اور کوئی کچھ نہیں پوچھتا۔“

دھنیا تو بچے کا روتا سن کر اندر چلی گئی اور گوبر بھی گھر سے نکلا۔ ہوری بیٹھا سوچ رہا تھا کہ لڑکے کی سمجھ جیسے کھل گئی ہے۔ کیسی بے لاگ بات کہتا ہے۔ اس کی الٹی سمجھ نے ہوری کے ایمان و اخلاق کو مغلوب کر دیا تھا۔

دھنیا ہوری نے اس سے پوچھا ”میں بھی چلوں؟“
 ”میں لڑائی کرنے نہیں جاتا، دادا! ڈرو نہیں۔ میری طرف تو کانوں ہے، میں کیوں لڑائی کرنے لگا؟“

”میں بھی چلوں تو کوئی ہرج نہیں؟“
 ”ہاں بڑا ہرج ہے، تم بنی بات بگاڑ دو گے۔“
 ہوری چپ ہو گیا اور گوبر چل دیا۔

پانچ منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ دھنیا بچے کو لیے ہوئے باہر نکلی اور بولی کیا گوبر چلا گیا؟ اکیلے؟ میں کہتی ہوں کہ تمہیں بھگوان کبھی بدھی دیں گے یا نہیں۔ بھولا کیا یوں ہی گوئی سادوے گا؟ تینوں اس پر ٹوٹ پڑیں گے؟ باج کی طرح۔ بھگوان ہی کسل کریں۔ اب کس سے کہوں کہ دوڑ کر گوبر کو پکڑے؟ تم سے تو میں ہار گئی۔“

ہوری نے کونے سے ڈنڈا اٹھایا اور گوبر کے پیچھے دوڑا۔ گاؤں کے باہر آکر اس نے نظر دوڑائی، ایک ہلکی سی لکیر افق سے ملی ہوئی دکھائی دی۔ اتنی ہی دیر میں گوبر اتنی دور کیسے نکل گیا۔ ہوری کا دل اسے ملامت کرنے لگا۔ اس نے کیوں گوبر کو روکا نہیں؟ اگر وہ ڈانٹ کر کہہ دیتا کہ بھولا کے گھر مت جاؤ تو گوبر کبھی نہ جاتا۔ اب اس سے دوڑا بھی تو نہیں جاتا۔ وہ ہار کر وہیں بیٹھ گیا اور بولا ”اس کی رچھا کرد مہا بیر سوامی!“

گوبر اس گاؤں میں پہنچا تو کچھ لوگ برگد کے نیچے بیٹھے جوا کھیل رہے تھے۔ اسے

دیکھ کر لوگوں نے سمجھا کہ پولیس کا سپاہی ہے۔ کوزیاں سمیٹ کر بھاگے کہ دفعتاً جنگلی نے پہچان کر کہا ”ارے یہ تو گوہر دھن ہے۔“

گوہر نے دیکھا کہ جنگلی چڑ کی آڑ میں کھڑا جھانک رہا ہے بولا ”ڈر دمٹ جنگلی بھیا میں ہوں۔ رام رام! آج ہی آیا ہوں۔ سوچا کہ چل سب سے ملتا آؤں۔ پھر نہ جانے کب آتا ہو۔ میں تو بھیا تمہارے آسیر باد سے بڑے مجھے میں نکل گیا۔ جس راجا کی نوکری میں ہوں اس نے مجھ سے کہا کہ ایک دو آدمی مل جائیں تو لیتے آتا۔ چوکیداری کے لیے چاہیے۔ میں نے کہا، سرکار ایسے آدمی دوں گا کہ چاہے جان چلی جائے پر وہ میدان سے ہنسنے والے نہیں۔ چاہو تو میرے ساتھ چلو اچھی جگہ ہے۔“

گوہر نے بڑے یقین سے کہا ”بس کچھ چننا مت کرو۔ سب کچھ اپنے ہی ہاتھ میں ہے، جو چاہو گے ہو جائے گا۔ ہم نے سوچا کہ جب گھر ہی میں آدمی ہے تو باہر کیوں جائیں؟“

”کام چاہے چوکیداری کرو چاہے نگادے پر جاؤ۔ نگادے کا کام سب سے اچھا ہے۔ آسامی سے گنٹھ گئے اور ادھر مالک سے آکر کہہ دیا کہ گھر پر ملا ہی نہیں۔ چاہو تو روپے آٹھ آنے روج بنا سکتے ہو۔“

”رہنے کی جگہ بھی ملتی ہے؟“

”جگہ کی کون کمی؟ پورا محل پڑا ہے، پانی کا تل، بجلی کی بتی کسی بات کی کمی نہیں۔ کامتا ہیں کہ کہیں گئے ہیں؟“

”دودھ لے کر گئے ہیں۔ مجھے کوئی ہاٹ نہیں جانے دیتا کہتے ہیں کہ تم تو گانجہ پی جاتے ہو۔ میں اب بہت کم پیتا ہوں بھیا، پر دو پیسے روج تو چاہیے۔ تم کامتا سے کچھ نہ کہنا میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”ہاں ہاں، بے کھٹکے چلو۔ ہوئی کے بعد۔“

”تو پکی رہی۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے بھولا کے دروازے پر جا پہنچے۔ بھولا بیٹھے ہوئے ستلی کات رہے تھے۔ گوہر نے لپک کر ان کے پیچھے چھوئے اور اس وقت اس کا گلا واقعی بھر آیا ”کا کا مجھ سے جو کچھ بھول چوک ہوئی ہو وہ چھما کرو۔“

بھولا نے سلی کا تانا بند کر دیا اور پتھریلی آواز میں بولا۔ ”کام تو تم نے ایسا ہی کیا تھا گوہر کہ تمہارا سر کاٹ لوں تو بھی پاپ نہ لگے گا، مگر اپنے دوارے پر آئے ہو تو اب کیا کہوں۔ جاؤ جیسا میرے ساتھ کیا اس کا ڈنڈ بھگوان دیں گے۔ کب آئے؟“

گوہر نے خوب نمک مرچ لگا کر اپنی تقدیر کے چکنے کا حال سنایا اور جنگلی کو اپنے ساتھ لے جانے کی منظوری چاہی۔ بھولا کو جیسے بے نائکے بردان مل گیا۔ جنگلی گھر پر ایک نہ ایک فساد کرتا رہتا تھا۔ باہر چلا جائے گا تو چار پیسے پیدا کر لے گا۔ نہ کسی کو کچھ دے اپنا بوجھ تو اٹھا لے گا۔

گوہر نے کہا ”نہیں کا کا، بھگوان نے چاہا اور ان سے رہتے بنا تو سال دو سال میں آدمی ہو جائیں گے۔“

”ہاں جب ان سے رہتے بنے۔“

”سر پر آپڑتی ہے تو آدمی آپ سنبھل جاتا ہے۔“

”تو کب تک جانے کا ارادہ ہے؟“

”ہولی کر کے چلا جاؤں گا۔ یہاں کھیتی باڑی کا سلسلہ پھر جمادوں تو بے پھکر ہو جاؤں۔“

”ہوری سے کہو کہ اب بیٹھ کر رام رام چلیں۔“

”کہتا تو ہوں، لیکن جب ان سے بیٹھا رہا جائے۔“

”وہاں کسی بید سے تو تمہاری جان پہچان ہوگی۔ کھانسی بہت آرہی ہے، ہو سکے تو کوئی دوائی بھیج دیتا۔“

”ایک نامی بید تو میرے پڑوس ہی میں رہتے ہیں۔ ان سے حال کہہ کے اور دوا بنوا کر بھیج دوں گا۔ کھانسی رات کو تنگ کرتی ہے کہ دن کو؟“

”نہیں بیٹا، رات کو۔ آنکھ نہیں لگتی۔ نہیں تو وہاں کوئی ڈول ہو تو میں بھی وہیں چل کر رہوں۔ یہاں تو کچھ پرہیز نہیں پڑتا۔“

”روجگار کا مجا تو وہاں ہے کا کا، یہاں کیا ہوگا؟ یہاں روپے کا دس سیر دودھ بھی کوئی نہیں پوچھتا، حلوائیوں کے گلے لگانا پڑتا ہے۔ وہاں پانچ چھ سیر کے بھاد سے چاہو تو ایک گھڑی میں منوں دودھ بیچ لو۔“

جنگلی گوبر کے لیے دودھیا شربت بنانے چلا گیا تھا۔ بھولانے تخیلہ دیکھ کر کہا ' اور بھیا ، اب اس جنجال سے جی ادب گیا ہے۔ جنگلی کا حال دیکھتے ہی ہو کا مٹا دودھ لے کر جاتا ہے۔ چارا پانی کھولنا باندھنا سب مجھے کرنا پڑتا ہے اب تو یہی چاہتا ہوں کہ سکھ سے کہیں ایک روٹی کھاؤں اور پڑا رہوں۔ کہاں تک ہائے ہائے کروں۔ روج لڑائی جھڑا، کس کس کے پاؤں سہلاؤں؟ کھانسی آتی ہے، رات کو اٹھا نہیں جاتا، پر کوئی ایک لوٹا پانی کو بھی نہیں پوچھتا۔ مگھی ٹوٹ گئی ہے پر کسی کو اس کی سدھ نہیں ہے جب میں بناؤں گا تبھی بنے گی۔“

گوبر نے ریکاگت کے ساتھ کہا ”تم چلو کھنڈو کا کا، پانچ سیر کا دودھ پتو کلد۔ کتنے ہی بڑے بڑے آدمیوں سے میری جان پہچان ہے۔ من بھر دودھ کی نکاسی کا جتہ تو میں لیتا ہوں۔ میری چائے کی دکان بھی ہے۔ دس سیر دودھ تو میں ہی روج لیتا ہو۔ تمہیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔“

جنگلی شربت لے آیا۔ گوبر نے ایک گلاس پی کر کہا ”تم سانجھ سیرے چائے کی دوکان ہی پر بیٹھ جاؤ کا کا، تو ایک روپیہ کہیں نہیں گیا۔“

بھولانے ایک منٹ بعد شرماتے ہوئے کہا ”کسے میں بیٹا آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ میں تمہاری گوئی کھول لایا تھا سو لیتے جانا۔ یہاں کون کھیتی باڑی ہوتی ہے۔“

”میں نے تو ایک نئی گوئی ٹھیک کر لی ہے، کا کا۔“

”نہیں نہیں، نئی گوئی لے کر کیا کرو گے؟ یہی لیتے جاؤ۔“

”تو میں تمہارے روپے بھجوادوں گا۔“

”روپے کہیں باہر تھوڑے ہی ہیں بیٹا، گھر ہی میں تو ہیں۔ برادری کا ڈھکوسلا ہے، نہیں تم میں اور ہم میں کون پھرک ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے سکھی ہونا چاہیے تھا کہ تھدیا بھلے گھر

میں ہے اور سکھ سے ہے اور میں اس کے کھون کا پیاسا بن گیا تھا۔“

شام کو گوبر وہاں سے چلا تو گوئی اس کے ساتھ تھی اور جنگلی دی کی دو ہانڈیاں لیے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

(۲۱)

دیہاتوں میں سال کے چھ مہینے کسی نہ کسی جشن میں ڈھول بجیرے بجتے ہی رہتے ہیں۔ ہولی کے ایک ماہ قبل سے ایک ماہ بعد تک پھاگ ہوتا رہتا ہے اسازہ لگتے ہی آٹھا شروع ہو جاتا ہے اور سادون بھادوں میں کجلیاں ہوتی ہیں۔ کجلیوں کے بعد رامائن شروع ہو جاتی ہے۔ سری بھی ان مشاغل سے مستثنیٰ نہیں۔ مہاجن کی دھمکیاں اور کارندوں کی گالیاں اس جشن میں خلل نہیں ڈال سکتیں۔ گھر میں غلہ نہیں ہے، بدن پر کپڑا نہیں ہے، گانڈھ میں پیسہ نہیں ہے، تو کوئی پرواہ نہیں۔ زندگی کی تفریحی رغبتیں تو دہائی نہیں جاسکتیں؛ بلا بے ہوئے تو رہا نہیں جاسکتا۔

یوں تو ہولی میں گانے بجانے کا خاص مقام نوکھے رام کی چوپال تھی۔ وہیں بھنگ چھتی تھی، وہیں رنگ اڑتا تھا، وہیں ناچ ہوتا تھا۔ اس جشن میں کارندے صاحب کے دس پانچ روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ اور کس میں یہ سکت تھی کہ اپنے دروازے پر جلسہ کراتا؟ مگر اب کے گوبر نے گاؤں کے سارے نوجوانوں کو اپنے یہاں کھینچ لیا ہے اور نوکھے رام چوپال خالی پڑی ہے۔ گوبر کے دروازے پر بھنگ گھٹ رہی ہے، پان کے بیڑے لگ رہے ہیں، رنگ گھولا جا رہا ہے۔ فرش بچھا ہوا ہے، گانا ہو رہا ہے اور چوپال میں بالکل سناٹا ہے۔ بھنگ رکھی ہوئی ہے مگر پیسے کون؟ ڈھول بجیرا سب موجود ہے مگر گائے بجائے کون؟ جسے دیکھو گوبر کے دروازے کی طرف دوڑا چلا جا رہا ہے۔ یہاں بھنگ میں گلاب، زعفران اور بادام کی بہار ہے۔ ہاں سیر بھر بادام گوبر خود لایا ہے۔ پیتے ہی کلیجہ تر ہو جاتا ہے اور آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ خمیرہ تمباکو بھی لایا ہے، خاص بسواں کی۔ رنگ میں بھی کیڑا ڈالا گیا ہے۔ وہ روپے کماتا بھی جانتا ہے اور خرچ کرنا بھی۔ گاڑ کر رکھ لو تو کون دیکھتا ہے؟ دولت کی یہی تو زیبائش ہے! اور صرف بھنگ ہی نہیں ہے بلکہ جتنے گویئے ہیں ان سب کا نیوتا بھی ہے اور گاؤں میں نہ ناچنے والوں کی کمی نہیں ہے، نہ گانے والوں کی اور نہ سوانگ بھرنے والوں کی۔ سو بھائی لنگڑوں کی ایسی نقل کرتا ہے کہ کوئی کیا کرے گا، اور آواز کی نقل میں تو

اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ جس کی بولی کہو اس کی بولے، انسان کی بھی حیوان کی بھی! اگر دھر بھی نقل کرنے میں بے نظیر ہے۔ وکیل کی نقل وہ کرے، پٹواری کی نقل وہ کرے، تھانیدار، چپراسی، سیٹھ سبھی کی نقل وہ کر سکتا ہے۔ ہاں غریب کے پاس ویسا ساز و سامان نہیں ہے مگر اب کے گوبر نے اس کے لیے سبھی سامان منگادیا ہے اور اس کی نقلیں دیکھنے کے قابل ہوں گی۔

یہ چرچا اتنا پھیلا کہ شام ہی سے تماشائیوں کا ہجوم ہونے لگا۔ قرب و جوار کے گاؤں سے دیکھنے والوں کی ٹولیاں آنے لگیں اور دس بجتے بجتے تین چار ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ اور جب گردھر، جھنگری سنگھ کا روپ بھرے ہوئے اپنی منڈی کے ساتھ آکھڑا ہوا تو لوگوں کو کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ وہی بے بالوں کا سروہی بڑی بڑی مونچھیں اور وہی بڑھا اور ٹلکتا ہوا پیٹ۔ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور پہلی ٹھکرائن بیٹھی پنکھا جھل رہی ہیں۔ ٹھاکر ٹھکرائن کو عاشقانہ انداز سے دیکھ کر کہتے ہیں۔ ”اب بھی تمہارے اوپر وہ جو بن ہے کہ کوئی جوان بھی دیکھ لے تو تڑپ جائے،، اور ٹھکرائن پھول کر جواب دیتی ہے کہ ”جیسی تو نئی ٹولہ لائے۔“

”اسے تو لایا ہوں تمہاری سیوا کرنے کے لیے وہ تمہاری کیا برابری کرے گی؟“

دوسری بیوی یہ بات سن لیتی ہے اور منہ پھلا کر چلی جاتی ہے۔

دوسرے منظر میں ٹھاکر چار پائی پر لیٹے ہیں اور چھوٹی بیوی منہ پھیرے ہوئے زمین پر بیٹھی ہے۔ ٹھاکر بار بار اس کا منہ اپنی طرف کرنے کی بیکار کوشش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”مجھ سے کیوں روٹھی ہو، میری لاڈلی؟“

”تمہاری لاڈلی جہاں ہو وہاں جاؤ میں تو لونڈی ہوں دوسروں کی سیوا ٹہل کرنے کے

لیے آئی ہوں۔“

”تم میری رانی ہو تمہاری سیوا ٹہل کرنے کے لیے وہ بڑھیا ہے۔“

پہلی ٹھکرائن سن لیتی ہے اور جھاڑو لے کر گھر میں گھستی ہے اور کئی جھاڑو انھیں رسید کرتی

ہے۔ ٹھاکر جان بچا کر بھاگتے ہیں۔

پھر دوسری نقل ہوئی جس میں ٹھاکر نے دس روپے کا تمسک لکھا کر پانچ روپے

دے، بقیہ نذرانہ تحریر، دستوری اور سود میں کاٹ لیے۔

کسان آکر اور ٹھاکر کے پیروں پر گر کر رونے لگتا ہے۔ بڑی مشکل سے ٹھاکر روپے دینے پر راضی ہوئے ہیں۔ جب کاغذ لکھ جاتا ہے اور اسامی کے ہاتھ میں پانچ روپے رکھ دیے جاتے ہیں تو وہ چکر کر پوچھتا ہے ”یہ تو پانچ ہی ہیں، مالک!“

”پانچ نہیں دس ہیں، مگر جا کر گنتا۔“

”نہیں سرکار، پانچ ہیں۔“

”ایک روپیہ نجرانے کا ہوا کہ نہیں؟“

”ہاں سرکار!“

ایک لکھائی کا؟“

”ہاں، سرکار!“

”ایک کاغذ (کاغذ) کا؟“

”ہاں، سرکار!“

”ایک دستوری کا؟“

”ہاں، سرکار!“

”ایک سود کا؟“

”ہاں، سرکار!“

”پانچ ٹکد، دس ہوئے کہ نہیں؟“

”ہاں، سرکار! اب یہ پانچوں بھی میری طرف سے رکھ لیجیے۔“

”کیسا پاگل ہے؟“

”نہیں سرکار۔ ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائین کا نجرانہ ہے اور ایک بڑی ٹھکرائین کا۔ ایک

روپیہ چھوٹی ٹھکرائین کے پان کھانے کو اور ایک روپیہ بڑی ٹھکرائین کے پان کھانے کو۔ رہا ایک

روپیہ، سودہ آپ کے کر یا گرم کے لیے!“

اسی طرح نوکھے رام، پیشوری، داتا دین، سب کی باری باری سے خبر لی گئی۔ اور

بھیتوں میں خواہ کوئی جدت نہ ہو اور نقلیں چاہے پرانی ہوں، مگر گردھر کا ڈھنگ ایسا ہنسانے

والا تھا اور دیکھنے والے اتنے سادہ دل تھے کہ وہ بے بات کی بات میں بھی ہنس پڑتے

تھے۔ ساری رات یہ نقلیں ہوتی رہیں اور ستائے ہوئے دل اس خیالی بدلے سے خوش ہوتے

رہے۔ آخری نقل ختم ہوئی تو کواے بول رہے تھے۔

سویا ہوتے ہی جسے دیکھو، اسی کے زبان پر وہی رات کے گانے، وہی نقل، وہی فقرے، گاؤں کے مکھیے تماشا بن گئے۔ جدھر نکلتے ہیں ادھر ہی دوچار لڑکے پیچھے لگ جاتے ہیں اور وہی فقرے کہتے ہیں۔ جھنگری سنگھ تو دل لگی باز آدی تھے، اسے محض مذاق سمجھے۔ مگر پیشوری میں چڑھنے کی بری عادت تھی اور پنڈت داتا دین تو اتنے تنگ مزاج تھے کہ ذرا سی بات میں فوراً لڑنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ وہ سب سے آدر پانے کے عادی تھے۔ کارندے کی تو بات ہی کیا، رائے صاحب انھیں دیکھتے ہی سر جھکا دیتے تھے۔ ان کی ایسی ہنسی اڑائی جائے اور اسی گاؤں میں، یہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اگر ان میں ”برہمہ تیج“، (برہمی جلال) ہوتا تو ان ڈشٹوں کو بھسم کر دیتے، ایسا سراپ دیتے کے سب کے سب وہیں بھسم ہو جاتے۔ مگر اس کلجک میں تو سراپ کا اثر ہی جاتا رہا۔ پس انھوں نے بھی کلجک والا ہتھیار نکالا۔ ہوری کے دروازے پر گئے اور آنکھیں نکال کر بولے ”کیا آج بھی تم کام کرنے نہ چلو گے ہوری؟ اب تو تم اچھے ہو گئے۔ میرا کتنا کسان ہو گیا، یہ تم نہیں سوچتے۔“ گوبر دیر میں سویا تھا ابھی ابھی اٹھا تھا آنکھیں ملتا ہوا باہر آ رہا تھا کہ داتا دین کی آواز کان میں پڑی۔ پلاگن کرنا تو دور رہا اٹلے اور ہیکڑی دکھا کر بولا ”اب وہ تمھاری مجوری نہ کریں گے ہمیں اپنی اداک بھی تو بوتا ہے۔“

داتا دین نے تمباکو کو پھانکتے ہوئے کہا ”کام کیسے نہیں کریں گے؟ سال کے بیچ میں کام نہیں چھوڑ سکتے۔ جینھ میں چھوڑنا ہو تو چھوڑ دیں کرنا ہو تو کریں۔ اس کے پہلے نہیں چھوڑ سکتے۔“

گوبر نے جمائی لیتے ہوئے کہا ”انھوں نے تمھاری گلامی نہیں لکھی ہے۔ جب تک من تھا کام کیا اب من نہیں ہے، نہیں کریں گے۔ اس میں کوئی جبر دتی نہیں کر سکتا۔“

”تو ہوری کام نہیں کریں گے؟“

”نا!“

”تو ہمارے روپے سود سمیت دے دو۔ تین سال کا سود ہوتا ہے سو روپیہ اصل ملا کر دو سو ہوتے ہیں۔ ہم نے سمجھا تھا کہ تین روپیہ مہینے سو د میں کٹتے جائیں گے پر تمھارا من نہیں ہے تو مت کرو۔ میرے روپے دے دو۔ دھنا سیٹھ بنتے ہو تو دھنا سیٹھ کا کام کرو۔“

ہوری نے عاجزی سے کہا ”تمھاری چاکری سے میں کب انکار کرتا ہوں، مہراج؟ پر ہماری اوکھ بھی تو بونے کو پڑی ہے۔“

گوبر نے باپ کو ڈانٹا ”کیسی چاکری اور کس کی چاکری؟ یہاں کوئی کسی کا چاکر نہیں، سبھی برابر ہیں۔ اچھی دل لگی ہے! کسی کو سو روپے ادھار دیے اور سود میں عمر بھر کام لیتے رہے! اصل جیوں کا تیلوں! یہ مہاجتی نہیں ہے کھون چوسنان ہے!“

”تو روپے دے دو بھیا، لڑائی کا ہے کی ہے؟ میں آنہ روپیہ بیاج لیتا ہوں تمھیں گاؤں گھر کا سبھجہ کر آدھ آنے روپیہ کر دیا تھا۔“

”ہم تو روپیہ سیکڑہ دیں گے، ایک کوڑی بیسی نہیں۔ تمھیں لینا ہو تو لو، نہیں عدالت سے لیتا۔ ایک روپیہ سیکڑا بیاج کم نہیں ہوتا۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ روپے کی گری ہو گئی ہے۔“

”گری انھیں ہوتی ہے جو ایک کا دس لیتے ہیں۔ ہم تو مجور ہیں، ہماری مجوری گری پسینے کی راہ بہہ جاتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے تیل کے لیے تیس روپے دیے تھے اس کے سو ہوئے۔ اور اب سو کے دو سو ہو گئے۔ اسی طرح تم لوگوں نے کسانوں کو لوٹ لوٹ کر مجبور بنا ڈالا اور آپ ان کی جمین کے مالک بن بیٹھے۔ تمیں کے دو سو! کچھ ٹھکانا ہے! کتنے دن ہوئے ہوں گے دادا؟“

ہوری نے غمگین لہجے میں کہا ”یہی آٹھ نو سال ہوئے ہوں گے۔“

گوبر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”نوسال میں تیس روپے کے دو سو۔ ایک روپے کے حساب سے کتنا ہوتا ہے؟“ اس نے زمین پر ایک ٹھیکرے سے حساب لگا کر کہا ”دس سال میں چھتیس روپے ہوتے ہیں۔ اصل ملا کر چھا چھٹھ۔ اُس کے ستر روپے لے لو۔ اس سے بیسی میں ایک کوڑی نہ دوں گا۔“

داتا دین نے ہوری کو بچ میں ڈال کر کہا ”سنئے ہو ہوری، گوبر کا نیاؤ۔ میں اپنے دو سو روپے چھوڑ کر ستر لے لوں، نہیں عدالت کروں۔ اس طرح کا برتاؤ ہوا تو سنسار گئے دن چلے گا؟ اور تم بیٹھے سن رہے ہو! پر یہ سمجھ لو کہ میں براہمن ہوں، میرے روپے جہم کر کے تم چین نہ پاؤ گے۔ میں نے یہ ستر روپے بھی چھوڑے اور عدالت بھی نہ جاؤں گا، اگر میں براہمن ہوں تو اپنے پورے دو سو روپے لے کر دکھا دوں گا اور تم میرے دوارے پر جاؤ گے

اور ہاتھ جوڑ کر دے آؤ گے۔“

داتا دین جھٹائے ہوئے لوٹ پڑے۔ گوہر اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مگر ہوری کے پیٹ میں دھرم کی ہل چل مچی ہوئی تھی۔ اگر ٹھاکر یا بپے کے روپے ہوتے تو اسے زیادہ فکر نہ ہوتی، مگر برہمن کے روپے! اس کی ایک پائی بھی دب گئی تو ہڈی توڑ کر نکلے گی۔ ایٹور نہ کرے برہمن کا کہہ کسی پر گرے۔ گھرانے میں کوئی چلو بھر پانی دینے والا، دیا جلانے والا بھی نہیں رہ جاتا۔ اس کا مذہب پرست دل دہل اٹھا۔ اس نے دوڑ کر پنڈت جی کے پیر پکڑ لیے اور درد بھری آواز میں بولا ”مہراج جب تک میں جیتا ہوں میں تمہاری ایک ایک پائی چکا دوں گا۔ لڑکوں کی باتوں پر مت جاؤ۔ معاملہ تو ہمارے تمہارے بیچ میں ہوا ہے، وہ کون ہوتا ہے؟“

داتا دین ذرا نرم پڑے ”جرا اس کی جبر دستی تو دیکھو، کہتا ہے کہ دو سو روپے کے ستر روپے لو یا عدالت جاؤ، ابھی عدالت کی ہوا نہیں کھائی تھی۔ ایک بار کسی کے پالے پڑ جائیں گے تو پھر یہ تاؤ نہ رہے گا۔ چار دن سہر میں کیا رہے تانا ساہ ہو گئے۔“

”میں تو کہتا ہوں مہراج کہ میں تمہاری ایک ایک پائی چکاؤں گا۔“

”تو کل سے ہمارے یہاں کام کرنے آتا پڑے گا۔“

”اپنی اوکھ بوتا ہے مہراج، نہیں تو تمہارا ہی کام کرتا۔“

داتا دین چلے گئے تو گوہر نے حقارت سے دیکھ کر کہا ”گئے تھے دیوتا کو منانے! تمہیں لوگوں نے ان سکھوں کا سبھاؤ بگاڑ دیا ہے۔ تیس روپے دیے اب دو سو لے گا، اور ڈانٹ اوپر سے بتا دے گا اور تم سے مجوری کراوے گا اور کام کراتے کراتے مار ڈالے گا۔“

ہوری نے اپنے خیال سے سچائی کا پہلو لے کر کہا ”دھرم نہ جھوڑنا چاہیے جینا، اپنی اپنی کرنی اپنے اپنے ساتھ ہے۔ ہم نے جس بیاج پر روپے لیے وہ تو دینے ہی پڑیں گے۔ پھر باصمن ٹھہرے ان کا پیسہ ہمیں بچے گا؟ ایسا مال تو ان ہی لوگوں کو چھتا ہے۔“

گوہر نے تیوریاں چڑھائیں ”دھرم جھوڑنے کو کون کہہ رہا ہے اور کون کہہ رہا ہے کہ باصمن کے پیسے دبالو؟ میں یہی کہتا ہوں کہ اتنا بیاج ہم نہیں دیں گے۔ بنک والے بارہ آنے بیاج لیتے ہیں۔ تم ایک روپیہ لے لو، اور کیا کسی کو لوٹ لو گے؟“

”ان کا رویاں جو دکھی ہوگا۔“

”ہوا کرے۔“

”بیٹا جب تک میں جیتا ہوں مجھے اپنے رستے چلنے دو۔ جب میں مر جاؤں تو تمہارے

جی میں جو آئے وہ کرنا۔“

”تو پھر تمہیں دینا۔ میں تو اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہ ماروں گا۔ میرا گدھا

پن تھا کہ تمہارے بیچ میں بولا۔ تم نے کھایا ہے تو بھرو میں کیوں اپنی جان دوں۔“

یہ کہتا ہوا گوبر اندر چلا گیا۔ تھمیا نے پوچھا ”آج سہرے سہرے دادا سے کیوں

الچھ پڑے؟“

گوبر نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور آخر میں بولا ”ان کے اوپر بن کا بوجھ اسی طرح

بڑھتا جائے گا۔ میں کہاں تک بھروں گا؟ انھوں نے کما کما کر دوسروں کا گھر بھرا ہے۔ میں

کیوں ان کی کھودی ہوئی کھائیں میں پڑوں؟ انھوں نے مجھ سے تو پوچھ کر بن نہیں لیا اور نہ

میرے واسطے لیا، میں اس کا دین دار نہیں ہوں۔“ ادھر کھیلوں میں گوبر کو نیچا دکھانے کی

سازش ہو رہی تھی۔ یہ لوٹڈا شلجے میں نہ کسا گیا تو گاؤں میں اہم مچا دے گا۔ پیادے سے

فرزین ہو گیا ہے نا، ٹیڑھے تو چلے ہی گا۔ نہ جانے کہاں سے اتنا قانون سیکھ آیا ہے، کہتا ہے

کہ روپیہ سیکھ سود سے بیسی نہ دوں گا۔ لینا ہو تو لونہیں عدالت جاؤ۔ رات اس نے سارے

گاؤں کے لونڈوں کو اکٹھا کر کے کتنا اڑتھ کیا۔ مگر کھیلوں میں بھی حسد کی کمی نہ تھی۔ سبھی اپنے

برابری والوں کے مضائقے پر خوش تھے۔ بیٹیوری اور نوکھے رام میں باتیں ہو رہی تھیں۔

بیٹیوری نے کہا ”مگر سبھوں کو گھر گھر کا رتی رتی حال معلوم ہے جھنگری سنگھ کو تو سبھوں نے

ایسا رگڑا کہ کچھ نہ پوچھو۔ دونوں ٹھکرائیوں کی باتیں سن سن کر لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔“

نوکھے رام نے قہقہہ لگا کر کہا ”مگر نکل سچی تھی۔ میں نے کئی بار ان کی چھوٹی بیگم کو

درواجے پر کھڑے ہوئے لونڈوں سے ہنسی کرتے دیکھا ہے۔“

”اور بڑی رانی جی کا جل اور سیندور اور مہاؤر لگا کر جوان بنی رہتی ہیں۔“

”دونوں میں رات دن چھڑی رہتی ہے، جھنگری پکا بے حیا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو

پاگل ہو جاتا۔“

”سنا کہ تمہاری بڑی بھدی نکل کی۔ چماری کے گھر میں بند کرا کے پٹوایا۔“

”میں تو بچہ پر لگان کا دعویٰ کر کے ٹھیک کر دوں گا۔ وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی

سے پالا پڑا تھا!،،

”لگان تو اس نے چکا دیا ہے نا؟“

”پر رسید تو میں نے نہیں دی۔ ثبوت کیا ہے کہ لگان چکا دیا؟ اور یہاں کون حساب کتاب دیکھتا ہے؟ آج ہی پیادہ بھیج کر بلاتا ہوں۔“ ہوری اور گوہر دونوں ا یکھ بونے کے لیے کھیت پہنچ رہے تھے۔ اب کے ا یکھ کی کھیتی ہونے کی امید تو تھی نہیں اس لیے کھیت پرتی پڑا ہوا تھا۔ اب نیل آگئے ہیں تو ا یکھ کیوں نہ ہوئی جائے۔“

مگر دونوں گویا چھتیس کا ہندی عدد (۳۶) بنے ہوئے تھے۔ نہ بولتے تھے نہ تاکتے تھے۔ ہوری بیلوں کو ہانک رہا تھا اور گوہر پر لے رہا تھا۔ سونا اور روپا کھیت میں پانی دوڑا رہی تھیں کہ ان میں جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑا یہ تھا کہ جھگری سنگھ کی چھوٹی ٹھکرائن پہلے خود کھا کر تب ٹھاکر کو کھلاتی ہیں یا ٹھاکر کو کھا کر تب خود کھاتی ہیں۔ سونا کہتی تھی کہ پہلے وہ آپ کھاتی ہیں۔ روپا کی رائے اس کے خلاف تھی۔

روپا نے جرح کی ”اگر وہ آپ پہلے کھاتی ہیں تو کیوں موٹی نہیں ہیں؟ ٹھاکر کیوں موٹے ہیں؟ اگر ٹھاکر ان پر مگر پڑے تو وہ پس جائیں۔“

سونا نے اختلاف کیا ”تو سمجھتی ہے کہ اچھا کھانے سے لوگ موٹے ہو جاتے ہیں۔ اچھا کھانے سے لوگ بلوان ہوتے ہیں، موٹے نہیں ہوتے موٹے ہوتے ہیں ساگ پات کھانے سے۔“

تو ٹھکرائن ٹھاکر سے بلوان ہیں؟“

”اور کیا؟ ابھی اس دن دونوں میں لڑائی ہوئی تو ٹھکرائن نے ٹھاکر کو ایسا ڈھکیلا کہ گھٹنے پھوٹ گئے۔“ تو تو پہلے آپ کھا کر تب جیجا کو کھلائے گی؟“

”اور کیا؟“

”اماں تو پہلے دادا کو کھلاتی ہیں۔“

”تبھی تو جب دیکھو دادا ڈانٹ دیتے ہیں۔ میں بلوان ہو کر اپنے آدمی کو بس میں رکھوں گی۔ تیرا آدمی تجھے پیٹے گا۔ تیری ہڈی توڑ کر رکھ دے گا۔“

روپا روئی صورت بنا کر بولی ”کیوں پیٹے گا؟ میں مار کھانے کا کام ہی نہ کروں گی۔“

”وہ کچھ نہ سنے گا۔ تو نے نک بھی کچھ کہا اور وہ مار چلے گا۔ مارتے مارتے تیری

کھال اڑھیز دے گا۔“

روپا نے مجڑ کر سونا کی ساڑی کو دانٹوں سے پھاڑنے کی کوشش کی اور ایسا نہ کر سکنے پر چٹکیاں کاٹنے لگی۔ سونا نے اور چڑھایا ”وہ تیری ناک بھی کاٹ لے گا۔“

اس پر روپا نے بہن کو دانت سے کاٹ لیا۔ سونا کا بازو لہو لہان ہو گیا اس نے روپا کو زور سے ڈھکیل دیا۔ وہ گر پڑی اور اٹھ کر رونے لگی۔ سونا بھی دانٹوں کے نشان دیکھ کر رو پڑی۔

ان دونوں کا چلانا دیکھ کر گوہر غصے میں بھرا ہوا آیا اور دونوں کو دو دو گھونٹے لگا دیے۔ دونوں روتی ہوئی کھیت سے نکل کر گھر چل دیں۔ سچائی کا کام رک گیا! اس پر باپ بیٹے میں ایک جھڑپ ہو گئی۔ ہوری نے کہا ”پانی کون چلائے گا؟ دوڑے دوڑے گئے اور دونوں کو بھگا آئے اب جا کر منا کیوں نہیں لاتے؟“

”تم ہی نے ان سب کو بگاڑ رکھا ہے۔“

”اس طرح مارنے سے اور بھی بے سرم ہو جائیں گی۔“

”دو جوان کھانا بند کر دو، آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”میں ان کا باپ ہوں کسائی نہیں ہوں۔“

پیر میں ایک بار ٹھوکر لگ جانے کے بعد کسی سبب سے بار بار ٹھوکر لگتی ہے اور کبھی کبھی انگوٹھا پک جاتا ہے اور مہینوں تکلیف دیتا ہے۔ باپ بیٹے کے باہمی خلوص کو آج اسی طرح کی چوٹ لگ گئی تھی اور اب اس پر یہ تیسری چوٹ پڑی۔

گوہر نے گھر جا کر کھیت میں پانی دینے کے لیے جھنڈا کو ساتھ لیا۔ جھنڈا بچے کو لے کر کھیت میں گئی۔ دھنیا اور اس کی دونوں لڑکیاں بیٹھی تاکتی رہیں۔ ماں کو بھی گوہر کی یہ حرکت بری لگی تھی۔ روپا کو مارتا تو برا نہ مانتی، مگر جوان لڑکی کو مارتا، یہ اس کے برداشت کے باہر تھا۔

آج ہی رات کو گوہر نے لکھنؤ لوٹ جانے کا ارادہ کر لیا۔ یہاں اب وہ نہیں رہ سکتا جب گھر میں اس کی کوئی پوچھ نہیں تو وہ کیوں رہے۔ وہ لین دین کے معاملے میں بول نہیں سکتا۔ لڑکیوں کو تنگ مار دیا تو لوگ ایسے جاسے سے باہر ہو گئے جیسے وہ باہر کا آدمی ہے۔ تب وہ اس گھر میں نہ رہے گا۔

دونوں کھانا کھا کر باہر آئے تھے کہ نوکھے رام کے پیادے نے آکر کہا ”چلو، کارندے صاحب نے بلایا ہے۔“

ہوری نے سمجھند سے کہا ”رات کو کیوں بلاتے ہیں، میں تو لگان دے چکا ہوں۔“
 پیادہ بولا۔ ”مجھے تو تمہیں بلانے کا حکم ملا ہے اور جو کچھ کہتا ہو، وہیں چل کر کہنا۔“
 ہوری کا جی نہ چاہتا تھا مگر جانا پڑا۔ گوہر بے تعلقی سے بیٹھا رہا۔ آدھ گھنٹے میں ہوری لوٹا اور چلم بھر کر پینے لگا۔ اب گوہر سے رہا نہ گیا پوچھا ”کس مطلب سے بلایا تھا؟“
 ہوری نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”میں نے پائی پائی لگان چکا دیا اور وہ کہتے ہیں کہ تمہارے اوپر دو سال کی باقی ہے۔ ابھی جس دن میں نے اوکھ نیچی تو پچیس روپے انھیں دیے اور آج وہ دو سال کی باقی نکالتے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں ایک دھیلا نہ دوں گا۔“

گوہر نے پوچھا ”تمہارے پاس رسید تو ہوگی؟“

”رسید کہاں دیتے ہیں۔“

”تو تم بنا رسید لیے روپے کیوں دیتے ہو؟“

”میں کیا جانتا تھا کہ یہ لوگ بے ایمانی کریں گے۔ یہ سب تمہاری کرنی کا پھل ہے۔ تم نے رات کو ان کی ہنسی کی، یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ پانی میں رہ کر مگر سے بیر نہیں کیا جاتا۔ سود لگا کر ستر روپے باقی نکال دیے۔ یہ کس کے گھر سے آویں؟“

گوہر نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا ”تم نے رسید لے لی ہوتی تو میں لاکھ ان کی ہنسی اڑاتا پر وہ تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا لین دین میں تم چوکی سے کیوں کام نہیں لیتے۔ یوں رسید نہیں دیتے تو تم روپیہ ڈاک سے بھیجو۔ یہی تو ہوگا کہ ایک آدھ روپیہ محصول پڑ جائے گا۔ پر اس طرح کی دھاندلی تو نہ ہوگی۔“

”تم نے یہ آگ نہ لگائی ہوتی تو کچھ نہ ہوتا۔ اب تو سب ہی کھیا بگڑے ہوئے ہیں۔ بید کھلی کی دھمکی دے رہے ہیں۔ رام جانے کیسے بیڑا پار لگے گا۔“

”میں جا کر ان سے پوچھتا ہوں۔“

”تم جا کر آگ لگا دو گے۔“

”اگر آگ لگانی پڑے گی تو آگ بھی لگا دوں گا۔ وہ بید کھلی کرتے ہیں تو کریں۔“

میں ان کے ہاتھ میں گنگا جلی رکھ کر قسم کھلاؤں گا۔ تم دم دبا کر بیٹھے رہو۔ میں اس کے پیچھے جان لڑا دوں گا۔ میں کسی کا ایک پیسہ دبا نہ نہیں چاہتا، نہ اپنا ایک پیسہ کھونا چاہتا ہوں۔“

وہ اسی وقت اٹھا اور نوکھے رام کی چوپال میں جا پہنچا۔ دیکھا تو سبھی لیڈروں کی مجلس جمی ہوئی ہے۔ گوہر کو دیکھ کر سب کے سب ہوشیار ہو گئے۔ فضا میں سازش کی سی بو بھری ہوئی تھی۔

گوہر نے پوچھا یہ کیا بات ہے کارندہ صاحب کہ آپ کو دادانے حال تک کا لگان چکا دیا اور آپ دو سال کی باکی نکال رہے ہیں۔ یہ کیسا گول مال ہے؟

نوکھے رام نے مسند پر لیٹ کر رعب دکھاتے ہوئے کہا ”جب تک ہو رہی ہے، میں تم سے لین دین کی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“

گوہر نے چوٹ کھائی ہوئی آواز میں کہا ”تو میں گھر میں کچھ نہیں ہوں؟“

”تم اپنے گھر میں سب کچھ ہو گے، مگر یہاں تم کچھ بھی نہیں ہو۔“

”اچھی بات ہے، آپ بید کھلی کیجیے، اب میں عدالت میں تم سے گنگا جلی اٹھوا کر روپے دوں گا۔ اسی گاؤں سے ایک سو گواہی دلا کر ثابت کر دوں گا کہ تم رسید نہیں دیتے۔ سیدھے سادھے کسان ہیں، کچھ بولتے نہیں، تو تم نے سمجھ لیا کہ سب کاٹھ کے اتو ہیں۔ رائے صاحب وہیں رہتے ہیں جہاں میں رہتا ہوں۔ گاؤں کے سب لوگ انھیں دیکھتے ہوں گے، میں نہیں سمجھتا۔ رتی رتی حال کہوں گا اور دیکھوں گا کہ تم کیسے مجھ سے دوبارہ روپے وصول کیے لیتے ہو۔“

اس کی بات میں سچائی کا بل تھا۔ بزدل لوگوں میں سچائی بھی گونگی ہو جاتی ہے۔ وہی سینٹ جوائینٹ پر چڑھ کر پتھر بن جاتا ہے اگر مٹی پر چڑھا دیا جائے تو مٹی ہو جائے گا۔ گوہر کی بے باکانہ صاف گوئی نے بدینتی کی زرہ توڑ ڈالی جسے پہن کر نوکھے رام کا کزور دل خود کو طاقتور سمجھ رہا تھا۔

نوکھے رام نے جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر کے کہا ”تم اتنا گرم کیوں ہو رہے ہو؟ اس میں گرم ہونے کی کون سی بات ہے؟ اگر ہو رہی ہے تو روپے دیے ہیں تو کہیں نہ کہیں تو لکھ لیے گئے ہوں گے۔ میں کل کاغذ نکال کر دیکھوں گا۔ اب مجھے کچھ کچھ یاد آرہا ہے کہ شاید ہو رہی ہے روپے دیے تھے۔ تم کھاطر جمع رکھو۔ اگر روپے یہاں آگئے ہیں تو کہیں

جانئیں سکتے۔ تم تھوڑے سے روپیوں کے لیے جھوٹ تھوڑے ہی بولو گے اور نہ میں ہی اتنے روپیوں سے امیر ہو جاؤں گا۔“

گوبر نے چوپال سے آکر ہوئی کو ایسے لتاڑا کہ بیچارہ بوڑھا آبدیدہ ہو گیا۔ ”تم تو بچوں سے بھی گمے، بیٹے ہو جو ملی کی میاؤں سن کر رو پڑتے ہیں۔ میں کہاں کہاں تمہیں بچاتا پھروں گا۔ میں تمہیں ستر روپے دیے جاتا ہوں، داتا دین لیں تو دے کر پورے کی رسید لکھا لینا۔ اس کے اوپر تم نے ایک پیسہ بھی دیا تو مجھ سے ایک پیسہ بھی نہ پاؤ گے۔ میں پردیس میں اس لیے نہیں پڑا ہوں کہ تم اپنے کو لٹواتے رہو اور میں کما کما کر بھرتا رہوں۔ میں کل چلا جاؤں گا۔ پر اتنا کہہ دیتا ہوں کہ اب کسی سے ایک پیسہ ادھار نہ لینا اور نہ کسی کو کچھ دینا۔ مگر وہ، دلاری، داتا دین سبھی سے ایک روپیہ سیکڑا سود کراتا ہوگا۔“

دھنیا بھی کھانا کھا کر باہر نکل آئی تھی، بولی ”ابھی کیوں جاتے ہو بیٹا، دو چار دن اور رہ کر ادھ کی بونی کراؤ اور کچھ لین دین کا حساب بھی ٹھیک کر لو تب جانا۔“

گوبر نے شان جماتے ہوئے کہا ”میرا دو تین روپے روج کا گھانا ہوزہا ہے یہ بھی سمجھتی ہو؟ یہاں میں بہت بہت کر کے چار آنے کی مجوری ہی تو کرتا ہوں! اور اب کی میں تھدیا کو بھی لیتا جاؤں گا۔ وہاں مجھے کھانے پینے کی بڑی تکلیف ہوتی ہے۔“

دھنیا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”جیسی تمہاری ایتھا، مگر وہ وہاں کیسے اکیلے گھر سنبھالے گی۔ کیسے بچے کی دیکھ بھال کرے گی؟“

”اب بچے کو دیکھوں کہ اپنا سمجھتا دیکھوں۔ مجھ سے چو لھا نہیں پھونکا جاتا۔“

”لے جانے کو میں نہیں روکتی، مگر پردیس میں بال بچوں کو لے کر، نہ کوئی آگے نہ پیچھے، سوچو کتنا جھنجھٹ ہے۔“

”پردیس میں بھی ساتھی نکل ہی آتے ہیں اماں! اور یہ تو مطلب کی دنیا ہے جس کے ساتھ چار پیسے گم کھاؤ وہی اپنا۔ کھالی ہاتھ تو ماں باپ بھی نہیں پوچھتے۔“

دھنیا اس حملے کو سمجھ گئی۔ وہ سر سے پاؤں تک جل اٹھی۔ بولی ”ماں باپ کو بھی تم نے انھیں پیسے کے یاروں میں سمجھ لیا۔“

”آنکھوں دیکھ رہا ہوں۔“

”نہیں دیکھ رہے ہو۔ ماں باپ کا دل اتنا کڑا نہیں ہوتا، ہاں لڑکے البتہ جہاں چار

پیسے کمانے لگے کہ ماں باپ سے آنکھیں پھیر لیں۔ اسی گاؤں میں ایک دو نہیں، دس بیس کو دکھا دوں۔ ماں باپ ادھار لیتے ہیں تو کس کے لیے؟ لڑکوں، لڑکیوں ہی کے لیے کہ اپنے آرام اڑانے کے لیے؟“

”کیا جانے تم نے کس کے لیے ادھار لیا۔ میں نے تو ایک پیسہ بھی نہیں جانا۔“

”بنا پالے ہی اتنے بڑے ہو گئے؟“

”پالنے میں تمھارا لگا ہی کیا؟ جب تک بچہ تھا دودھ پلا دیا۔ پھر لاوارث کی طرح چھوڑ دیا۔ جو سب نے کھایا وہی میں نے کھایا۔ میرے لیے دودھ نہیں آتا تھا۔ مکھن نہیں آتا تھا۔ اور اب بھی تم چاہتی ہو اور دادا بھی چاہتے ہیں کہ میں سارا بون چکاؤں، لگان دوں اور لڑکیوں کا بیاہ کروں۔ جیسی میری جندگی تمھارا دینا بھرنے کے لیے ہے۔ میرے بھی تو بال بچے ہیں۔“

دھنیا سنائے میں آگئی۔ ایک ہی لمحے میں اس کی زندگی کا میٹھا پینا ٹوٹ سا گیا۔ اب تک وہ دل میں خوش تھی کہ اب اس کا دکھ ولد ر سب دور ہو گیا۔ جب سے گوبر گھر آیا اس کے چہرے پر ہنسی کچھ کھلتی سی رہتی تھی۔ اس کے کلام میں محاس اور برتاؤ میں فراخ دلی آگئی تھی۔ بھگوان نے اس پر دیا کی تھی تو اسے سر جھکا کر چلنا چاہیے۔ اندر کا سکون باہر کی شرافت بن گیا تھا۔ یہ الفاظ جلتے ہوئے بالو کی طرح دل پر پڑے اور چنے کی طرح سارے ارمان جھلس گئے۔ اس کا سارا گھمنڈ چور چور ہو گیا۔ اتنا سن لینے کے بعد اب زندگی میں کیا لطف رہ گیا۔ جس کشش پر بیٹھ کر زندگی کے سمندر کو پار کرتا چاہتی تھی، جب وہی ٹوٹ گئی تو کس سکھ کے لیے جیے؟

لیکن نہیں، اس کا گوبر اتنا مطلبی نہیں ہے۔ اس نے کبھی ماں کی بات کا جواب نہیں دیا، کبھی کسی بات کے لیے ہٹ نہیں کی، جو کچھ روکھا سو کھا مل گیا وہی کھا لیتا تھا۔ وہی بھولا بھالا پریم کا چٹلا آج کیوں ایسی دل توڑنے والی باتیں کہہ رہا ہے؟ اس کی طبیعت کے خلاف تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ماں باپ دونوں ہی اس کا منہ تکتے رہتے ہیں۔ اس نے آپ ہی لین دین کی بات چلائی، ورنہ اس سے کون کہتا کہ ماں باپ کا قرضہ ادا کر؟ ماں باپ کے لیے یہی کیا کم سکھ ہے کہ وہ عزت آبرو کے ساتھ بھلے لوگوں کی طرح کماتا کھاتا ہے۔ اس سے کچھ ہو سکے تو ماں باپ کی مدد کرے نہیں ہو سکتا تو ماں باپ اس کا گھانا نہ دبائیں

گئے۔ جھینا کو لے جانا چاہتا ہے تو خوشی سے لے جائے۔ دھنیا نے صرف اس کی بھلائی کے خیال سے کہا تھا کہ جھینا کو وہاں لے جانے میں اسے جتنا آرام ملے گا، اس سے کہیں زیادہ جھنجھٹ بڑھ جائے گا۔ اس میں ایسی کون سی گلے والی بات تھی کہ وہ اتنا بگڑ اٹھا۔ ہونہ ہو یہ آگ جھینا نے لگائی ہے۔ وہی بیٹھے بیٹھے اسے یہ منتر پڑھا رہی ہے۔ یہاں بناؤ سنگار کرنے کو نہیں ملتا، گھر کا کچھ نہ کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ وہاں روپے پیسے ہاتھ میں آئیں گے تو آرام سے اچھا کھائے گی، اچھا پہنے گی، اور پاؤں پھیلا کر سوئے گی۔ دو آدمیوں کی روٹی پکانے میں کیا لگتا ہے۔ وہاں تو پیسہ چاہیے۔ سنا ہے کہ ہاٹ میں پکائی روٹیاں مل جاتی ہیں۔ یہ سارا بکھیرا اسی نے کھڑا کیا ہے۔ سہر میں کچھ دنوں رہ بھی چکی ہے۔ وہاں کا دانہ پانی منو لگا ہوا ہے۔ یہاں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ یہ بھوند مل گیا تو اسے پھنسا لیا۔ جب یہاں پانچ مہینے کا پیٹ لے کر آئی تھی تب کیسے میاؤں میاؤں کرتی تھی۔ تب یہاں ٹھکانا نہ ملا ہوتا تو آج کہیں بھیک مانگتی پھرتی! یہ اسی نیکی کا بدلہ ہے! اسی چڑیل کے پیچھے ڈنڈ دینا پڑا۔ برادری میں بدنامی ہوئی، کھیتی ٹوٹی، ساری درگت ہوئی، اور آج یہ چڑیل جس پتل میں کھاتی ہے، اسی میں چھید کر رہی ہے۔ پیسے دیکھے تو آنکھ ہو گئی۔ تبھی اینٹھی اینٹھی پھرتی ہے، مجاج نہیں ملتا۔ آج لڑکا چار پیسے کمانے لگا ہے۔ اتنے دنوں بات نہیں پوچھی تو ساس کے پاؤں دبانے کے لیے تیل لیے دوڑتی پھرتی تھی۔ ڈائن اس کی جندگی کی پونجی کو اس کے ہاتھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔

دکھ بھری آواز میں بولی ”یہ منتر تمہیں کون دے رہا ہے بیٹا؟ تم تو ایسے نہ تھے۔ ماں باپ تمہارے ہی ہیں، بہنیں تمہاری ہی ہیں، گھر تمہارا ہی ہے۔ یہاں باہر کا کون ہے؟ اور کیا ہم بہت دن بیٹھے رہیں گے؟ گھر کی آبرو بنائے رہو گے تو تم ہی کو سکھ ہوگا۔ آدمی گھر والوں ہی کے لیے پیسہ کمانا ہے کہ اور کسی کے لیے۔ اپنا پیٹ تو سور بھی پال لیتا ہے۔ میں نہ جانتی تھی کہ جھینا ناگن بن کر ہمیں کوڑے لگی۔“

گو بر نے بگڑ کر کہا ”اماں میں نادان نہیں ہوں کہ جھینا مجھے منتر پڑھائے۔ تم اسے ناکھ کوس رہی ہو۔ تمہاری گرتی کا سارا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا تمہاری مدد کروں گا۔ پر اپنے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈال سکتا۔“

جھینا بھی کوٹھری سے نکل کر بولی ”اماں، جلا ہے کا ٹنڈہ داڑھی پر نہ اتارو۔ کوئی بچہ

نہیں ہے کہ میں پھوڑ لوں گی۔ اپنا برا بھلا سب سمجھتے ہیں۔ آدمی اسی لیے جنم نہیں لیتا کہ عمر بھر تپسیا کرتا ہے اور ایک دن چھوٹے ہاتھ مر جائے۔ سب جینے کا کچھ سکھ چاہتے ہیں۔ سب کا جی چاہتا ہے کہ ہاتھ میں چار پیسے ہوں۔“

دھنیا نے دانت پیس کر کہا ”بہت گیان نہ بگھار! آج تو بھی اپنا بھلا برا سوچنے لاکھ ہو گئی ہے۔ یہاں آکر میرے پاؤں پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔ تب اپنا بھلا برا نہیں سوچا تھا؟ اس گھڑی ہم بھی اپنا بھلا برا سوچنے لگتے تو آج تیرا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔“

اس کے بعد جنگ چھڑ گئی۔ طعنے مہنے، گالی گلوں، جھٹکا فضیحت، کوئی بات نہ بچی۔ گوہر بھی بیچ بیچ میں ڈنک مارتا جاتا تھا۔ ہوری بدست میں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ سونا اور روپا آنگن میں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ دلاری، پنیا اور کئی عورتیں بیچ بچاؤں کرنے آ پہنچی تھیں۔ گرج کے درمیان کبھی کبھی بوندیں بھی پڑ جاتی تھیں۔ دونوں ہی اپنے اپنے بھاگ کو رو رہی تھیں۔ دونوں ہی الیٹور کو کوس رہی تھیں اور دونوں ہی اپنا اپنا بے قصور ہونا ثابت کر رہی تھیں۔ جھڈیا گڑے مردے اکھاڑ رہی تھی۔ آج اسے ہیرا اور سوبھا سے خالص ہمدردی ہو گئی تھی۔ جنھیں دھنیا نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ دھنیا کی آج تک کسی سے نہ پٹی تھی تو جھڈیا سے کیسے پٹ سکتی ہے؟ دھنیا اپنی صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ جھڈیا ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی اور دھنیا آپے سے باہر تھی، شاید اس لیے بھی کہ جھڈیا اب کمانے والے مرد کی بیوی تھی اور اسے خوش رکھنا زیادہ قرین مصلحت تھا۔

تب ہوری نے آنگن میں آکر کہا ”میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں دھنیا، چپ رہ! میرے منہ میں کالکھ نہ لگا۔ ہاں ابھی جی نہ بھرا ہو تو اور سن۔“

دھنیا پھنکارتی ہوئی ادھر دوڑی۔ ”تم بھی موٹی ڈال پکڑنے چلے۔ میں ہی دکھی ہوں، وہ تو میرے اوپر پھول برسا رہی ہے۔“

جنگ کا میدان بدل گیا۔

”جو چھوٹوں کے منہ لگے وہ چھوٹا۔“

دھنیا کس دلیل سے جھڈیا کو چھوٹا مان لے۔

ہوری نے رنجیدگی سے کہا۔ ”اچھا وہ چھوٹی نہیں بڑی سہی۔ جو آدمی نہیں رہنا چاہتا تو کیا اسے باندھ کر رکھے گی؟ ماں باپ کا دھرم ہے لڑکے کو پال پوس کر بڑا کر دینا۔ وہ ہم کر

چکے۔ ان کے ہاتھ پاؤں ہو گئے۔ اب تو کیا چاہتی ہے کہ وہ دانہ چارہ لا کر تجھے کھلا دیں؟
 ماں باپ کا دھرم سولہوں آنے لڑکوں کے ساتھ ہے، لڑکوں کا ماں باپ کے ساتھ ایک آنہ بھی
 دھرم نہیں ہے۔ جو جاتا ہے اسے ایس دے کر بدا کر دے۔ ہمارا بھگوان مالک ہے۔ جو کچھ
 بھومنا بدا ہے بھوگیں گے۔ چالیس سات، سینتالیس اسی طرح روتے دھوتے کٹ گئے، دس
 پانچ سال ہیں وہ بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔“

ادھر گوبر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب اس گھر کا پانی بھی اس کے لیے حرام ہے۔
 ماں ہو کر جب اسے ایسی ایسی باتیں کہے تو اب وہ اس کا منہ بھی نہ دیکھے گا۔
 دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بستر بندھ گیا۔ جھینا نے بھی چندری پھن لی۔ منو بھی ٹوپ اور
 فراک پہن کر راجا بن گیا۔

ہوری نے بھرے گلے سے کہا ”بیٹا، تم سے کچھ کہنے کا منہ تو نہیں ہے، پر جی نہیں
 مانتا۔ کیا جرا جا کر اپنی ابھانگی ماما کے پاؤں چھولو گے تو کچھ برا ہوگا؟ جس ماما کی کوکھ سے
 جنم لیا اور جس کا لبو پی کر پلے ہو کیا اس کے ساتھ اتنا بھی نہیں کر سکتے؟“
 گوبر نے منہ پھیر کر کہا ”میں اسے اپنی ماما نہیں سمجھتا۔“

ہوری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ”جیسی تمہاری اچھا۔ جہاں رہو سکھی رہو۔“
 جھینا نے ساس کے پاس جا کر اس کے پیروں کو آچٹل سے چھوا۔ دھنیا کے منہ سے دعا
 کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا نہیں۔ گوبر بچے کو گود میں لیے آگے
 آگے تھا اور جھینا بستر بغل میں دبائے پیچھے پیچھے۔ ایک چمار کا لڑکا صندوق لیے ہوئے تھا۔
 گاؤں کے کئی مرد گوبر کو پہنچانے گاؤں کے باہر تک گئے۔

اور دھنیا بیٹھی رو رہی تھی جیسے کوئی اس کے دل کو آرے سے چیر رہا ہو۔ اس کی ماما
 اس گھر کی مانند ہو رہی تھی جس میں آگ لگی ہو اور سب کچھ جل کر خاک ہو گیا ہو۔ بیٹھ کر
 رونے کے لیے بھی جگہ نہ پچی ہو۔

ادھر کچھ دنوں سے رائے صاحب کی لڑکی کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی تھی۔ چناؤ بھی سر پر آپہنچا تھا مگر ان سب سے زیادہ ضروری انھیں دیوانی کا ایک مقدمہ دائر کرنا تھا۔ جس کی کورٹ فیس ہی پچاس ہزار ہوتی تھی اور اوپر سے خرچ الگ۔ رائے صاحب کے سالے جو اپنے ریاست کے واحد اکیلے وارث تھے عین شباب میں موٹر کے لڑ جانے میں فوت ہو گئے تھے۔ اور رائے صاحب اپنے کنوارے لڑکے کی طرف سے اس ریاست پر قبضہ پانے کے لیے قانون کی پناہ لینا چاہتے تھے۔ ان کے چچا زاد سالوں نے ریاست پر قبضہ کر رکھا تھا اور رائے صاحب کو ان میں سے کوئی حصہ دینے کو تیار نہ تھے۔ رائے صاحب نے بہت چاہا کہ باہمی مفاہمت و مصالحت ہو جائے اور ان کے چچا زاد سالے معقول گزارہ لے کر ہٹ جائیں، حتیٰ کے وہ ریاست کی نصف آمدنی چھوڑنے پر راضی تھے۔ مگر ان کے سالوں نے کسی طرح کا سمجھوتہ منظور نہیں کیا اور صرف طاقت کے زور سے ریاست میں تحصیل وصول کا شروع کر دی۔ رائے صاحب کو عدالت جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مقدمے میں لاکھوں کا خرچ تھا مگر ریاست بھی بیس لاکھ سے کم مالیت کی نہ تھی۔ وکلاء نے یقینی طور سے کہہ دیا تھا کہ آپ کی شرطیہ ڈگری ہوگی۔ ایسا موقع کون چھوڑ سکتا تھا؟ مشکل یہی تھی کہ یہ تینوں کام ایک ساتھ آپڑے تھے اور انھیں کسی طرح ٹالا نہ جاسکتا تھا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ برس کی ہو گئی تھی اور صرف ہاتھ میں روپیہ نہ رہنے کے سبب اس کا بیاہ ملتا جاتا تھا۔ خرچ کا اندازہ ایک لاکھ تھا۔ جس کے پاس جاتے وہی بڑا سامنہ کھولتا، مگر حال میں ایک بڑا اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ کنور دگ وجے سنگھ کی بیوی تپ دق کی نذر ہو چکی تھی اور کنور صاحب اپنے اجڑے گھر کو جلد سے جلد آباد کر لینا چاہتے تھے۔ سودا بھی کفایت سے طے ہو گیا۔ اور انھیں شکار ہاتھ سے نکل نہ جائے اسی لیے اسی لگن میں بیاہ ہونا نہایت ضروری تھا۔ کنور صاحب لفٹ پرستیوں کے غلام تھے۔ شراب، گانجا، انیون، مدک، چرس، ایسا کوئی نشہ نہ تھا جس کے عادی نہ ہوں اور عیاشی تو انھیں کی زینت ہی ہے۔ وہ انھیں ہی کیا جو عیاش نہ ہو؟ روپیہ اور خرچ ہی کیسے کیا جائے؟

مگر ان سب بری عادتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان میں وہ قابلیت تھی کہ بڑے بڑے علماء ان کا لوہا مانتے تھے۔ موسیقی، ناول، ہاتھ دیکھنا، جوتش، لاشی، کشتی، نشانہ بازی وغیرہ فنوں میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی بڑے دبدبے والے اور بے خوف تھے۔ قومی تحریکوں میں دل کھول کر مدد دیتے تھے مگر پوشیدہ طریقے پر۔ حکام سے یہ بات چھی نہ تھی پھر بھی ان کی بڑی عزت تھی اور سال میں دو ایک بار گورنر صاحب بھی ان کے مہمان ہوتے تھے۔ عرتمیں بتیس سال سے زیادہ نہ تھی اور صحت تو ایسی تھی کہ تنہا ایک بکرا کھا کر ہنم کر ڈالتے تھے۔ رائے صاحب نے سمجھالی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ابھی کنور صاحب سولہواں وغیرہ سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ رائے صاحب نے گفتگو شروع کر دی۔ کنور صاحب کے لیے بیاہ صرف اپنا اثر اور زور بڑھانے کا ذریعہ تھا۔ رائے صاحب کنسل کے ممبر تھے ہی، یوں ہی با اثر تھے۔ قومی جنگ میں اپنا تیاگ دکھلا کر عقیدت عامہ کے مستحق بھی بن چکے تھے۔ بیاہ طے ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو سکتی تھی اور وہ طے بھی ہو گیا۔

رہا چناؤ، وہ سونے کی کٹار تھی جسے نہ اگلنے جتا تھا نہ نکلنے۔ اب تک وہ دو مرتبہ پنے جا چکے تھے اور دونوں ہی دفعہ ایک ایک لاکھ کی چیت پڑ چکی تھی۔ مگر اب کے ایک راجا صاحب اسی علاقے سے کھڑے ہو گئے تھے اور ڈنگے کی چوٹ یہ اعلان کر دیا تھا کہ چاہے ایک ایک دوڑ کو ایک ایک ہزار ہی کیوں نہ دینا پڑے اور چاہے پچاس لاکھ کی ریاست بُرد ہو جائے مگر رائے امر پال سنگھ کو کنسل میں نہ جانے دوں گا اور ان سے حکام نے اپنی امداد کا وعدہ بھی کر رکھا تھا۔ رائے صاحب فہیم تھے، چالاک تھے اور اپنا نفع سمجھتے تھے۔ مگر راجپوت تھے اور رئیس تھے، یہ چیلنج پا کر میدان سے کیسے ہٹ جائیں؟ یوں ان راجا سورج پرتاپ سنگھ نے آکر کہا ہوتا کہ بھائی صاحب آپ تو دو بار کنسل میں جا چکے، اب کے مجھے جانے دیجیے تو شاید رائے صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا ہوتا۔ کنسل کا لالچ اب انھیں نہ تھا مگر اس چیلنج کے سامنے خم ٹھوکنے کے سوا اور کوئی چارا نہ تھا۔ ایک مصلحت اور تھی۔ مسٹر بیٹھانے انھیں یقین دلایا تھا کہ آپ کھڑے ہو جائیے پھر بعد کو راجا صاحب سے ایک لاکھ کی تھیلی لے کر بیٹھ جائیے گا۔ انھوں نے یہاں تک کہاں کہ راجا صاحب بڑی خوشی سے ایک لاکھ دے دیں گے، میری ان سے بات چیت ہو چکی ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ راجا صاحب رائے صاحب کو ہرانے کا انکار نہیں چھوڑتا چاہتے اور اس کا خاص سبب تھا رائے صاحب کی لڑکی کی شادی

کا کنور صاحب سے ملے ہوتا۔ دو ہاٹر گھرانوں کا میل، وہ اپنی شان کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ ادھر رائے صاحب کو سسرالی جائداد ملنے کی قوی امید تھی۔ راجا صاحب کے پہلو میں یہ کاٹنا بھی بری طرح کھٹک رہا تھا۔ کہیں وہ جائداد انہیں مل گئی۔ اور قانون رائے صاحب کے موافق تھا ہی، تب تو راجا صاحب کا ایک مذہم مقابل کھڑا ہو جائے گا۔ پس ان کا یہ فرض تھا کہ وہ رائے صاحب کو کچل ڈالیں اور ان کی عزت خاک میں ملا دیں۔

بے چارے رائے صاحب بڑی سکٹ میں پڑ گئے تھے۔ انہیں یہ شک ہونے لگا تھا کہ مسٹر ٹنٹا نے صرف اپنا مطلب نکالنے کے لیے انہیں دھوکا دیا۔ یہ خبر بھی ملی تھی کہ اب وہ راجا صاحب کے پیروکار ہو گئے ہیں۔ یہ رائے صاحب کے زخم پر نمک تھا۔ انہوں نے کئی بار ٹنٹا کو بلایا تھا مگر وہ یا تو گھر پر ملتے ہی نہ تھے یا آنے کا وعدہ کر کے بھول جاتے تھے۔ آخر آج وہ خود ان سے ملنے کا ارادہ کر کے ان کے یہاں جا پہنچے۔ اتفاق سے ٹنٹا گھر پر مل گئے، مگر رائے صاحب کو پورے گھنٹہ بھر تک ان کا انتظار کرنا پڑا۔ یہ وہی ٹنٹا ہیں جو رائے صاحب کے دروازے پر روزانہ ایک بار حاضری دیا کرتے تھے۔ آج اتنا مزاج ہو گیا ہے، جلتے بیٹھے تھے۔ جیوں ہی مسٹر ٹنٹا آراستہ پیراستہ ہو کر منہ میں سگار دبائے ہوئے کمرے میں آئے اور ہاتھ بڑھایا کہ رائے صاحب نے ہم چھوڑ دیا ”میں گھنٹہ بھر سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں اور آپ نکلے، نکلے اب نکلے ہیں! میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔“

ٹنٹا نے ایک صوفے پر بیٹھ کر بے پروائی سے دھواں اڑاتے ہوئے کہاں ”مجھے اس کا افسوس ہے میں ایک ضروری کام میں لگا ہوا تھا۔ آپ کو فون کر کے مجھ سے وقت ملے کر لینا چاہیے تھا۔“

آگ میں گھی پڑ گیا، مگر رائے صاحب نے غصے کو ضبط کیا۔ وہ لڑنے نہ آئے تھے۔ اس توہین کو پی جانے ہی کا موقع تھا، بولے ”ہاں یہ غلطی ہوئی آج کل آپ کو بہت کم فرصت رہتی ہے شاید؟“

”جی ہاں بہت کم، ورنہ میں ضرور آتا۔“

”میں اسی معاملے کے بارے میں آپ سے پوچھنے آیا تھا۔ سمجھوتے کی تو کوئی امید

نہیں معلوم ہوتی۔ ادھر تو لڑائی کی تیاریاں بہت زوروں سے ہو رہی ہیں۔“

”راجا صاحب کو تو آپ جانتے ہیں، مٹھکو آدمی ہیں۔ پورے سکی! کوئی نہ کوئی دھن

سوار رہتی ہے۔ آج کل یہی دھن ہے کہ رائے صاحب کو نیچا دکھا کر رہیں گے اور انھیں جب ایک دھن سوار ہو جاتی ہے تو پھر کسی کی نہیں سنتے، خواہ کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ کوئی چالیس لاکھ کا بار سر پر ہے پھر بھی وہی دم خم ہے وہی اتاپ شاپ خرچ ہے۔ پیسے کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ نوکروں کی تنخواہ چھ چھ مہینے سے بڑی ہوئی ہے۔ مگر ہیرا محل بن رہا ہے۔ سنگ مرمر کا تو فرش ہے۔ چچی کاری ایسی ہوئی ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ افسروں کے پاس روز ڈالیاں جاتی رہتی ہیں۔ سنا ہے کہ کوئی انگریز مینیجر رکھنے والے ہیں۔“

”پھر آپ نے کیسے کہہ دیا تھا کہ آپ کوئی سمجھوتہ کرا دیں گے۔“

”مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے کیا۔ اس کے سوا میں اور کیا کر سکتا تھا؟ اگر

کوئی شخص اپنے دو چار لاکھ روپے پھونکنے ہی پر تیار ہوا ہے تو میرا کیا بس؟“

رائے صاحب اب غصے کو ضبط نہ کر سکے بولے ”خصوصاً جب اس دو چار لاکھ میں

سے دس بیس ہزار آپ کے ہتھے چڑھنے کی بھی امید ہو۔“

نشا اب کیوں دبتے؟ بولے ”رائے صاحب! اب صاف صاف نہ کہلایئے۔ یہاں نہ

میں سنیا سی ہوں نہ آپ۔ ہم سبھی کچھ نہ کچھ کمانے نکلے ہیں۔ آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے

پورے کی تلاش آپ کو بھی اتنی ہی ہے جتنی مجھے۔ آپ سے میں نے کھڑے ہونے کو کہا۔

آپ ایک لاکھ کے لالچ سے کھڑے ہو گئے۔ اگر گوئی لال ہو جاتی تو آج آپ ایک لاکھ

کے مالک ہوتے اور بلا ایک پائی قرض لیے کنور صاحب سے رشتہ بھی قائم ہو جاتا اور مقدمہ

بھی دائر ہو جاتا۔ مگر آپ کی بد قسمتی سے وہ چال پٹ پڑ گئی۔ جب وہی یوں رہ گئے تو مجھے

کیا ملتا؟ آخر میں نے جھک مار کر ان کی دم پکڑی۔ کسی نہ کسی طرح اس بھرتی کو تیار کرنا

ہی ہے۔“

رائے صاحب کو ایسا غصہ آ رہا تھا کہ اس بد معاش کو گولی مار دیں۔ اسی نے سبز باغ دکھا

کر کھڑا کیا اور اب اپنی صفائی دے رہا ہے، چنپہ میں دھول بھی نہیں لگنے دیتا! مگر اب موقع

وہل دیکھ کر زبان بند کیے ہوئے تھے۔

”تو اب آپ کے کیسے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”ایسا ہی سمجھیے۔“

”میں پچاس ہزار پر بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں۔“

’راجا صاحب کسی طرح نہ مانیں گے۔‘
 ”بچیس ہزار پر تو مان جائیں گے۔“
 ”کوئی امید نہیں۔ وہ صاف کہہ چکے ہیں۔“
 ”وہ کہہ رہے ہیں یا آپ کہہ رہے ہیں؟“
 ”آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں؟“

رائے صاحب نے انکار سے کہا ”میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا مگر اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ آپ چاہتے تو معاملہ ہو جاتا۔“
 ”تو آپ کا خیال ہے کہ میں نے معاملہ نہیں ہونے دیا۔“
 ”نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ چاہتے تو کام ہو جاتا اور میں اس پریشانی میں نہ پڑتا۔“

ٹخا نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تو رائے صاحب اگر آپ صاف کہلاتا چاہتے ہیں تو سنئے۔ اگر آپ نے دس ہزار کا چیک میرے ہاتھ میں رکھ دیا ہوتا تو آج یقیناً آپ ایک لاکھ کے مالک ہوتے۔ آپ شاید چاہتے ہوں گے کہ جب آپ کو راجا صاحب سے روپے مل جاتے تو آپ مجھے ہزار دو ہزار دے دیتے۔ تو میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ آپ راجا صاحب سے روپے لے کر سیلف میں رکھتے اور مجھے انگوٹھا دکھا دیتے۔ پھر میں آپ کا کیا بنا لیتا، بتلائیے؟ کہیں نالش فریاد بھی تو نہ کر سکتا تھا۔“
 رائے صاحب نے جیسے چوٹ کھائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ ”آپ مجھے اتنا بے ایمان سمجھتے ہیں؟“

ٹخا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ”اسے بے ایمانی کون سمجھتا ہے۔ آج کل یہی چالاکي ہے کہ کیسے دوسروں کو الو بنایا جائے۔ یہی کامیاب طریقہ ہے اور آپ اس کے استاد کامل ہیں۔“

رائے صاحب نے مضی باندھ کر کہا ”میں؟“

”جی ہاں، آپ! پہلے چنآؤ میں میں نے آپ کی دل و جان سے بیرونی کی تو آپ نے بڑی مشکل سے رو دھو کر پانچ سو روپے دیے۔ پھر دوسرے چنآؤ میں آپ نے ایک سڑا گلا، ٹوٹا پھوٹا، موٹر دے کر اپنا گلا چھڑایا۔ دودھ کا جلا چھاجھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔“

وہ کمرے سے نکل گئے اور موٹر لانے کا حکم دیا۔

رائے صاحب کا خون کھول رہا تھا۔ اس بد تہذیبی کی بھی کوئی حد ہے۔ ایک تو گھنہ بھر انتظار کرایا اور اب اتنی بے مروتی سے پیش آکر انہیں جبراً گھر سے نکال رہا ہے۔ اگر انہیں یقین ہوتا کہ وہ مسٹر نٹھا کو پنک سکتے ہیں تو کبھی نہ چوکتے۔ مگر نٹھا قدامت میں ان سے سوا گناتے۔ جب نٹھا نے ہارن بجایا تو یہ بھی آکر اپنے موٹر میں بیٹھے اور سیدھے مسٹر کھنا کے پاس پہنچے۔

نوبج رہے تھے مگر کھنا صاحب خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے۔ وہ دو بجے رات کے پہلے کبھی نہ سوتے تھے اور پھر قدرتا نوبجے دن تک سوتے رہتے تھے۔ یہاں بھی رائے صاحب کو آدھا گھنہ بیٹھنا پڑا۔ اس لیے جب کوئی ساڑھے نو بجے مسٹر کھنا مسکراتے ہوئے نکلے تو رائے صاحب نے ڈانٹ بتائی ”اچھا، اب سرکار کی آنکھ کھلی ہے، ساڑھے نو بجے! ردپے جمع کر لیے ہیں نا، جیسی یہ بے فکری ہے۔ میری طرح تعلقدار ہوتے تو اب تک آپ بھی کسی کے دروازے پر کھڑے ہوتے۔ بیٹھے بیٹھے سر میں چکر آجاتا۔“

کھنا نے سگرت کیس ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”رات سونے میں بڑی دیر ہوگئی۔ اس وقت کدھر سے آرہے ہیں؟“

رائے صاحب نے تھوڑے لفظوں میں اپنی ساری مشکلیں بیان کر دیں۔ دل میں کھنا کو گالیاں دیتے تھے جو ان کا ہم سبق ہو کر بھی ہمیشہ ان کو ٹھگنے کی فکر میں لگا رہتا تھا، مگر سامنے ان کی خوشامد کرتے تھے۔

کھنا نے ایسی شکل بنائی گویا انہیں بڑی تشویش ہو گئی ہو لے ”میری تو صلاح ہے کہ آپ چناؤ کو گولی ماریں اور اپنے سالوں پر مقدمہ دائر کریں۔ رہا بیاہ وہ تو تین دن کا تماشا ہے۔ جس کے لیے زیر بار ہونا مناسب نہیں۔ کنور صاحب میرے دوستوں میں ہیں۔ پس لینے دینے کا کوئی سوال نہ اٹھنے پائے گا۔“

رائے صاحب نے طنز سے کہا۔ ”آپ یہ بھولے جاتے ہیں، مسٹر کھنا میں بینکر نہیں، تعلقدار ہوں۔ کنور صاحب جہیز نہیں مانگتے انہیں ایسٹور نے سب کچھ دیا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ میری ایک اکیلی لڑکی ہے اور اس کی ماں مر چکی ہے۔ وہ آج زندہ ہوتی تو شاید یہ سارا گھر لٹا کر بھی اس کا جی نہ بھرتا، اس وقت میں شاید اسے ہاتھ روک کر خرچ

کرنے کا حکم دیتا۔ لیکن اب تو میں ماں بھی ہوں ، باپ بھی ہوں ۔ اور اگر مجھے اپنے دل کا خون بھی نکال کر دینا پڑے تو میں خوشی سے دے دوں گا۔ اس مجرد زندگی میں میں نے اولاد کی محبت ہی میں اپنے دل کی پیاس بجھائی ہے ۔ دونوں بچوں کے پیار ہی میں میں نے متوفیہ کے متعلق اپنی دفا شعاری کو نبھایا ہے ۔ میرے لیے ناممکن ہے کہ اس مبارک موقع پر اپنے دل کے ارمان نہ نکالوں ۔ میں اپنے دل کو تو سمجھا سکتا ہوں مگر جسے میں متوفیہ کا حکم سمجھتا ہوں اسے نہیں ٹال سکتا ۔ اور چٹاؤ کے میدان سے بھاگنا بھی میرے لیے ناممکن ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہاروں گا ، راجا صاحب سے میرا کوئی مقابلہ نہیں ہے ، پھر راجا صاحب کو اتنا ضرور دکھا دینا چاہتا ہوں کہ امر پال سنگھ کوئی ملائم چارہ نہیں ہے ۔“

”اور مقدمہ دائر کرنا تو ضروری ہی ہے؟“

”اسی پر تو سارا دار و مدار ہے۔ اب آپ بتائیے کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

”میرے ڈائریکٹروں کا اس بارے میں جو حکم ہے ، آپ جانتے ہی ہیں اور راجا صاحب بھی ہمارے ڈائریکٹر ہیں ، یہ بھی آپ کو معلوم ہی ہے ۔ پچھلا روپیہ وصول کرنے کے لیے بار بار تاکید ہو رہی ہے ، کوئی ، نیا معاملہ تو شاید ہی ہو سکے۔“

رائے صاحب نے اداس ہو کر کہا ”آپ تو میری ناؤ ہی ڈبائے دیتے ہیں مسٹر کھنا!“

”میرے پاس جو کچھ اپنا ہے وہ آپ کا ہے ، مگر بینک کے معاملے میں تو مجھے مالکوں کا حکم ہی ماننا پڑے گا۔“

”اگر یہ جائیداد ہاتھ آگئی ، جس کی مجھے پوری امید ہے تو میں پائی پائی ادا کر دوں گا۔“

”آپ بتلا سکتے ہیں اس وقت آپ پر کتنا قرض ہے؟“ رائے صاحب نے پچھتے ہوئے کہا ”پانچ لاکھ سمجھیے ، کچھ کم ہی ہوگا۔“ کھنا نے بے اعتباری سے کہا ”یا تو آپ کو یاد نہیں یا آپ چھپا رہے ہیں۔“

رائے صاحب نے زور دے کر کہا ”جی نہیں ، نہ میں بھولا ہوں اور نہ چھپا رہا ہوں۔ میری جائیداد اس وقت کم از کم پچاس لاکھ کی ہے اور سسرال کی جائیداد بھی اس سے کم نہیں ہے۔ اتنی جائیداد پر دس پانچ لاکھ کا بار کچھ نہ ہونے کے برابر ہے۔“

”مگر یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سسرال والی جائیداد پر قرض نہیں ہے؟“

”جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بالکل بے داغ ہے۔“

”اور مجھے خبر ملی ہے کہ اس پر دس لاکھ سے کم کا بار نہیں ہے۔ اس جائداد پر تو اب کچھ ملنے سے رہا۔ آپ کی جائداد پر بھی میرے خیال میں دس لاکھ سے کم قرض نہیں ہے۔ اور وہ جائداد اب پچاس لاکھ کی نہیں بلکہ مشکل سے پچیس لاکھ کی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی بینک آپ کو قرض نہیں دے سکتا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ آپ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ ایک ہلکی سی ٹھوکر آپ کو تخت الٹی میں پہنچا سکتی ہے۔ آپ کو اس وقت بہت سنبھل کر چلنا چاہیے۔“

رائے صاحب نے ان کا ہاتھ اپنی طرف کھینچ کر کہا ”میرے دوست! یہ سب میں خوب سمجھتا ہوں! مگر زندگی کی ٹریجیڈی اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ کا دل جو کام نہیں کرنا چاہتا وہ آپ کو کرنا پڑے گا۔ آپ کو اس موقع پر میرے لیے کم سے کم دو لاکھ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“

کھنا نے لباسائس لے کر کہا ”مائی گاڈ، دو لاکھ! غیر ممکن، بالکل غیر ممکن!“

”میں تمہارے دروازے پر سر پٹک کر جان دے دوں گا۔ کھنا، اتنا سمجھ لو! میں نے تمہارے بھروسے یہ سارے منصوبے باندھے ہیں۔ اگر تم نے مایوس کر دیا تو شاید مجھے زہر کھالینا پڑے۔ میں سورج پر تاپ سنگھ کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیک سکتا۔ لڑکی کا بیاہ! ابھی دو چار مہینے ٹل سکتا ہے، مقدمہ دائر کرنے کے لیے بھی ابھی کافی وقت ہے، مگر چناؤ سر پر آگیا ہے اور مجھے سب سے بڑی فکر یہی ہے۔“

کھنا نے حیرت سے کہا ”تو آپ چناؤ میں دو لاکھ لگا دیں گے؟“

”چناؤ کا سوال نہیں ہے بھئی، یہ عزت کا سوال ہے۔ کیا آپ کی رائے میں میری عزت دو لاکھ کی بھی نہیں؟ میری ساری ریاست بک جائے اس کا غم نہیں، مگر سورج پر تاپ سنگھ کو میں آسانی سے جیتنے نہ دوں گا۔“

کھنا نے ایک منٹ دھواں اڑانے کے بعد کہا ”بینک کی جو حالت ہے وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔ بینک نے ایک طرح سے لین دین کا کام بند کر دیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ساتھ خاص رعایت کی جائے مگر کاروبار تو کاروبار ہی ہے، یہ آپ کو معلوم ہے۔ میرا کمیشن کیا رہے گا؟ مجھے آپ کے لیے خاص طور پر سفارش کرنی پڑے گی۔ راجا صاحب کا دوسرے ڈائریکٹروں پر کتنا اثر ہے، یہ بھی آپ جانتے ہیں۔ مجھے ان کے

خلاف پارٹی بندی کرنی پڑے گی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ میری ذمہ داری ہی پر معاملہ ہوگا۔“
 رائے صاحب کا چہرا اتر گیا۔ کھانا ان کے خاص دوستوں میں تھے۔ ساتھ کے پڑھے ہوئے، ساتھ کے بیٹھنے والے۔ اور وہ ان سے کمیشن کی امید رکھتے ہیں۔ اتنی بے مروتی! آخر وہ جوائنٹے دنوں سے کھانا کی خوشامد کرتے آتے ہیں۔ تو کس دن کے لیے؟ باغ میں پھل ہوں۔ ترکاریاں ہوں، سب سے پہلے کھانا کے یہاں بھیجتے ہیں۔ کوئی جشن ہو، کوئی جلسہ ہو، سب سے پہلے کھانا کو مدعو کرتے ہیں اس کا یہ جواب ہے!

اداس ہو کر بولے ”آپ کی جو مرضی ہو، مگر میں آپ کو اپنا بھائی سمجھتا تھا۔“
 کھانا نے ممنوعیت کے لہجے سے کہا ”یہ آپ کی مہربانی ہے۔ میں نے بھی آپ کو ہمیشہ اپنا بڑا بھائی سمجھا ہے اور اب بھی سمجھتا ہوں۔ کبھی آپ سے کوئی پردہ نہیں رکھا۔ مگر کاروباری فضا ایک اور ہی فضا ہے۔ جہاں کوئی کسی کا دوست نہیں کوئی کسی کا بھائی نہیں۔ جس طرح میں بھائی کے ناتے آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے دوسروں سے زیادہ کمیشن دیجیے اسی طرح آپ کو بھی میرے کمیشن میں رعایت کے لیے اصرار نہ کرنا چاہیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں جتنی رعایت آپ کے ساتھ کر سکتا ہوں اتنی کروں گا۔ آپ دفتر کے وقت آئیں اور لکھا پڑھی کر دیں۔ بس معاملہ ختم! آپ نے کچھ اور سنا؟ مہتا صاحب آج کل مالتی پر بے طرح ریتھے ہوئے ہیں۔ ساری فلاسفری نکل گئی۔ دن میں ایک دو بار ضرور حاضری دے آتے ہیں۔ اور شام کو اکثر دونوں ساتھ ساتھ گھومنے نکلتے ہیں۔ یہ تو میری ہی شان تھی کہ کبھی مالتی کے دروازے پر سلام کرنے نہ گیا۔ شاید اب اسی کی کٹر نکال رہی ہے۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ جو کچھ ہیں مسٹر کھانا ہیں۔ کوئی کام ہوتا تو کھانا کے پاس دوڑی آتیں۔ جب روپوں کی ضرورت پڑتی تو کھانا کے نام رقعہ آتا۔ اور کہاں اب مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہیں۔ میں نے خاص انھیں کے لیے فرانس سے ایک گھڑی منگوائی تھی۔ بڑے شوق سے لے کر گیا مگر نہیں لی۔ ابھی کل میوؤں کی ڈالی بھیجی تھی۔ کشمیر سے منگوائے تھے۔ واپس کر دی۔ مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ آدمی اتنی جلدی کیسے بدل جاتا ہے۔“

رائے صاحب دل میں تو ان کی بے قدری پر خوش ہوئے مگر ہمدردی دکھا کر بولے ”اگر یہ بھی مان لیں کہ مہتا سے انھیں محبت ہوگئی ہے تو قطع مراسم کی تو کوئی وجہ نہیں ہے۔“
 کھانا نے افسوس سے کہا ”یہی تو رنج ہے۔ بھائی صاحب! یہ تو میں شروع ہی سے

جانتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ نہیں آسکتیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں کبھی اس کے دھوکے میں نہیں پڑا کہ مالتی کو مجھ سے محبت ہے۔ محبت جیسی چیز ان سے مل سکتی ہے، اس کی میں نے کبھی امید ہی نہیں کی۔ میں تو صرف ان کے روپ کا پجاری ہوں۔ سانپ میں زہر ہے، یہ جانتے ہوئے بھی ہم اسے دودھ پلاتے ہیں۔ طوطے سے زیادہ بے مروت جانور اور کون ہوگا؟ لیکن اس کی شکل اور اس کی آواز پر گرویدہ ہو کر لوگ اسے پالتے ہیں اور سونے کے بنجرے میں رکھتے ہیں۔ میرے لیے بھی مالتی اسی طوطے کی طرح تھی۔ افسوس یہی ہے کہ میں پہلے کیوں نہ ہوشیار ہو گیا۔ اس کے لیے میں نے ہزاروں روپے برباد کر دیے۔ بھائی صاحب۔ جب اس کا پرزہ پہنچا میں نے فوراً روپے بھیجے۔ میرا موٹر آج بھی اس کی سواری میں ہے۔ اس کے پیچھے میں نے اپنا گھر چوٹ کر دیا۔ بھائی صاحب، دل میں جتنا رس تھا وہ دوسر کی طرف اتنی زور سے بہا کہ دوسری طرف کا باغ بالکل خشک ہی رہ گیا۔ برسوں ہو گئے کہ میں نے گوبندی سے کھول کر بات بھی نہیں کی۔ اس کی خدمت اور محبت اور قربانی سے مجھے اسی طرح بدمزگی ہو گئی تھی جیسے بدبضی کے مریض کو حلوے سے ہو جاتی ہے۔ مالتی مجھے اسی طرح نچاتی تھی۔ جیسے مداری بندر کو نچاتا ہے، اور میں خوشی سے ناچتا تھا۔ وہ میری توہین کرتی تھی اور میں خوش ہو کر ہنستا تھا۔ وہ مجھ پر حکومت کرتی تھی اور میں سر جھکاتا تھا۔ اس نے کبھی مجھے منہ نہیں لگایا۔ یہ میں مانتا ہوں، اس نے کبھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی، یہ بھی سچ ہے۔ پھر بھی پیٹنے کی طرح اس کے چہرے کی چمک پر جان دیتا تھا۔ اور اب وہ مجھ سے اخلاق کا برتاؤ بھی نہیں کر سکتی! لیکن صاحب، میں یہ کہہ دیتا ہوں کہ کھنا چپ بیٹھنے والا آدمی نہیں ہے۔ اس کے رقبے میرے پاس محفوظ ہیں۔ میں اس سے ایک ایک پائی وصول کر لوں گا۔ اور ڈاکٹر مہتا کو تو میں لکھنؤ سے نکال کر دم لوں گا ان کا یہاں رہنا ناممکن کر دوں گا۔

اسی وقت ہارن کی آواز آئی اور ایک لمبے میں مسٹر مہتا آکر کھڑے ہو گئے۔ گورا چٹا رنگ، صحت کی سرفی گالوں پر چمکتی ہوئی، لمبی اپکن، چوڑی دار پاجامہ اور سنہری عینک، شرافت کے اوتار سے معلوم ہوتے تھے۔ کھانے اٹھ کر ہاتھ ملایا ”آئیے مسٹر مہتا، آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔“

مہتا نے دونوں صاحبوں سے ہاتھ ملا کر کہا ”بڑی اچھی ساعت گھر سے چلا تھا کہ آپ

دونوں صاحبوں سے ایک ہی جگہ ملاقات ہو گئی۔ آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ یہاں عورتوں کے لیے ایک ورزش گاہ بنانے کی تجویز ہو رہی ہے۔ مس مالتی اس کمیٹی کی صدر ہیں۔ اندازہ کیا گیا کہ اس کی تعمیر میں دو لاکھ روپے لگیں گے۔ شہر میں اب اس کی کتنی ضرورت ہے، یہ آپ لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ چندہ دینے والوں میں آپ دونوں صاحبوں کا نام سب سے اوپر ہو۔ مس مالتی خود آنے والی تھیں، مگر آج اللہ کے والد کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اس لیے نہیں آسکیں۔“

انھوں نے چندے کے فہرست رائے صاحب کے ہاتھ میں رکھ دی۔ پہلا نام راجا سورج پرتاپ سنگھ کا تھا۔ سامنے پانچ ہزار روپے کی رقم درج تھی۔ اس کے بعد کنور دگ و بے سنگھ کے تین ہزار روپے تھے۔ اس کے بعد کئی رقمیں اتنی ہی یا کچھ کم تھیں۔ مالتی نے پانچ سو روپے دیے تھے۔ اور ڈاکٹر مہتا نے ایک ہزار۔

رائے صاحب نے شرم کر کہا ”کوئی چالیس ہزار تو آپ لوگوں نے کر ہی لیے۔“ مہتا فخر سے بولے ”یہ آپ سب لوگوں کی مہربانی ہے، اور یہ صرف تین گھنٹے کی محنت کا نتیجہ ہے۔ راجا سورج پرتاپ سنگھ نے شاید ہی کسی رفاہ کے کام میں حصہ لیا ہو۔ مگر آج انھوں نے بلا کہے سنے چمک لکھ دیا۔ ملک میں بیداری ہے۔ پبلک کسی بھی نیک کام میں مدد دینے کو تیار ہے۔ صرف اسے یقین ہونا چاہیے کہ اس کی خیرات کا جائز استعمال ہوگا۔ آپ سے مجھے بڑی امید ہے، مسٹر کھنا۔“

کھنا نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں ایسے فضول کاموں میں نہیں پڑتا۔ نہ جانے آپ لوگ مغرب کی غلامی میں کہاں تک بڑھتے جائیں گے۔ یوں ہی عورتوں کو خانہ داری سے نفرت ہو رہی ہے اور ورزش کی دھن سوار ہوئی تو وہ اور بھی کہیں کی نہ رہیں گی۔ جو عورت گھر کا کام کرتی ہے۔ اس کے لیے ورزش کی ضرورت نہیں، اور جو گھر کا کوئی کام نہیں کرتی اور صرف عیش و آرام میں محو ہے۔ اس کی ورزش کے لیے چندہ دینا میں ادھر م سمجھتا ہوں۔“

مہتا ذرا بھی بے دل نہیں ہوئے۔ ”ایسی حالت میں آپ سے کچھ مانگوں گا بھی نہیں۔ جس تجویز میں ہمارا یقین نہ ہو اس میں کسی طرح کی امداد دینا واقعی ادھر م ہے۔ آپ تو مسٹر کھنا سے متفق نہیں ہیں۔ رائے صاحب؟“

رائے صاحب بڑے سوچ میں پڑے ہوئے تھے۔ سورج پرتاپ سنگھ کے پانچ ہزار ان

کا حوصلہ پست کیے ڈالتے تھے۔ چونک کر بولے ”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“

”میں نے کہا آپ تو اس کام میں اعداد دینا ادھر نہیں سمجھتے؟“

”جس کام میں آپ شریک ہیں وہ دھرم ہے یا ادھرم میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔“

”میں چاہتا ہوں کہ آپ خود غور کریں اور اگر آپ اس تجویز کو سانج کے لیے مفید

سمجھیں تو اس میں مدد دیں۔“

”مسٹر کھنا کا طرز عمل مجھے پسند آیا۔“

کھنا بولے ”میں تو صاف کہتا ہوں اسی لیے بدنام ہوں۔“

رائے صاحب نے کمزور مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”مجھ میں تو سوچنے کی سکت نہیں ہے۔

شرقا کی تقلید کرنا ہی میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔“

”تو لکھیے کوئی اچھی رقم۔“

”جو کیسے وہ لکھ دوں۔“

”جو آپ کی خوشی۔“

”آپ جو کیسے وہ لکھ دوں۔“

”تو دو ہزار سے کم کیا لکھیے گا۔“

رائے صاحب نے مجروح لہجے میں کہا ”تو آپ کی نگاہ میں میری یہی حیثیت ہے؟“

انھوں نے قلم اٹھایا اور اپنا نام لکھ کر اس کے آگے پانچ ہزار لکھ دیے۔ مہتا نے

فہرست ان کے ہاتھ سے لے لی! مگر انھیں اتنا رنج ہوا کہ رائے صاحب کا شکریہ بھی ادا

کرنا بھول گئے۔ رائے صاحب کو چندے کی فہرست دکھا کر انھوں نے برا کیا، یہ سوچ کر

انھیں افسوس ہوا۔

مسٹر کھنا نے انھیں ترحمانہ نظر سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں ”کتنے بڑے گدھے ہوتم!“

دفعتاً مہتا، رائے صاحب کے گلے سے لپٹ گئے۔ اور زور سے بولے ”رائے

صاحب کے لیے تالیاں! ہپ ہپ ہڑا!“

کھنا نے کھیا کر کہا ”یہ لوگ راجے مہراجے ٹھہرے، یہی ان کاموں میں دان نہ دیں

تو کون دے؟“

مہتا بولے ”میں تو آپ کو راجاؤں کا راجا سمجھتا ہوں۔ آپ ان پر حکومت کرتے

ہیں۔ ان کی چوٹی آپ کے ہاتھ میں ہے۔“
 رائے صاحب خوش ہو گئے۔ ”یہ آپ نے بڑے معرکے کی بات کہی، مہتاجی، اصلی
 راجا تو ہمارے میٹرک لوگ ہیں۔“

مہتا نے کھانا کی خوشامد کا پہلا اختیار کیا ”مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے، کھنا جی۔
 آپ ابھی اس کام میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو نہ سہی، لیکن کبھی نہ کبھی آپ ضرور شرکت
 کریں گے۔ امیروں کی بدولت ہی ہماری بڑی بڑی تحریکیں چل رہی ہیں۔ قومی تحریکوں کو دو
 تین سال تک اس دھوم دھام سے کس نے چلایا؟ اتنے دھرم شالے اور پاٹھ شالے کون بنا
 رہا ہے؟ آج دنیا کی حکومت کی باگ ڈور میٹکروں کے ہاتھ میں ہے۔ سرکاریوں ان کے ہاتھ
 کا کھلوتا ہیں۔ میں ابھی آپ سے نا امید نہیں ہوں۔ جو شخص قوم کے لیے جیل جاسکتا ہے
 اس کے لیے دو چار ہزار خرچ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم نے طے کیا ہے کہ اس عمارت
 کا بنیادی پتھر گوہندی دیوی کے ہاتھوں سے رکھا جائے۔ ہم دونوں جلد ہی گورنر صاحب سے
 بھی ملیں گے اور مجھے یقین ہے کہ ہمیں ان کی مدد مل جائے گی۔ لیڈی ولسن کو نسوانی تحریکوں
 سے کتنی ہمدردی ہے، یہ آپ جانتے ہیں راجا صاحب اور دیگر اصحاب کی بھی رائے تھی کہ
 لیڈی ولسن ہی سے سنگ بنیاد رکھا جائے مگر بالآخر یہی طے ہوا کہ یہ سب کام کسی اپنی ہی بہن
 کے ہاتھوں ہونا چاہیے۔ آپ کم از کم اس موقع پر تشریف لائیں گے ضرور؟“

کھانا نے مضحکہ اڑایا ”ہاں جب لارڈ ولسن آئیں گے تو میرا پہنچنا لازمی ہی ہے۔ اس
 طرح آپ بہت سے رئیسوں کو پھنسا لیں گے۔ آپ لوگوں کو نکلنے بھی خوب سمجھتے ہیں۔ اور
 ہمارے رئیس ہیں بھی۔ اسی لائق انھیں آلو بنا کر موٹا جاسکتا ہے۔“

”جب روپیہ ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے تو اپنے لیے نکلنے کا راستہ تلاش کرتا ہے۔
 یوں نہ نکل پائے تو قمار بازی میں جائے گا۔ گھوڑ دوڑ میں جائے گا، اینٹ پتھر میں جائے گا
 یا عیاشی میں جائے گا۔“

گیارہ بجنے کو تھے۔ کھانا صاحب کے دفتر کا وقت آگیا۔ مہتا چلے گئے۔
 رائے صاحب بھی اٹھے کہ کھانا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا لیا۔ ”نہیں، آپ ذرا بیٹھیے۔ آپ
 دیکھ رہے ہیں کہ مہتا نے مجھے اس بری طرح پھانسا ہے کہ نکلنے کی کوئی سبیل ہی نہیں رہی۔
 گوہندی سے سنگ بنیاد رکھائیں گے۔ ایسی حالت میں میرا الگ رہنا مضحکہ انگیز ہے یا نہیں؟

گوبندی کیسے رضا مند ہوگئی ، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا ، اور مالتی نے اسے کیسے برداشت کر لیا یہ سمجھنا اور بھی مشکل ہے ۔ آپ کا کیا خیال ہے ، اس میں کوئی راز ہے یا نہیں ؟ ”

رائے صاحب نے اچانک جواب دیا ۔ ” ایسے معاملوں میں عورت کو ہمیشہ اپنے خاوند سے صلاح لے لینی چاہیے ۔ ”

کھنانے رائے صاحب کو تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا ۔ ” ان ہی باتوں پر گوبندی سے میرا جی جلتا ہے اور اس پر لوگ مجھی کو برا کہتے ہیں ۔ آپ ہی سوچئے مجھے ان جھگڑوں سے کیا واسطہ ؟ ان میں تو وہ بڑے جس کے پاس فالتو روپیہ ہو ، فالتو وقت ہو ، اور نام و نمود کی ہوس ہو ۔ ہوتا یہی ہے کہ دو چار لوگ سکرٹری اور انڈر سکرٹری اور پریسیڈنٹ اور وائس پریسیڈنٹ بن کر افسروں کو دعویتیں دیں گے ، ان کے منظور نظر بنیں گے ۔ اور یونیورسٹی کی چھوڑیوں کو جمع کر کے گل چھڑے اڑائیں گے ۔ ورزش تو صرف دکھانے کے دانت ہیں ۔ ایسی تحریکوں میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے اور یہی ہوگا ، اور آئو بنیں گے ہم اور ہمارے بھائی جو دولتمند کہلاتے ہیں ، اور یہ سب گوبندی کے سبب ! ”

وہ ایک بار کرسی سے اٹھے ، پھر بیٹھ گئے ۔ گوبندی پر ان کا غصہ بڑھ رہا تھا ۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر کہا ۔ ” میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے ۔ ”

رائے صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی ۔ ” کچھ نہیں آپ گوبندی دیوی سے صاف کہہ دیں کہ تم مہتا کو انکار کا خط لکھ دو چلو چھٹی ہوئی ۔ میں تو لاگ ڈانٹ میں پھنس گیا ۔ آپ کیوں پھنسیں ؟ ”

کھنانے لمحہ بھر اس تجویز پر غور کر کے کہا ۔ ” لیکن سوچئے تو کتنا مشکل کام ہے ، لیڈی ولن سے اس کا ذکر آچکا ہوگا ۔ سارے شہر میں خبر پھیل گئی ہوگی اور شاید آج اخباروں میں نکل جائے ۔ یہ سب مالتی کی شرارت ہے ۔ اسی نے مجھے زچ کرنے کا یہ ذہن نکالا ہے ۔ ”

” ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے ۔ ”

” وہ مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہے ۔ ”

” آپ بنیاد رکھنے کے ایک روز قبل باہر چلے جائیے گا ۔ ”

” مشکل ہے ، رائے صاحب کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی ۔ اس دن تو مجھے

ہیضہ بھی ہو جائے تو مجھے وہاں جانا پڑے گا ۔ ”

رائے صاحب آس باندھے کل آنے کا وعدہ کر جیوں ہی باہر نکلے کہ کھانا نے اندر جا کر گوبندی کو آڑے ہاتھوں لیا ”تم نے اس درزش گاہ کی بنیاد رکھنا کیوں منظور کیا۔“ گوبندی کیسے کہے کہ یہ وقار پا کر وہ دل میں کتنا خوش ہو رہی تھی، اس موقع کے لیے کتنی توجہ سے اپنی تقریر لکھ رہی تھی اور ایک جوشیلی نظم بھی تیار کی تھی۔ اس نے دل میں سمجھا تھا کہ یہ تجویز منظور کر کے وہ کھانا کو خوش کر دے گی۔ اس کی توقیر تو اس کے شوہر ہی کی توقیر ہے۔ کھانا کو اس میں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے، اس کا اسے سان گمان بھی نہ تھا۔ ادھر کئی دنوں سے شوہر کو کچھ مہربان دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھنے لگا تھا وہ اپنی تقریر سے اور اپنی نظم سے لوگوں کو محو بنانے کا خواب دیکھ رہی تھی۔

یہ سوال سنا اور کھانا کی صورت دیکھی تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔ خطاوار کی طرح بولی ”ڈاکٹر مہتا نے اصرار کیا تو میں نے منظور کر لیا۔“

”ڈاکٹر مہتا تمہیں کنوئیں میں گرنے کو کہیں تو شاید اتنی خوشی سے نہ تیار ہوگی۔“

گوبندی کی زبان بند!

”تمہیں جب ایٹور نے عقل نہیں دی تو کیوں مجھ سے نہیں پوچھ لیا؟ مہتا اور مالتی دونوں یہ چال چل کر مجھ سے دوچار ہزار روپے اینٹھنے کی فکر میں ہیں اور میں نے ٹھان لی ہے کہ ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔ تم آج ہی مہتا کو انکار کا خط لکھ دو۔“

گوبندی نے ایک لمحہ سوچ کر کہا ”تمہیں لکھ دوتا۔“

”میں کیوں لکھوں؟ بات کی تم نے اور لکھوں میں؟“

”ڈاکٹر صاحب سبب پوچھیں گے تو کیا بتاؤں گی؟“

”بتانا اپنا سر اور کیا! میں اس عشرت گاہ کو ایک کوڑی بھی نہیں دینا چاہتا۔“

”تو تمہیں کچھ دینے کو کون کہتا ہے؟“

کھانا نے ہونٹ چبا کر کہا ”کیسی بیوقوفوں کی سی بات کرتی ہو تم۔ تم وہاں بنیاد رکھو گی

اور کچھ دوں گی نہیں تو دنیا کیا کہے گی؟“

گوبندی نے جیسے عین کی نوک پر کہا ”اچھی بات ہے لکھ دوں گی۔“

”آج ہی لکھنا ہوگا۔“

”کہہ تو دیا لکھ دوں گی۔“

کھنا باہر آئے اور ڈاک دیکھنے لگے۔ انھیں دفتر جانے میں دیر ہو جاتی تھی تو چہرہ اسی گھر ہی پر ڈاک دے جاتا تھا۔ شکر گراں ہو گئی ہے۔ کھنا کا چہرہ کھل اٹھا۔ دوسرا خط کھولا اکیچہ کا نرخ مقرر کرنے کے لیے جو کمیٹی بنی تھی۔ اس نے طے کر دیا کہ ایسی بندش نہیں کی جاسکتی۔ دھت تری کی! وہ پہلے ہی یہی بات کہہ رہے تھے مگر اس انگوہتری نے غل چاکر جبراً کمیٹی بنائی۔ آخر بچے کے منہ پر تھپڑ لگا۔ یہ مل والوں اور کسانوں کے درمیان کا معاملہ ہے۔ سرکار اس میں دخل دینے والی کون؟

دفترتاس مالتی موٹر سے اتری، کنول کی طرح گھٹنہ، چراغ کی طرح روشن، زندہ دلی، اور خوشی کی مورت سی، بے خوف، بے فکر، گویا اسے یقین ہے کہ دنیا میں اس کے لیے عزت و راحت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کھنا نے برآمدے میں آکر خیر مقدم کیا۔

مالتی نے پوچھا ”کیا یہاں مہتا آئے تھے؟“

”ہاں آئے تو تھے۔“

”کچھ کہا، کہاں جا رہے ہیں؟“

”یہ تو کچھ نہیں کہا۔“

”جانے کہاں غوطہ لگا گئے۔ میں چاروں طرف گھوم آئی۔ آپ نے ورزش گاہ کے لیے

کتنا دیا؟“

”کھنا نے خطاوارانہ کہا ”میں نے ابھی اس معاملے کو سمجھا ہی نہیں۔“

”مالتی نے بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف تیز تیز دیکھا گویا سوچ رہی تھی کہ اس پر رحم کرے یا غصہ۔ بولی ”اس میں سمجھنے کی کیا بات تھی؟ اور سمجھ لیتے تو آگے پیچھے، اس وقت تو کچھ دینے کی بات تھی۔ میں نے مہتا کو جبراً یہاں بھیجا، بے چارے ڈر رہے تھے کہ آپ نہ جانے کیا جواب دیں۔ آپ کے اس بخل کا کیا نتیجہ ہوگا، آپ جانتے ہیں؟ یہاں کی تجارت پیشہ جماعت سے کچھ نہ ملے گا۔ آپ نے شاید مجھے ذلیل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ سب کی رائے تھی کہ لیڈی ولسن بنیادی پتھر رکھیں۔ میں نے گوبندی دیوی کی جانبداری کی اور لڑکر سب کو راضی کیا۔ اب آپ فرماتے ہیں کہ آپ نے اس معاملے کو سمجھا ہی نہیں! آپ بینک کی چھبڑگیاں سمجھتے ہیں مگر اتنی موٹی بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ مجھے شرمندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اچھی بات ہے، یہی سہی۔“

مالتی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ کھنا گھبرائے۔ ساری اکڑ جاتی رہی مگر اس کے ساتھ انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر وہ کانٹوں میں الجھ گئے ہیں تو مالتی دلدل میں پھنس گئی، اگر ان کی تھیلیوں پر سنکٹ آپڑا ہے تو مالتی کی عزت پر، جو تھیلیوں سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ تب ان کا دل مالتی کی اس درگت پر کیوں نہ خوش ہو؟ انھوں نے مالتی کو آردب میں ڈال دیا تھا۔ اور اگرچہ وہ اسے ناراض کر دینے کی ہمت کھو چکے تھے مگر دو چار کھری کھری باتیں کہہ سنانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتے تھے۔ یہ بھی دکھا دینا چاہتے تھے کہ میں بالکل احمق نہیں ہوں۔ اس کا راستہ روک کر بولے ”تم مجھ پر اتنی مہربان ہو گئی ہو اس پر مجھے حیرت ہو رہی ہے، مالتی!“

مالتی نے ابروؤں کو سکیز کر کہا ”میں اس کا مطلب نہیں سمجھی۔“
 ”کیا اب میرے ساتھ تمھارا وہی برتاؤ ہے جو کچھ دنوں پہلے تھا۔“
 ”میں تو اس میں کوئی فرق نہیں دیکھتی۔“
 ”لیکن میں تو زمین آسمان کا فرق دیکھ رہا ہوں۔“

”اچھا مان لوں کہ تمھارا قیاس ٹھیک ہے تو پھر؟ میں تم سے ایک نیک کام میں مدد مانگنے آئی ہوں۔ اپنے سلوک کی آزمائش کے لیے نہیں اور اگر تم سمجھتے ہو کہ کچھ چندہ دے کر تم نیک نامی اور شکرے کے سوا کچھ اور پاسکتے ہو تو یہ تمھاری خام خیالی ہے۔“
 کھنا ہار گئے۔ وہ ایسے تنگ گوشے میں پھنس گئے تھے۔ جہاں ادھر ادھر ہلنے کی بھی محبت نہ تھی۔ کیا وہ اس سے یہ کہنے کی جرات رکھتے ہیں کہ میں نے اب تک تمھارے اوپر ہزاروں روپے الٹا دیے تو کیا اس کا یہی صلہ ہے؟ شرم سے ان کا منہ ذرا سا نکل آیا جیسے سکڑ گیا ہو۔ جھینچے ہوئے بولے ”میرا مطلب یہ نہ تھا، مالتی! تم بالکل غلط سمجھیں۔“

مالتی نے ہنستے ہوئے کہا ”خدا کرے میں نے غلط سمجھا ہو۔ کیونکہ اگر میں اسے سچ سمجھوں گی تو تمھارے سائے سے بھی بھاگوں گی۔ میں خوبصورت ہوں اور تم بھی میرے بہت سے چاہنے والوں میں ایک ہو۔ میری مہربانی تھی کہ جہاں میں اوروں کے تحفے لوٹا دیتی تھی وہاں تمھاری معمولی معمولی سے چیزیں بھی شکرے کے ساتھ قبول کر لیتی تھی، اور ضرورت پڑنے پر تم سے روپے بھی مانگ لیتی تھی۔ اگر تم نے اپنے روپے کے نئے میں اس کا کوئی دوسرا مطلب نکال لیا تو میں تمھیں معاف کر دوں گی، یہ مردوں کی سرشت ہے اور تم اس سے

مستفی نہیں ہو۔ مگر یہ سمجھ لو کہ روپے نے آج تک کسی عورت کے دل پر فتح نہیں پائی اور نہ کبھی پائے گی۔“

کھنا ایک ایک لفظ پر گویا گز گز بھر نیچے دھنستے جا رہے تھے، اور زیادہ چوٹ سہنے کی ان میں سکت نہ رہی۔ شرمندہ ہو کر بولے ”مالتی! میں تمہارے پیروں پڑتا ہوں، اب اور ذلیل نہ کرو۔ اور نہ سہی تو دوستانہ برتاؤ تو قائم رہنے دو۔“

یہ کہتے ہوئے انھوں نے دروازے سے چلوں کی کتاب نکالی اور ایک ہزار کا چک لکھ کر ڈرتے ڈرتے مالتی کی طرف بڑھا دیا۔

مالتی نے چک لے کر بے دردانہ طنز سے کہا ”یہ میرے سلوک کی قیمت ہے یا ورزش گاہ کا چندہ ہے؟“

کھنا ابدیدہ ہو کر بولے ”اب میری جان بخشو، مالتی! کیوں میرے منہ میں کالگھ لگا رہی ہو۔“

مالتی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ”دیکھا، ڈانٹ بھی بتائی اور ایک ہزار روپے بھی وصول کیے! اب تم کبھی شرارت نہ کرو گے؟“
 ”کبھی نہیں، جیتے جی کبھی نہیں!“
 ”کان پکڑو۔“

”کان پکڑتا ہوں۔ مگر اب تم مجھ پر رحم کر کے چلی جاؤ اور مجھے تھپے میں بیٹھ کر سوچنے اور رونے دو۔ تم نے آج میری زندگی کی ساری خوشی“

مالتی اور زور سے ہنسی۔ ”دیکھو کھنا، تم میری بڑی توہین کر رہے ہو، اور تم جانتے ہو کہ حسن توہین نہیں سہ سکتا۔ میں نے تمہارے ساتھ نیکی کی اور تم اسے بدی سمجھ رہے ہو۔“
 کھنا احتجاج کی نگاہوں سے دیکھ کر بولے ”تم نے میرے ساتھ نیکی کی ہے یا اپنی چھری سے میرا گلا کاٹا ہے؟“

”کیوں؟ میں تمہیں لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھر رہی تھی۔ تم اس لوٹ سے بچ گئے۔“
 ”کیوں زخم پر نمک چھڑک رہی ہو مالتی؟ میں بھی آدمی ہوں۔“

مالتی نے اس طرح کھنا کی طرف دیکھا، گویا یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ آدمی ہیں یا نہیں؟ بولی ”ابھی تو مجھے اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔“

”تم بالکل معما ہو، آج یہ ثابت ہو گیا۔“
”ہاں تمہارے لیے معما ہوں اور معما ہی رہوں گی۔“
یہ کہتی ہوئی وہ چڑیا کی طرح ایک دم اڑ گئی اور کھنا سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگے کہ یہ
صرف دکھاوا ہے یا اس کا سچا روپ !

گوبر اور جھنیا کے چلے جانے پر گھر سنسان رہنے لگا۔ دھنیا کو بار بار منو کی یاد آتی رہتی ہے۔ بچے کی ماں تو جھنیا تھی مگر اس کی پرورش دھنیا ہی کرتی تھی۔ وہی اسے اٹھن ملتی، کاجل لگاتی، سلاتی اور جب کام سے فرصت ملتی تو پیار کرتی۔ محبت کا یہ نشہ ہی اس کی تکلیفوں کو بھلاتا رہتا تھا۔ اسی کا بھولا بھالا مکھن سا چہرہ دیکھ کر وہ اپنی ساری فکر بھول جاتی اور محبت بھرے گھمنڈ سے اس کا دل پھول اٹھتا۔ وہ زندگی کا سہارا اب نہ تھا۔ اس کا سونے کا کھٹولا دیکھ کر وہ رو اٹھتی۔ وہ تعویذ جو تمام پریشانیوں اور نا امیدیوں سے اسے بچاتا تھا، اس سے چھن گیا تھا۔ وہ بار بار سوچتی اس نے جھنیا کے ساتھ ایسی کون سی برائی کی تھی جس کی اس نے یہ سزا دی۔ ڈائن نے آکر اس کے سونے کا سا گھر مٹی میں ملا دیا۔ گوبر نے تو کبھی اس کی بات کا جواب بھی نہ دیا تھا۔ اسی رات نے اسے پھوڑا اور اب وہاں لے جا کر نہ جانے کون کون سے ناچ نچائے گی۔ یہیں وہ بچے کی کون بہت پرواہ کرتی تھی اسے تو اپنی مٹی، کاجل اور مائیک چوٹی ہی سے فرصت نہ ملتی تھی، بچے کی دیکھ بھال کیا کرے گی؟ بے چارہ اکیلا دھرتی پر بڑا روتا ہوگا۔ بے چارہ ایک دن بھی تو سکھ سے نہیں رہنے پاتا۔ کبھی کھانسی، کبھی دست، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ یہ سوچ سوچ کر اسے جھنیا پر غصہ آتا۔ گوبر کے لیے اب بھی اس کے دل میں وہی ماما تھی۔ اسی چڑیل نے اسے کچھ کھلا پلا کر اسے اپنے بس میں کر لیا۔ ایسی جادو ٹوتا جاننے والی نہ ہوتی تو یہ ٹوتا کیسے کرتی؟ کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ بھو جانیوں کی لاتیں کھاتی تھی۔ یہ بدھول گیا تو آج رانی ہو گئی۔

ہوری نے چڑھ کر کہا ”جب دیکھو تب جھنیا کو ہی دوکھ دیتی رہتی ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ جب اپنا سوتا کھوٹا تو سنار کا کیا دوس؟ گوبر اسے نہ لے جاتا تو کیا آپ سے آپ چلی جاتی؟ سہر کا دانہ پانی لگنے سے لوٹے کی آنکھ بدل گئی۔ ایسا کیوں نہیں سمجھ لیتی۔“

دھنیا گرج اٹھی ”اچھا چپ رہو۔ تم ہی نے رات کو سر پر چڑھا رکھا تھا نہیں میں پہلے ہی دن جھاڑو مار کر نکال دیتی۔“

کھلیان میں کٹا ہوا اناج جمع ہو گیا تھا۔ ہوری بیلوں کو لیے اسے مانڈنے جا رہا تھا۔ منہ پھیر کر بولا ”مان لے کہ بہو نے گوبر کو پھوڑ ہی لیا تو تو اتنا کڑھتی کیوں ہے؟ جو ساری دنیا کرتی ہے وہی گوبر نے بھی کیا۔ اب اس کے بچے ہوئے تو میرے بال بچوں کے لیے کیوں اپنی جان آپھٹ میں ڈالے؟ کیوں ہمارے سر کا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے؟“

”تمہیں سارے بکھیرے کی جڑ ہو۔“

”تو مجھے نکال دے۔ لے جائیلوں کو، اناج مانڈ۔ میں حکم پیتا ہوں۔“

”تم چل کر چکی پیسو، میں اناج مانڈوں۔“

مذاق میں غم دور ہو گیا۔ یہی اس کی دوا ہے۔ دھنیا خوش ہو کر روپا کے بال گوندھنے بیٹھ گئی جو بالکل الجھ کر رہ گئے تھے اور ہوری کھلیان چلا۔ کیف آفریں بسنت نکبت، فرحت اور جاں بخشی کا سرمایہ لٹا رہی تھی دونوں ہاتھوں سے دل کھول کر۔ کول آم کی ڈالیوں میں چھپی اپنی ریلی، میٹھی اور دل پر اثر ڈالنے والی آواز سے سوئی ہوئی امیدوں کو جگاتی پھر رہی تھی۔ مہوے کے ڈالیوں پر مینوں کی برات سی بجی بیٹھی تھی۔ نیم اور سر سا اور کروندے اپنی خوشبو میں نشہ گھول رہے تھے۔ ہوری آموں کے باغوں میں پہنچا تو پیڑوں کے نیچے تارے کھلے تھے۔ اس کا رنج اور مایوسی سے بھرا ہوا دل بھی اس عالم گیر رونق اور رنگینی میں جیسے ڈوب سا گیا۔ وہ ترنگ میں آکر گانے لگا:-

جیا جرت رتہ دن رین

آم کی ڈریا کول بولے ٹیک نہ آوت چین

سامنے سے دلاری گلابی ساڑھی پہنے چلی آ رہی تھی۔ پاؤں میں موٹے نفرتی کڑے گلے میں موٹی طلائی ہنسی، چہرہ خشک مگر دل میں تازگی۔ ایک وقت تھا جب ہوری کھیت کھلیان میں اسے چھیڑا کرتا تھا۔ وہ بھابھی تھی، اور ہوری دیور تھا۔ اس ناتے سے دونوں میں مذاق ہوتا رہتا تھا۔ جب سے سینھ جی مر گئے دلاری نے گھر سے ٹکنا چھوڑ دیا۔ سارے دن دوکان پر بیٹھی رہتی اور وہیں سے گاؤں کی خبر لیتی رہتی تھی۔ کہیں آپس میں جھگڑا ہو جائے تو سیٹھانی وہاں بچ پچاؤ کرنے ضرور پہنچے گی۔ ایک آنہ روپیہ سود سے کم پر قرض نہ دیتی تھی اور اگرچہ سود کے لالچ میں اصل بھی ہاتھ نہ آتا تھا مگر اس کے سود کی شرح جیوں کی تیوں بنی ہوئی تھی بے چاری کیسے وصول کرے؟ نالش فریاد کرنے سے رہی، تھانے پولیس کرنے سے

رہی ، صرف زبان کا زور تھا ! مگر جیوں جیوں عمر کے ساتھ زبان کی تیزی بڑھتی جاتی تھی ،
 تیوں تیوں اس کی کاٹ ٹھٹھتی جاتی تھی ۔ اب اس کی گالی پر لوگ ہنس دیتے تھے اور مذاق میں
 کہتے ” کیا کرے گی ، روپے لے کر کاکی ؟ ساتھ تو ایک کوڑی بھی نہ لے جا سکے گی ۔
 غریبوں کو کھلا پلا کر جتنی ایس مل سکے ، لے لے ۔ یہی پر لوک میں کام آئے گا ۔“ اور دلاری
 پر لوک کے نام سے جلتی تھی ۔

ہوری نے چھیڑا ” آج تو بھابھی تم سچ سچ جوان لگتی ہو ۔“

سیٹھانی مگن ہو کر بولی ” آج منگل کا دن ہے ، وہ ٹھہ نہ لگا دینا ۔ اسی سے میں کچھ
 پہنتی اور دھتی نہیں ۔ گھر سے نکلو تو سبھی گھورنے لگتے ہیں ، جیسے کبھی کوئی مہر یا دیکھی ہی نہ ہو ۔
 بیٹھو ری لالا کی پرانی بان ابھی تک نہیں چھوٹی ۔“

ہوری رک گیا ۔ بڑی دلکش بحث چھڑ گئی تھی ، بیل آگے نکل گئے تھے بولا ” وہ تو آج
 کل بڑے بھگت ہو گئے ہیں ۔“

” دیکھتی نہیں ہو کہ ہر پورنہ کو ست نرائن کی کتھا سنتے ہیں اور دونوں جون مندر میں
 درس کرنے جاتے ہیں ۔“

ایسے بد چلن جتنے ہوتے ہیں ، وہ سبھی بوڑھے ہو کر بھگت بن جاتے ہیں ۔ کرم کا پرا
 حقت تو کرنا ہی پڑتا ہے ۔ پوچھو ، میں اب بڑھیا ہوئی ، مجھ سے ہنسی کیسی ؟“

” تم ابھی بڑھیا کیسے ہو گئیں ، بھابھی ؟ مجھے تو اب بھی“

” اچھا چپ ہی رہنا ، نہیں تو ڈبڑھ سو گالی دوں گی ۔ لڑکا پردیس کمانے لگا اور ایک دن
 نیوتا بھی نہ کھلایا ، سینت میت میں بھابھی بنانے کو تیار !“

” مجھ سے سوگند لے لو بھابھی ، جو میں نے اس کی کمائی کا ایک پیسہ بھی چھوا ہو ۔ نہ
 جانے کیا لایا ، کہاں اٹھایا ، مجھے کچھ بھی پتہ نہیں ، بس ایک جوڑا دھوتی اور ایک منڈا سا
 میرے ہاتھ لگا ۔“

” اچھا کمانے تو لگا ، آج نہیں تو کل گھر سنبھالے ہی گا ۔ بھگوان اسے سکھی رکھیں ۔
 ہمارے روپے تھوڑا تھوڑا دیتے چلو ، سود ہی تو بڑھ رہا ہے ۔“

” تمہاری ایک ایک پائی دوں گا بھابی ، ہاتھ میں پیسے آنے دو اور کھا ہی جائیں گے تو
 کوئی باہر کے تو نہیں ہیں ، ہیں تو تمہارے ہی !“

”سیٹھانی ایسی مذاقیہ خوشامد سے نہتی سی ہو جاتی تھی۔ مسکراتی ہوئی اپنی راہ چلی گئی۔ ہوری لپک کر نیلوں کے پاس پہنچ گیا اور اناج ماٹرنے لگا۔ سارے گاؤں کا یہی ایک کھلیان تھا۔ کہیں اناج ماٹرا جا رہا تھا، کہیں اسایا جا رہا تھا، اور کوئی تول رہا تھا۔ ٹائی باری بڑھی، لوہار، پروہت، بھاٹ، بھکاری، سبھی اپنے اپنے ”جیورے“ لینے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ایک پیڑ کے نیچے جھنگری سنگھ کھاٹ پر بیٹھے اپنی ”سوئی“ وصول کر رہے تھے۔ کئی بچے کھڑے ہوئے اناج کا مول تول کر رہے تھے۔ سارے کھلیان میں منڈی کی سی رونق تھی۔ ایک کھٹکن پیرا اور کھوے بچ رہی تھی اور ایک خوانچہ والا تیل کا سیو اور جلیبیاں لیے گھوم رہا تھا۔ پنڈت داتادین بھی ہوری سے اناج بٹوانے کے لیے آ پہنچے تھے اور جھنگری سنگھ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

داتادین نے تبا کو کو طے ہوئے کہا ”کچھ سنا، سرکار بھی مہاجنوں سے کہہ رہی ہے کہ بیاج کی درگھٹا دو، نہیں ڈگری نہ ملے گی۔“

جھنگری تبا کو کو بھانک کر بولے ”پنڈت میں تو ایک بات جانتا ہوں۔ تمہیں گرج پڑے گی تو سو بار ہم سے روپے ادھار لینے آؤ گے اور ہم جو بیاج چاہیں گے، لیں گے۔ سرکار اگر آسامیوں کو روپے ادھار دینے کا کوئی بندوبست کرے گی تو ہمیں اس قانون سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم درکم لکھادیں گے، مگر سیکڑے میں بچیں پہلے ہی کاٹ لیں گے۔ اس میں سرکار کیا کر سکتی ہے؟“

”یہ تو ٹھیک ہے، پر سرکار بھی ان باتوں کو کھوب سمجھتی ہے۔ وہ اس کی بھی کوئی روک نکالے گی، دیکھ لینا۔“

”اس کی روک ہو ہی نہیں سکتی۔“

”اچھا، اگر وہ کر دے کہ جب تک اسٹام پر گاؤں کے کھیا یا کارندے کی گواہی نہ ہو، وہ پکا نہ ہوگا۔ تب کیا کرو گے؟“

”اسامی کو سو بار گرج ہوگی تو کھیا کو ہاتھ پاؤں جوڑ کے لا دے گا اور گواہی کرا دے گا۔ ہم تو ایک چوتھائی کاٹ ہی لیں گے۔“

”اور جو پھنس جاؤ؟ جعلی حساب لکھا اور گئے چودہ سال کو۔“

جھنگری سنگھ زور سے ہنسنے ”تم کیا کہتے ہو پنڈت؟ کیا تب سنسار بدل جائے گا؟“

کانون اور نیاؤ اس کا ہے جس کے پاس پیسہ ہے۔ کانون تو ہے کہ مہاجن کسی اسامی سے کڑائی نہ کرے، کوئی جمیدار کسی کا ستکار کے ساتھ کڑائی نہ کرے، پر ہوتا کیا ہے، یہ تو بت ہی دیکھتے ہو۔ جمیدار مسکین بندھوا کر پٹواتا ہے اور مہاجن لات جوتے سے بات کرتا ہے۔ ہاں جو کسان ہے اس سے نہ حمیدار بولتا ہے نہ مہاجن، ایسے کسانوں سے ہم مل جاتے ہیں۔ اور ان کی مدد سے دوسروں کی گردن دباتے ہیں تمہارے ہی اوپر رائے صاحب کے پانچ سو روپے نکلتے ہیں، پر نوکھے رام میں ہے اتنی ہمت کہ تم سے کچھ بولیں؟ وہ جانتے ہیں کہ تم سے میل ہی کرنے میں ان کی بھلائی ہے۔ کس اسامی میں اتنا بوتا ہے کہ بت عدالت دوڑے؟ سب کاروبار اسی طرح چلا جائے گا جیسے چل رہا ہے۔ کچھری، عدالت اسی کے ساتھ ہے جس کے پاس پیسہ ہے۔ ہم لوگوں کے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“

یہ کہہ کر انھوں نے کھلیان کا ایک چکر لگایا اور پھر آکر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے بولے ”ہاں، متنی کے بیاہ کا کیا ہوا؟ ہماری صلاح تو یہ ہے کہ اس کا بیاہ کر ڈالو۔ اب تو بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔“

داتا دین کو جیسے بھڑنے کاٹ کھایا۔ اس کہنے کا کیا مطلب تھا، وہ خوب سمجھتے تھے گرم ہو کر بولے۔ ”پینہ پیچھے آدمی جو چاہے کہے، ہمارے منہ پر کوئی کچھ کہے تو اس کی مونچھیں اکھاڑ لوں۔ کوئی ہماری طرح نمی بن تو لے۔ کتنوں کو جانتا ہوں جو کبھی سندھیا پوجا نہیں کرتے۔ نہ انھیں دھرم سے مطلب نہ کرم سے۔ نہ کھانا سے مطلب نہ پران سے۔ وہ بھی اپنے کو براہمن کہتے ہیں۔ ہمارے اوپر کیا منے گا کوئی۔ جس نے اپنی عمر میں ایک ایکادسی کبھی نہیں چھوڑی، کبھی بنا انسان دھیان کیے، منہ میں پانی نہیں ڈالا۔ نیم کا نباہنا کٹھن ہے۔ کوئی بتادے کہ ہم نے باٹ کی کوئی بیج کھائی ہو یا کسی دوسرے کے ہاتھ کا پانی پیا ہو، تو اس کی ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ سلپا ہماری چوکھٹ نہیں ناگھنے پانی، برتن بھانڈے چھوٹا تو بڑی بات ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ متنی کوئی بہت اچھا کام کر رہا ہے، پر جب ایک بار ایک بات ہو گئی تو یہ ادھرم کا کام ہے کہ عورت کو چھوڑے میں تو کھلم کھلا کہتا ہوں، اس میں چھپانے کی کوئی بات نہیں استری جات پوتر ہے۔“

داتا دین خود اپنی جوانی میں بڑے عیاش رہ چکے تھے مگر اپنے نیم دھرم سے کبھی نہیں چو کے۔ داتا دین بھی لائق لڑکے کی طرح ان ہی کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ دھرم کا اصلی

جزد ہے پوجا پاٹ، کتھارت اور چوکا چولہا، جب باپ بیٹھے دونوں ہی اصلیت کو پکڑے ہوئے ہیں، تو کس کی مجال ہے کہ انھیں ادھری کہہ سکے۔“

جھنگری سنگھ نے قائل ہو کر کہا ”میں نے تو جو سنا تھا وہ تم سے کہہ دیا۔“

داتا دین نے مہابھارت اور پرانوں سے ان برہمنوں کی فہرست پیش کر دی، جنہوں نے دوسری ذات کی لڑکیوں سے تعلق پیدا کر لیا تھا اور ساتھ ہی یہ ثابت کر دیا کہ ان سے جو اولاد ہوئی وہ برہمن کہلائی اور آج کل کے جو برہمن ہیں وہ اسی اولاد کی اولاد ہیں۔ یہ رواج شروع ہی سے چلا آرہا ہے اور اس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔

جھنگری سنگھ نے ان کی قابلیت پر خوش ہو کر کہا ”تب کیوں آج کل لوگ باجپنی اور ٹکٹل بنے پھرتے ہیں۔“

”سے سے کا رواج ہے اور کیا؟ کسی میں اتنا جج تو ہو۔ بس کھا کر اسے بچانا تو چاہیے۔ وہ ست جگ کی بات تھی، ست جگ کے ساتھ گئی۔ اب تو اپنا نہاہ برادری کے ساتھ مل کر رہنے میں ہے۔ مگر کروں کیا، کوئی لڑکی والا آتا ہی نہیں تم سے بھی کہا اوروں سے بھی کہا، پر جب کوئی نہیں سنتا تو کیا میں لڑکی بناؤں؟“

جھنگری سنگھ نے ڈانٹا ”جھوٹ مت بولو، پنڈت! میں دو آدمیوں کو پھانس کر لایا پر تم منہ پھلانے لگے تو دونوں کان کھڑے کر کے نکل بھاگے۔ آخر کس برتے پر ہجار پانچ سو مانگتے ہو تم؟ دس بیگھے اور بھیک کے سوا تمہارے پاس اور کیا ہے؟“

داتا دین کے گھمنڈ کو چوٹ لگی۔ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے ”میرے پاس کچھ نہ سہی، میں ہی بھیک مانگتا ہوں، پر میں نے اپنی لڑکیوں کے بیاہ میں پانچ پانچ سو دیے ہیں۔ پھر لڑکے کے لیے پانچ سو کیوں نہ مانگتا؟ کسی نے سنت میں میری لڑکی بیاہ لی ہوتی تو میں بھی سنت میں اپنا لڑکا بیاہ دیتا۔ رہی حیثیت کی بات، سو تم جھمانی کو بھیک سمجھو، پر میں تو اسے جمینداری سمجھتا ہوں، بنک گھر! جمینداری مٹ جائے، بنک گھر ٹوٹ جائے، پر جھمانی تو انت تک بنی رہے گی۔ جب تک ہندو جات رہے گی تب تک باہمن بھی رہیں گے اور جھمانی بھی رہے گی۔ سہاگ میں آرام سے گھر بیٹھے سو دو سو پھنکار لیتے ہیں۔ کبھی بھاگ لڑکیا تو چار پانچ سو مار لیے۔ کپڑے برتن، کھانا اوپر سے۔ کہیں نہ کہیں نت ہی کام بنا رہتا ہے۔ کچھ نہ ملے تب بھی ایک دو قہال اور دو چار آنے دچھنا کے مل جاتے ہیں۔ ایسا جمین نہ

جمیداری ہی میں ہے نہ ساہوکاری میں ! اور پھر میرا تو سلیا سے جتنا کام نکلتا ہے اتنا باصن کی کنیا سے کیا ہوگا۔ وہ تو بہو بنی بیٹی رہے گی بہت ہوگا تو روٹی بنا دے گی یہاں سلیا اکیلی تین آدمیوں کا کام کرتی ہے اور میں اسے روٹی کے سوا اور کیا دیتا ہوں ؟ بہت ہوا تو سال میں ایک دھوٹی دے دی۔“

دوسرے پڑ کے نیچے داتا دین کا گھی ،، پیرا ،، تھا چار بیلوں سے منڈائی ہو رہی تھی۔ دھنا چار بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ سلیا ہیرے سے اناج نکال نکال کر اُسا رہی تھی اور ماتا دین دوسری طرف بیٹھا ہوا اپنی لاشی پر تیل مل رہا تھا۔

سلیا سانولی، سلونی اور چھری لڑکی تھی جو کھیل نہ ہونے پر بھی دلکش تھی۔ اس کی ہنسی میں، چتون میں، اس کی حرکتوں میں مسرت کا جنون تھا۔ جس سے اس کا عضو عضو ناچتا رہتا تھا۔ سر سے پیر تک بھس کے ذروں سے آلودہ، پسینے سے تر سر کے بال آدھے کھلے، دوڑ دوڑ کر اناج اُسا رہی تھی، گویا دل و جان سے کسی کھیل میں مصروف تھی۔

ماتا دین نے کہا ”آج سانجھ تک اناج باکی نہ رہے۔ سلیا تو تھک گئی ہو تو میں آؤں۔“

سلیا خوش ہو کر بولی ”تم کا بے کو آؤ گے پنڈت، میں سانجھ تک سب اُسا ڈالوں گی۔“

”اچھا تو میں اناج ڈھو ڈھو کر رکھ آؤں، تو اکیلی کیا کیا کر لے گی؟“

”تو تم گھبراتے کیوں ہو؟ میں اسابھی دوں گی اور ڈھو کر رکھ بھی آؤں گی۔ پہر رات

تک یہاں ایک دانہ بھی نہ رہے گا۔“

دلاری آج اپنی یافتنی وصول کر رہی تھی۔ سلیا اس کی دوکان سے ہولی کے دن دو پیسے

کا گلابی رنگ لائی تھی اور ابھی تک پیسے نہیں دیے تھے۔ وہ سلیا کے پاس جا کر بولی

”کیوں ری سلیا، مہینہ بھر رنگ لائے ہو گیا اور ابھی تک پیسے نہیں دیے۔ مانگتی ہوں

تو تنک کر چلی جاتی ہے۔ آج میں بنا پیسے لیے نہ جاؤں گی۔“

ماتا دین چپکے سے کھسک گیا۔ سلیا کا سب کچھ لے کر بھی وہ بدلے میں کچھ نہ دینا

چاہتا تھا۔ سلیا اب اس کی نگاہ میں صرف کام کرنے کی مشین تھی اور بس اس کی محبت کو وہ

بڑی چالاکی سے نچاتا رہتا تھا۔

سلیا نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ ماتا دین وہاں نہ تھا۔ بولی ”چلاؤ مت سیٹھانی۔ یہ لے

لو دو کی جگہ چار پیسے کا اناج۔ اب کیا جان لوگی؟ میں مری تھوڑے ہی جاتی تھی۔“
اس نے اندازہ سے کوئی سیر بھر اناج ڈھیر میں سے نکال کر سیٹھانی کے پھیلے ہوئے
آنچل میں ڈال دیا۔ اسی وقت ماتادین بیڑ کی آڑ سے جھلایا ہوا نکلا اور دلاری کا آنچل پکڑ کر
بولا ”اناج سیدھے سے رکھ دو سیٹھانی، لوٹ نہیں ہے۔“

پھر اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے سلپا کو دیکھ کر ڈانٹا ”تو نے اناج کیوں دیا؟ کس
سے پوچھ کر دیا؟ تو کون ہوتی ہے میرا اناج دینے والی؟“

سیٹھانی نے اناج ڈھیر میں ڈال دیا اور سلپا متحیر ہو کر ماتادین کا منہ تاکنے لگی۔ ایسا
معلوم ہوا کہ جس ڈال پر وہ بے فکری سے بیٹھی ہوئی تھی وہ ٹوٹ گئی ہے اور اب وہ بلا
سہارے کے نیچے گری جا رہی ہے۔ کھسپائے ہوئے منہ سے آنسو بھر کر دلاری سے بولی۔

”تمہارے پیسے میں پھر دوں گی، سیٹھانی جی آج مجھ پر دیا کرو۔“

سیٹھانی نے اسے رحم کی نگاہوں سے دیکھا اور ماتادین کو ملامت بھری نگاہوں سے
دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ تب سلپا نے اناج اساتے ہوئے چوٹ کھائے ہوئے گھمنڈ سے پوچھا۔
”تمہاری چیخ پر میرا کچھ اختیار نہیں ہے؟“

ماتادین آنکھیں نکال کر بولا ”نہیں تیرا کوئی اختیار نہیں ہے، کام کرتی ہے کھاتی ہے،
تو چاہے کھا بھی اور لٹا بھی تو یہ نہ ہوگا۔ اگر تجھے یہاں پر نہ نہ پڑتا ہو تو کہیں اور جا کر کام کر
مجوروں کی کمی نہیں ہے۔ سینت میں کام نہیں لیتے کھانا کپڑا دیتے ہیں۔“

سلپا نے اس چڑیا کی طرح جسے مالک نے پر کاٹ کر بنجرے سے نکال دیا ہو،
ماتادین کی طرف دیکھا۔ اس کی چتون میں درد زیادہ تھا یا شکوہ، یہ کہنا مشکل ہے۔ مگر اسی
چڑیا کی طرح اس کا دل پھڑ پھڑا رہا تھا اور ادھچی ڈال پر اس آزاد فضا میں اڑنے کی سکت نہ
پا کر اسی بنجرے میں جا بیٹھنا چاہتی تھی، خواہ اسے بے آب و دانہ رہ کر بنجرے کی تیلیوں سے
سرنگراتے ہوئے مری کیوں نہ جانا پڑے۔ سلپا سوچ رہی تھی کہ اب اس کے لیے دوسری
کون سی جگہ ہے۔ وہ بیاہتا نہ ہو کر بھی فطرتاً اور عملاً بیاہتا تھی اور اب ماتادین چاہے اسے
مارے یا کاٹے اسے دوسرا سہارا نہیں ہے۔ اسے وہ دن یا آئے اور ابھی دو سال بھی تو نہیں
ہوئے جب یہی ماتادین اس کے تلوے چاٹتا تھا۔ جب اس نے جینو ہاتھ میں لے کر کہا
تھا۔ ”سلپا! جب تک دم میں دم ہے، تجھے بیاہتا کی طرح رکھوں گا۔“ جب وہ بے قرار ہو کر

جنگل اور باغ میں اور ندی کے کنارے اس کے پیچھے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرا کرتا تھا اور آج اس کا یہ بے دردانہ سلوک! مٹھی بھرا تاج کے لیے اس کا پانی اتار لیا! اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ حلق میں نمک کی ایک ڈلی سی محسوس کرتی ہوئی زخمی دل اور ست ہاتھوں سے پھر کام کرنے لگی۔

اسی وقت اس کے ماں باپ، دونوں بھائی اور چھاروں نے نہ جانے کدھر سے آکر ماتادین کو گھیر لیا۔ سلیا کی ماں نے آتے ہی اس کے ہاتھ سے تاج کی ٹوکری لے کر پھینک دی اور گالی دے کر بولی ”رائٹ تجھے جب مجوری ہی کرنی تھی تو گھر کی مجوری چھوڑ کر یہاں کیوں مرنے آئی؟ جب باہمن کے ساتھ رہتی ہے تو باہمن کی طرح رہ۔ ساری برادری کی ناک کٹوا کر بھی چھارن بننا تھا تو یہاں کیا کھی کا لوندا لینے آئی تھی؟ چلو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرتی۔“

جھنگری سنگھ اور داتادین دونوں دوڑے اور چھاروں کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جھنگری نے سلیا کے باپ سے پوچھا۔ کیا بات ہے چودھری؟ کس بات کا جھگڑا ہے؟“

سلیا کا باپ ہر کھوساٹھ سال کا بوڑھا تھا۔ کالا، دبلا اور سوکھی مرج کی طرح پچکا ہوا، مگر اتنا ہی تلخ و تیز! بولا ”جھگڑا کچھ نہیں ہے ٹھاکر، ہم آج یا تو ماتادین کو چھار بنا کر چھوڑیں گے یا ان کا اور اپنا رکت ایک کر دیں گے۔ سلیا کنیا جات ہے، کسی نہ کسی کے گھر تو جائے گی ہی، اس پر ہمیں نہیں کہنا۔ پر اسے جو کوئی بھی رکھے وہ ہمارا ہو کر رہے۔ تم ہمیں باہمن نہیں بنا سکتے مگر ہم تمہیں چھار بنا سکتے ہیں۔ ہمیں باہمن بنا دو، ہماری ساری برادری بننے کو تیار ہے۔ جب یہ سامر تھ نہیں تو تم بھی چھار بنو، ہمارے ساتھ کھاؤ پیو، ہمارے ساتھ اٹھو بیٹھو۔ ہماری ہمت لیتے ہو تو اپنا دھرم ہمیں دو۔“

داتادین نے لاشمی گھما کر کہا ”منہ سنبھال کر باتیں کر ہر کھو! تیری لڑکی وہ کھڑی ہے لے جا، جہاں چاہے۔ ہم نے اسے باندھ نہیں رکھا ہے۔ کام کرتی تھی مجوری لیتی تھی یہاں مجوروں کی کمی نہیں ہے۔“

سلیا کی ماں انگلی منکا کر بولی ”واہ واہ پنڈت، اچھا نیاؤ کرتے ہو۔ تمہاری لڑکی کسی چھار کے ساتھ نکل گئی ہوتی اور تم اس طرح کی باتیں کرتے تو دیکھتی۔ ہم چھار ہیں۔ اس

لیے ہماری کوئی اجت نہیں! ہم سلیا کو اکیلی نہ لے جائیں گے، اس کے ساتھ ماتادین کو بھی لے جائیں گے جس نے اس کی اجت بگاڑی ہے۔ تم بڑے نمی دھری ہو۔ اس کے ساتھ سوؤ گے، پر اس کے ہاتھ کا پانی نہ پیو گے! وہی چڑیل ہے کہ یہ سب سبتی ہے۔ میں تو ایسے آدمی کو سکھیا دے دیتی۔“ ہرکھو نے اپنے ساتھیوں کو لٹکارا ”سن لی ان لوگوں کی باتیں کہ نہیں؟ اب کیا کھڑے منہ تاکتے ہو۔“

اتنا سننا تھا کہ دو چماروں نے لپک کر ماتادین کے ہاتھ پکڑے اور تیسرے نے جھپٹ کر اس کا جینو توڑ ڈالا اور اس کے قبل کہ داتادین اور جھنگری سنگھ اپنی اپنی لالھیاں سنہال سکیں دو چماروں نے ماتادین کے منہ میں ایک بڑی سی ہڈی کا ٹکڑا ڈال دیا۔ ماتادین نے دانت جکڑ لیے پھر بھی وہ گھن کی چیز اس کے ہونٹوں میں تو لگ ہی گئی، انھیں متلی ہوئی اور منہ خود بخود کھل گیا۔ اور ہڈی حلق تک جا پہنچی۔ اتنے میں کھلیان کے سب آدمی جمع ہو گئے مگر تعجب تو یہ ہے کہ کوئی ان دھرم کے لیٹروں سے مزاحم نہ ہوا۔ ماتادین کا برتاؤ سبھی کو ناپسند تھا۔ وہ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو تا کا کرتا تھا۔ پس دل میں سبھی اس کی درگت پر خوش تھے۔ ہاں ظاہراً لوگ چماروں پر رعب جمار ہے تھے۔

ہوری نے کہا ”اچھا اب بہت ہوا ہرکھو! بھلا چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔“ ہرکھو نے بے خوفی سے جواب دیا ”تمہارے گھر میں بھی لڑکیاں ہیں ہوری مہتو! اتنا سمجھ لو۔ اس طرح گاؤں کی مر جاد بگڑنے لگی تو کسی کی آبرو نہ بچے گی۔“ ایک لمحے میں دشمن پر پوری فتح پا کر دشمنوں نے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔ لوگوں کی رائے بدلتے دیر نہیں لگتی، اس سے بچے رہنا ہی اچھا ہے۔ ماتادین تے کر رہا تھا۔ داتادین نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا ”ایک ایک کو پانچ پانچ سال کے لیے بڑے گھر نہ بھجوا یا تو کہنا۔ پانچ پانچ سال تک چکی پھوڑوں گا۔“

ہرکھو نے ہیکڑی سے جواب دیا۔ ”اس کا یہاں کوئی گم نہیں ہے کون تمہاری طرح بیٹھے موج کرتے ہیں؟ جہاں کام کریں گے وہیں آدھا پیٹ دانہ بھی مل جائے گا۔“

ماتادین نے تے کر چکنے کے بعد مردہ سا زمین پر پڑ رہا گویا کمر ٹوٹ گئی ہو، گویا ڈوب مرنے کے لیے چلو بھر پانی کی تلاش ہو۔ جس عزت کے ٹل بوتے پر اس کی رنگین مزاحی اور رعونت اور مردیت اکثرتی پھرتی تھی وہ مٹ چکی تھی۔

اس ہڈی کے کھڑے نے صرف اس کے منہ کو نہیں بلکہ اس کی روح کو بھی ناپاک کر دیا تھا۔ اس کا دھرم اسی کھانے پینے اور جھوٹ اچھوت کے سمجھنے پر قائم تھا۔ آج اس دھرم کی جڑ کٹ گئی۔ اب وہ لاکھ پراچت کرے، لاکھ گوبر کھائے اور گنگا جل پیے، لاکھ دان پن اور تیرتھ برت کرے، اس کا مرا ہوا دھرم جی نہیں سکتا۔ اگر تنہائی کی بات ہوتی تو چھپائی جاتی مگر یہاں تو سب کے سامنے اس کا دھرم لٹا۔ اب اس کا سر ہمیشہ کے لیے نیچا ہو گیا۔ آج سے وہ اپنے ہی گھر میں اچھوت سمجھا جائے گا۔ اس کی ماما بھری ماں بھی اس سے گھن کرے گی۔ اور سنسار سے دھرم ایسا اٹھ گیا کہ اتنے آدمی کھڑے سبھی تماشا دیکھتے رہے، کسی نے چوں تک نہ کی۔ ایک لمحہ پہلے جو لوگ اسے دیکھتے ہی پالاگن کرتے تھے اب اسے دیکھ کر منہ پھیر لیں گے۔ وہ کسی مندر میں بھی نہ جاسکے گا، نہ کسی کے برتن چھو سکے گا۔ اور یہ سب اس ابھائی گئی سلیا کے کارن۔

سلیا جہاں اناج اُسا رہی تھی وہیں سر جھکائے کھڑی تھی جیسے یہ اسی کی درگت ہو رہی ہو۔ یکا یک اس کی ماں نے آکر ڈانٹا ”کھڑی تاکتی کیا ہے؟ چل سیدھے گھر! نہیں تو بوٹی بوٹی کاٹ ڈالوں گی۔ باپ دادا کا نام تو کھوب اجاگر کر چکی اب اور کیا کرنے پر لگی ہے؟“

سلیا بت بنی کھڑی رہی۔ ماں باپ اور بھائیوں پر اسے غصہ آرہا تھا۔ یہ لوگ کیوں اس کے بچ میں بولتے ہیں؟ وہ جیسے چاہتی ہے رہتی ہے دوسروں سے کیا مطلب؟ کہتے ہیں کہ یہاں تیری جگہ ہوتی ہے۔ تب کیا کوئی باصن اس کا پکایا کھائے گا یا اس کے ہاتھ کا پانی پی لے گا؟ ابھی ذرا دیر پہلے اس کا دل ماتادین کے برتاؤ سے بے حال ہو رہا تھا، مگر اپنے گھر والوں اور برادری کی اس زیادتی نے اس نفرت کو گہری رغبت میں تبدیل کر دیا۔ احتجاج کے لہجے سے بولی۔ ”میں کہیں نہ جاؤں گی۔ تو کیا یہاں بھی مجھے جینے نہ دے گی؟“

بڑھیا نے کڑی آواز میں کہا ”تو نہ چلے گی؟“

”نہیں۔“

”چل سیدھے سے۔“

”نہیں جاتی۔“

فوراً دونوں بھائیوں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور اسے مھیسے ہوئے لے چلے۔ سلیا زمین پر بیٹھ گئی۔ بھائیوں نے اس پر بھی نہ چھوڑا، مھیسے ہی رہے، اس کی ساڑی پھٹ گئی۔

بیٹھ اور کمر کی کھال چھل گئی ، پھر بھی وہ جانے پر راضی نہ ہوئی ۔
تب ہر کھونے لڑکوں سے کہا ” اچھا اب اسے چھوڑ دو سمجھ لیں گے کہ مر گئی ۔ مگر اب
جو کبھی میرے دوارے پر آئی تو لہو پی جاؤں گا ۔“

سلیم جان پر کھیل کر بولی ” ہاں جب تمہارے دوارے پر جاؤں تو پی لینا ۔“
بڑھیا نے غصے کے جنون میں سلیم کو کئی لاتیں جمائیں اور ہر کھونے اسے ہٹا نہ دیا ہوتا
تو شاید جان ہی لے کر چھوڑتی ۔

بڑھیا پھر چھینی تو ہر کھونے اسے دھکے دے کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا ” تو بڑی ہتیارنی
ہے ، کلیا ! کیا اسے مار ہی ڈالے گی ؟“

سلیم باپ کے پیروں سے لپٹ کر بولی ” مار ڈالو دادا ، سب لوگ مل کر مار ڈالو ۔ ہائے
اماں ، تم اتنی بے درد ہو ، اسی لیے دودھ پلا کر پالا تھا ؟ پیدا ہوتے ہی کیوں نہ گلا گھونٹ دیا ؟
ہاں میرے پیچھے تم نے پنڈت کو بھی بھر شٹ کر دیا ۔ اس کا دھرم لے کر تمہیں کیا ملا ؟ اب تو
وہ نہ پوچھے گا ، مگر پوچھے یا نہ پوچھے رہوں گی تو اسی کے ساتھ وہ مجھے چاہے بھوکوں رکھے
چاہے مار ڈالے ، پر اس کا ساتھ نہ چھوڑوں گی ۔ ان کی اتنی درگت کرا کے کیسے چھوڑوں ؟
مر جاؤں گی پر ہر جاؤں نہ بنوں گی ۔ ایک بار جس نے باہنہ پکڑی اسی کی رہوں گی ۔“
کلیا نے ہونٹ چبا کر کہا ” جانے دو رائڈ کو ۔ سمجھتی ہے کہ وہ اس کا نباہ کرے گا ، مگر
آج ہی مار کر بھگا نہ دے تو منہ نہ دکھاؤں ۔“

بھائیوں کو بھی رحم آگیا سلیم کو وہیں چھوڑ کر سب کے سب چلے گئے ، تب وہ آہستہ
سے اٹھ کر لنگڑاتی اور کراہتی ہوئی کھلیان میں جا کر بیٹھ گئی اور آنچل سے منہ ڈھانک کر
رونے لگی ۔

دادا دین نے جلاہا کا غصہ داڑھی پر اتارا ” ان کے ساتھ کیوں نہیں چلی گئی سلیم ؟ اب
کیا کرانے پر لگی ہوئی ہے ؟ میرا ستیا ناس کرا کے بھی پیٹ نہیں بھرا ؟“
سلیم نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں ۔ ان میں نور کی جھلک تھی بولی ” ان کے
ساتھ کیوں جاؤں ؟ جس نے باہنہ پکڑی اسی کے ساتھ رہوں گی ۔“

پنڈت جی نے دھمکایا ” میرے گھر میں پاؤں رکھا تو لاتوں سے بات کروں گا ۔“
سلیم نے بھی گستاخانہ کہا ” مجھے جہاں وہ رکھیں گے وہاں رہوں گی ۔ پیڑ تلے رکھیں ،

چاہے محل میں رہیں۔“

ماتادین بدحواس سا بیٹھا تھا۔ دوپہر ہونے کو تھی۔ دھوپ چٹوں سے چمن چمن کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، ماتھے سے پسینہ ٹپک رہا تھا مگر وہ خاموش بلا حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

دفعتاً جیسے اس نے ہوش میں آکر کہا ”میرے لیے اب کیا کہتے ہو دادا؟“ ماتادین نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھارس دیتے ہوئے کہا ”تمہارے لیے ابھی میں کیا کہوں بیٹا؟ چل کر نہاؤ، کھاؤ، پھر پنڈتوں کی جیسی رائے ہوگی کیا جائے گا۔ ہاں ایک بات ہے، سلیا کو اب چھوڑنا پڑے گا۔“

ماتادین نے سلیا کی طرف خون بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں اب کبھی اس کا منہ نہ دیکھوں گا مگر پراچت ہو جانے پر پھر تو کوئی دوکھ نہ رہے گا؟“
”پراچت ہو جانے پر کوئی دوکھ پاپ نہیں رہتا۔“
”تو آج ہی پنڈتوں کے پاس جاؤ۔“
”آج ہی جاؤں گا بیٹا!،،

”مگر پنڈت کہیں اس کا پراچت نہیں ہو سکتا تب؟“
”وہ جو کچھ کہیں۔“

”تو تم مجھے گھر سے نکال دو گے؟“

ماتادین نے پدرانہ محبت سے بے قرار ہو کر کہا ”ایسا کہیں ہو سکتا ہے بیٹا؟ دھن جائے، دھرم جائے، پر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔“

ماتادین نے لاٹھی اٹھائی اور باپ کے پیچھے پیچھے گھر چلا۔ سلیا بھی اٹھی اور لنگڑاتی ہوئی اس کے پیچھے ہوئی۔ ماتادین نے پیچھے پھر کر بے دردی سے کہا ”میرے ساتھ مت آ۔ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ اتنی درگت کروا کے بھی تیرا پیٹ نہیں بھرا؟“

سلیا نے گستاخانہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ”واسطہ کیسے نہیں ہے؟ اسی گاؤں میں تم سے دھنی، تم سے سُندر، تم سے یثع دار لوگ ہیں، میں ان کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑتی؟ تمہاری یہ درگت ہی آج کیوں ہوئی؟ جو رشتی تمہارے گلے میں پڑ گئی ہے اسے تم لاکھ چاہو پر توڑ نہیں سکتے اور نہ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں جاؤں گی۔ مجوری کروں گی بھیک مانگوں گی، پر تمہیں

چھوڑوں گی نہیں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ماتادین کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر کھلیان میں جا کر اناج اسانے لگی۔ ہوری ابھی تک وہاں غلہ ماڑ رہا تھا۔ دھنیا اسے کھانا کھانے کو بلانے آئی تھی۔ ہوری نے بیلوں کو پیرے سے باہر نکال کر ایک درخت سے باندھ دیا۔ اور سلیا سے بولا ”تو بھی جا، کھا پی آسلیا۔ دھنیا یہاں بیٹھی ہے۔ تیری پیٹھ پر کی ساڑی تو لہو سے رنگ گئی ہے رے! کہیں گھاؤ پک نہ جائے تیرے گھر والے بڑے کسائی ہیں۔“

سلیا نے ان کی طرف غمگین آنکھوں سے دیکھا۔ ”یہاں کسائی کون نہیں ہے دادا؟ میں نے تو کسی کو دیا وان نہیں پایا۔“

”کیا کہا پنڈت نے؟“

”کہتے ہیں کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔“

”اچھا، ایسا کہتے ہیں!“

”سمجھتے ہوں گے کہ اس طرح اپنے منہ کی لالی رکھ لیں گے، پر جس بات کو دنیا جانتی ہے اسے کیسے چھپالیں گے؟“

”میری روٹیاں بھاری ہیں تو نہ دیں۔ میرے لیے کیا؟ مجوری اب بھی کرتی ہوں، تب بھی کروگی۔ سونے کو ہاتھ بھر جگہ تم ہی سے مانگوں گی تو کیا تم نہ دو گے؟“

دھنیا ترس کھا کر بولی ”جگہ کی کون کمی ہے بیٹی؟ تو چل، میرے گھر رہ!“

ہوری نے آزدگی سے کہا ”بلائی تو ہے پر پنڈت کو جانتی نہیں؟“

دھنیا نے بے خوفی سے کہا ”گبڑیں گے تو ایک روٹی بیسی کھالیں گے، اور کیا کریں گے؟ کوئی ان کی دبتل ہوں؟ اس کی آبرو لی، برادری سے نکلویا اور آپ کہتے ہیں کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ آدمی ہے کہ کسائی؟ یہ اسی نیت کا آج پھل ملا ہے۔ پہلے نہیں سوچ لیا تھا۔ تب تو موج اڑاتے رہے۔ اب کہتے ہیں کہ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔“

ہوری کے خیال سے دھنیا غلطی کر رہی تھی۔ ”سلیا کے گھر والوں نے مٹی کو کتنا بے دھرم کر دیا۔ یہ کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ سلیا کو چاہے مار کر لے جاتے، چاہے دلار کر کے لے جاتے وہ ان کی لڑکی ہے۔ مٹی کو کیوں بے دھرم کیا؟“

دھنیا نے ڈانٹ بتائی ”اچھا رہنے دو، بڑے نیائی بنے ہو! مرد مرد سب ایک ہوتے

ہیں۔ اس کو مٹی نے بھرست کیا تب تو کسی کو برا نہ لگا اور اب جو مٹی بے دھرم ہو گئے تو کیوں برا لگتا ہے؟ کیا سلیا کا دھرم دھرم نہیں ہے؟ رکھنے کو تو چمارن، اس پر بڑے ٹیم دھرم والے بنتے ہیں! بڑا اچھا کیا ہر کھو چو دھری نے۔ ایسے گنڈوں کی یہی دوا ہے۔ تو چل سلیا میرے گھر، نہ جانے کیسے بے درد ماں باپ ہیں کہ بیچاری کی ساری پیٹھ لبو لہان کر دی۔ تم جا کے سونا کو بھیج دو میں اسے لے کر آتی ہوں۔“

ہوری گھر چلا اور سلیا دھنیا کے پیروں میں گر کر رونے لگی۔

سونا سترہویں سال میں تھی اور اس سال اس کا بیاہ کرنا ضروری تھا۔ ہوری تو دو سال سے اسی فکر میں تھا مگر ہاتھ خالی ہونے سے کوئی قابو نہ چلتا تھا مگر اس سال جیسے بھی ہو اس کا بیاہ کر ہی دینا چاہیے، چاہے قرض لینا پڑے چاہے کھیت رہن رکھنے پڑیں اور تنہا ہوری کی بات چلتی تو دو سال پہلے ہی بیاہ ہو گیا ہوتا۔ وہ کفایت سے کام کرنا چاہتا مگر دھنیا کہتی تھی کہ چاہے کتنا ہاتھ باندھ کر کھرچ کر دو، دو ڈھائی سو تو لگ ہی جائیں گے۔ جھنڈیا کے آجانے سے برادری میں ان لوگوں کا درجہ کچھ گر گیا تھا اور سو دو سو دیے بغیر کوئی اچھا لڑکا نہ مل سکتا تھا۔ پچھلے سال چیت کی فصل میں کچھ نہ ملا تھا تو پنڈت داتا دین سے آدھے کا سا جھا، مگر پنڈت جی نے بیج اور مزدوری کی کچھ ایسی تفصیل بتائی کہ ہوری کے ہاتھ ایک چوتھائی سے زیادہ اناج نہ لگا اور لگان دینا پڑ گیا پورا۔ اکیہ اور سن کی فصل برباد ہو گئی، سن تو بارش زیادہ ہونے اور اکیہ دیمک لگ جانے سے۔ ہاں اس سال کی فصل اچھی تھی، اور اکیہ بھی خوب لگی ہوئی تھی۔ بیاہ کے لیے اناج تو موجود ہی تھا، دو سو روپے بھی ہاتھ آجائیں تو وہ لڑکی کے فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ اگر گوبر سو روپے کی مدد کرے تو بقیہ روپے ہوری کو آسانی سے مل جائیں گے۔ جھنگری سنگھ اور منگرو ساہ دونوں ہی اب کچھ نرم پڑ گئے تھے۔ جب گوبر پردیس میں کما رہا ہے تو ان کے روپے مار میں نہ پڑ سکتے تھے۔

ایک دن ہوری نے گوبر کے پاس دو تین دن کے لیے جانے کی تجویز کی۔ مگر دھنیا ابھی تک گوبر کے وہ سخت الفاظ نہ بھولی تھی۔ وہ گوبر سے ایک پیسہ بھی نہ لینا چاہتی تھی، کسی طرح بھی نہیں!

ہوری نے جھنجھلا کر کہا ”پر کام کیسے چلے گا یہ بتا۔“
 دھنیا سر ہلا کر بولی ”مان لو کہ گوبر پردیس نہ گیا ہوتا تب تم کیا کرتے، وہی اب کرو۔“
 ہوری کی زبان بند ہو گئی، لمحہ بھر بعد بولا ”میں تو تجھ سے پوچھتا ہوں۔“
 دھنیا نے جان بچائی ”یہ سوچتا مردوں کا کام ہے۔“

ہوری کے پاس جواب تیار تھا ”مان لے میں نہ ہوتا اور تو ہی اکیلے ہوتی تب تو کیا کرتی؟ وہی کر۔“

دھیا نے حقارت سے دیکھا ”تب میں لسا کنیا بھی دے دیتی تو کوئی ہنسنے والا نہ تھا۔“

ایسا تو ہوری بھی کر سکتا تھا۔ اسی میں اس کی خیر بھی تھی۔ مگر گھر کی مرچا کیسے چھوڑ دے؟ اس کی بہنوں کے بیاہ میں تین تین سو براتی دروازے پر آئے تھے۔ جہیز بھی اچھا دیا گیا تھا۔ ناچ، تماشا، باجے گا بے، ہاتھی گھوڑے، کبھی تھے۔ آج بھی برادری میں اس کا نام ہے۔ دس گاؤں کے لوگوں سے اس کا میل جول ہے۔ لسا کنیا دے کر وہ کسے منہ دکھائے گا؟ اس سے تو مرجانا اچھا ہے اور وہ کیسے کسا کنیا دے؟ درخت ہیں، زمین ہے اور کچھ ساکھ بھی ہے۔ اگر وہ ایک بیکھ بھی بچ دے تو دو سول جائیں، مگر کسان کے لیے زمین جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، خاندانی وقار سے بھی زیادہ عزیز ہے! اور کل تین ہی بیکھے اس کے پاس ہیں۔ اگر ایک بیکھ بچ دے تو پھر کھیتی کیسے کرے گا؟

اسی جیس بھیس میں کئی دن گزر گئے اور ہوری کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

دسہرے کی چھٹیوں کے دن تھے۔ جھنگری، پیٹھوری اور نوکھے رام تینوں کے لڑکے تعطیل میں گھر آئے تھے۔ تینوں انگریزی پڑھتے تھے اور اگرچہ تینوں بیس بیس برس کے ہو گئے تھے مگر ابھی تک یونیورسٹی میں جانے کا نام نہ لیتے تھے۔ ایک ایک درجے میں دو دو تین تین سال پڑے رہتے۔ تینوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

پیٹھوری کے سپوت بندیشوری تو ایک لڑکے کے باپ بھی ہو چکے تھے۔ تینوں دن بھر تاش کھیلتے، بھنگ پیتے اور چھیلا بنے گھومتے پھرتے تھے اور دن میں کئی کئی بار ہوری کے دروازے کی طرف تاکتے ہوئے نکلتے اور ایسا اتفاق تھا کہ جس وقت وہ نکلتے اس وقت سونا بھی کسی نہ کسی کام سے دروازے پر آکھڑی ہوتی۔ ان دنوں وہ وہی ساڑی پہنتی تھی جو گوہر اس کے لیے لایا تھا۔ یہ سب تماشا دیکھ دیکھ کر ہوری کا خون خشک ہو جاتا تھا گویا اس کی کھیتی چوٹ کرنے کے لیے آسمان پر اولے والے زرد بادل اٹھے چلے آتے ہوں۔

ایک دن تینوں اسی کنوئیں پر نہانے جا پہنچے، جہاں ہوری اکیچہ سینچنے کے لیے پڑ چلا رہا تھا۔ سونا پڑ لے رہی تھی۔ ہوری کا خون آج کھول اٹھا۔

اسی شام کو وہ دلاری کے پاس گیا۔ سوچا کہ عورتوں کا دل نرم ہوتا ہے شاید اس کا دل پہنچ جائے اور کم سود پر روپیہ دے دے مگر دلاری اپنا ہی رونا لے بیٹھی۔ گاؤں میں ایسا کوئی گھر نہ تھا جس پر اس کے کچھ روپے نہ آتے ہوں، حتیٰ کہ جھنگری سنگھ پر اس کے بیس روپے آتے تھے۔ لیکن کوئی دینے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بیچاری کہاں سے روپے لائے؟

ہوری نے گزرگزا کر کہا ”بھابھی، بڑا پن ہوگا۔ تم روپے نہ دوگی، یہ میرے گلے کی پھانسی کھول دوگی۔ جھنگری اور پیشوری میرے کھیتوں پر دانت لگائے ہوئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ باپ دادوں کی یہی تو نسانی ہے، یہ نکل گئی تو جاؤں گا کہاں؟ ایک سپوت وہ ہوتا ہے جو گھر کی سمپت بڑھاتا ہے۔ میں ایسا کپوت ہو جاؤں کہ باپ دادوں کی کمائی پر جھاڑو پھیر دوں!“

دلاری نے قسم کھائی ”ہوری! میں ٹھاکر جی کے چرن چھو کر کہتی ہوں کہ اس سے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جس نے لیا وہ دیتا نہیں تو میں کیا کروں؟ تمہارا ہی بھائی ہیرا ہے۔ نیل کے لیے پچاس روپے لیے۔ اس کا تو کہیں، پتا ٹھکانا نہیں، اس کی گھر والی سے مانگو تو لڑنے کو تیار ہے۔ سو بھابھی دیکھنے میں بڑا سیدھا ہے مگر پیسہ دینا نہیں جانتا اور اصل بات تو یہ ہے کہ کسی کے پاس ہے ہی نہیں، دے کہاں سے؟ سب کی دسا دیکھتی ہوں، اسی مارے صبر کر جاتی ہوں۔ لوگ کس طرح پیٹ پال رہے ہیں اور کیا کھیتی باڑی بیچنے کی میں صلاح نہ دوں گی۔ کچھ نہیں ہے، مر جاد تو ہے۔“

پھر سرگوشی کرتی ہوئی بولی ”پیشوری لالا کا لونڈا تمہارے گھر کی طرف بہت چکر لگاتا ہے۔ تینوں کا وہی حال ہے۔ ان سے چوکنا رہنا۔ یہ سہر کے ہو گئے ہیں، گاؤں کا بھائی چارا کیا سمجھیں؟ لڑکے گاؤں میں بھی ہیں۔ مگر ان میں کچھ سرم ہے، کچھ ادب ہے اور کچھ ڈر ہے۔ یہ سب تو چھوٹے ساڈ ہیں۔ میری گوسلیا سسرال سے آئی تھی مگر میں نے ان سیوں کے ڈھنگ دیکھ کر اس کے سر کو بلا کر بڈا کر دیا۔ کوئی کہاں تک پہرا دے؟“

ہوری کو مسکراتا دیکھ کر اس نے میٹھے شکوے کے لہجے میں کہا ”ہنسو گے ہوری، تو میں بھی کچھ کہہ دوں گی۔ تم کیا کسی سے کم نٹ کھٹ تھے؟ دن میں پچاسوں بار کسی نہ کسی بہانے سے میری دکان میں آیا کرتے تھے، پر میں نے کبھی تا کا تک نہیں۔“

ہوری نے نرم احتجاج کے ساتھ کہا ”یہ تو تم جھوٹ بولتی ہو بھابھی! میں بنا کچھ رس

پائے تھوڑا ہی آتا تھا۔ چڑیا ایک بار ہرج جاتی ہے تبھی دوسری بار آگن میں آتی ہے۔“
 ”چل جھوٹے!“

”آنکھوں سے نہ تاکتی رہی ہو، پر تمہارا من تو تاکتا ہی تھا، بلکہ بلاتا تھا۔“
 ”اچھا رہنے دو بڑے آئے جوتسی بن کے! تمہیں بار بار منڈرات دیکھ کے مجھے دیا آجاتی تھی، نہیں تم ایسے کوئی بانگے جوان نہ تھے۔“
 حسینی ایک پیسے کا نمک لینے آگیا اور یہ مذاق بند ہو گیا۔ حسینی نمک لے کر چلا گیا تو دلاری نے پھر کہا ”گوہر کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟ دیکھتے بھی آؤ گے سائیت کچھ مل بھی جائے۔“

ہوری مایوسی سے بولا ”وہ کچھ نہ دے گا۔ لڑکے چار پیسے کمانے لگتے ہیں تو آنکھ بدل جاتی ہے۔ میں تو بے حیائی کرنے کو تیار تھا پر دھنیا نہیں مانتی۔ اس کے بنا کہے چلا جاؤں تو گھر میں رہنا دو بھر کر دے۔ اس کا سُھاؤ تو جانتی ہو۔“
 دلاری نے طنزیہ کہا ”تم تو مہریا کے جیسے ٹھگام ہو گئے۔“
 ”تم نے پوچھا ہی نہیں تو کیا کرتا؟“
 ”میری گلائی کرنے کہتے تو میں نے لکھا لیا ہوتا، سچ۔“
 ”تو اب سے کیا بگڑا ہے؟ لکھا لو نا!۔ دو سو میں لکھتا ہوں، ان داسوں مہنگا نہیں ہوں۔“

”تب دھنیا سے تو نہ بولو گے؟“

”نہیں، کہو کسم کھالوں۔“

”اور جو بولے؟“

”تو میری چیمھ کاٹ لینا۔“

”اچھا تو جاؤ، لڑکا ٹھیک ٹھاک کر دو، میں روپے دے دوں گی۔“

ہوری نے آنسو بہاتے ہوئے دلاری کے ہیر پکڑ لیے۔ رقت سے زبان بند ہو گئی۔
 سیٹھانی نے پاؤں کھینچ کر کہا ”اب یہی سرارت تو مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں سال بھر کے اندر اپنے روپے سود سمیت کان پکڑ کر لے لوں گی۔ تم تو بیوہار کے ایسے سچے نہیں ہو مگر دھنیا پر مجھے بسواس ہے۔ سنا کہ پنڈت تم سے بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسے

گاؤں سے نکال کر نہ چھوڑا تو باہن نہیں۔ تم سلیا کو نکال باہر کیوں نہیں کرتے؟ بیٹھے بیٹھائے جھگڑا مول لے لیا۔“

”دھنیا اسے رکھے ہوئے ہے میں کیا کروں؟“

”سنا ہے کہ پنڈت کا سی گئے تھے۔ وہاں ایک بڑا نامی پنڈت ہے۔ وہ پانچ سو مانگتا ہے تب پراچت کرے گا۔ بھلا پوچھو، ایسا اندھیر کہیں ہوا ہے۔ جب دھرم چلا گیا تو ایک نہیں ہجار بار پراچت کرو تو کیا ہوتا ہے۔ تمہارے ہاتھ کا جھوا پانی کوئی نہ پیے گا، چاہے جتنا پراچت کرو۔“

ہوری یہاں سے گھر چلا تو اس کا دل اچھل رہا تھا۔ زندگی میں ایسا سکھ دینے والا تجربہ کبھی نہ ہوا تھا۔ راستے میں سو بھا کے گھر گیا اور سگائی لے کر چلنے کے لیے نیوٹہ دے آیا۔ پھر دونوں داتا دین کے پاس سگائی کی ساعت پوچھنے گئے۔ وہاں سے آکر دروازے پر سگائی کی تیاریوں کا مشورہ کرنے لگے۔

دھنیا نے باہر نکل کر کہا ”پھر رات گئی، ابھی روٹی کھانے کی پیرا نہیں آئی؟ کھا کر بیٹھو۔ باتیں کرنے کو تو ساری رات پڑی ہے۔“

ہوری نے اس سے بھی مشورے میں شریک ہونے کا اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی سہا لگ میں لگن ٹھیک ہوئی ہے۔ بتا کیا کیا سامان لانا چاہیے۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔“

”جب کچھ معلوم ہی نہیں تو صلاح کرنے کیا بیٹھے ہو؟ کچھ روپے پیسہ کا ٹھیک بھی ہوا ہے کہ من کی مٹھائی کھا رہے ہو؟“

ہوری نے شان سے کہا ”تجھے اس سے کیا مطلب؟ تو اتنا بتا دے کہ کیا کیا سامان لانا ہوگا؟“

”تو میں ایسی من کی مٹھائی نہیں کھاتی۔“

”تو اتنا بتا دے کہ ہماری بہنوں کے بیاہ میں کیا کیا سامان آیا تھا؟“

”پہلے یہ بتا دو کہ روپے مل گئے۔“

”ہاں مل گئے اور نہیں تو کیا بھگ کھائی ہے۔“

”تو پہلے چل کر کھالو، پھر صلاح کریں گے۔“

مگر جب اس نے سنا کہ دلاری سے بات چیت ہوئی ہے تو ناک سکیڑ کر بولی ”اس

سے روپے لے کر آج تک ارن ہوا ہے؟ چیل کتنا کس کر سود لیتی ہے۔“

”لیکن کرتا کیا؟ دوسرا دیتا کون ہے؟“

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ اسی بہانے دو گال ہنسنے بولنے گیا تھا؟ بوڑھے ہو گئے پر وہ بان نہ گئی۔“

”تو تو دھنیا بچوں کی سی باتیں کرنے لگتی ہے۔ میرے جیسے پھٹے حالوں سے وہ ہنسے بولے گی؟ سیدھے منہ بات تو کرتی نہیں۔“

”تم جیسے کو چھوڑ کر اس کے پاس اور جائے ہی گا کون؟“

”اس کے دوارے پر اچھے اچھے ناک رگڑتے ہیں۔ دھنیا! تو کیا جانے؟ اس کے پاس بھی ہے۔“

”اس نے ٹینک سی حامی بھردی تو تم سب جگہ گاتے پھرنے لگے۔“

”حامی نہیں بھردی، پکا وعدہ کیا ہے۔“

ہوری روٹی کھانے لگا اور سو بھا اپنے گھر چلا گیا تو سونا سلیا کے ساتھ باہر نکلی۔ وہ دروازے پر کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس کی سگائی کے لیے دو سو روپے دلاری سے ادھار لیے جارہے ہیں، یہ بات اس کے پیٹ میں ایسی کھلبلی مچا رہی تھی جیسے تازہ چوٹا پانی میں پڑ گیا ہو۔ دروازے پر ایک کچی جل رہی تھی جس سے طاق کے اوپر کی دیوار سیاہ ہو گئی تھی۔ دونوں تیل تاند میں سانی کھا رہے تھے اور ایک کتا زمین پر کھڑا کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ دونوں بیلوں کی چری کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔

سونا بولی ”تو نے کچھ سنا؟ دادا میری سگائی کے لیے سیٹھانی سے دو سو روپے ادھار لے رہے ہیں۔“

سلیا گھر کا ذرا ذرا حال جانتی تھی بولی ”گھر میں پیسہ نہیں ہے تو کیا کریں؟“

سونا نے سامنے کے سیاہ درختوں کی طرف تاکتے ہوئے کہا ”میں ایسا بیاہ نہیں کرتا چاہتی جس میں ماں باپ کو ادھار لینا پڑے۔ کہاں سے دیں گے بے چارے؟ بتا! پہلے ہی رن کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، دو سو اور لیں گے تو بوجھ اور بھاری ہو جائے گا کہ نہیں؟“

”بتا دیے لیے بڑے آدمیوں کا کہیں بیاہ نہیں ہوتا پگلی؟ دیچ کے بتا تو کوئی بوڑھا

باڑھا ہی ملے گا۔ جائے گی بوڑھے کے ساتھ؟“
 ”بوڑھے کے ساتھ کیوں جاؤں؟ بھیا بوڑھے تھے جو تمھیا کو لے آئے؟ انھیں کس
 نے دیچ میں گئے پیسے دیے تھے؟“

”اس میں باپ دادا کا نام ڈوبتا ہے۔“
 ”میں تو سناری والوں سے کہہ دوں گی کہ اگر تم نے ایک پیسہ بھی دیچ لیا تو میں تم
 سے بیاہ نہ کروں گی۔“

سونا کا بیاہ سناری کے ایک مالدار کسان کے لڑکے سے ملے ہوا تھا۔
 ”اور جو وہ کہہ دے کہ میں کیا کروں، تمھارے باپ دیتے ہیں اور میرے باپ لیتے
 ہیں، تو اس میں میرا کیا بس؟“

سونا نے جس ہتھیار کو بہت کارگر سمجھا تھا، اب معلوم ہوا کہ وہ بالکل نکما ہے مایوس ہو کر
 بولی ”میں ایک بار اس سے کہہ کر دیکھ لینا چاہتی ہوں۔ اگر اس نے کہہ دیا کہ میرا کوئی بس
 نہیں تو کیا گومتی یہاں سے بہت دور ہے؟ جاکر ڈوب مروں گی۔ ماں باپ نے مرمر کے
 پالا پوسا تو اس کا بدلہ کیا یہی ہے کہ ان کے گھر سے جانے لگوں تو انھیں کربے اور لادتی
 جاؤں؟ بھگوان نے ماں باپ کو دیا ہو تو بھتنا جی میں آوے لڑکی کو دیں، میں منع نہیں کرتی۔
 لیکن جب وہ پیسے کو تنگ ہو رہے ہیں، تو کنیا کا دھرم یہی ہے کہ ڈوب مرے۔ گھر کی
 جمین، جگہ اور جائیداد تو بیچ جائے گی، روٹی کا سہارا تو رہ جائے گا۔ ماں باپ چار دن
 میرے نام کو رو کر صبر کر لیں گے۔ یہ تو نہ ہوگا کہ انھیں میرا بیاہ کر کے جنم بھر روتا پڑے۔
 تین چار سال میں دو سو کے دوٹے ہو جائیں گے۔ دادا کہاں سے لا کر دیں گے؟“

سلیا کو معلوم ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں نئی چمک آگئی ہے۔ جوش میں سونا کو
 سینے سے لگا کر بولی ”تو نے اتنا گیان کہاں سے سیکھ لیا سونا؟ دیکھنے میں تو بڑی بھولی
 بھالی ہے۔“

”اس میں گیان کی کون بات ہے؟ کیا میرے آنکھ نہیں ہے؟ کہ میں پاگل ہوں؟ دو
 سو میرے بیاہ میں لیں۔ تین سال میں دوٹا ہو جائے۔ تب روپیا کی سگائی میں دو سو اور لیں
 اور جو کچھ بھیتی باری ہے سب لیلام ہو جائے اور دوارے دوارے بھیک مانگتے پھریں، یہی نا؟
 اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ میں اپنی ہی جان دے دوں۔ تو منہ اندھیرے سناری چلی جانا

اور اسے بلا لانا۔ مگر نہیں، بلانے کا کام نہیں ہے۔ مجھے اس سے بولتے لاج آئے گی۔ تو ہی میرا یہ سندیسہ کہہ دیتا۔ دیکھیں کیا جواب ملتا ہے۔ کون دور ہے؟ ہندی کے اس پار ہی تو ہے! کبھی کبھی ڈھور لے کر ادھر آ جاتا ہے۔ ایک بار اس کی بھینس میرے کھیت میں ٹھس گئی تھی تو میں نے اسے بہت گالیاں دی تھیں۔ ہاتھ جوڑنے لگا۔ ہاں یہ تو بتا کہ ادھر متی سے تیری بھینٹ ہوئی؟ سنا کہ ہامن اسے برداری میں نہیں لے رہے ہیں۔“

سلیمانے حقارت سے کہا ”برادری میں کیوں نہ لیں گے، ہاں وہ بوڑھا روپیہ نہیں کھرج کرنا چاہتا۔ اس کو پیسہ مل جائے تو جھوٹی گنگا اٹھالے۔ لڑکا آج کل باہر کی دالان میں بٹلر لگاتا ہے۔“

”تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟ اپنی برادری میں کسی کے یہاں بیٹھ جا اور آرام سے رہ۔ وہ تیری ہنک تو نہ کرے گا؟“

”ہاں ری، کیوں نہیں۔ میرے پیچھے اس کی اتنی درگت ہوئی تو اب میں اسے چھوڑ دوں؟ اب وہ چاہے پنڈت بن جائے، چاہے دیوتا بن جائے پر میرے لیے تو وہی متی ہے جو میرے پیروں پر ماتھا رگڑا کرتا تھا۔ اور ہامن بھی ہو جائے اور ہامن سے بیاہ بھی کر لے تو بھی جتنی اس کی سیوا میں نے کی ہے وہ کوئی ہامن کیا کرے گی۔ ابھی مر جاد کے موہ میں وہ چاہے مجھے چھوڑے دے پر دیکھ لینا کہ پھر دوڑا آئے گا۔“

”آپکا اب۔۔۔ تجھے پائے تو کچا ہی کھا جائے۔“

”تو اسے بلانے ہی کون جاتا ہے؟ اپنا اپنا دھرم اپنے اپنے ساتھ ہے۔ وہ اپنا دھرم

توڑ رہا ہے تو میں اپنا دھرم کیوں توڑوں؟“

بڑے سویرے سلیماناری کی طرف چلی مگر ہوری نے روک لیا۔ دھنیا کے سر میں درد تھا۔ اس کی جگہ کیاریوں کو برانا تھا سلیمانار نہ کر سکی۔ یہاں سے جب دوپہر کو چھٹی ملی تو وہ سناری چلی۔ ادھر تیسرے پہر ہوری پھر کنوئیں پر چلا تو سلیمانار کا پتہ نہ تھا، مگر کر بولا ”سلیمانار کہاں اڑ گئی؟ رہتی ہے، رہتی ہے، نہ جانے کدھر چل دیتی ہے۔ جیسے کسی کام میں من ہی نہیں لگتا۔ تو جانتی ہے سونا، کہاں گئی ہے؟“ سونا نے حیلہ کیا ”مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ کہتی تھی کہ دھوبن کے گھر کپڑے لینے جاتا ہے، وہیں چلی گئی ہوگی۔“

دھنیا نے چار پائی سے اٹھ کر کہا ”چلو میں کیاری برائے دیتی ہوں۔ کون اسے مجھوری

دیتے ہو جو بگڑ رہے ہو؟“

”ہمارے گھر میں رہتی نہیں ہے؟ اس کے پیچھے سارے گاؤں میں بدنامی نہیں ہو رہی

ہے؟“

”اچھا رہنے دو۔ ایک کونے میں پڑی ہوئی ہے تو اس سے کرایہ لو گے؟“

”ایک کونے میں نہیں پڑی ہوئی ہے، ایک پوری کوٹھری لیے ہوئے ہے۔“

”تو اس کوٹھری کا کرایہ ہوگا کوئی پانچ روپیہ مہینہ؟“

”اس کا کرایہ ایک پیسہ سہی! ہمارے گھر میں رہتی ہے، تو جہاں جائے پوچھ کر جائے،

آج آتی ہے تو کھم لیتا ہوں۔“

پُر چلنے لگا۔ دھنیا کو ہواری نے نہ آنے دیا۔ روپا کیاری براتی تھی اور سونا پُر لے رہی

تھی۔ روپا گیلی مٹی کے چولھے اور برتن بنا رہی تھی اور سونا یاس اور امید بھری آنکھوں سے

سناری کی طرف تاک رہی تھی۔ امید کم تھی، یاس زیادہ سوچتی تھی کہ ان لوگوں کو روپے مل

رہے ہیں تو کیوں چھوڑنے لگے؟ جن کے پاس پیسہ ہے وہ تو پیسے پر اور جان دیتے ہیں۔

پھر گوری مہتو تو ایک ہی لالچی ہیں۔ مہرا میں دیا ہے، دھرم ہے مگر باپ کی ہتھکڑی ہوگی وہی

اسے ماننی پڑے گی۔ مگر سونا بھی بچہ کو ایسا پھٹکارے گی کہ یاد کریں گے۔ وہ کھلم کھلا کہہ

دے گی کہ جا کر کسی امیر کی لڑکی سے بیاہ کر؟ تجھ جیسے مرد کے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ کہیں

گوری مہتو مان گئے تو وہ ان کے چرن دھو دھو کر پیسے گی۔ ان کی ایسی سیوا کرے گی جیسی اپنی

باپ کی بھی نہ کی ہوگی۔ اور سلیا کو بھر پیٹ مٹھائی کھلا دے گی۔ گوہر نے جو روپیہ اسے دیا

اسے وہ ابھی تک رکھے ہوئی تھی۔ اس شیریں تصور سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور

رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔

مگر سلیا ابھی تک آئی کیوں نہیں؟ کون بڑی دور ہے؟ نہ آنے دیا ہوگا ان لوگوں

نے۔ آہا، وہ آ رہی ہے! لیکن بہت دھیرے دھیرے آتی ہے۔ سونا کا دل بیٹھ گیا۔ ابھاگے

نہیں مانے سلیمت، نہیں تو سلیا دوڑتی آتی۔ تو سونا سے ہو چکا بیاہ منہ دھو رکھو۔

سلیا آئی ضرور مگر کونوئیں پر نہ جا کر کھیت میں کیاری برانے لگی۔ ڈر رہی تھی کہ اگر

ہواری پوچھیں گے کہ کہاں گئی تھی اب تک، تو کیا جواب دے گی۔ سونا کے یہ دو گھنٹے بڑی

مشکل سے گزرے۔ پر بند ہوتے ہی وہ دوڑی ہوئی سلیا کے پاس گئی۔

”وہاں جا کر تو مر گئی تھی کیا؟ تاکتے تاکتے آنکھیں پھوٹ گئیں۔“

سلیا کو برا لگا ”تو کیا میں وہاں سوتی تھی؟ اس طرح کی بات چیت راہ چلتے تھوڑے ہو جاتی ہے۔ موکا دیکھنا پڑتا ہے۔ مقرر اندی پر دھور چرانے گیا تھا۔ کھوجتی کھوجتی اس کے پاس گئی اور تیرا سند یہ کہا۔“

”ایسا کس ہوا کہ تجھ سے کیا کہوں۔ میرے پاؤں پر گر پڑا اور بولا میں نے تو جب سے سنا ہے کہ سونا میرے گھر میں آ رہی ہے تب سے آنکھوں کی نیند ہر گئی ہے۔ اس کی وہ گالیاں مجھے پھل گئیں۔ پر کا کا کو کیا کروں، وہ کسی کی نہیں سنتے۔“

سونا نے ٹوکا ”تو نہ سنیں سونا بھی ٹپٹی ہے۔ جو کہا ہے وہ کر دکھائے گی۔ پھر ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔“

”بس اسی جہنم دھوروں کو وہیں چھوڑ کے مجھے لیے ہوئے گوری مہتو کے پاس گیا۔ مہتو کے چار پڑ چلتے ہیں۔ کنواں بھی ان کا ہے۔ دس بیگھے ادکھ ہے مہتو کو دیکھ کے مجھے ہنسی آگئی جیسے کوئی گھسیرا ہو۔ ہاں بھاگ اچھے ہیں۔ باپ بیٹے میں بڑی کہا سنی ہوئی۔ گوری مہتو کہتے تھے کہ تجھ سے کیا مطلب، میں چاہے کچھ لوں یا نہ لوں، تو کون ہوتا ہے بولنے والا؟ مقرر اکہتا تھا کہ تم کو لینا دینا ہے تو میرا بیاہ مت کرو، میں اپنا بیاہ جیسے چاہوں گا کر لوں گا۔ بات بڑھ گئی اور گوری نے ”نہیں اتار مقرر اکو خوب پیٹا۔ کوئی دوسرا لڑکا اتنی مار کھا کے بگڑ کھڑا ہوتا۔ مقرر ایک گھونسنہ بھی بھادیتا تو مہتو پھرنے لگتے۔ مگر بے چارہ ”نہیں کھا کر بھی کچھ نہ بولا۔ آنکھوں میں آنسوں بھرے میرا منہ تاکتا ہوا چلا گیا۔ تب مہتو مجھ پر بگڑنے لگے۔ سیکڑوں گالیاں دیں۔ مگر میں کیوں سننے لگی؟ مجھے ان کا کیا ڈر تھا؟ میں نے ساپھ کہہ دیا کہ مہتو! دو تین سو کوئی بڑی بھاری رقم نہیں ہے اور ہوری مہتو اتنے میں بک نہ جائیں گے اور نہ تم ہی امیر ہو جاؤ گے، پر وہ سب دھن ناچ تماشے میں ہی اڑ جائے گا۔ ہاں ایسی بہو نہ پاؤ گے۔“

سونا نے آنسو بھر کر پوچھا ”تو مہتو اتنی ہی بات پر اسے مارنے لگے؟“

سلیا نے بات چھپا رکھی تھی، ایسی ذلیل بات سونا کے کانوں نہ ڈالنا چاہتی تھی مگر یہ سوال سن کر ضبط نہ کر سکی اور بولی ”وہی گویہ بھیا والی بات تھی۔ مہتو نے کہا آدمی جو غصا تو تبھی کھاتا ہے جب بیٹھا ہو، اور کلنگ چاندی ہی سے دھلتا ہے۔ اس پر مقرر بولا کہ کا کا کون

گھر کلنگ سے بچا ہے؟ ہاں کسی کا کھل گیا اور کسی کا چھپا ہوا ہے۔ گوری مہتو بھی پہلے ایک چمارن سے پھنسے تھے اور اس سے دوڑنے لگے بھی ہیں۔ مٹھرا کے منہ سے اتنا ٹکنا تھا کہ بوڑھے پر جیسے بھوت چڑھ گیا۔ جتنا لالچی ہے۔ اتنا گتیل بھی ہے۔ بنا لیے نہ مانے گا۔“

دونوں گھر چلیں۔ سونا کے سر پر ہڈ، رستا اور جوئے کا بھاری بوجھ تھا۔ مگر اس وقت تو وہ اسے پھول سے بھی ہلکا لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں جیسے خوشی اور زندہ دلی کا سوتا کھل گیا تھا۔ مٹھرا کی وہ مردانہ مورت سامنے کھڑی تھی اور وہ گویا اسے اپنے دل میں بیٹھا کر اس کے پیروں کو اپنے آنسوؤں سے دھو رہی تھی۔ جیسے آسمانی روحیں اسے گود میں اٹھائے آسمان میں پھیلی ہوئی سرخی میں لیے چلی جا رہی تھیں!۔

اسی رات سونا کو شدت کا بخار ہو آیا۔

تیسرے دن گوری مہتو نے نائی کے ہاتھ یہ خط بھیجا۔

”سری سرب اُپا جوگ سری ہوری مہتو کو گوری رام کا رام رام بانچنا۔ آگے جو ہم لوگوں میں دیچ کی بات چیت ہوئی تھی۔ اس پر ہم نے من سے بچا کر کیا تو سمجھ میں آیا کہ لین دین سے بُرے اور کنیا دونوں ہی کے گھر والے جبر بار ہوتے ہیں۔ جب ہمارا تمہارا ناتا ہو گیا تو ہمیں ایسا برتاؤ کرنا چاہیے کہ کسی کو نہ اکھرے۔ تم دیچ کی کوئی چٹا مت کرنا۔ ہم تم کو سوگند دیتے ہیں۔ جو کچھ موٹا مہین ہو سکے، براتیوں کو کھلا دینا۔ ہم تو وہ بھی نہ مانگیں گے۔ رسد کا بندوبست ہم نے کر لیا ہے۔ ہاں تم کھسی سے جو ہمارے کھاطر کرو گے وہ سر جھکا کر منجور کریں گے۔“

ہوری نے خط پڑھا اور دوڑتے ہوئے اندر جا کر دھنیا کو سنایا۔ خوشی کے مارے اچھلا پڑتا تھا۔ مگر دھنیا کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی رہی۔ ایک لمحہ بعد بولی ”یہ گوری مہتو کی بھلمنسی ہے پر ہمیں بھی تو اپنی مرچاد کا نباہ کرنا ہے۔ سنسار کیا کہے گا؟ روپیہ ہاتھوں کا میل ہے۔ اس کے لیے گھر کی مرچاد نہیں چھوڑی جاسکتی۔ جو کچھ ہم سے ہو سکے گا ہم دیں گے اور گوری مہتو کو لینا پڑے گا۔ تم یہی جواب لکھ دو۔ ماں باپ کی کمائی میں کیا لڑکی کا کوئی حصہ نہیں ہے؟ نہیں، لکھنا کیا ہے۔ چلو میں نائی سے سندیرہ کہلائے دیتی ہوں۔“

ہوری بدحواس سا آنگن میں کھڑا تھا اور دھنیا اس فیاضی کے جواب میں جو گوری نے کی تھی، اپنا سندیرہ کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے نائی کو شربت پلایا اور رخصتانہ دے کر

رخصت کیا۔

وہ چلا گیا تو ہوری نے کہا ”یہ تو نے کیا کر ڈالا دھنیا؟ تیرا سجاؤ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تو آگے بھی چلتی ہے اور پیچھے بھی چلتی ہے۔ پہلے اس باپ پر لڑ رہی تھی کہ کسی سے ایک پیسہ ادھار مت لو۔ کچھ دینے دلانے کا کام نہیں ہے اور جب بھگوان نے گوری کے دل میں بیٹھ کر یہ چشمی لکھوائی تو تو نے گھرانے کی مرجاد کا راگ چھیڑ دیا۔ تیرا بھید بھگوان ہی جانیں۔“

دھنیا بولی ”منہ دیکھ کر بیڑا دیا جاتا ہے، جانتے ہو کہ نہیں؟ تب گوری اپنی سان دکھاتے تھے، اب وہ بھلمنسی دکھاتے ہیں۔ اینٹ کا جواب چاہے پتھر ہو مگر پرنام کا جواب تو گالی نہیں ہے۔“

ہوری نے ناک سکیڑ کر کہا ”تو دکھا اپنی بھلمنسی! دیکھوں کہ کہاں سے روپے لاتی ہے۔“
دھنیا آنکھیں منکا کر بولی ”روپیہ لانا میرا کام نہیں ہے، تمہارا کام ہے۔“
”میں تو دلاری ہی سے لوں گا۔“

”لے لو اسی سے۔ سود تو سبھی لیں گے۔ جب ڈوبتا ہی ہے تو کیا گڑھنی اور کیا گنگا۔“
ہوری باہر جا کر ٹھہ پینے لگا۔ کتنے مزے سے گلا چھوٹا جاتا تھا۔ مگر دھنیا جان چھوڑے تب تو جب دیکھو الٹا ہی چلتی ہے۔ اسے جیسے کوئی بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ گھر کی دسا دیکھ کر بھی اس کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

بھولا ادھر دوسری سگائی کر لائے تھے۔ عورت کے بغیر ان کی زندگی بے کیف تھی۔ جب تک جھپٹا تھی انھیں حقہ پانی دے دیتی تھی اور وقت پر کھانے کو بھی بلا لے جاتی تھی۔ اب بے چارے بے بس ہو گئے تھے۔ بہوؤں کو گھر کے کام کاج ہی سے جھٹی نہ ملتی تھی۔ ان کی خدمت کیا کرتیں؟ اس لیے اب سگائی بہت ضروری ہو گئی تھی۔ اتفاق سے ایک جوان بیوہ مل گئی جس کے شوہر کو مرے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا بھی تھا بھولا کی رال ٹپک پڑی اور جھٹ پٹ شکار مار لائے۔ جب تک سگائی نہ ہوئی اس کا گھر کھو ڈالا۔ ابھی تک ان کے گھر میں جو کچھ تھا وہ بہوؤں کا تھا۔ جو چاہتی تھیں کرتی تھیں، جیسے چاہتی تھیں رہتی تھیں۔ جنگلی جب سے اپنی عورت کو لے کر لکھنؤ چلا گیا تھا اس وقت سے کامتا ہی کی عورت گھر کی مالک تھی۔ پانچ چھ مہینے ہی میں اس نے تیس چالیس روپے اپنے ہاتھ میں کر لیے تھے۔ سیر آدھ سیر دودھ دی چرا کر بیچ لیتی تھی۔ اب مالک ہوئی اس کی سوتیلی ساس۔ اس کی حکومت بہو کو بری لگتی تھی اور آئے دن دونوں میں جھگڑا ہوتا رہتا تھا، حتیٰ کے عورتوں کے پیچھے بھولا اور کامتا میں بھی کہا سنی ہو گئی۔ جھگڑا اتنا بڑھا کہ الگا وے کی نوبت آگئی اور یہ ریت سدا سے چلی آئی ہے کہ الگا وے کے وقت مار پیٹ بھی ضروری ہوتی ہے۔ یہاں بھی اسی قاعدے پر عمل کیا گیا۔ کامتا جوان آدمی تھا۔ بھولا کا اس پر جو کچھ دباؤ تھا وہ باپ کے ناتے مگر نبی عورت لا کر اسے بیٹے سے عزت پانے کا اسے کوئی حق نہ رہا۔ کم از کم کامتا اسے تسلیم نہ کرتا تھا۔ اس نے بھولا کو پنک کر کئی لاتیں لگائیں اور گھر سے نکال باہر کر دیا۔ گھر کی چیزیں چھونے بھی نہ دیں۔ گاؤں والوں میں بھی کسی نے بھولا کی حمایت نہ کی۔ نئے بیاہ نے انھیں نکو بنا دیا تھا۔ رات تو انھوں نے کسی طرح ایک بیڑ کی نیچے کاٹی مگر صبح ہوتے ہی نوکھے رام کے یہاں جا پہنچے اور فریاد کی۔ بھولا کا گاؤں بھی انھیں کے حلقے میں تھا اور حلقے بھر کے مالک کھیا جو کچھ تھے وہی تھے۔ نوکھے رام کو بھولا پر تو کیا رحم آتا، مگر ان کے ساتھ ایک رنگیلی جھیلی عورت دیکھی تو فوراً جگہ دینے پر راضی ہو گئے۔ جہاں ان کی کائیں

بندھتی تھیں ، وہی ایک کوٹھری رہنے کو دے دی ۔ اپنے جانوروں کی دیکھ بھال ، سانی پانی کے لیے انھیں یکا یک ایک واقف کار آدمی کی ضرورت محسوس ہونے لگی ۔ بھولا کو تین روپے ماہوار اور ایک سیر روز اناج پر رکھ لیا ۔

نوکھے رام ناٹے ، موٹے ، چندوے ، لمبی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے آدمی تھے ۔ بڑا سا گچڑ باندھتے ، بچا کرتے پہنتے اور جاڑوں میں لحاف اوڑھ کر باہر آتے جاتے تھے ۔ انھیں تیل کی مالش کرانے میں بڑا مزا آتا تھا ۔ پس ان کے کپڑے ہمیشہ میلے کچیلے رہتے تھے ۔ ان کا کنبہ بہت بڑا تھا ۔ سات بھائی اور ان کے بال بچے ، سبھی ان کے سہارے تھے خود ان کا لڑکا نویں درجہ میں انگریزی پڑھتا تھا اور اس کے بابو پن کا ٹھٹا باٹ بھانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا ۔ رائے صاحب سے انھیں صرف بارہ روپے تنخواہ ملتی تھی مگر خرچ سو روپے سے کوڑی کم نہ تھا ۔ اسی لیے آسامی کسی طرح ان کے چنگل میں پھنس جائے تو اسے خوب چوسے بغیر نہ چھوڑتے تھے ۔ پہلے چھ روپے تنخواہ ملتی تھی ، تب آسامیوں سے اتنی نوچ کھسٹ نہ کرتے تھے مگر جب سے بارہ روپے ہو گئے تھے اس وقت سے ان کی ہوس اور بھی بڑھ گئی تھی ۔ اس لیے رائے صاحب ان کی ترقی نہ کرتے تھے ۔

گاؤں میں اور تو سبھی کسی نہ کسی صورت میں ان کا دباؤ مانتے تھے حتیٰ کہ دامادین اور جھنگری سنگھ بھی ان کی خوشامد کرتے تھے ، صرف پیٹھوری ان سے غم ٹھونکنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے ۔ نوکھے رام کو اگر یہ دُغم تھا کہ ہم برہمن ہیں اور کاسیتھوں کو انگلی پر نچاتے ہیں تو پیٹھوری کو گھمنڈ تھا کہ ہم کانستھ ہیں ، قلم کے بادشاہ ۔ اس میدان میں کوئی دوسرا ہم سے کیا بازی لے جائے گا ۔ پھر وہ زمیندار کے نوکر نہیں ۔ بلکہ ایسی سرکار کے نوکر ہیں جس کے راج میں آفتاب کبھی نہیں غروب ہوتا ۔ نوکھے رام اگر ایکادیشی کو درت رکھتے ہیں اور پانچ برہمنوں کو کھلاتے ہیں تو پیٹھوری ہر پورن ماسی کو ست نرائن کی کھٹاسیں گے اور دس برہمنوں کو کھلائیں گے ۔ جب سے ان کا بڑا لڑکا پتر دل ہو گیا تھا ، نوکھے رام اس تاک میں رہتے تھے کہ ان کا لڑکا بھی کسی طرح دھواں درجہ پاس کر لے تو اسے بھی کہیں نقل نویسی دلادیں ۔ اسی لیے حکام کے پاس فصلی تحفے لے کر برابر سلام کرنے جایا کرتے تھے ۔ پیٹھوری ایک اور بات میں بھی ان سے بڑھے ہوئے تھے ۔ لوگوں کا خیال تھا وہ اپنی بیوہ کہارن کو رکھے ہوئے ہیں تو اب نوکھے رام کو بھی اپنی شان میں یہ کسر پوری کرنے کا موقع ملتا ہوا معلوم ہوا ۔

بھولا کو ڈھارس دیتے ہوئے بولے ”تم یہاں آرام سے رہو بھولا ، کسی بات کا کھٹکا نہیں۔ جو ضرورت ہو ہم سے آکر کہو۔ تمھاری گھر والی ہے سو اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی کام نکل آوے گا۔ بکھاروں میں اناج رکھنا ، نکالنا ، بچھوڑنا ، پھٹکنا کیا یہ سب تمھوڑا کام ہے۔“

بھولانے عرض کیا ”ایک بار کامتا کو بلا کر پوچھ لو کیا باپ کے ساتھ بیٹے کا یہی برتاؤ ہونا چاہیے۔ مگر ہم نے بنوایا ، گائے بھینسیں ہم نے لیں ، اب سب کچھ اس نے ہتھ لیا اور ہمیں نکال باہر کر دیا ہے۔ یہ آیاؤ نہیں تو کیا ہے ؟ ہمارے مالک تو تم ہی ہو ، تمھارے دربار سے اس کا نیاؤ ہونا چاہیے۔“

نوکھے رام نے سمجھایا ”بھولا تم اس سے لڑکر جیت نہ پاؤ گے۔ اس نے جیسا کیا اس کا ڈنڈ اسے بھگوان دیں گے۔ بے ایمانی کر کے کوئی آج تک پھلا پھولا نہیں۔ دنیا میں بے ایمانی نہ ہوتی تو اسے نرک کیوں کہا جاتا ؟ یہاں نیائے اور دھرم کو کون پوچھتا ہے ؟ بھگوان سب دیکھتے ہیں۔ سنسار کا رتی رتی حال جانتے ہیں۔ تمھارے من میں اس سے کیا بات ہے ، یہ ان سے کیا چھپا ہے ؟ اسی سے تو انٹر جامی کہلاتے ہیں۔ ان سے بچ کر کوئی کہاں جائے گا ؟ تم چپکے ہو کے بیٹھو۔ بھگوان کی اچھا ہوئی تو یہاں تم اس سے بُرے نہ رہو گے۔“

یہاں سے اٹھ کر بھولانے ہوری کے پاس جا کر اپنا دکھڑا رویا۔ ہوری بنے اپنی بیٹی سنائی ”لڑکوں کی آج کل کچھ نہ پوچھو، بھولا بھائی ! مرمر کے پالو پوسو اور جوان ہو تو ہیری بن جائیں۔ میرے ہی گوبر کو دیکھو ، ماں سے لڑکر گیا ہے اور برسوں ہو گئے ، نہ چشمی نہ پتڑی ! اس کے لیکھے تو ماں باپ مر گئے۔ لڑکی کا بیاہ سر پر ہے پر اس سے کوئی مطلب نہیں۔ کھیت رہن رکھ کر دوسو روپے لیے ہیں۔ اجت آبرو کا نباہ تو کرنا ہی ہوگا۔“

کامتا نے باپ کو نکال باہر تو کر دیا مگر اسے معلوم ہونے لگا کہ بوڑھا کتنے کام کا آدمی تھا۔ سویرے اٹھ کر سانی پانی کرنا ، دودھ دوہنا ، پھر دودھ لے کر بازار جانا ، پھر وہاں سے آکر سانی پانی کرنا ، پھر دودھ دوہنا ، کوئی چندرہ روز میں اس کا حلیہ بگڑ گیا۔ مرد عورت میں لڑائی ہوئی۔ عورت نے کہا کہ میں جان دینے کے لیے تمھارے گھر نہیں آئی ہوں ، اگر میری روٹی تمھیں بھاری ہو تو میں اپنے گھر چلی جاؤں۔ کامتا ڈرا کہ یہ کہیں چلی جائے تو روٹی کا بھی ٹھکانہ نہ رہے۔ اپنے ہی ہاتھ سے ٹھوکنے پڑے۔ آخر ایک نوکر رکھا۔ مگر اس سے کام نہ چلا۔ نوکر کھلی بھوسہ چرا چرا کر پیچھے لگا تو اسے الگ کیا۔ پھر عورت مرد میں لڑائی ہوئی۔

عورت روٹھ کر میکے چلی گئی۔ کامتا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہار کر بھولا کے پاس آیا اور خوشامد کرنے لگا۔ ”دادا مجھ سے جو کچھ بھول چوک ہوئی چھما کرو۔ اب چل کر گھر سنبھالو۔ جیسے تم رکھو گے ویسے ہی رہوں گا۔“

بھولا کو یہاں مزدوروں کی طرح رہنا کھل رہا تھا۔ پہلے مینے دو مینے ان کی جو خاطر ہوئی وہ اب نہ تھی۔ نوکے رام کبھی کبھی ان سے چلم بھرنے اور چار پائی بچھانے کو بھی کہتے تھے، اس وقت بے چارہ بھولا زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ اپنے گھر میں لڑائی جھگڑا بھی ہو تو کسی کی سیوا ٹھل تو نہ کرنی پڑے گی۔

اس کی عورت ٹہرا نے یہ تجویز سنی تو اینٹھ کر بولی ”جہاں سے لات کھا کر آئے وہیں پھر جاؤ گے؟ تمہیں لاج بھی نہیں آتی؟“

بھولانے کہا ”تو یہیں کون سنگھاسن پر بیٹھا ہوا ہوں۔“

نہرانے منک کر کہا ”تمہیں جانا ہو تو جاؤ، میں نہیں جاتی۔“

بھولا جانتا تھا کہ نہرا مخالفت کرے گی۔ اس کا سبب بھی وہ کچھ کچھ سمجھتا تھا اور کچھ کچھ دیکھتا بھی تھا۔ اس کے یہاں سے بھاگنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ یہاں اس کی تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا مگر نہرا کی بڑی خاطر ہوتی تھی۔ پیادے اور ٹھننے تک اس کا دباؤ مانتے تھے۔ اس کا جواب سن کر بھولا کو غصہ آیا مگر کرتا کیا؟ نہرا کو چھوڑ کر جانے کی ہمت اس میں ہوتی تو نہرا بھی جھک مار کر اس کے پیچھے چلی جاتی۔ اسے یہاں تنہا رکھنے کی ہمت نوکے رام میں نہ تھی۔ وہ نئی کی آڑ سے شکار کھیلنے والے آدمی تھے مگر نہرا بھولا کے مزاج سے واقف ہو چکی تھی۔

بھولا منت کر کے بولا ”دیکھ نہری! تنگ مت کر۔ اب تو وہاں بہوویں بھی نہیں ہیں، میرے ہی ہاتھ میں سب کچھ رہے گا۔ یہاں مجوری کرنے سے برادری میں کتنی بدنامی ہو رہی ہے، یہ سوچ!“

نہرا نے انگوٹھا دکھا کر کہا ”تمہیں جانا ہو تو جاؤ میں تمہیں روک نہیں رہی ہوں۔ تمہیں بیٹے کی لاتیں پیاری لگتی ہوں، مجھے تو نہیں لگتیں۔ میں اپنی مجوری میں مگن ہوں۔“

بھولا کو رہنا پڑا اور کامتا اپنی عورت کو خوشامد کر کے اسے منا لایا۔ ادھر نہرا کے بارے میں بھی سرگوشیاں ہوتی رہیں۔

”نہرا نے آج گلابی ساڑی پہنی ہے۔ اب کیا پوچھنا ہے۔ چاہے نت نئی ساڑی پہنے سناں بھئے کو تو اب ڈر کا ہے کا؟ بھولا کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟“

سو بھا بڑا پر مذاق تھا۔ سارے گاؤں کا مسخرا بلکہ نازد۔ ہر بات کی ٹوہ لگاتا رہتا تھا۔ ایک دن نہری اسے گھر میں مل گئی، کچھ ہنسی کر بیٹھا۔ نہری نے نوکھے رام سے جڑ دیا۔ سو بھا کی چو پال میں طلی ہوئی اور ایسی ڈانٹ پڑی کے عمر بھر نہ بھولے گا۔

ایک دن لالا پیشوری پر شاد کی شامت آگئی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ لالا باغیچے میں آم توڑ دار ہے تھے۔ نہری بنی ٹھنی ادھر سے نکلی۔ لالا نے پکارا ”نہری رانی، ادھر آؤ تھوڑے سے آم لیتی جاؤ، بڑے میٹھے ہیں۔“

نہری کو شک ہوا کہ لالا میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اسے اب گھمنڈ ہونے لگا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ لوگ اسے زمیندارنی سمجھیں اور اس کی عزت کریں۔ مغرور شخص عموماً شکی ہوا کرتا ہے اور جب دل میں چور ہو تو یہ شک اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر کیوں ہنسا؟ سب لوگ مجھے دیکھ کر کیوں جلتے ہیں؟ میں کسی سے کچھ مانگتے نہیں جاتی۔ کون بڑی ستونتی ہے؟ تنک میرے سامنے آئے تو دیکھوں!

اتنے دنوں میں نہری گاؤں کے بھیدوں سے واقف ہو چکی تھی۔ یہی لالا کہارن کو رکھے ہوئے ہیں اور مجھے ہنسنے ہیں! انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا، بڑے آدمی ہیں نا۔ نہری غریب ہے، کم ذات کی ہے اسی لیے سبھی اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا۔ انھیں کارمیسوری تو سلایا کے پیچھے پاگل بنا پھرتا ہے۔ چماریوں پر تو گمدھ کی طرح ٹوٹتے ہیں، اس پر دعویٰ ہے کہ ہم اونچے ہیں۔

اس نے وہیں کھڑے ہو کر کہا ”تم ایسے دانی کب سے ہو گئے لالا؟ پاؤ تو دوسروں کے تھالی کی روٹی اڑا جاؤ۔ آج بڑے آم والے ہوئے ہیں۔ مجھ سے چھیڑ کھانی کی تو اچھا نہ ہوگا کہہ دیتی ہوں۔“

اوہو، اس امیرن کا اتنا مزاج! نوکھے رام کو کیا پھانس لیا سمجھتی ہے کہ ساری دنیا پر اسی کا راج ہے۔ بولے ”تو تو ایسی تنک رہی ہے جیسے اب کسی کو گاؤں میں نہ رہنے دے گی۔ جراجان سنہال کر بات کیا کر، اتنی جلدی اپنے کو بھول نہ جا۔“

”تو کیا تمہارے دوارے پر کبھی بھیک مانگنے آئی تھی۔“

”نو کھے رام نے چھانہ نہ دی ہوئی تو بھیک بھی مانگتی۔“

نہری کو لال مرچ سی لگ گئی۔ جو کچھ منہ میں آیا بکا ”دادی جار، منہ جھونسا، وغیرہ نہ جانے کیا کیا کہا اور اسی غصے میں بھری ہوئی، اپنی کوٹھری میں گئی اور اپنا سامان نکال نکال کر باہر رکھنے لگی۔

نو کھے رام نے سنا تو گھبرائے ہوئے آئے اور پوچھا ”یہ کیا کر رہی ہو نہری! کپڑے لے کر کیوں نکال رہی ہو؟ کسی نے کچھ کہا کیا؟“

نہری مردوں کے نچانے کی حکمت جانتی تھی۔ اپنی زندگی میں اس نے یہی فن سیکھا تھا۔ نو کھے رام پڑھے لکھے آدمی تھے۔ قانون بھی جانتے تھے اور مذہبی کتابیں بھی بہت پڑھی تھیں۔ بڑے بڑے دکیوں بیرسٹروں کی جوتیاں سیدھی کی تھیں مگر اس منوار نہری کے ہاتھ کھلونا بنے ہوئے تھے۔ بھویں سکیڑ کر بولی ”دن کا پھیر ہے کہ یہاں آگنی پر اپنی آبرو نہ گنواؤں گی۔“ براہمن آپے میں آگیا۔ مونچھیں کھڑی کر کے بولا ”تیری طرح جو تار کے اس کی آنکھیں نکال لوں۔“

نہری نے لوہے کو گرم کر کے گھن جمایا ”لالا ہیشوری جب دیکھو مجھ سے بے بات کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں ہر جالی تھوڑے ہی ہوں کہ کوئی مجھے پیسے دکھائے؟ گاؤں بھر میں سبھی عورتیں تو ہیں پر کوئی ان سے نہیں بولتا۔ جسے دیکھو وہ مجھی کو چھیڑتا ہے۔“

نو کھے رام پر بھوت سوار ہو گیا۔ اپنا موٹا ڈنڈا اٹھایا اور آندھی کی طرح ہر ہراتے ہوئے باغ میں پہنچ کر گلے لگا کر نے ”آجا بڑا مرد ہے تو! مونچھیں اکھاڑ لوں گا! کھود کر گاڑ دوں گا! نکل آ سامنے! اگر پھر کبھی نہری کو چھیڑا تو لہو پی جاؤں گا۔ ساری پٹواری گری نکال دوں گا۔ جیسا آپ ہے ویسا ہی اوروں کو بھی سمجھتا ہے۔ تو ہے کس گھمنڈ میں۔“

لالا ہیشوری سر جھکائے اور سانس روکے ہوئے بت کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ ذرا بھی زبان کھولی اور شامت آئی۔ ان کی اتنی توہین زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ لوگوں نے انھیں تالاب کے کنارے رات کو گھیر کر خوب پیٹا تھا مگر گاؤں میں کسی کو خبر نہ ہوئی تھی۔ کسی کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ مگر آج تو سارے گاؤں کے سامنے ان کا پانی اتر گیا۔ کل جو عورت گاؤں میں ٹھکانہ کھوجنے آئی تھی، آج سارے گاؤں پر اس کا دبدبہ تھا۔ اب کس کی ہمت ہے جو اس کو چھیڑ سکے؟ جب لالا ہیشوری کچھ نہ کر سکے تو دوسروں کی

بساط ہی کیا؟“

اب نُہری گاؤں کی رانی تھی۔ اسے آتا دیکھ کسان لوگ اس کے راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ یہ کھلا ہوا راز تھا۔ اس کی تھوڑی سی پوجا کر کے نوکھے رام سے بہت کام نکل سکتا ہے۔ کسی کو بٹورا کرانا ہو، لگان کے لیے مہلت مانگنی ہو، مکان بنانے کے لیے زمین کی ضرورت ہو، نُہری کی پوجا کیے بغیر اس کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اچھے اچھے اسامیوں کو ڈانٹ بتا دیتی تھی۔ اسامی ہی نہیں، اب وہ کارکن صاحب پر بھی رعب جمانے لگی تھی۔

بھولا اس کے محتاج بن کر نہ رہنا چاہتے تھے۔ عورت کی کمائی کھانے سے زیادہ برا کام ان کی نظر میں دوسرا کام نہ تھا۔ انھیں کل تین روپے ماہوار ملتے تھے اور وہ ان کے ہاتھ نہ لگتے تھے۔ نُہری اوپر ہی اوپر اڑا دیتی تھی۔ انھیں تنباکو پینے کو ایک کوڑی میسر نہیں اور نُہری دو آنے کے روزانہ پان کھا جاتی تھی۔ جسے دیکھو وہی ان پر رعب جماتا تھا۔ پیادے ان سے چلم بھرواتے اور لکڑی کٹواتے۔ بے چارہ دن بھر کا تھکا ماندا آتا اور دروازے پر پیڑ کے نیچے ایک جھنگی چارپائی پر پڑ رہتا۔ کوئی ایک لوٹا پانی دینے والا بھی نہیں۔ دوپہر کی باسی روٹیاں رات کو کھانی پڑتیں اور وہ بھی پانی اور نمک کے ساتھ۔

آخر تک ہو کر اس نے گھر میں کامتا کے ساتھ رہنے کا ارادہ کیا۔ کچھ نہ ہوگا، ایک کلڑا روٹی تو مل ہی جائے گی۔ اپنا گھر تو ہے۔

نُہری بولی ”میں وہاں کسی کی گھامی کرنے نہ جاؤں گی۔“

بھولانے جی کڑا کر کے کہا ”تمہیں جلنے کو تو میں نہیں کہتا، میں تو اپنے جلنے کو کہتا ہوں۔“

”تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ کہتے لاج نہیں آتی؟“

لاج تو گھول کر لی گیا۔“

”لیکن میں نے تو اپنی لاج نہیں لی۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“

”تو، اپنے من کی ہے، تو میں تیری گھامی کیوں کروں؟“

پنچایت کرا کے منہ میں کالکھ لگاؤں گی، اتنا سمجھ لینا۔“

”کیا ابھی کچھ کم کالکھ لگی ہے؟ کیا اب بھی مجھے دھوکے میں رکھنا چاہتی ہے۔؟“

”تم تو ایسا تاؤ دکھا رہے ہو جیسے مجھے روج گہنے ہی تو گڑھواتے ہو۔ تو یہاں نُہری

کسی کا تاؤ سہنے والی نہیں ہے۔“

بھولا جھلا کر اٹھے اور سر ہانے سے لکڑی اٹھا کر چلے کہ نہری نے لپک کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے طاقت ور پنچے سے ٹکنا بھولا کے لیے مشکل تھا۔ چپکے سے قیدی کی طرح بیٹھ گئے۔ ایک وقت تھا جب عورتوں کو اٹھیوں پر بچایا کرتے تھے۔ آج وہ ایک عورت کے پنچے میں پھنسے ہوئے ہیں اور کسی طرح نکل نہیں سکتے۔ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر کے وہ پردہ فاش نہیں کرنا چاہتے تھے، اپنی طاقت کا اندازہ انھیں ہو گیا ہے۔ مگر وہ کیوں اس سے ڈر ہو کر نہیں کہہ دیتے کہ تو، میرے کام کی نہیں ہے اور میں تجھے چھوڑتا ہوں۔ پنچایت کی دھمکی دیتی ہے تو کیا پنچایت کوئی ہوا ہے۔ اگر تجھے پنچایت کا ڈر نہیں تو میں کیوں پنچایت سے ڈروں؟

لیکن یہ خیال لفظوں میں آنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ نہری نے جیسے ان پر کوئی جادو کر دیا تھا۔

لالا پیٹھوری پٹواریا نہ اوصاف کے مجسمہ تھے۔ وہ یہ نہ دیکھ سکتے تھے کہ کوئی اسامی اپنے دوسرے بھائی کی انچ بھر بھی زمین دبالے اور نہ وہ یہی دیکھ سکتے تھے کہ اسامی کسی مہاجن کے روپے دبالے۔ گاؤں کے سبھی لوگوں کے فوائد کی حفاظت کرنا ان کا اولین فرض تھا۔ سمجھوتہ یا سیل جہول پر ان کا اعتقاد نہ تھا۔ یہ تو مردہ دلی کی علامتیں ہیں۔ وہ کشمکش کے قائل تھے جو زندگی کی علامت ہے۔ آئے دن اس زندگی کو ابھارنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑتے رہتے تھے۔ منگرو ساہ پر ان دنوں ان کی خاص مہربانی تھی۔ وہ گاؤں کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی تھے۔ مگر مقامی سیاسیات میں بالکل حصہ نہ لیتا تھا۔ رعب یا اقتدار کا لالچ اسے نہ تھا۔ مکان بھی اس کا گاؤں سے باہر تھا۔ جہاں اس نے ایک باغ اور کنواں اور ایک چھوٹا سا شوالہ بنوالیا تھا۔ بال بچہ کوئی نہ تھا اس لیے لین دین بھی کم کر دیا تھا اور زیادہ تر پوجا پاٹ ہی میں لگا رہتا تھا۔ کتنے ہی اسامیوں نے اس کے روپے ہضم کر لیے تھے مگر اس نے کسی پر تالش نہیں کی۔ ہوری پر بھی اس کے سود سمیت تقریباً ڈیڑھ سو ہو گئے تھے مگر نہ ہوری کو قرض ادا کرنے کی کوئی فکر تھی اور نہ منگرو کو اسے وصول کرنے کی۔ وہ چار بار تقاضا کیا۔ ڈانٹ بھی بتائی، مگر ہوری کی عادت دیکھ کر چپ ہو بیٹھا۔ اب کے اتفاق سے ہوری کی اکچہ گاؤں بھر کے اوپر تھی۔ کچھ نہیں تو اس کے دو ڈھائی سو سیدھے ہو جائیں گے، لوگوں کو ایسا اندازہ تھا۔ پیٹھوری نے منگرو کو سمجھایا کہ اگر اس وقت ہوری پر دعویٰ کر دیا جائے تو سب روپے وصول ہو جائیں۔ منگرو اتنا رحیم نہیں جتنا کابل تھا، جھنجھٹ میں نہ پڑنا چاہتا تھا۔ مگر جب پیٹھوری نے ذمہ لیا کہ اسے ایک دن بھی کچہری نہ جانا پڑے گا، نہ کوئی اور تکلیف ہوگی، بیٹھے بیٹھائے اس کی ڈگری ہو جائے گی، تو وہ تالش کرنے پر راضی ہو گیا اور عدالتی صرفہ کے لیے روپے بھی دے دیے۔ ہوری کو پتہ بھی نہ تھا کہ یہاں کیا کچہری پک رہی ہے۔ کب دعویٰ دائر ہوا اور کب ڈگری ہوئی، اسے بالکل معلوم نہ ہوا۔ جب قرق امین اس کی اکچہ نیلام کرنے آیا تب اسے خبر ہوئی۔ سارا گاؤں

کھیت کے کنارے جمع ہو گیا۔ ہوری منگرو ساہ کے پاس دوڑا اور دھنیا پیٹھوری کو گالیاں دینے لگی وہ سمجھ گئی کہ یہ سب کام پیٹھوری ہی کا ہے۔ مگر منگرو ساہ پوچا پرتے مل نہ سکے اور دھنیا گالیوں کی برکھا کر کے بھی پیٹھوری کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ ادھر اکیہ ڈیڑھ سو روپے میں نیلام ہو گئی اور بولی منگرو ہی کے نام پر ختم ہو گئی۔ کوئی دوسرا آدمی نہ بول سکا۔ داتا دین میں بھی دھنیا کی گالیاں سننے کی ہمت نہ تھی۔

دھنیا نے ہوری کو اکسا کر کہا ”میٹھے کیا ہو، جا کر پنواری سے پوچھتے کیوں نہیں کہ یہی دھرم ہے تمہارا گاؤں گھر کے لوگوں کے ساتھ؟“
ہوری نے عاجزانہ کہا۔ ”پوچھنے کے لیے تم نے منہ بھی رکھا ہو۔ تیری گالیاں کیا انھوں نے نہ سنی ہوں گی؟“

”جو گالی سننے کا کام کرے گا اسے گالی ہی ملے گی۔“
”تو گالیاں بھی دے گی اور بھائی چارہ بھی نبھائے گی؟“
”دیکھوں گی کہ میرے کھیت کے پاس کون آتا ہے؟“
”مل والے آکر کاٹ لے جائیں گے۔ تو تو کیا کرے گی اور میں کیا کروں گا؟“
گالیاں دے کر اپنی جیھ کی کھلی چاہے مثالے۔“
”میرے جیتے میرا کھیت کوئی کاٹ لے جائے گا۔؟“
”ہاں ہاں، تیرے اور میرے جیتے! سارا گاؤں مل کر بھی اسے نہیں روک سکتا۔ اب وہ چیچ میری نہیں منگرو ساہ کی ہے۔“

”منگرو ساہ نے مرمر کر جینھ کی دوپہری میں سچائی اور گزائی کی تھی؟“
”وہ سب تو نے کیا، مگر اب وہ چیچ منگرو ساہ کی ہے ہم ان کے کرج دار نہیں ہیں؟“
اکیہ تو گئی مگر اس کے ساتھ ایک نیا مسئلہ آ پڑا۔ دلاری اسی اکیہ پر روپے دینے کو تیار ہوئی تھی۔ اب وہ کس ضمانت پر روپے دے؟ ابھی اس کے پہلے ہی کے دوسو پڑے ہوئے تھے۔ سوچا تھا کہ اکیہ کے پڑانے روپے مل جائیں گے تو نیا حساب چلنے لگے گا۔ اس کی نظر میں ہوری کی ساکھ دو سو تک کی تھی۔ اس سے زیادہ دینا جو کھم تھا۔ سہا لگ سر پر تھا۔ تاریخ ملے ہو چکی تھی۔ گوری مہتو نے ساری تیاریاں کر لی ہوں گی۔ اب بیاہ کا ملنا ناممکن تھا۔ ہوری کو ایسا غصہ آتا تھا کہ جا کر دلاری کا گلا گھونٹ دے۔ جتنی منت سماجت ہو سکتی تھی وہ کر چکا،

مگر وہ پتھر کی دیوی ذرا بھی نہ پیچی۔ اس نے چلتے چلتے ہاتھ جوڑ کر کہا ”دلاری میں تمہارے روپے لے کر بھاگ نہ جاؤں گا نہ ہی اتنی جلدی مرا جاتا ہوں۔ کھیت ہیں، بیڑ ہیں، گھر ہے، جوان لڑکا ہے، تمہارے روپے مارے نہ جائیں گے۔ میری مرچاد جارہی ہے، اسے سنبھالو۔“ مگر دلاری نے کاروبار میں رحم کی شمولیت منظور نہ کی۔ اگر کاروبار کو وہ رحم کی صورت دے سکتی تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا، مگر رحم کو کاروباری صورت دینا اس نے سیکھا نہ تھا۔

ہوری نے گھر آ کر دھنیا سے کہا ”اب؟“

دھنیا نے اسی پر دل کا غبار نکالا ”یہی تو چاہتے تھے۔“

ہوری نے زخمی آنکھوں سے دیکھا ”میرا ہی دوکھ ہے؟“

”کسی کا دوکھ ہو، پر ہوئی تو تمہارے من کی۔“

”تیری اچھا ہے کہ جمین رہن رکھ دوں؟“

”جمین رہن رکھ دو گے تو کرو گے کیا؟“

”مجوری۔“

مگر زمین دونوں کو یکساں عزیز تھی۔ اس پر تو ان کی عزت اور آبرو قائم تھی جس کے پاس زمین نہیں وہ گرسنت نہیں، مزدور ہے۔

ہوری نے کچھ جواب نہ پا کر پوچھا ”تو کیا کہتی ہے؟“

دھنیا نے زخمی گلے سے کہا ”کہنا کیا ہے۔ گوری برات لے کر آئیں گے تو ایک ہون کھلا کر سیرے لڑکی کو بدا کر دینا۔ دنیا ہنسے گی تو ہنس لے۔ بھگوان کی یہی ایتھا ہے کہ ہماری ناک کٹے اور ہمارے منہ کا لکھ لگے تو ہم کیا کریں گے؟“

دفعتاً نہری چوندری پہنے سامنے سے جاتی ہوئی نظر پڑی۔ ہوری کو دیکھتے ہی اس نے ذرا گھونگھٹ نکال لیا۔ اس سے سدھی کا نانا مانتی تھی۔

دھنیا سے اس کی شناسائی ہو چکی تھی۔ اس نے پکارا ”آج کدھر چلیں سدھن؟ آؤ بیٹھو۔“

نہری نے فتح پائی تھی اور اب رائے عامہ کو اپنی موافقت میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آ کر کھڑی ہو گئی۔

دھنیا نے اسے سر سے پیر تک تقادانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا ”آج ادھر کیسے

بھول پڑیں؟“

نہری نے انکار سے کہا ”ایسے ہی تم لوگوں سے ملنے چلی آئی۔ لڑکی کا بیاہ کب تک ہے؟“

دھنیا نے شبہ سے بولی ”بھگوان مالک ہیں، جب ہو جائے۔“
میں نے سنا کہ اسی لگن میں ہوگا۔ ساعت ٹھیک ہو گئی ہے؟“
”ہاں، ساعت تو ٹھیک ہو گئی ہے۔“
”مجھے بھی نیوتا دینا۔“

”تمھاری تو لڑکی ہے نیوتا کیسا؟“

”دبج کا سامان تو منگوالیا ہوگا۔ جرا میں بھی دیکھوں۔“

دھنیا شش و پنج میں پڑی، کیا کہے؟ ہوری نے اسے سنبھالا ”ابھی تو کوئی سامان نہیں منگایا ہے اور سامان کیا کرنا ہے، کسا کنیا تو دیتا ہے۔“
نہری نے بے اعتباری سے دیکھا ”کسا کنیا کیوں دو گے مہو؟ پہلی لڑکی ہے، دل کھول کر کرو۔“

ہوری ہنسا، گویا کہہ رہا تھا کہ تمھیں تو چاروں طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہوگا مگر یہاں تو سوکھا ہی پڑا ہوا ہے۔ ”روپے پیسے کی تنگی ہے، کیا دل کھول کر کروں؟ تم سے کون پردہ ہے۔“

”لڑکا کتا ہے۔ تم کتاتے ہو، پھر بھی روپے پیسے کی تنگی؟ کسے بسواس آئے گا؟“
”بیٹا ہی لایک ہوتا تو پھر کاہے کا رونا تھا؟ چٹھی پتری تک بھیجتا نہیں، تو روپے کیا بھیجے گا؟ یہ دوسرا سال ہے ایک بھی چٹھی نہیں آئی۔“

اتنے میں سوتا بیلوں کے واسطے سبز چارے کا ایک گٹھا سر پر لیے ہوئے اپنے شباب کو آچل سے چھپاتی ہوئی مصوصانہ رفتار سے آئی اور گٹھا وہیں پٹک کر اندر چلی گئی۔

نہری نے کہا ”لڑکی تو سیانی ہو گئی ہے۔“
دھنیا بولی ”لڑکی کی باڑھ تو رینڈ کی باڑھ ہے، نہیں، ہے ابھی گئے دن کی۔“
”بر تو ٹھیک ہو گیا ہے نا؟“

”ہاں بر تو ٹھیک ہے روپے کا بندوبست ہو گیا تو اسی مہینے میں بیاہ کر دیں گے۔“
نہری اوجھی طبیعت کی تھی۔ ادھر جو اس نے تھوڑے سے روپے جمع کیے تھے وہ اس

کے پیٹ میں اچھل رہے تھے۔ اگر وہ سونا کے بیاہ میں کچھ روپے دے دے تو کتنا نام ہوگا۔ سارے گاؤں میں اس کا چرچہ ہو جائے گا۔ لوگ تعجب سے کہیں گے کہ نہری نے اتنے روپے دے دیے۔ بڑی دیوی ہے۔ ہوری اور دھنیا گھر گھر اس کا بکھان کرتے پھریں گے۔ گاؤں میں اس کی مر جاد کتنی بڑھ جائے گی۔ وہ انگلی دکھانے والوں کا منہ سی دے گی۔ پھر کس کی ہمت ہے جو اس پر ہنسے یا بولیاں بولے؟ ابھی گاؤں بھر اس کا بیری ہے، پھر گاؤں بھر اس کا ہوا ہو جائے گا۔ اس خیال سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ بولی ”تھوڑے بہت سے کام چلتا ہو تو مجھ سے لے لو جب ہاتھ میں روپے آجائیں تو دے دینا۔“

ہوری اور دھنیا نے اس کی طرف دیکھا نہیں، نہری مذاق نہیں کر رہی ہے۔ دونوں آنکھوں میں حیرت تھی، ممنونیت تھی، رشک تھا اور شرم تھی۔ نہری اتنی بری نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ نہری نے پھر کہا ”تمھاری اور ہماری آبرو ایک ہے۔ تمھاری ہنسی ہو تو کیا میری ہنسی نہ ہوگی؟ کیسے ہی ہو، پر اب تو تم ہمارے سمدھی ہو۔“

ہوری نے شرماتے ہوئے کہا ”تمھارے روپے تو گھر ہی میں ہیں، جب کام پڑے گا، لے لیں گے۔ آدمی اپنوں ہی کا بھروسہ کرتا ہے مگر اوپر سے بندوبست ہو جائے تو گھر کے روپے کیوں چھوئیں؟“ دھنیا نے تائید کی ”ہاں اور کیا۔“

نہری نے اپنا دا بتایا ”جب گھر میں روپے ہیں تو باہر والوں کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلاؤ؟ بیاج بھی دینا پڑے گا، اس پر اسنام لکھو، گواہی کراؤ۔ دستوری دو اور کھوسامد کرو۔ ہاں میرے روپے میں چھوت لگی ہو تو دوسری بات ہے۔“

ہوری نے سنہالا ”نہیں نہیں، جب گھر میں کام چل جائے گا تو باہر کیوں ہاتھ پھیلائیں گے؟ پر آپس والی بات ہے، بھیتی باڑی کا بھروسہ نہیں، تمھیں جلدی کوئی کام پڑا اور ہم روپے نہ دے سکے تو تمھیں بھی برا لگے گا اور ہماری جان بھی سنکٹ میں پڑے گی۔ اسی سے کہتا تھا۔ نہیں لڑکی تو تمھاری ہے۔“

”مجھے ابھی روپے کی ایسی جلدی نہیں ہے۔“

”تو تم ہی سے لے لیں گے۔ کنیا دان کا پھل بھی کیوں باہر جائے؟“

”کتنے روپے چاہیے؟“

”تم کتنے دے سکو گی؟“

”سو میں کام چل جائے گا؟“

ہوری کو لالچ آیا بھگوان نے چھپر پھاڑ کر روپے دیے ہیں تو جتنا لے سکے کیوں نہ لے۔

”سو میں بھی چل جائے گا، پانسو میں بھی چل جائے گا، جیسا حوصلہ ہو۔“

”میرے پاس کل دو سو روپے ہیں، سو میں دے دوں گی۔“

”تو اتنے میں بہت اچھی طرح کام چل جائے گا۔ اناج گھر میں ہے۔ مگر ٹھکرائن آج

تم سے کہتا ہوں کہ میں تمہیں ایسی کچھی نہ سمجھتا تھا۔ آج کل کون کس کی مدد کرتا ہے اور کس

کے پاس ہے؟ تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔“

جراغ جلنے کا وقت آ گیا تھا۔ ٹھنڈک پڑنے لگی تھی۔ زمین نے نیلی چادر اوڑھ لی

تھی۔ دھنیا اندر جا کر انگلیٹھی لائی اور سب تاپنے لگے۔ پوال کی روشنی میں چھیلی، رگیلی،

بدچلن ٹہری ان کے سامنے بردان کی طرح بیٹھی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کتنی

ہمدردی تھی، گالوں پر کتنی حیا اور ہونٹوں پر کتنی راست کلامی! کچھ دیر تک ادھر ادھر کی

باتیں کر کے نہری اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی گھر چلی ”اب دیر ہو رہی ہے۔ کل تم

آکر روپے لے لینا مہتو۔“

”چلو میں تمہیں پہنچا دوں۔“

”نہیں نہیں، تم بیٹھو میں چلی جاؤں گی۔“

”جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں کندھے پر بٹھا کر پہنچا آؤں۔“

نوکھے رام کی چوپال گاؤں کے دوسرے سرے پر تھی اور باہر جانے کا راستہ صاف تھا۔

دونوں اسی راستے سے چلے اب چاروں طرف سناٹا تھا۔

نہری نے کہا ”تنگ سمجھا نہیں دیتے راوت کو، کیوں سب سے لڑائی کیا کرتے ہیں۔

جب ان ہی لوگوں کے بچ میں رہتا ہے تو ایسے رہنا چاہیے نا، کہ چار آدمی اپنے

جائیں اور ان کا حال یہ ہے کہ سب سے لڑائی، سب سے جھگڑا، جب تم مجھے پردے میں

نہیں رکھ سکتے اور مجھے دوسروں کی مجبوری کرنی پڑتی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نہ کسی سے

ہنسوں نہ بولوں اور نہ کوئی میری طرف تاکے نہ ہنسے؟ یہ سب تو پردے ہی میں ہو سکتا ہے۔

پوچھو، کوئی مجھے تاکتا ہے یا گھورتا ہے تو میں کیا کروں؟ اس کی آنکھیں تو نہیں پھوڑ سکتی۔ پھر

میل محبت سے آدمی کے سو کام نکلتے ہیں۔ جیسا بکھٹ دیکھو ویسا بیوہار کرو۔ تمہارے گھر

ہاتھی جھومتا تھا تو اب وہ تمھارے کس کام کا؟ اب تو تم تین روپے کے مجور ہو۔ میرے گھر سو بھینیس لگتی تھیں پر اب تو مجورن ہوں۔ مگر ان کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں۔ کبھی لڑکوں کے ساتھ رہنے کی سوچتے ہیں اور کبھی لکھنؤ جا کر رہنے کی سوچتے ہیں۔ میری ناک میں دم کر رکھا ہے۔“

ہوری نے چالپوسی کی ”یہ بھولا کی سراسر نادانی ہے۔ بوڑھے ہوئے اب تو انھیں سمجھ آنی چاہیے۔ میں سمجھا دوں گا۔“

”تو سیرے آجانا، میں روپے دے دوں گی۔“

”کچھ لکھا پڑھی.....“

”تم میرے روپے کھانہ جاؤ گے یہ میں جانتی ہوں۔“

اس کا گھر آگیا تھا۔ وہ اندر چلی گئی۔ ہوری گھر لوٹا۔

گوبر کو شہر آنے پر معلوم ہوا کہ جس جگہ وہ اپنا خانچہ لے کر بیٹھا تھا وہاں ایک دوسرا خانچہ والا بیٹھنے لگا ہے اور گا ہک اب گوبر کو بھول گئے ہیں وہ گھر بھی اب اسے بنجرا سالگتا تھا۔ چھٹیا اب اس میں تنہا بیٹھی ہوئی رویا کرتی۔ لڑکا دن بھر آنگن میں یا دروازے کا عادی تھا۔ وہاں اس کے کھیلنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ کہاں جائے؟ دروازے پر مشکل سے گز بھر کا راستہ تھا۔ جہاں غنوت پھیل رہی تھی۔ گرمی میں کہیں باہر لینے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ لڑکا ماں کو ایک لمحہ کے لیے چھوڑتا نہ تھا۔ اور جب کچھ کھیلنے کو نہ ہو تو کچھ کھانے اور دودھ پینے کے علاوہ اور کیا کرے؟ گھر پر کبھی دھنیا کھلاتی کبھی روپا، کبھی ہوری کبھی پنیا۔ یہاں تنہا چھٹیا تھی اور اسے گھر کا سارا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔

اور گوبر شراب کے نشے میں بد مست تھا۔ اس کی آسودہ نہ ہونے والی خواہشیں نفس پرستیوں کے سمندر میں غرق ہو جانا چاہتی تھیں۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ خانچہ لے کر جاتا تو گھنٹہ ہی بھر میں واپس آ جاتا۔ دلچسپی کا کوئی دوسرا سامان نہ تھا۔ پڑوس کے مزدور اور یکے والے رات رات بھر تاش اور جوا کھیلتے تھے۔ پہلے وہ بھی خوب کھیلتا تھا، مگر اب اس کے لیے صرف ایک ہی دلچسپ مشغلہ تھا اور وہ تھا چھٹیا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا۔ تھوڑے ہی دنوں میں چھٹیا اس کی زندگی سے اکتا گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ کہیں تخیلے میں جا کر بیٹھے اور خوب بے فکری سے لیٹے، سوئے، مگر وہ تخیلے کہیں نہ ملتا تھا۔ اسے اب گوبر پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے شہری زندگی کی کتنی دلکش تصویر کھینچی تھی اور یہاں اس کا لکڑی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بچے پر بھی اسے چڑھتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اسے مار کر باہر نکال دیتی اور اندر سے کواڑ بند کر لیتی۔ بچہ روتے روتے بے دم ہو جاتا۔

اس پر مصیبت یہ کہ اس کے دوسرا بچہ ہونے والا تھا اور کوئی آگے نہ پیچھے اکثر سر میں درد ہوا کرتا تھا۔ کھانے سے بھی نفرت ہو گئی تھی ایسی سستی تھی کہ گوشے میں خاموش پڑی رہے اور کوئی اس سے نہ بولے چالے۔ مگر یہاں گوبر کی بے دردانہ محبت اپنے خیر مقدم کے

لیے ہمیشہ دروازہ کھٹکھٹاتی رہتی تھی اگرچہ دودھ نام کو بھی نہیں تھا پھر بھی لٹو سینے پر سوار رہتا۔ جسم کے ساتھ اس کا دل بھی کمزور ہو گیا تھا۔ وہ جو ارادہ کرتی اسے ذرا سے اصرار پر فتح کر دیتی۔ وہ لیٹی ہوتی اور لٹو آکر جبراً اس کے سینے پر بیٹھ جاتا اور دودھ پینے کی کوشش کرتا۔ وہ اب دو سال کا ہو گیا تھا۔ بڑے تیز دانت نکل آئے تھے منہ میں دودھ نہ جاتا تھا تو وہ غصے میں آکر دانتوں سے کاٹ لیتا۔ مگر تھدیا میں اب اتنی سکت بھی نہ تھی کہ اسے اپنے اوپر سے ڈکھیل دے۔ اسے ہر وقت موت سامنے کھڑی نظر آتی۔ شوہر اور بچہ کسی سے بھی اسے رغبت نہ تھی سبھی اپنے مطلب کے یار ہیں۔ برسات کے دنوں میں جب لٹو کو دست آنے لگے اور اس نے دودھ پینا چھوڑ دیا تو تھدیا کو اپنے سر سے ایک بلا ٹل جانے کا سا احساس ہوا۔ مگر جب ایک ہفتے کے بعد لڑکا مر گیا تو اس کی یاد مہر مادری سے زندہ ہو کر اسے رلانے لگی۔

تھدیا کو اب لٹو کی یاد لٹو سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ لٹو جب تک سامنے تھا وہ اس سے جتنا سکھ پاتی تھی اب اس سے کہیں زیادہ دکھ پاتی ہے۔ اب لٹو اس کے اندر والے لٹو، کا محض عکس تھا۔ وہ عکس سامنے نہ تھا جو باطل اور ناپائیدار تھا۔ حقیقی مجسمہ تو اس کے اندر تھا جو اس کی تمناؤں اور خیر اندیشیوں سے زندہ ہو رہا تھا۔ دودھ کے بجائے وہ اسے اپنا خون پلا پلا کر پال رہی تھی۔ اسے اب وہ بند کوٹھری اور بدبو دار ہوا اور وہ دونوں وقت آگ کے سامنے جلنا، ان باتوں کا گویا احساس ہی نہ رہ گیا تھا۔ وہ میٹھی یاد دلنشین ہو کر گویا اسے قوت دے رہی تھی۔ جیتے جی جو اس کی زندگی کا بار تھا وہ مرکز اس کی روح میں سما گیا تھا۔ اس کی ساری مامتا اندر کی طرف جاکر باہر کی جانب سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ گو بر دیر میں آتا ہے یا جلد رغبت سے کھانا کھاتا ہے یا نہیں، خوش ہے یا رنجیدہ، ان باتوں کی اب اسے بالکل فکر نہ تھی۔ گو بر کیا کماتا اور کیسے خرچ کرتا ہے، اس کی بھی اسے پروا نہ تھی۔ اس کی زندگی جو کچھ تھی اندر تھی، باہر تو صرف ایک بے جان مشین تھی!

اس کے غم میں شریک ہو کر اس کی اندرونی زندگی میں داخل ہو کر، گو بر اس کے پاس جاسکتا تھا اور اس کی زندگی کا جزو بن سکتا تھا۔ مگر وہ اس بیرونی زندگی کے خشک ساحل پر جا کر ہی پیاسا لوٹ آتا تھا!

ایک دن اس نے رکھائی سے کہا ”تو لٹو کے نام کب تک روئے جائے گی؟ چار پانچ مہینے تو ہو گئے۔“

چھپا نے سرد آہ بھر کر کہا ”تم میرا دکھ نہیں سمجھ سکتے۔ اپنا کام دیکھو میں جیسی ہوں
وہی پڑی رہنے دو۔“

”تیرے روتے رہنے سے للو لوٹ آدے گا؟“

چھپا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اٹھ کر دیہی میں کپالو کے لیے آلو ہالنے لگی۔
اس نے گوبر کو ایسا سنگدل نہ سمجھا تھا۔

گوبر نے خوانچے سے بڑا ہو کر شکر مل میں نوکری کر لی تھی۔ مسٹر کھانا پہلے مل
سے حوصلہ پا کر حال ہی میں یہ دوسرا مل کھول دیا تھا۔ گوبر کو وہاں بڑے سویرے جانا پڑتا تھا
اور دن بھر کے بعد جب وہ چراغ جلنے گھر واپس آتا تو اس کے بدن میں ذرا بھی جان نہ رہ
جاتی۔ پہلے گھر پر بھی اسے کچھ کم محنت نہ کرنی پڑتی تھی، مگر وہاں اسے ذرا بھی تھکان نہ ہوتا
تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ہنس بول بھی لیا کرتا تھا پھر اس کھلے میدان میں، کھلے آسمان کے نیچے،
گویا اس کی کمی بھی پوری ہو جاتی تھی۔ وہاں اس کا جسم چاہے کتنا کام کرے، دل آزاد رہتا
تھا۔ اب یہاں اتنی جسمانی محنت نہ ہونے پر بھی جیسے اس طوفانی شور اور ہلچل کا اس پر بوجھ
سالد رہتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی لگا رہتا تھا کہ تاجانے کب ڈانٹ پڑ جائے۔ سبھی مزدوروں کی
یہی حالت تھی، سبھی تازی یا شراب میں اپنے جسمانی اور دماغی تھکان کو ڈبو دیا کرتے تھے۔
گوبر کو بھی شراب کا چسکا پڑا۔ گھر آتا تو نشہ میں چور اور پہر رات گئے۔ اور آکر کوئی نہ کوئی
بہانہ کھوج کر چھپا کو گالیاں دیتا، گھر سے نکالنے لگتا اور کبھی کبھی مار بھی دیتا۔

چھپا کو اب یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ وہ داشتہ ہے۔ اسی لیے اس کی یہ ذلت ہو رہی
ہے۔ منکوحہ ہوتی تو گوبر کی مجال نہ تھی کہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا۔ برادری اسے سزا
دیتی، حقہ پانی بند کر دیتی۔ اس نے کتنی بڑی غلطی کی کہ اس بے وفا کے ساتھ گھر سے نکل
بھاگی۔ ساری دنیا میں ہنسی بھی ہوئی اور ہاتھ کچھ نہ آیا۔ وہ گوبر کو اپنا دشمن سمجھنے لگی۔ نہ اس
کے کھانے پینے کی پرواہ کرتی اور نہ اپنے کھانے پینے کی۔ جب گوبر اسے مارتا تو اسے ایسا
غصہ آتا کہ اس کا گلا جھرے سے کاٹ ڈالے۔ زچگی کا زمانہ جیوں جیوں قریب آتا جاتا
ہے، اس کی تشویش بڑھتی جاتی ہے۔ اس گھر میں اس کا مرن ہو جائے گا کون اس کی دیکھ
بھال کرے گا؟ کون اسے سنبھالے گا؟ اور جو گوبر اسی طرح مارتا پٹتا رہا تو اس کا جینا اور
بھی کٹھن ہو گا۔

ایک روز غل پر پانی بھرنے گئی تو پردس کی ایک عورت نے پوچھا ”گے مہینے کا ہے رے؟“
جھپیا نے لجا کر کہا ”کیا جانے دیدنی، میں نے تو گنا ہی نہیں۔“

دوہرے بدن کی سیاہ قام، پستہ قد، بد صورت عورت تھی۔ اس کا شوہر یکہ ہانکتا تھا اور وہ خود لکڑی کی دوکان کرتی تھی۔ جھپیا کئی بار اس کے یہاں سے لکڑی لائی تھی۔ اسی قدر تعارف تھا۔

مسکرا کر بولی ”مجھے تو جان پڑتا ہے کہ دن پورے ہو گئے ہیں آج ہی کل میں ہوگا کوئی دائی ٹھیک کر لی ہے؟“

جھپیا نے ڈری ہوئی آواز میں کہا ”میں تو یہاں کسی کو نہیں جانتی۔“
”تیرا مرد کیسا ہے جو کان میں تیل ڈالے بیٹھا ہے؟“
”انھیں میری کیا پھلک۔“

”ہاں دیکھ تو رہی ہوں۔ تم تو سُوڈر (زچہ خانہ) میں بیٹھو گی، کوئی کرنے دھرنے والا چاہیے کہ نہیں؟ ساس، نند، دیورانی، جھانی کوئی ہے کہ نہیں؟ کسی کو بلا لینا تھا۔“
”میرے لیے سب مر گئے۔“

وہ پانی لا کر جوٹھے برتن ملنے لگی تو زچگی کے اندیشے سے دل دھڑکنے لگا ”کیسے کیا ہوگا بھلوان؟“

”انہہ! یہی تو ہوگا کہ مر جاؤں گی، اچھا ہے، جنجال سے چھوٹ جاؤں گی۔“
شام کو اس کے پیٹ میں درد شروع ہوا۔ سمجھ گئی کے پتا کی گھڑی آپہنچی۔ پیٹ کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے اور پسینے سے بیٹگی ہوئی۔ اس نے چولھا جلایا کھجڑی ڈالی اور درد سے جہاب ہو کر وہیں زمین پر پڑی رہی۔ کوئی دس بجے رات کو گوبر آیا، تازی کی بدبو اڑاتا ہوا لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اوٹ پٹانگ بک رہا تھا۔ ”مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے جسے سو بار گرج ہو رہے، نہیں چلا جائے۔ میں کسی کا تاؤ نہیں سہہ سکتا۔ اپنے ماں باپ کا تاؤ نہیں سہا جس نے جنم دیا، تب دوسروں کا تاؤ کیوں سہوں؟ جعدار آنکھیں دکھاتا ہے تو یہاں کسی کی دھونس سینے والے نہیں ہیں۔ لوگوں نے پکڑ نہ لیا ہوتا تو کھون پی جاتا کھون! کل دیکھوں گا بچہ کو۔ پھانسی ہی تو ہوگی۔ دکھاؤں گا کہ مرد کیسے مرتے ہیں۔ ہنستا ہوا، اکڑتا ہوا اور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا پھانسی پر چڑھ جاؤں تو سہی۔ عورت کی جات! کتنی مطلبی ہوتی ہے

کھڑی ڈال دی اور پاؤں سپار کر سو رہی۔ کوئی کھائے چاہے نہ کھائے، اس کے ٹھیکے سے! آپ نے بھلکے اڑاتی ہے اور میرے لیے کھڑی۔ اچھا ستالے جتنا ستاتے بنے، تجھے بھگوان ستائیں گے۔“

اس نے تھنیا کو جگایا نہیں۔ کچھ بولا بھی نہیں، چپکے سے کھڑی تھالی میں نکالی اور دو چار لقمے نگل کر برآمدے میں لیٹ رہا۔ پچھلے پہر اسے سردی لگی۔ کوٹھری میں کبل لینے گیا تو تھنیا کے کراہنے کی آواز سنی۔ نشہ اتر چکا تھا۔

پوچھا ”کیسا جی ہے تھنیا؟ کہیں درد ہے کیا؟“

”ہاں پیٹ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔“

”تو نے پہلے کیوں نہیں کہا؟ اب اس بکھت کہاں جاؤں؟“

”کس سے کہتی؟“

”میں کیا مر گیا تھا؟“

”تمہیں میرے مرنے جینے کی کیا چھتا؟“

گوبر گھبرایا۔ کہاں دائی کھوجنے جائے؟ اس وقت وہ آنے ہی کیوں لگی۔ گھر میں کچھ ہے بھی تو نہیں، چڑیل نے پہلے بتادیا ہوتا تو کسی سے دو چار روپے مانگ لاتا۔ ان ہی ہاتھوں میں سو پچاس روپے ہر دم پڑے رہتے تھے، چار آدمی کھسا د کرتے تھے۔ اس کلچھنی کے یہاں آتے ہی جیسے چھنی روٹھ گئی، نکلے نکلے کو محتاج ہو گیا۔

دفتا کسی نے پکارا ”یہ کیا تمہاری گھر والی کراہ رہی ہے؟ درد تو نہیں ہو رہا ہے؟“

یہ وہی موٹی کالی عورت تھی جس سے آج تھنیا کی بات چیت ہوئی تھی۔ گھوڑے کو دانہ کھلانے اٹھی تھی اور تھنیا کا کراہنا سن کر پوچھنے آگئی تھی۔

گوبر نے برآمدے میں جا کر کہا ”پیٹ میں درد ہے چھٹ پٹا رہی ہے۔“ یہاں کوئی دائی ملے گی؟“

”وہ تو میں آج اسے دیکھ گئی تھی۔ دائی کچی سرائے میں رہتی ہے۔ لپک کر بلا لاؤ۔“

تب تک میں یہیں بیٹھی ہوں۔“

”میں نے کچی سرائے نہیں دیکھی، کدھر ہے؟“

”اچھا تم اسے پکھا جھلتے رہو، میں بلائے لاتی ہوں۔ یہی کہتے ہیں کہ اناڑی آدمی

کسی کام کا نہیں۔ پورا پیٹ اور دائی کی کھوج نہیں۔“

یہ کہتی ہوئی وہ چل دی۔ اس کے منہ پر تو لوگ اسے چوبیا کہتے تھے لیکن غیبت میں مٹلی کہا کرتے تھے۔ کسی کو مٹلی کہتے سن لیتی تھی تو اس کے سات پرکھوں تک چڑھ جاتی تھی۔ گوہر کو بیٹھے دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ وہ لوٹ آئی اور بولی ”اب سنسار میں گریبوں کا کیسے نباہ ہوگا۔ رائڈ کہتی ہے کہ پانچ روپے لوں گی، جب چلوں گی، اور آٹھ آنے روج اور بارہویں دن ایک ساڑی۔ میں نے کہا تیرا منہ مجلس دوں! تو جا چولھے میں! میں دیکھ لوں گی، بارہ بچوں کی ماں یوں ہی نہیں ہوگئی ہوں۔ تم باہر آ جاؤ گو بردھن، میں سب کر لوں گی۔ بکھٹ پڑے پر آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ چار بچے جنا لیے تو دائی بن بیٹھی۔“ وہ چھدیا کے پاس جا بیٹھی اور اس کا سراپنی جائگہ پر رکھ کر اس کا پیٹ سہلاتی ہوئی بولی ”میں تو آج تجھے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔ سچ پوچھو تو آج اسی دھڑ کے میں مجھے نیند نہیں آئی۔ یہاں تیرا کون سا بیٹھا ہے؟“

چھدیا نے درد سے دانت جما کر سی، کرتے ہوئے کہا ”اب نہ بچوں کی دیدی! میں تو بھگوان سے مانگنے نہ گئی تھی۔ ایک کو پالا پوسا، اسے تم نے چھین لیا تو پھر اس کا کون کام تھا؟ میں مر جاؤں ماما، تو اس بچے پر دیا کرنا، اسے پال پوس لینا۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں گے۔“ چوبیا محبت سے اس کے بال سلجھاتی ہوئی بولی ”دھیرج دھر بیٹی، دھیرج دھرا! ابھی چھن بھر میں کشت کٹا جاتا ہے۔ تو نے بھی جیسے چبی سادھ لی تھی۔ اس میں کس بات کی لاج؟ مجھ سے بتا دیا ہوتا تو میں مولوی صاحب کے پاس سے گنڈا لادیتی، وہی مرجاجی جو اس حاٹے میں رہتے ہیں۔“

اس کے بعد چھدیا کو کچھ ہوش نہ رہا۔ نو بجے صبح اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ چوبیا بچے کو لیے بیٹھی ہے اور وہ صاف ساڑی پہنے ہوئے لیٹی ہے۔ ایسی کمزور تھی گویا بدن میں خون کا نام نہ ہو۔

چوبیا روزانہ صبح آکر چھدیا کے لیے حریرہ اور حلوہ پکا جاتی اور دن میں بھی کئی بار آکر بچے کو ابٹن ملتی اور اوپر کا دودھ پلا جاتی۔ آج چوتھا دن تھا مگر چھدیا کے دودھ نہ اترتا تھا۔ بچہ رو رو کر گلا پھاڑے لیتا تھا کیونکہ اوپر کا دودھ اسے ہضم نہ ہوتا تھا۔ ایک لمحہ بھی چپ نہ رہتا۔ چوبیا اپنا دودھ اس کے منہ میں دیتی۔ بچہ ایک منٹ چوستا مگر جب دودھ نہ لگا تو چیخنے

لگتا۔ جب چوتھی شام تک بھی جھنڈا کے دودھ نہ اتر ا تو چوبیا گھبرائی۔ بچہ سوکھتا چلا جاتا تھا۔ نخاس پر ایک پنشنر ڈاکٹر رہتے تھے وہ انھیں لے آئی ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا ”اس کے بدن میں خون تو ہے نہیں، پھر دودھ کہاں سے آئے؟ معاملہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بدن میں خون لانے کے لیے مہینوں مقوی دوائیں کھانی پڑیں گی تب کہیں دودھ اترے گا۔ اس وقت تک تو اس گوشت کے لوتھڑے کا کام ہی تمام ہو جائے گا۔“

پھر رات ہو گئی تھی۔ گوبر تازی پیے ہوئے دالان میں پڑا تھا۔ چوبیا بچے کو چپ کرانے کے لیے اس کے منہ میں اپنا دودھ ڈالے ہوئے تھی۔ یکا یک اسے معلوم ہوا کہ اس کے خود میں دودھ اتر آیا ہے۔ خوش ہو کر بولی۔

”لے جھنڈا اب تیرا بچہ جی جائے گا، میرے دودھ آ گیا۔“

جھنڈا نے تعجب سے کہا ”تمہارے دودھ آ گیا!“

”نہیں ری، سچ!“

”میں تو نہیں بسواس کرتی۔“

”دیکھ لے۔“

اس نے اپنا دودھ دبا کر دکھایا۔ دھار پھوٹ نکلی۔

جھنڈا نے پوچھا ”تمہاری چھوٹی لڑکی تو آٹھ سال سے کم نہیں ہے؟“

”ہاں آٹھواں برس ہے، پر میرے دودھ بہت ہوتا تھا۔“

”ادھر تو تمہیں کوئی بال بچہ نہیں ہوا؟“

”وہی لڑکی پیٹ پوچھنی تھی۔ چھاتی بالکل سوکھ گئی تھی مگر بھگوان کی لیلیا ہے اور کیا۔“

اب سے چوبیا چار پانچ بار آکر بچے کو دودھ پلا جاتی۔ بچہ پیدا تو ہوا تھا کمزور، مگر

چوبیا کا صحت بخش دودھ پی کر موٹا ہوتا جاتا تھا۔ ایک روز چوبیا ندی نہانے چلی گئی۔ بچہ

بھوک سے چھٹ پانے لگا۔ چوبیا دس بجے لوٹی تو جھنڈا بچے کو کندھے سے لگائے، جھلا رہی

تھی اور وہ روئے جاتا تھا۔ چوبیا نے بچے کو اس کی گود سے لے کر دودھ پلا دینا چاہا مگر جھنڈا

نے اسے جھڑک کر کہا ”رہنے دو۔ ابھاگا مر جائے یہی اچھا کسی کا احسان تو نہ لینا پڑے۔“

چوبیا گڑگڑانے لگی۔ جھنڈا نے بڑے مناؤں کے بعد بچے کو اس کی گود میں دیا۔

لیکن جھنڈا اور گوبر میں اب بھی نہ بنتی تھی۔ جھنڈا کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ یہ پکا مطلبی

اور بیدار آدمی ہے، مجھے صرف اپنے شوق و آرام کی چیز سمجھتا ہے چاہے میں مردوں یا عیوں۔ اس کی ہمتا پوری ہوتی جائے۔“ اسے بالکل رنج نہیں۔ سوچتا ہوگا کہ یہ مر جائے گی تو دوسری لاؤں گا۔ مگر منہ دھو رکھیں بچہ! میں ہی ایسی المیز تھی کہ تمہارے پھندے میں آگئی تب تو پاؤں پڑتا رہتا تھا اب یہاں آتے ہی نہ جانے کیوں جیسے اس کا سبھاؤ ہی بگڑ گیا۔ جاڑا آگیا تھا۔ مگر نہ اوڑھنے کو تھا نہ بچھانے کو۔ روٹی دال سے جو دو چار روپے بچتے وہ تازی میں اڑ جاتے تھے۔ ایک پرانا لحاف تھا دونوں اسی میں سوتے تھے۔ پھر بھی ان میں سوکوس کا فاصلہ تھا۔ دونوں ایک ہی کروٹ میں رات کاٹ دیتے تھے۔

گوبر کا جی بچے کو گود میں لے کر کھلانے کے لیے ترس کر رہ جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات کو اٹھ کر اس کا پیارا کھڑا دیکھ لیا کرتا، مگر جھینا کی جانب سے اس کے دل میں کشیدگی نہ تھی۔ جھینا بھی اس سے بات نہ کرتی، نہ اس کی کچھ خدمت ہی کرتی۔ دونوں کے درمیان میں یہ کدورت، دقت کے ساتھ لوہے میں زنگ کی طرح گہری، مضبوط اور سخت ہوتی جاتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی باتوں کا الٹا ہی مطلب نکالتے، وہی جس سے باہمی منافرت میں زیادتی ہو اور کئی دن تک ایک ایک بات کو دل میں رکھے رہتے اور اسے اپنا خون پلا پلا کر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے کے لیے تیار کرتے رہتے، گویا شکاری کتے ہوں۔

ادھر گوبر کے کارخانے میں بھی آئے دن ایک نہ ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ اب کے بجٹ میں شکر پرنکس لگ گیا تھا۔ مل کے مالکوں کو اجرت گھٹانے کا اچھا بہانہ مل گیا۔ نکس سے اگر پانچ کا نقصان تھا تو اجرت گھٹا دینے سے دس کا منافع تھا۔ ادھر مزدوری گھٹتی اور ادھر ہڑتال ہوتی۔ مزدوری میں دھیلے کی کمی بھی منظور نہ تھی۔ جب اس مہنگی کے دنوں میں ایک دھیلہ بھی اجرت نہ بڑھی تو اب وہ گھٹانے میں کیوں ساتھ دے؟ مرزا خورشید مزدور سبھا کے پریسیڈنٹ اور پنڈت اونکار ناتھ ایڈیٹر ”بجلی“، اس کے سکریٹری تھے۔ دونوں ایسی ہڑتال کرانے پر تلے ہوئے تھے کہ مل کے مالکوں کو کچھ دن یاد رہے۔ مزدوروں کو بھی ہڑتال سے نقصان پہنچے گا حتیٰ کہ ہزاروں کو روٹی کے لالے پڑ جائیں گے، اس پہلو پر ان کی نگاہ بالکل نہ تھی۔ گوبر ہڑتالیوں میں سب سے آگے تھا۔ اکھڑ سبھاؤ کا تھا ہی، للکارنے کی ضرورت تھی، پھر تو وہ مرنے مارنے سے نہ ڈرتا تھا۔ ایک دن جھینا نے اسے جی کڑا کر کے سمجھایا بھی کہ تم بال بچے والے آدمی ہو، تمہارا اس طرح آگ میں کودنا اچھا نہیں، مگر گوبر بگڑ اٹھا ”تو کون

ہوتی ہے میرے بیچ میں بولنے والی؟ میں تجھ سے صلاح نہیں پوچھتا۔“ بات بڑھ گئی اور گوہر نے جھٹکا کو خوب پیٹا۔ چوہیا نے آکر جھٹکا کو چھڑایا اور گوہر کو ڈانٹنے لگی۔ گوہر کے سر پر شیطان سوار تھا۔ سرخ سرخ آنکھیں نکال کر بولا۔ ”تم میرے گھر میں مت آیا کرو چوہیا، تمہارے آنے کا کچھ کام نہیں۔“

چوہیا نے طنز سے کہا ”تمہارے گھر میں نہ آؤں گی تو میری روٹیاں کیسے چلیں گی؟ یہیں سے مانگ کر لے جاتی ہوں تب تو گرم ہوتا ہے۔ میں نہ ہوتی لالا، تو یہ بی آج تمہاری لاتیں کھانے کے لیے بیٹھی نہ ہوتی۔“

گوہر گھونہ تان کر بولا ”میں نے کہہ دیا کہ میرے گھر میں نہ آیا کرو تم ہی نے اس جیل کا حجاج آسمان پر چڑھا دیا ہے۔“

چوہیا وہیں جمی ہوئی بے خوف کھڑی رہی۔ ”اچھا اب چپ رہنا گوہر۔ بے چاری ادھ مری عورت کو مار کر تم نے کوئی بڑی بہادری کا کام نہیں کیا ہے۔ تم اس کے لیے کیا کرتے ہو کہ تمہاری مار سے؟ ایک روٹی کھلا دیتے ہو اسی لیے؟ اپنا بھاگ سہا ہو کہ ایسی گمراہ عورت پا گئے ہو۔ دوسری ہوتی تو تمہارے منہ پر جھاڑو مار کر نکل گئی ہوتی۔“

محلے کے لوگ جمع ہو گئے اور چاروں طرف سے گوہر پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ وہی لوگ جو اپنے گھروں میں اپنی عورتوں کو روز پیٹتے تھے اس وقت رحم و انصاف کے پتلے بنے ہوئے تھے۔ چوہیا اور شیر ہو گئی اور فریاد کرنے لگی۔

”داری جارہا ہے کہ میرے گھر نہ آیا کرو۔ بی بی۔ بچہ رکھنے چلا ہے۔ پر یہ نہیں جانتا کہ بی بی بچوں کو پالنا بڑے گردے کا کام ہے۔ اس سے پوچھو میں نہ ہوتی تو آج یہ بچہ جو پچھڑے کی طرح کلیں کر رہا ہے، کہاں ہوتا؟ عورت کو مار کر جوانی دکھاتا ہے۔ میں نہ ہوتی تیری بی بی، نہیں تو یہی جوتی اٹھا کر تیرے منہ پر تتر تتر جماتی اور کوٹھری میں ڈھکیل کر باہر سے کنڈی بند کر دیتی۔ دانے دانے کو ترس جاتے۔“

گوہر جھلایا ہوا اپنے کام پر چلا گیا۔ چوہیا مرد ہوئی تو مزا چکھا دیتا۔ عورت کے منہ کیا لگے؟

مل میں بے چینی کے بادل گہرے ہوتے جارہے تھے۔ مزدور ”بکلی“ کے پرچے جیب میں لیے پھرتے اور ذرا بھی موقع پاتے تو دو تین مزدور مل کر اسے پڑھنے لگتے۔ اخبار کی

مکرمی خوب بڑھ رہی تھی۔ مزدوروں کے لیڈر ”بکلی“ کے کارخانے میں بیٹھے ہڑتال کی تجویزیں سوچا کرتے اور صبح ہوتے جب اخبار میں یہ خبر جلی حروف میں نکلتی تو پبلک ٹوٹ پڑتی اور اخبار کی کاپیاں دگنے تکٹنے قیمت پر بک جاتیں۔ ادھر کمپنی کے ڈائریکٹر بھی اپنی گھات میں بیٹھے تھے۔ ہڑتال ہو جانے ہی میں ان کا فائدہ تھا۔ آدمیوں کی کمی تو ہے نہیں۔ بے کاری بڑھی ہوئی ہے۔ اس کی نصف اجرت پر ویسے ہی آدمی آسانی سے مل سکتے ہیں۔ مال کی تیاری میں ایک دم آدمی بچت ہو جائے گی۔ دس پانچ دن کام کا حرج ہوگا، کچھ پرداہ نہیں۔ آخر یہ طے ہو گیا کہ اجرت میں کمی کا اعلان کر دیا جائے۔ دن اور وقت مقرر کر دیا گیا۔ پولیس کو اطلاع دے دی گئی۔ مزدوروں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ اپنی گھات میں تھے۔ اسی وقت ہڑتال کرنا چاہتے تھے جب گودام میں بہت تھوڑا مال رہ جائے اور مانگ کی زیادتی ہو۔

ایک ایک روز جب مزدور شام کو چھٹی پا کر جانے لگے تو ڈائریکٹروں کا اعلان سنا دیا گیا۔ اسی وقت پولیس آگئی۔ مزدوروں کو اپنی مرضی کے خلاف اسی وقت ہڑتال کرنی پڑی جب گودام میں اتنا مال بھرا ہوا تھا کہ بہت زیادہ مانگ ہونے پر بھی چھ مہینے سے پہلے نہ اٹھ سکتا تھا۔

مرزا خورشید نے یہ خبر سنی تو مسکرائے جیسے کوئی ہوشیار جنرل اپنے دشمن کے جنگی کمال پر خوش ہو گیا ہو۔ ایک لمحہ غور کرنے کے بعد بولے ”اچھی بات ہے۔ اگر ڈائریکٹروں کی یہی مرضی تو یہی سہی۔ حالات ان کے موافق ہیں، لیکن ہمیں بھی حق و انصاف پر بھروسہ ہے۔ وہ لوگ نئے آدمی رکھ کر اپنا کام چلانا چاہتے ہیں۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ انہیں ایک بھی نیا آدمی نہ ملے، یہی ہماری فتح ہوگی۔“

بکلی کے دفتر میں اسی وقت خطرے کی میٹنگ ہوئی۔ کارکن کمیٹی بنائی گئی، عہدے داروں کا انتخاب ہوا اور آٹھ بجے رات کو مزدوروں کا لمبا جلوس نکلا۔ دس بجے رات کو اگلے دن کا سارا پروگرام طے کیا گیا اور یہ تاکید کر دی گئی کہ کسی طرح کا شر و فساد نہ ہونے پائے۔ مگر ساری کوشش بے کار ہوئی۔ ہڑتالیوں نے نئے مزدوروں کی کثیر تعداد مل کے پھانگ پر کھڑی دیکھی تو ان کی مفیدانہ رغبت قابو سے باہر ہو گئی۔ سوچا تھا کہ سو سو پچاس پچاس آدمی روزانہ بھرتی کے لیے آئیں گے تو انہیں سمجھا بجا کر یاد دہاکر بھگادیں گے۔ ہڑتالیوں کی تعداد دیکھ کر آنے والے مزدور آپ ہی ڈر جائیں گے۔ مگر یہاں تو نقشہ ہی دگر

گوں تھا۔ اگر یہ کل آدمی بھرتی ہو گئے تو ہڑتالیوں کے لیے سمجھوتے کی کوئی امید ہی نہ تھی۔ طے ہوا کہ نئے آدمیوں کو مل میں جانے ہی نہ دیا جائے۔ طاقت کے استعمال کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ نیا گروہ بھی مرنے مارنے پر تیار تھا۔ ان میں زیادہ تر مر بھوکے تھے جو اس موقع کو کسی طرح بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتے تھے۔ بھوکوں مرجانے یا اپنے بال بچوں کو بھوکوں مرتے دیکھنے سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ حالات حاضرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے مریں۔ دونوں جماعتوں میں فوجداری ہو گئی۔ بجلی، کے ایڈیٹر تو بھاگ کھڑے ہوئے ہاں، بے چارے مرزا جی پٹ گئے اور ان کے بچانے میں گوبر بھی بری طرح زخمی ہوا۔ مرزا پہلوان آدمی تھے اور منجے ہوئے مہینیکٹ۔ اپنے اوپر کوئی گہرا وار نہ پڑنے دیا۔ گوبر دہقانی تھا، پورا لٹھ مار، مگر اپنی حفاظت کرنا نہ جانتا تھا جو لڑائی میں سب سے زیادہ اہم بات ہے۔ اس کے ایک ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ سر پھٹ گیا۔ اور آخر کار وہیں ڈھیر ہو گیا۔ کندھوں پر بے شمار لاشیاں پڑی تھیں جس سے اس کا ایک ایک عضو چور ہو گیا تھا۔ ہڑتالیوں نے اسے گرتے دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف دس بارہ بچے ہوئے آدمی مرزا کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ نئے آدمی فتح کا جھنڈا اڑاتے ہوئے مل میں داخل ہوئے اور ہارے ہوئے ہڑتالی اپنے زخموں کو اٹھا اٹھا کر اسپتال پہنچانے لگے۔ مگر اسپتال میں اتنے آدمیوں کے لیے جگہ نہ تھی۔ مرزا تو لے لیے گئے، گوبر کی مرہم پٹی کر کے اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔

تھینا نے گوبر کا وہ بے جان سا جسم دیکھا تو اس کی نسائیت بیدار ہو گئی۔ اب تک اس نے اسے طاقت کی شکل میں دیکھا تھا۔ جو اس پر حکومت کرتا تھا اور اسے ڈانٹتا مارتا تھا۔ آج وہ ناکارا، یکس اور قابل رحم تھا۔ تھینا نے کھات پر جھک کر آنسوؤں بھری آنکھوں سے گوبر کو دیکھا اور گھر کی حالت کا خیال کر کے اسے گوبر پر رشک آمیز غصہ آیا۔ گوبر جانتا تھا کہ گھر میں ایک پیسہ نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کہیں سے ایک پیسہ ملنے کی امید نہیں ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی، اس کے بار بار سمجھانے پر بھی، اس نے یہ آفت اپنے اوپر لی۔ اس نے کتنی بار کہا تھا کہ تم اس جھگڑے میں نہ پڑو، آگ لگانے والے آگ لگا کر الگ ہو جائیں گے اور جائے گی غریبوں کے سر۔ لیکن وہ کب اس کی سننے والا تھا۔ وہ تو اس کی بیرن تھی۔ دوست تو وہ لوگ تھے جو مزے سے موڑوں میں گھوم رہے ہیں۔ اس غصے میں ایک طرح کا اطمینان تھا جیسے ہم ان بچوں کو کرسی سے گرتے دیکھ کر جو بار بار منع کرنے پر بھی کھڑے

ہونے سے باز نہ آتے، چلا اٹھتے ہیں ”اچھا ہوا، بہت اچھا، تمہارا سر کیوں نہ پھٹ گیا۔“
 لیکن ایک ہی لمحے میں گوبر کا چلانا سن کر اس کے سارے ہوش و حواس ٹھکانے آ گئے۔
 درد و تکلیف میں ڈوبے ہوئے اس کے منہ یہ الفاظ نکلے ”ہائے ہائے! سارا بدن بھر کس ہو گیا۔
 سبوں کو شیک بھی دیا نہ آئی۔“

وہ اسی طرح بڑی دیر تک گوبر کا منہ دیکھتی رہی۔ وہ سمجھتی ہوئی امید سے زندگی کی کوئی
 علامت پالینا چاہتی تھی اور ہر لمحہ اس کا صبر و استقلال غروب ہونے والے سورج کی طرح ڈوبتا
 جاتا تھا اور مستقبل کی تاریکی سے اپنے اندر سیٹھ لیتی تھی۔
 دفعتاً چوہیا نے پکارا ”گوبر کا کیا حال ہے بہو؟ میں نے تو ابھی سنا دوکان سے دوڑی
 آئی ہوں۔“

تھحیا کے رکے ہوئے آنسو ابل پڑے۔ کچھ بول نہ سکی۔ سہمی ہوئی آنکھوں سے
 چوہیا کی طرف دیکھا۔

چوہیا نے گوبر کا منہ دیکھا، اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور تفسفی کے لہجے میں بولی ”یہ
 چار دن میں اچھے ہو جائیں گے۔ گھبر امت۔ کسل ہوئی۔ تیرا سہاگ بلوان تھا۔ کئی آدمی
 اسی دنگے میں مر گئے۔ گھر میں کچھ روپے پیسے ہیں؟“
 تھحیا نے شرم سے سر ہلا دیا۔

”میں لائے دیتی ہوں۔ تھوڑا سا دودھ لاکر گرم کر لے۔“
 تھحیا نے اس کے چہرے پر کڑک کہا ”دیدتی تم ہی میری ماما ہو۔ میرا دوسرا کوئی نہیں ہے۔“
 جائزوں کی اداس شام آج اور بھی اداس لگ رہی تھی۔ تھحیا نے چولہا جلایا اور دودھ
 ابلنے لگی۔

چوہیا برآمدے میں بچے کو لیے کھلا رہی تھی۔
 دفعتاً تھحیا بھرے ہوئے گگلے سے بولی ”میں بڑی ابھائی ہوں دیدتی! میرے جی میں
 ایسا آرہا ہے جیسے میرے ہی کارن ان کی یہ گت ہوئی ہے۔ جی کڑھتا ہے تب دل دکھی ہوتا
 ہے۔ پھر گالیاں بھی نکلتی ہیں اور سراپ بھی نکلتا ہے۔ کون جانے میری گالیوں.....“
 اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ آنسوؤں سے بہاؤ میں آواز بھی بہہ گئی۔
 چوہیا نے آنچل سے اس کے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ ”کیسی باتیں سوچتی ہے، بیٹی؟“

یہ تیرے سیندر کا بھاگ ہے کہ بچ گئے مگر ہاں اتنا ہے کہ آپس میں لڑائی ہو تو منہ سے چاہے جتنا بک لے پر من میں میل نہ رکھے۔ بچ اندر پڑا تو انکھوا نکلے بنا نہیں رہتا۔۔۔
 جھینا نے تھرائی ہوئی آواز میں پوچھا ”اب میں کیا کروں دیدی؟“
 چوہیا نے ڈھارس دی ”کچھ نہیں بیٹی۔ بھگوان کا نام لے دی گریبوں کی رہتا کرتے ہیں۔“

اسی وقت گوبر نے آنکھیں کھولیں اور جھینا کو سامنے دیکھ کر التجا کے انداز سے کمزور آواز میں بولا۔

”آج بہت چوٹ کھا گیا جھینا! میں کسی سے کچھ نہیں بولا۔ سبوں نے ایک دم مجھے مارا۔ کہا سنا چھما کرنا! تجھے ستاتا تھا، اسی کا یہ پھل ملا۔ تھوڑی دیر کا اور مہمان ہوں۔ اب نہ بچوں گا۔ درد کے مارے سارا بدن پھٹا جاتا ہے۔“
 چوہیا نے اندر آکر کہا ”چپ چاپ پڑے رہو بولو چالو نہیں۔ مرو گئے نہیں، اس کا میرا جتہ۔“

گوبر کے چہرے پر امید کی جھلک آگئی، بولا سچ کہتی ہو، میں مروں گا نہیں؟“ ”ہاں، نہیں مرو گے۔ تمہیں ہوا کیا ہے؟ جرا سر میں چوٹ آگئی ہے اور ہاتھ کی ہڈی اتر گئی ہے۔ ایسے چوٹیں مردوں کو نت ہی لگا کرتی ہیں۔ ان سے کوئی نہیں مرتا۔“

”اب میں جھینا کو کبھی نہ ماروں گا۔“

”ڈرتے ہو گے کہ کہیں جھینا تمہیں نہ مارے۔“

”وہ مارے گی بھی تو نہ بولوں گا۔“

”اچھے ہونے پر بھول جاؤ گے۔“

”نہیں دیدی، کبھی نہیں بھولوں گا۔“

گوبر اس وقت بچوں کی سی باتیں کیا کرتا۔ دس پانچ منٹ غافل پڑا رہتا! اس کا جی نہ جانے کہاں کہاں اڑتا پھرتا۔ کبھی دیکھتا کہ وہ ندی میں ڈوبا جا رہا ہے اور جھینا اسے بچانے کے لئے ندی میں چلی آ رہی ہے۔ کبھی دیکھتا کہ کوئی دیو اس کے سینے پر سوار ہے اور جھینا کی شکل کی کوئی دیوی اسے بچا رہی ہے اور بار بار چوک کر پوچھتا ”میں مروں گا تو نہیں، جھینا؟“
 تین دن اس کی یہی حالت رہی اور جھینا نے رات کو جاگ کر اور دن کو پاس کھڑے رہ

کر گویا موت کے منہ سے اسے بچایا۔ بچے کو چوہیا سنبھالے رہتی تھی۔ چوتھے دن جھنڈیا یکہ لائی اور سب نے گوبر کو اس پر لاد کر اسپتال پہنچایا۔ وہاں سے لوٹ کر گوبر کو معلوم ہوا کہ وہ اب بچ بچ جائے گا۔ اس نے آنکھوں میں آنسوؤں بھر کر کہا ”مجھے چھما کر دو جھوٹا!“

ان تین چار دن میں چوہیا کے تین چار روپے خرچ ہو گئے تھے اور اب جھنڈیا کو اس سے کچھ لینے میں تامل ہوتا تھا۔ وہ بھی کوئی مالدار تو تھی نہیں۔ لکڑی کی بکری کے روپے جھنڈیا کو دے دیتی تھی۔ آخر جھنڈیا نے کچھ کام کرنے کا ارادہ کیا۔ ابھی گوبر کو اچھا ہوتے مہینے لگیں گے۔ کھانے پینے کو بھی چاہیے، دوا دارو کو بھی چاہیے۔ وہ کچھ کام کر کے کھانے بھر کو تولے ہی آئے گی۔ بچپن سے اس نے گایوں کا پالنا اور گھاس کا چھیلنا سیکھا تھا۔ یہاں گائے تو تھیں نہیں، ہاں لوگ گھاس چھیلنے جاتے تھے اور آٹھ دس آنے کما لاتے تھے۔ وہ علی الصباح گوبر کا ہاتھ منہ دھولا کر اور بچے کو اسے سوپ کر گھاس چھیلنے چلی جاتی اور بھوکی پیاسی تیسرے پہر تک چھیلی رہتی۔ پھر اسے منڈی میں لے جا کر بیچتی اور شام کو گھر آتی۔ رات کو بھی وہ گوبر کی نیند سوتی اور گوبر کی نیند جاگتی۔ مگر اتنی سخت محنت کرنے پر بھی اس کا دل ایسا بلاش رہتا گویا جھولے پر بیٹھی گارہی ہو۔ راستے بھر ہمراہی عورتوں مردوں سے ہنستی بولتی ہوئی چلی جاتی اور گھاس چھیلنے وقت بھی سب میں ایسی ہی باتیں ہوتی رہتیں۔ نہ تقدیر کا شکوہ، نہ تباہی کا گلا۔ زندگی کی معنویت میں، یگانوں کے لیے زبردست سے زبردست ایثار میں، اور آزادانہ مذمت میں جو خوشی ہے اسی کی چمک اس کے ہر ہر عضو سے ظاہر تھی۔ بچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر جیسے تالیاں بجا بجا کر خوش ہوتا ہے کچھ دسکی ہی خوشی وہ بھی محسوس کر رہی تھی، گویا اس کے دل میں خوشی کا کوئی چشمہ جاری ہو گیا ہو۔ اور جب دل بحال ہو تو پھر بھی کیوں ویسا ہی نہ رہے؟ اسی ایک مہینے میں جیسے اس کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اس کے اعضا میں اب سستی نہیں بلکہ تیزی ہے، لچک ہے اور نزاکت ہے چہرے پر وہ زردی نہیں بلکہ خون کی گلابی رنگت ہے۔ اس کا شباب جو اس بند کوٹھری میں پڑے پڑے ذلت اور خانہ جنگی سے افسردہ ہو گیا تھا وہ گویا ہوا اور روشنی پا کر لہلہا اٹھا ہے۔ اب اسے کسی بات پر غصہ نہیں آتا۔ بچے کے ذرا سے رونے پر وہ جھنجھلا اٹھا کرتی تھی اب گویا اس کی برداشت اور محبت کی کوئی حد ہی نہ تھی۔

اس کے خلاف گوبر اچھا ہوتے جانے پر بھی کچھ اداس رہتا تھا۔ جب ہم اپنے عزیز

پر ظلم کرتے ہیں اور جب مصیبت آپڑنے سے ہم میں اتنی طاقت آجاتی ہے کہ اس کی شدید تکلیف کو خود محسوس کر سکیں، تو اس سے ہمارا دل بیدار ہو جاتا ہے اور ہم اس بے جا سلوک کا کفارہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ گو براہی کفارے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ اب اس کی زندگی کا رویہ بالکل دوسرا ہوگا جس میں تلخی کی جگہ شیرینی ہوگی اور غرور کے بجائے انکسار، اسے اب معلوم ہوا کہ خدمت کرنے کا موقع بڑی خوش قسمتی سے ملتا ہے اور اب وہ اسے کبھی نہ بھولے گا۔

مسٹر کھنا کو مزدوروں کی یہ ہڑتال بالکل بے جا معلوم ہوتی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ عوام کے ساتھ ملے رہنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خود کو عوام ہی کا آدمی سمجھتے تھے۔ سابق قومی تحریک میں انھوں نے بڑا حوصلہ دکھایا تھا۔ اس وقت ضلع کے خاص لیڈر تھے، دو بار جیل گئے تھے اور کئی ہزار کا نقصان اٹھایا تھا۔ اب بھی وہ مزدوروں کی شکایتیں سننے کو تیار تھے۔ مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ مل کے جسے داروں کے فائدے کا خیال قطعی چھوڑ دیں۔ اپنا سوارتھ چھوڑ دینے کو وہ تیار ہو سکتے تھے بشرطیکہ ان کی بلند خیالی سے مس ہو، مگر جسے داروں کے اغراض کی حفاظت نہ کرتا، یہ تو ادھر تھا۔ یہ تو کاروبار ہے، کوئی سدا برت نہیں کہ سب کا سب مزدوروں ہی کو بانٹ دیا جائے۔ جسے داروں کو یہ یقین دلا کر روپے لیے گئے تھے کہ اس کام میں پندرہ بیس روپے سیکڑہ کا منافع ہے اور اگر انھیں دس روپے سیکڑہ بھی نہ ملے تو وہ ڈائریکٹر اور خصوصاً کھنا کو دھوکہ باز ہی تو سمجھیں گے۔ پھر اپنی تنخواہ وہ کیسے کم کر سکتے تھے؟ اور کمپنیوں کے دیکھتے انھوں نے اپنی تنخواہ بہت کم رکھی تھی۔ صرف ایک ہزار روپے ماہوار لیتے تھے۔ کچھ کمیشن بھی مل جاتا تھا۔ لیکن اگر وہ اتنا لیتے تھے تو مل کے چلانے کا سارا انتظام بھی تو ان ہی کے ذمے تھا۔ مزدور صرف ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔ ڈائریکٹر اپنی عقل سے، اپنے علم سے اور اپنے اثر سے کام کرتا ہے۔ دونوں طاقتوں کی قیمت برابر تو نہیں ہو سکتی۔ مزدوروں کو یہ سوچ کر کیوں نہیں صبر ہوتا کہ کساد بازاری کا وقت ہے۔ اور چاروں طرف بے کاری پھیلی ہونے کے سبب آدمی سستے ہو گئے ہیں۔ انھیں ایک کی جگہ پون بھی ملے تو مطمئن رہنا چاہیے تھا۔ سچ پوچھیے تو وہ مطمئن ہی ہیں۔ ان کا کوئی تصور نہیں۔ وہ تو جاہل مطلق ہیں۔ شرارت تو اونکارنا تھا اور مرزا خورشید کی ہے۔ یہی لوگ ان غریبوں کو کٹھ پتلی کی طرح نچا رہے ہیں، صرف تھوڑے سے پیسے اور کچھ ناموری کے لالچ میں پڑ کر۔ یہ نہیں سوچتے کہ ان کی اس حرکت سے کتنے گھرتا ہو جائیں گے۔ اونکارنا تھا کہ اخبار نہیں چلتا تو کھنا کیا کریں؟ اور آج ان کے اخبار کے ایک لاکھ گاہک ہو جائیں جس سے انھیں پانچ لاکھ کا منافع ہونے لگے

تو کیا وہ صرف اپنی گزر بسر کے لیے لے کر بقیہ رقم کام کرنے والوں کو تقسیم کر دیں گے؟ کہاں کی بات! اور یہ تیاگی مرزا بھی تو ایک دن لکھ پتی تھے اور ہزاروں مزدور ان کے یہاں کام کرتے تھے، تو کیا وہ اپنی ضرورت بھر کے لیے لے کر بقیہ مزدوروں میں بانٹ دیتے تھے؟ کیا وہ اسی ضرورت بھر کی قلیل رقم میں یورپین چھوڑیوں کے ساتھ عیش و عشرت کرتے تھے، بڑے بڑے افسروں کے ساتھ دعوتیں اڑاتے تھے، ہزاروں روپے ماہوار کی شراب پی جاتے تھے اور ہر سال فرانس اور سویٹزر لینڈ کی سیر کرتے تھے؟ آج مزدوروں کی حالت دیکھ کر ان کا کلیجہ پھٹتا ہے!۔

ان دونوں لیڈروں کی تو کھنا کو پرواہ نہ تھی ان کی نیت کی صفائی میں پورا شک تھا۔ نہ رائے صاحب ہی کی انھیں پرواہ تھی جو ہمیشہ کھنا کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے اور ان کی ہر بات کی تائید کر دیا کرتے تھے۔ اپنے شناساؤں میں صرف ایک ہی ایسا شخص تھا جس کی غیر جانبدارانہ رائے پر کھنا کو کامل اعتماد تھا۔! اور وہ تھے ڈاکٹر مہتا۔ جب سے انھوں نے مالتی سے اپنا تعلق بڑھانا شروع کیا تھا، کھنا کی نظروں میں ان کی عزت بہت کم ہو گئی تھی۔ مالتی برسوں کھنا کے دل کی مالکہ رہ چکی تھی۔ مگر اس کو ہمیشہ انھوں نے کھلونا ہی سمجھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کھلونا انھیں بہت پیارا تھا اور اس کے کھوجانے یا ٹوٹ جانے یا چھن جانے پر وہ روئے بھی تھے، مگر تھی وہ کھلونا ہی۔ انھیں کبھی مالتی پر بھروسہ نہ ہوا، وہ بھی ان کے شوق کی باہری پوشاک میں سما کر ان کے دل تک نہ پہنچ سکی تھی۔ وہ اگر خود کھنا سے بیاہ کے لیے کہتی تو وہ منظور نہ کرتے اور کسی نہ کسی حیلے سے ٹال دیتے۔ کتنے ہی اور انسانوں کی طرح کھنا کی زندگی بھی دوزخ تھی۔ ایک طرف وہ تیاگ اور سیوا اور اپکار کے پجاری تھے تو دوسری طرف خود غرضی، عیش پسندی اور اقتدار کے۔ ان کا اصلی رخ کون تھا، یہ کہنا مشکل ہے۔ شاید ان کی روح کا اعلیٰ نصف، خدمت اور ہمدردی کے اجزا سے بنا ہوا تھا اور ادنیٰ نصف خود غرضی اور عیش پسندی سے، مگر اس اعلیٰ اور ادنیٰ میں برابر مقابلہ ہوتا رہتا تھا اور ادنیٰ ہی اپنی زبردستی اور ہٹ کے سبب امن اور سکون سے بھرے ہوئے اعلیٰ پر غالب آ جاتا تھا۔ ادنیٰ مالتی کی طرف جھکتا تھا تو اعلیٰ مہتا کی طرف، مگر وہ اب ادنیٰ میں شامل ہو گیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مہتا جیسا معیار پرست آدمی مالتی جیسی شوخ اور آرام پسند عورت پر کیسے فریفتہ ہو گیا۔ وہ بہت کوشش کرنے پر بھی مہتا کو نفس پرستیوں کا شکار نہ قرار دے سکتے تھے اور کبھی

کبھی انھیں یہ شک بھی ہونے لگتا تھا کہ مالٹی کا کوئی ایسا دوسرا روپ بھی ہے جسے نہ تو وہ دیکھ سکے اور نہ جسے وہ دیکھنے کے اہل ہی تھے۔

موافق و مخالف، سبھی پہلوؤں پر غور کر کے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس حالت میں ان کو مہتا ہی سے واجبی ہدایت مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر مہتا کو کام کرنے کا نشہ تھا۔ آدھی رات کو سوتے تھے اور رات رہے جاگ پڑتے تھے۔ کیسا ہی کام ہو وہ اس کے لیے کہیں نہ کہیں سے وقت نکال لیتے تھے۔ ہاکی کھیلنا ہو یا یونیورسٹی کے مباحثے میں حصہ لینا ہو، ”گاؤں گٹھن“، ہو یا کسی شادی کا نیوتا سبھی کاموں کے لیے ان کے دل میں شوق تھا اور ان کے پاس وقت تھا۔ وہ اخباروں میں مضامین بھی لکھتے تھے اور کئی سال سے فلسفہ کی ایک ضخیم کتاب بھی لکھ رہے تھے جو اب ختم ہونے والی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک سائنس کا کھیل ہی کھیل رہے تھے۔ اپنے باغیچے میں پودوں پر برقی اثر کی آزمائش کر رہے تھے۔ انھوں نے حال میں ایک سائنس کی انجمن میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ فصلیں برقی طاقت سے بہت کم وقت میں پیدا کی جاسکتی ہیں، ان کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہیں، اور بے فصل کی چیزوں کی بیج بھی کی جاسکتی ہے۔ آج کل صبح کے دو تین گھنٹے وہ ان ہی باتوں میں صرف کرتے تھے۔

مسٹر کھنا کی باتیں سن کر انھوں نے خرش روئی سے ان کی طرف دیکھ کر کہا ”کیا یہ ضروری تھا کہ ٹیکس لگ جانے سے مزدوروں کی اجرت گھٹا دی جائے؟ آپ کو سرکار سے شکایت کرنی چاہیے تھی۔ اگر سرکار نے نہیں سنا تو اس کی سزا مزدوروں کو کیوں دی جائے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ مزدوروں کو اتنی اجرت دی جاتی ہے کہ اس میں ایک چوتھائی کی کمی سے انھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی؟ آپ کے مزدور بلوں میں رہتے ہیں؟ گندے اور بدبودار بلوں میں، جہاں آپ ایک منٹ رہیں تو تھکے ہو جائے، جو کپڑے وہ پہنتے ہیں ان سے آپ اپنے جوتے بھی صاف نہ کریں گے۔ جو کھانا وہ کھاتے ہیں وہ آپ کا کتا بھی نہ کھائے گا۔ میں نے ان کی زندگی میں حصہ لیا ہے۔ آپ ان کی روٹیاں چھن کر اپنے حصہ داروں کا پیٹ بھرنا چاہتے ہیں.....“

کھنا نے بے صبری سے کہا ”مگر ہمارے سبھی رشتے دار تو امیر نہیں ہیں۔ کتنوں نے ہی اپنا سب کچھ اسی بل کی نذر کر دیا ہے اور اس کے نفع کے سوا ان کی زندگی کا کوئی سہارا

نہیں ہے۔“

مہتا نے اس انداز سے جواب دیا گویا اس دلیل کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔
بولے ”جو آدمی کسی کاروبار میں حصہ لیتا ہے وہ اتنا مفلس نہیں ہوتا کہ اس کے منافع ہی کو
زندگی کا سہارا سمجھے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے نفع کم ملے پر اپنا ایک نوکر کم کر دینا پڑے یا اس کے
مکھن اور پھلوں کا بل گھٹ جائے مگر وہ تنگ یا بھوکا نہ رہے گا۔ جو لوگ اپنی جان کھاتے ہیں
ان لوگوں کا حق ان سے زیادہ ہے جو صرف روپیہ لگاتے ہیں۔“

یہی بات پنڈت اونکار ناتھ نے کبھی تھی، مرزا خورشید نے بھی یہی صلاح دی تھی، حتیٰ کے
گوبندی نے بھی مزدوروں کی حمایت کی تھی۔ مگر کھنا نے ان لوگوں کے کہنے کا خیال نہ کیا تھا۔
مگر مہتا کے منہ سے ویسا ہی سن کر وہ متاثر ہو گئے۔ اونکار ناتھ کو وہ مطلبی سمجھتے تھے، مرزا کو غیر
ذمہ دار اور گوبندی کو ناقابل۔ مہتا کی بات میں کردار مطالعہ اور اخلاق کی طاقت تھی۔

دفعتاً مہتا نے پوچھا ”آپ نے اپنی اہلیہ سے بھی اس بارے میں رائے لی؟“

کھنا نے لباتے ہوئے کہاں ”ہاں، پوچھا تھا۔“
”ان کی کیا رائے تھی؟“

”دبی جو آپ کی رائے ہے۔“

”مجھے یہی امید تھی۔ اور آپ اس قابلہ کو ناقابل سمجھتے ہیں!،،

اسی وقت مالتی آچنچی اور کھنا کو دیکھ کر بولی ”اچھا، آپ موجود ہیں! میں نے آج مہتا
جی کی دعوت کی ہے سبھی چیزیں اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہیں۔ آپ کو بھی نینٹا دیتی ہوں۔
گوبندی دیوی سے آپ کا یہ قصور معاف کرادوں گی۔“

کھنا کو تعجب ہوا۔ اب مالتی اپنے ہاتھوں سے کھانا پکانے لگی ہے! مالتی جو خود کبھی اپنے
جوتے نہ پہنتی تھی، جو خود کبھی بجلی کا بٹن تک نہ دباتی تھی، عیش و آرام ہی جس کی زندگی تھی۔
مسکرا کر بولے ”اگر آپ نے پکایا ہے تو ضرور کھاؤں گا۔ میں تو کبھی سوچ ہی نہ سکتا تھا کہ
آپ اس فن میں بھی ماہر ہیں۔“

مالتی نے بلا تامل کہا ”انھوں نے مار مار کر حکیم بنا دیا ہے۔ ان کا حکم کیسے ٹال سکتی؟
مرد دیوتا جو ٹھہرے!،،

کھنا نے اس طرز سے لطف اٹھاتے ہوئے اور مہتا کی طرف آنکھیں مارتے ہوئے کہا ”

مرد تو آپ کی نگاہوں میں اتنی آدر کی چیز نہ تھے۔“

مالتی شرمائی نہیں۔ اس اشارے کا مطلب سمجھ کر جوش کے لہجے میں بولے ”لیکن اب ہو گئے ہیں، اس لیے کے میں نے مرد کا جو روپ اپنی جان پہچان والوں کے دائرے میں دیکھا تھا اس سے یہ کہیں بہتر ہے۔ مرد اتنا بہتر، اتنا نرم دل؟؟“

مہتا نے مالتی کی طرف انکسار سے دیکھا اور کہا ”نہیں مالتی مجھ پر رحم کرو ورنہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔“

ان دنوں جو بھی مالتی سے ملتا تو وہ اس سے مہتا کی تعریفوں کے ہلے باندھ دیتی جیسے کوئی نو مرید اپنے نئے عقاید کا دھندورا پیٹتا پھرے۔ پسند کا بھی اسے خیال نہ رہتا۔ اور بے چارے مہتا دل میں کٹ کر رہ جاتے۔ وہ تلخ اور درشت تنقید کو تو بڑے شوق سے سنتے تھے لیکن اپنی تعریف سن کر گویا بیوقوف بن جاتے تھے اور منہ ذرا سا نکل آتا تھا۔ اور مالتی ان عورتوں میں نہ تھی جو اندر رہ سکے، وہ باہر ہی رہ سکتی تھی، پہلے بھی، اب بھی، عمل میں اور خیال میں دل میں کچھ رکھ چھوڑنا وہ نہ جانتی تھی جس طرح ایک عمدہ سازی پا کر وہ پہننے کے لیے بے چین ہو جاتی تھی۔ اسی طرح دل میں کوئی اچھا خیال آئے تو وہ اسے ظاہر کیے بغیر کل نہ پاتی تھی۔

مالتی نے اور قریب جا کر ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر، گویا ان کی حفاظت کرتے ہوئے کہا ”اچھا بھاگو نہیں، اب میں کچھ نہ کہوں گی معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اپنی جھوڑا وہ پسند ہے تو وہی سنو، کھنا جی! یہ حضرت مجھ پر اپنی محبت کا جال“

شکر مل کی چنی یہاں سے صاف نظر آتی تھی۔ کھانے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چنی کھنا کی نیک نامی کے ستون کی طرح آسمان میں سر اٹھائے کھڑی تھی۔ کھنا کی آنکھوں میں غرور چمک اٹھا۔ اسی وقت انھیں مل کے دفتر میں جانا ہے۔ وہاں ڈائریکٹروں کی ایک فوری اور ضروری میٹنگ کرنی ہوگی اور اس حالت کو ان کے ذہن نشین کرانا ہوگا اور ساتھ ہی اس مسئلے کے حل کی تدبیر بھی بتانی ہوگی۔

مگر چنی کے پاس یہ دھواں کہاں سے اٹھ رہا ہے؟ دیکھتے دیکھتے سارا آسمان غبارے کی طرح دھوئیں سے بھر گیا۔ سب نے خائف ہو کر ادھر دیکھا۔ کہیں آگ تو نہیں لگ گئی؟ آگ ہی معلوم ہوتی ہے۔

دفعاً سامنے سڑک پر ہزاروں آدمی مل کی طرف دوڑے جاتے ہوئے نظر آئے۔ کھانا نے کھڑے ہو کر زور سے پوچھا ”تم لوگ کہاں دوڑے جا رہے ہو؟“ ایک آدمی نے رک کر کہا ”اجی شکر مل میں آگ لگ گئی! آپ دیکھ نہیں رہے ہیں؟“ کھانا نے مہتا کی طرف دیکھا اور مہتا نے کھانا کی طرف - مالتی دوڑی ہوئی اپنے بچلے میں گئی اور جوتے پہن آئی - افسوس اور شکایت کا موقع نہ تھا - کسی کے منہ سے ایک بات نہ نکلی - خطرے میں ہمارے ہوش و ہواس کا رخ اندر کی طرف ہو جاتا ہے - کھانا کا موٹر کھڑا ہی تھا - تینوں آدمی گھبرائے ہوئے آکر بیٹھے اور مل کی طرف بھاگے - چوراہے پر پہنچے تو دیکھا کے سارا شہر اڑا چلا آ رہا ہے - آگ میں آدمیوں کے کھینچنے کا جادو ہے - موٹر آگے نہ بڑھ سکا -

مہتا نے پوچھا ”آگ کا بیہ تو کرا لیا تھا نا؟“ کھانا نے لمبا سانس کھنچ کر کہا ”کہاں بھئی! ابھی تو لکھا پڑھی ہو رہی تھی - کیا جانتا تھا کہ آفت آنے والی ہے -“

موٹر وہیں چھوڑ دیا گیا اور تینوں آدمی بھیڑ کو چیرتے ہوئے مل کے سامنے جا پہنچے - دیکھا تو آگ کا ایک سمندر خلا میں امنڈ رہا تھا - آگ کی پاگل لہریں ایک ہو کر دانت قہقہے تھیں اور زبان نکال رہی تھیں گویا آسمان کو بھی نگل جائیں گی - اس آگ کے سمندر کے نیچے ایک ایسا دھواں چھایا ہوا تھا گویا ساون کی گھٹا کا جل میں نہا کر نیچے اتر آئی ہو - اس کے اوپر آگ کا کانپا اور ابلتا پہاڑ کھڑا تھا - احاطہ میں لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ تھی ، پولیس بھی تھی ، فائر بریگیڈ بھی اور سیوا سمیٹی کے والیوں بھی ، مگر سب کے سب آگ کی تیزی سے گویا ست ہو گئے تھے - فائر بریگیڈ کے چھینٹے اس آتشیں سمندر میں پڑ کر جیسے بجھ جاتے تھے - اینٹیں جل رہی تھیں ، آہنی گزدر جل رہے تھے اور پکھلی ہوئی شکر کے پر نالے چاروں طرف جاری تھے اور تو اور زمین سے بھی شیطانی نکل رہے تھے -

دور سے تو مہتا اور کھانا کو تعجب ہو رہا تھا کہ اتنے لوگ کھڑے تماشا کیوں دیکھ رہے ہیں ، آگ بجھانے میں مدد کیوں نہیں دیتے؟ مگر اب انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تماشا دیکھنے کے سوا اور کچھ کرنا بس کے باہر ہے - مل کی دیواروں سے پچاس گز کے اندر جانا ، جان جوہم تھا - اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے تڑاق تڑاق ٹوٹتے ہوئے اچھل رہے تھے - کبھی ہوا کا رخ ادھر ہو جاتا

تو بھگدڑ پڑ جاتی تھی۔

یہ تینوں بھیڑ کے پیچھے کھڑے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ آخر آگ لگی کیسے اور اتنی جلد پھیل کیسے گئی؟ کیا پہلے کسی نے دیکھا نہیں، یاد کچھ کر بھی بھانے کی کوشش نہیں کی؟ ایسے ہی سوال سب کے دل میں اٹھ رہے تھے مگر وہاں پوچھیں کس سے؟ مل میں کام کرنے والے ہوں گے تو ضرور مگر اس مجمع میں ان کا ملنا مشکل تھا۔

دفعتاً ہوا کا اتنا تیز جھونکا آیا کہ آگ کی لپٹیں نیچی ہو کر ادھر دوڑیں جیسے سمندر میں جوا ر آگیا ہو۔ لوگ سر پر پیر رکھ کر بھاگے، ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے، گویا کوئی شیر جھپٹا آتا ہو۔ شعلوں میں جیسے جان پڑ گئی تھی، جیسے حرکت آگئی تھی، جیسے ہزاروں پھن والے شیش ناگ اپنے منہ سے آگ اگل رہے تھے! کتنے ہی آدمی تو دھکے میں کچل گئے۔ کھانا منہ کے بل گر پڑے۔ بالائی کو مہتا صاحب دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھے ورنہ وہ ضرور کچل گئی ہوتی۔ تینوں آدمی احاطہ کی دیوار کے پاس ایک اہلی کے پیر کے نیچے آکر رکے۔ کھانا ایک طرح کی بے حس محویت کے ساتھ مل کی چنی کی طرف ٹٹلکی لگائے کھڑے تھے۔

مہتا نے پوچھا ”آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“

کھانا نے کوئی جواب نہ دیا، اسی طرف تاکتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں وہ بے حس تھی جو جنون کی علامت ہے۔

مہتا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پھر پوچھا ”ہم لوگ یہاں بے کار کھڑے ہیں۔ مجھے خوف ہو رہا ہے کہ آپ کو چوٹ زیادہ آگئی ہے آئیے لوٹ چلیں۔“

کھانا نے ان کی طرف دیکھا اور جیسے اپنی سنک میں بولے ”جس کی یہ حرکت ہے انھیں میں خوب جانتا ہوں۔ اگر ان کو اسی میں اطمینان ملتا ہے تو ایٹور ان کا بھلا کرے۔ مجھے کچھ پرواہ نہیں،! آج چاہوں تو ایسی نئی مل کھڑی کر سکتا ہوں۔ جی ہاں، بالکل نئی مل کھڑی کر سکتا ہوں! یہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ مل نے مجھے نہیں بنایا، میں نے مل کو بنایا ہے، اور میں پھر بنا سکتا ہوں۔ مگر جن کی یہ حرکت ہے انھیں میں خاک میں ملا دوں گا۔ مجھے سب معلوم ہے رتی رتی معلوم ہے۔“

مہتا نے ان کا چہرا اور ان کی حرکات کو دیکھا تو گھبرا کر بولے ”چلیے آپ کو گھر پہنچا دوں۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔“

کھانا نے قہقہہ لگا کر کہا ”میری طبیعت اچھی نہیں ہے! اس لیے کے یہ مل جل گئی؟ ایسی ملوں کو میں چٹکیوں میں کھوسکتا ہوں میرا نام کھنا ہے، چند پرکاش کھنا! میں نے اپنا سب کچھ اسی مل میں لگا دیا ہے۔ پہلی مل میں ہم نے بیس فیصدی منافع دیا۔ میں نے حوصلہ پا کر یہ مل کھولا، اس میں آدھے روپے میرے ہیں۔ میں نے بینک کے دو لاکھ روپے اس مل میں لگا دیے۔ میں ایک گھنٹہ نہیں، آدھ گھنٹہ پہلے دس لاکھ کا آدمی تھا جی ہاں دس لاکھ! مگر اس وقت فائدہ مست ہوں، نہیں دیوالیہ ہوں! مجھے بینک کا دو لاکھ دینا ہے جس مکان میں رہتا ہوں وہ اب میرا نہیں ہے جس برتن میں کھاتا ہوں وہ بھی اب میرا نہیں ہے۔ بینک سے میں نکال دیا جاؤں گا۔ جس کھانا کو دیکھ کر لوگ جلتے تھے وہ کھانا اب خاک میں مل گیا ہے۔ سوسائٹی میں اب میرا کوئی درجہ نہیں ہے۔ میرے احباب اب مجھے اپنی عقیدت کا نہیں، بلکہ اپنے رحم کا مستحق سمجھیں گے۔ میرے دشمن مجھ سے جلیں گے نہیں، بلکہ مجھ پر نہیں گے۔ آپ نہیں جانتے مسٹر مہتا ”میں نے اپنے اصولوں کا کتنا خون کیا ہے۔ کتنی رشوتیں دی ہیں، کتنی رشوتیں لی ہیں۔ کسانوں کی ایکہ تولنے کے لیے کیسے آدمی رکھے، کیسے نقلی باٹ رکھے۔ کیا کیجیے گا یہ سب سن کر؟ مگر کھانا اپنی یہ درگت کرانے کے لیے کیوں زندہ رہے؟ جو کچھ ہوتا ہے ہو، دنیا جتنا چاہے بنے، احباب جتنا چاہے افسوس کریں، لوگ جتنی گالیاں دینا چاہے دیں، کھانا اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے لیے زندہ نہ رہے گا۔ وہ بے حیا نہیں ہے، بے غیرت نہیں ہے!“

یہ کہتے کہتے کھانا دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ کر زار و قطار رونے لگے۔ مہتا نے انھیں سینے سے لگا کر غمگین لہجے میں کہا ”کھانا جی، ذرا مبر سے کام لیجیے۔ آپ سمجھدار ہو کر دل اتنا چھوٹا کرتے ہیں۔ دولت سے آدمی کو جو وقار ملتا ہے وہ اس کا وقار نہیں بلکہ اس کی دولت کا وقار ہے۔ آپ مفلس رہ کر بھی دوستوں کی عقیدت کے مستحق رہ سکتے ہیں اور دشمنوں کی بھی، بلکہ تب کوئی آپ کا دشمن رہے گا ہی نہیں۔ آئیے گھر چلیں۔ ذرا آرام کر لینے سے آپ کا دل ٹھہر جائے گا۔“

کھانا نے کوئی جواب نہ دیا۔ تینوں آدمی چوراہے پہنچے۔ موٹر کھڑا تھا۔ دس منٹ میں کھانا کی کوشی میں پہنچ گئے۔

کھانا نے اتر کر سکون کے لہجے میں کہا ”موٹر آپ لے جائیں“ اب مجھے اس کی

ضرورت نہیں ہے۔“

مالتی اور مہتا بھی اتر پڑے۔ مالتی نے کہا ”تم چل کر ذرا آرام سے لیٹو، ہم بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔ مگر جانے کی تو کوئی ایسی غلت نہیں ہے۔“

کھانا نے ممنونیت سے ان کی طرف دیکھا اور بھرے ہوئے گلے سے بولے ”مجھ سے جو خطائیں ہوئی ہیں انھیں بخش دینا، مالتی! تم اور مہتا، بس اور دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم دونوں مجھے اپنی نظروں سے نہ گراؤ گے۔ شاید دس پانچ دن میں یہ کوٹھی بھی چھوڑنی پڑے۔ قسمت نے کیسی دعا کی!“

مہتا نے کہا ”میں آپ سے سچ کہتا ہوں کھانا جی کہ آج میری نظروں میں جو آپ کی وقعت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔“

تینوں آدمی کمرے میں گئے۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ پاتے ہی گوبندی اندر سے آکر بولی ”کیا آپ لوگ وہیں سے آرہے ہیں؟ مہراج تو بڑی بری خبر لایا ہے۔“

کھانا کے دل میں ایسا زبردست اور نہ رکنے والا طوفانی جوش اٹھا کہ وہ گوبندی کے پیروں میں گر پڑیں اور انھیں آنسوؤں سے تر کر دیں۔ بھرے گلے سے بولے ”ہاں پیاری ہم تباہ ہو گئے!“

ان کا بے حس، مایوس اور مجرد دل تسکین کے لیے، بے قرار ہو رہا تھا، بچی اور محبت میں ڈوبی ہوئی تسکین کے لیے اس مریض کی طرح جو زندگی کی قوت زائل ہو جانے پر بھی طبیب کے چہرے کی طرف آس بھری آنکھوں سے تاک رہا ہو۔ وہی گوبندی جس پر انھوں نے ہمیشہ ظلم کیا، جسے ہمیشہ ذلیل کیا، جس سے ہمیشہ بے وفائی کی، جسے ہمیشہ زندگی کا بار سمجھا، جس کی موت کے لیے ہمیشہ خواہش مند رہے، وہی اس وقت گویا اپنے آنچل میں دعا اور شگون اور تحفظ لیے ہوئے ان پر نچھاور کر رہی تھی، گویا اس کے قدموں میں ہی ان کی زندگی کی بہشت تھی، گویا وہ ان کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر ہی ان کی بے جان رگوں میں پھر خون کی گردش قائم کر دے گی! دل کی اس کمزور حالت میں اس بھاری مصیبت میں گویا وہ انھیں گلے سے لگالینے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ کشتی پر بیٹھ کر آبی سیر کا لطف اٹھاتے ہوئے ہم جن چٹانوں کو خطرناک سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی انھیں کھود کر پھینک دے، ان ہی چٹانوں سے کشتی کے ٹوٹ جانے پر ہم بے اختیار لپٹ جاتے ہیں۔

گوبندی نے انھیں ایک صوفے پر بیٹھا دیا اور محبت بھرے لہجے میں بولی ”تو تم دل کیوں چھوٹا کرتے ہو دھن کے لیے؟ جو سارے پاؤں کی جڑ ہے؟ اس دھن سے ہمیں کیا سکھ تھا؟ سویرے سے آدھی رات تک ایک نہ ایک جھنجھٹ، آتما کی تباہی اور بربادی! بچے تم سے بات کرنے کو ترس جاتے تھے، تمہیں رشتے داروں کو خط لکھنے تک کی فرصت نہ تھی۔ کیا بڑی عزت تھی؟ ہاں تھی، کیوں کہ دنیا آج کل دھن کی پوجا کرتی ہے اور سدا کرتی چلی آئی ہے۔ اس کو تم سے کوئی مطلب نہیں۔ جب تک تمہارے پاس کچھ بھی ہے، تمہارے سامنے دم ہلائے گی اور پھر کل اتنی ہی بھگتی سے دوسروں کے دروازے پر ہاتھ مارے گی، اور پھر تمہاری طرف تانے کی بھی نہیں۔ سچا انسان دھن کے آگے سر نہیں جھکا تا۔ وہ دیکھتا ہے کہ تم کیا ہو۔ اگر تم میں سچائی ہے، انصاف ہے، تیاگ ہے اور مردانگی ہے تو وہ تمہاری پوجا کرے گا۔ ورنہ تمہیں سانج کا لٹیرا سمجھ کر منہ پھیر لے گا بلکہ تمہارا دشمن ہو جائے گا میں جھوٹ تو نہیں کہتی مہتا جی؟“

مہتا نے گویا جنت کے خواب سے چونک کر کہا ”جھوٹ؟ وہی کہہ رہی ہیں جو دنیا کے عظیم لوگوں نے زندگی کا ٹھوس تجربہ کرنے کے بعد کہا ہے۔ زندگی کا سچا سہارا یہی ہے۔“

گوبندی نے مہتا کو مخاطب کر کے کہا ”دھنی کون ہوتا ہے اس کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ وہی جو اپنی چالاکی سے دوسروں کو بیوقوف بنا سکتا ہے.....“

کھانا نے بات کاٹ کر کہا ”نہیں گوبندی، دھن کمانے کے لیے اپنے میں فطری جوہر چاہیے، صرف چالاکی سے دھن نہیں ملتا۔ اس کے لیے بھی تیاگ اور تپا کرنا لازمی ہے۔ شاید اتنی ریاضت سے خدا بھی مل جائے۔ ہماری ساری جسمانی، روحانی اور عقلی طاقتوں کے توازن کا نام دولت ہے۔“

گوبندی نے مخالفت نہ کرتے ہوئے ثالث کے لہجے میں کہا ”میں مانتی ہوں کہ دھن کے لیے تھوڑی تپا نہیں کرنی پڑتی، مگر پھر بھی ہم نے زندگی میں اسے جتنی اہم چیز سمجھ رکھا ہے اتنی وہ نہیں ہے۔ میں تو خوش ہوں کہ تمہارے سر سے یہ بوجھ ٹلا۔ اب تمہارے لڑکے انسان بنیں گے، خود غرضی اور غرور کے پتے نہیں۔ زندگی کا سکھ دوسروں کو سکھی رکھنے میں ہے، انھیں لوٹنے میں نہیں۔ برا نہ ماننا اب تک تمہاری زندگی کا مطلب تھا خود پروری اور عیش کوٹی۔ ایٹھور نے تمہیں ان ذرائع سے محروم کر کے تمہارے لیے زندہ، بلند اور پاک

زندگی کا راستہ کھول دیا ہے۔ اس کے حصول میں اگر کچھ تکلیف بھی ہو تو اس کا خیر مقدم کرو۔ تم اسے مصیبت سمجھتے ہی کیوں ہو؟ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ تمہیں بے انصافیوں سے لڑنے کا موقع ملا ہے۔ میرے خیال میں تو ظالم ہونے سے مظلوم ہونا کہیں بہتر ہے۔ دھن کھو کر اگر ہم اپنی آتما کو پا سکیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ انصاف کے سپاہی بن کر لڑنے میں جو عظمت ہے اور راحت ہے کیا اسے اتنا جلد بھول گئے؟“

گوبندی کے زرد و خشک چہرے پر جلال کی ایسی چمک تھی گویا اس میں کوئی عجیب طاقت آگئی ہو، گویا اس کی ساری خاموش ریاضت میں گویائی آگئی ہو!

مہتا اس کی طرف عقیدت سے تاک رہے تھے، سر جھکائے اسے خدائی الہام سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور مالٹی دل میں نادم تھی۔ گوبندی کے خیالات کتنے بلند، اس کا دل کتنا کشادہ اور اس کی زندگی کتنی روشن ہے!

نہری ان عورتوں میں نہ تھی جو نیکی کر کے دریا میں ڈال دیتی ہیں۔ اس نے نیکی کی ہے تو اس کا خوب دھندورا پیٹے گی اور اس سے جتنی نیک نامی مل سکتی ہے اس سے کچھ زیادہ ہی پانے کے لیے ہاتھ پیر مارے گی۔ ایسے آدمی کو نیک نامی کے عوض بدنامی ہی ملتی ہے۔ نیکی نہ کرنا بدنامی کی بات نہیں۔ اپنی خواہش یا اپنے میں سکت نہیں ہے۔ اس کے لیے کوئی ہمیں برا نہیں کہہ سکتا۔ مگر جب ہم نیکی کر کے اس کا احسان جتاتے ہیں تو وہی شخص جس کے ساتھ ہم نے نیکی کی تھی، ہمارا دشمن ہو جاتا ہے اور ہمارے احسان کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ وہی نیکی اگر کرنے والے کے دل میں رہے تو نیکی ہے، اور باہر نکل آوے تو بدی ہے۔ نہری چاروں طرف کہتی پھرتی تھی۔ ”بے چارا ہوری بڑی پتا میں تھا، بیٹی کے بیاہ کے لیے کھیت رہن رکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ دسا دیکھی تو مجھے دیا آگئی۔ دھنیا سے تو جی جلتا تھا، وہ رائے تو مارے گھمنڈ کے دھرتی پر پاؤں نہیں رکھتی۔ بے چارا ہوری چتا سے گھلا جاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سنگت میں اس کی تھوڑی مدد کر دوں۔ آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ اور ہوری تو اب کوئی گیر نہیں ہے، مانو چاہے نہ مانو وہ تمہارے ناتے دار ہو چکے۔ روپے نکال کر دے دیے۔ نہیں لڑکی اب تک بیٹی ہی ہوتی۔“

دھنیا بھلا یہ ڈیج کب سننے لگی ”روپے کھیرات (خیرات) دیے تھے! بڑی کھیرات دینے والی! بیاج مہاجن بھی لے گا اور تم بھی لوگی، پھر احسان کا ہے کا؟ دوسروں کو دیتی تو بیاج کی جگہ اصل بھی چلا جاتا۔ ہم نے لیا ہے تو ہاتھ میں روپے آتے ہی ناک پر رکھ دیں گے۔ ہمیں تھے کہ تمہارے گھر کا بس اٹھا کے پی گئے۔ اور کبھی منہ پر نہیں لائے۔ کوئی یہاں دوارے پر کھڑا نہیں ہونے دیتا تھا۔ ہم نے تمہاری مر جاد بنادی۔ تمہارے منہ کی لالی رکھ لی۔“

رات کے دس بج گئے تھے۔ سادون کی اندھیری گھٹا چھائی تھی۔ سارے گاؤں میں اندھیرا تھا۔ ہوری نے کھانا کھا کر تمباکو پی اور سونے جا رہا تھا کہ بھولا آکر کھڑا ہو گیا۔

ہوری نے پوچھا ”کیسے ہو بھولا مہتو؟ جب اسی گاؤں میں رہتا ہے تو الگ کیوں چھوٹا سا گھر نہیں بنا لیتے؟ گاؤں میں لوگ کیسی کیسی برائی کرتے ہیں، کیا تمہیں اچھا لگتا ہے؟ برانا ماننا، تم سے ناتا ہو گیا ہے اسی لیے تمہاری بدنامی نہیں سنی جاتی، نہیں تو مجھے کیا کرنا تھا۔“
دھنیا اسی وقت لوٹے میں پانی لے لے کر ہوری کے سر ہانے رکھنے آئی تھی، سن کر بولی ”دوسرا مرد ہوتا تو ایسی عورت کا سر کاٹ لیتا۔“

ہوری نے ڈانٹا ”کیوں بے بات کی بات کہتی ہے؟ پانی رکھ دے اور جا سو۔“
دھنیا اسے ایک پانی کا چھینٹا مار کر بولی ”بری راہ چلیں تمہاری بہن، میں کیوں چلنے لگی؟ میں تو دنیا کی بات کہتی ہوں مجھے گالی دینے لگے۔ اب منہ میٹھا ہو گیا ہوگا عورت چاہے جس راہ جائے مرد نکمر نکمر دیکھتا رہے! ایسے مرد کو میں مرد نہیں کہتی۔“

ہوری دل میں کٹا جاتا تھا۔ بھولا اس سے اپنا دکھ درد کہنے آیا ہوگا، یہ الٹا اسی پر ٹوٹ پڑی۔ ذرا گرم ہو کر بولا ”تو سارے دن اپنے ہی من کی کیا کرتی ہے تو میں تیرا کیا بگاڑ لیتا ہوں؟ کچھ کہتا ہوں تو کانٹے دوڑتی ہے یہی سوچ!“

دھنیا نے چالوسی کرنا نہ سیکھا تھا بولی ”عورت گھر کا گھڑا ڈھلکا دے، گھر میں آگ لگا دے تو یہ سب مرد سہ لے گا، مگر اس کا بدراہ چلنا کوئی مرد نہ سہے گا۔“

”بھولا غمگین لہجے میں بولا ”تو بہت ٹھیک کہتی ہے۔ دھنیا مجھے بے سک اس کا سر کاٹ لینا چاہیے تھا۔ لیکن اب اتنا بل نہیں رہا۔ تو چل کر سجدہ دے، میں تو سب کچھ کر کے ہار گیا۔“

”جب عورت کو بس میں رکھنے کا بوتانا تھا تو سگائی کیوں کی تھی؟ اس ہنچھا لیدر کے لیے؟ کیا سوچتے تھے کہ وہ آکر تمہارے پاؤں دبائے گی، تمہیں چلم بھر بھر کر پلائے گی اور جب تم بیمار پڑو گے تو تمہاری سیوا اٹھل کرے گی؟ تو ایسا وہی عورت کر سکتی ہے جس نے تمہارے ساتھ جوانی کا سکھ اٹھایا ہو۔ میری سمجھ میں یہی نہیں آتا کہ تم اسے دیکھ کر لٹو کیسے ہو گئے۔ دیکھ تو لیا ہوتا کہ وہ کس سبھاؤ کی ہے، کس رنگ ڈھنگ کی ہے تم تو بھوکے سیار کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اب تو تمہارا دھرم یہی ہے کہ گنڈا سے اس کا سر کاٹ لو۔ پھانسی ہی تو پاؤ گے۔ اس چھالیدر سے اچھی!“

بھولا کے خون میں کچھ گرمی آگئی بولا ”تو تمہاری یہی صلاح ہے؟“

دھنیا بولی ”ہاں میری یہی صلاح ہے اب سو بچاس برس تو جیو گے نہیں، سمجھ لینا کہ اتنی ہی عمر تھی۔“

ہوری نے اب کے زور سے پھٹکارا ”چپ رہ بڑی آئی ہے وہاں سے ستوتی بن کے! جبر دتی چڑیا تک تو بجنرے میں رہتی نہیں پھر آدمی کیا رہے گا؟ تم اسے چھوڑ دو بھولا، اور سمجھ لو کہ مر گئی۔ جا کر اپنے ہال بچوں میں آرام سے رہو۔ دو روٹی کھاؤ اور رام کا نام لو۔ جوانی کے سکھ اب گئے۔ وہ عورت جنچل ہے، سو بدنامی اور جلن کے سوا تم اس سے کوئی سکھ نہ پاؤ گے۔“

بھولا نہری کو چھوڑ دے؟ ناممکن! نہری اس وقت بھی اس کی طرف غصہ بھری آنکھوں سے تیز تیز دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مگر نہیں، بھولا اب اسے چھوڑ ہی دے گا۔ جیسا کر رہی ہے اس کا پھل بھو گئے!

آنکھوں میں آنسو آگئے بولا ”ہوری بھیا، اس عورت کے پیچھے میری جتنی سانسٹ ہوری ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اسی کے پیچھے کامتا سے لڑائی ہوئی۔ بڑھاپے میں یہ داگ بھی لگنا تھا سو لگ گیا۔ مجھے روج طعنہ دیتی ہے کہ تمھاری تو لڑکی نکل گئی۔ میری لڑکی نکل گئی چاہے بھاگ گئی پر اپنے آدمی کے ساتھ پڑی تو ہے، اس کے سکھ دکھ کی ساتھن تو ہے ایسی تو میں نے عورت ہی نہیں دیکھی دوسروں کے ساتھ تو ہنستی ہے اور مجھے دیکھ کر ٹپٹا سامنہ پھلا لیتی ہے۔ میں گریب آدمی ٹھہرا، تمن چار آنے روج کی بجوری کرتا ہوں تب دودھ دے مانی مانس چھلی، ربڑی ملائی کہاں سے لاؤں؟“

بھولا یہاں سے عہد کر کے اپنے گھر گئے۔ اب بیٹوں کے ساتھ رہیں گے۔ بہت دھکے کھا چکے۔ مگر دوسرے دن صبح ہوری نے دیکھا تو بھولا دلاری سیٹھانی کی دوکان سے تمباکو لیے چلے جا رہے تھے۔ ہوری نے پکارنا ٹھیک نہ سمجھا۔ عشق میں انسان کو خود پر قابو نہیں رہتا۔ وہاں سے آکر دھنیا سے بولا ”بھولا تو ابھی وہیں ہیں۔ نہری نے جج جج ان پر کوئی جادو کر دیا ہے۔“

دھنیا نے ناک سکیڑ کر کہا ”جیسی بے حیا وہ ہے، ویسا ہی بے حیا یہ ہے۔ ایسے مرد کو تو چلو بھر پانی میں ڈوب کر مرنا چاہیے۔ اب وہ سیکھی (شٹی) نہ جانے کہاں گئی۔ جھڈیا یہاں آئی تو اس کے لیے ڈنڈا لیے پھر رہے تھے۔ مزجاد چلی جاتی تھی۔ اب مزجاد نہیں جاتی۔“

ہوری کو بھولا پر رحم آرہا تھا۔ بے چارہ اس ہرجائی کے پھیر میں پڑ کر اپنے کو برباد کیے

ڈالتا ہے۔ چھوڑ کر جائے بھی تو کیسے؟ عورت کو اس طرح چھوڑ کر جانا کیا سہل ہے؟ وہ جڑیل اسے وہاں بھی تو چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔ کہیں پنچایت کرائے گی کہیں روٹی کپڑے کا دعویٰ کرے گی۔ ابھی تو گاؤں کے ہی لوگ جانتے ہیں۔ کسی کو کچھ کہتے سوچ ہوتا ہے۔ کانا پھوسی کر کے ہی رہ جاتے ہیں۔ جب تو دنیا بھی بھولا ہی کو برا کہے گی۔ لوگ یہی تو کہیں گے کہ جب مرد نے چھوڑ دیا تو بے چاری عورت کیا کرے؟ مرد برا ہو تو عورت کی گردن کاٹ لے گا، عورت بری ہو تو مرد کے منہ میں کالکھ لگا دے گی۔“

اس کے دو مہینے بعد ایک روز گاؤں میں یہ خبر پھیلی کہ نہری نے مارے جوتوں کے بھولا کی چاند سنگھی کر دی۔ برسات ختم ہو گئی تھی اور رنج بونے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہوری کی اکچہ تو نیلام ہو گئی تھی۔ بیج کے لیے اسے روپے نہ ملے اور اکچہ نہ بوئی جاسکی۔ ادھر دہنا تیل بھی بیٹھان لینے کو تھا اور ایک نئے تیل کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا۔ پٹیا کا ایک تیل تالے میں گر کر مر گیا تھا، اس وقت سے اور بھی دقت پڑ گئی تھی۔ ایک دن پٹیا کے کھیت میں مل جاتا تو ایک دن ہوری کے کھیت میں۔ کھیتوں کی جتنائی جیسے ہونے چاہیے تھی، ویسی نہ ہو پائی تھی۔

ہوری بل لے کر کھیت میں گیا، مگر بھولا کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی یہ نہ سنا تھا کہ کسی عورت نے اپنے خاوند کو جوتوں سے مارا ہو۔ جوتوں سے کیا، تھنریا گھونے مارنے کا بھی کوئی واقعہ اسے یاد نہ آتا تھا۔ مگر آج نہری نے بھولا کو جوتوں سے پٹیا اور سب لوگوں نے تماشا دیکھا۔ اس عورت سے کیسے اس ابھائے کا گلا چھوٹے؟ اب تو بھولا کو کہیں ڈوب ہی مرنا چاہیے۔ جب جندگی میں بدنامی اور درگت کے سوا کچھ نہ ہو تو آدمی کا مرجانا ہی اچھا۔ کون بھولا کے نام کو رونے والا بیٹھا ہے۔ بیٹے چاہے کریا کرم کر دیں سو وہ بھی دنیا کی لاج کے کارن، آنسو کسی کی آنکھ میں نہ آئے گا۔ موہ کے بس میں پڑ کر آدمی اس طرح اپنے کوچہ پٹ کرتا ہے۔ جب کوئی رونے والا ہی نہیں تو پھر جینے کا کیسا موہ اور مرنے سے کیسا ڈر؟

ایک یہ نہری ہے اور ایک یہ چمارن سلیم! دیکھنے سننے میں اس سے لاکھ درجہ اچھی۔ چاہے تو درد کو کھلا کر کھائے اور رادھا بنی گھوے، لیکن مجوری کرتی ہے، بھوکوں مرتی ہے اور پتی کے نام پر بیٹھی ہے اور وہ بے درد بات بھی نہیں پوچھتا۔ کون جانے، دھنیا مر گئی ہوتی تو آج

ہوری کی بھی یہی دسا ہوتی۔ اس کی موت کے خیال ہی سے ہوری کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ دھنیا کی خیالی شکل آنکھوں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی، سیوا اور تیاگ کی دیوی، زبان کی تیز مگر موم جیسا دل رکھنے والی۔ پیسے پیسے کے لیے جان دینے والی مگر آبرو بچانے کے لیے اپنا سب کچھ دے دینے کو تیار! جوانی میں وہ کم سندر نہ تھی۔ نہری اس کے سامنے کیا ہے؟ چلتی تھی تو رانی سی لگتی تھی جو دیکھتا تھا دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ یہی پیشوری اور جھنگری تب جوان تھے۔ دونوں دھنیا کو دیکھ کر سینے پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ دروازے کے سو سو چکر لگاتے تھے۔ ہوری ان کی تاک میں رہتا تھا مگر چھیڑنے کا کوئی حیلہ نہ پاتا تھا۔ اس وقت گھر میں کھانے پینے کی بڑی تکلیف تھی۔ پالا پڑ گیا تھا اور کھیتوں میں بھوسا تک نہ ہوا تھا لوگ جھر بیریاں کھا کھا کر دن کا نٹتے تھے۔ ہوری کو قحط کے کپ میں کام کرنے جانا پڑتا تھا۔ چھ پیسے روزانہ ملتے تھے۔ دھنیا گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ مگر کبھی کسی نے اس کو کسی مرد کی طرف تاکتے نہیں دیکھا۔ پیشورں نے ایک بار کچھ چھیڑ چھاڑ کی تھی تو اس کا ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ لالہ آج تک نہیں بھولے۔

دفعاً اس نے ماتا دین کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ کسائی کہیں کا! کیسا تلک لگائے ہوئے ہے جیسے بھگوان کا پورا بھکت ہے۔ رنگا سیار! ایسے بائمن کو پالا گن کون کرے؟
ماتا دین نے قریب آکر کہا ”تمہارا داہنا تیل تو بوڑھا ہو گیا، ہوری! اب کی سینچائی میں نہ ٹھہرے گا۔ اس کو لائے کوئی پانچ سال ہوئے ہوں گے؟“

ہوری نے تیل کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا ”کیسا پانچواں؟ آٹھواں سال چل رہا ہے، بھائی! جی تو چاہتا ہے کہ اسے غسن دے دوں، پر کسان کو اور کسان کے تیل، ان کو جراج غسن دے تو ملے۔ اس کی گردن پر جوا رکھتے میرا من مسوتا ہے۔ بے چارا سوچتا ہوگا کہ اب بھی چھٹی نہیں، اب کیا میرا ہاڑ جوتے گا کیا؟ پر اپنا کوئی بس نہیں ہے۔ تم کیسے چلے؟ اب تو جی اچھا ہے؟“

ماتا دین ادھر ایک مہینے سے فصلی بخار میں پڑا ہوا تھا۔ ایک دن تو اس کی نبض چھوٹ گئی تھی اور چار پائی سے نیچے اتار دیا گیا تھا۔ اس وقت سے اس کے دل میں یہ تحریک ہوئی تھی کہ سلیم پر ظلم کرنے کی اسے یہ سزا ملی ہے جب اس نے سلیم کو گھر سے نکالا جب وہ حاملہ تھی۔ اسے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ پورے حمل کے ساتھ بھی وہ مجوری کرتی رہی۔ اگر دھنیا نے

اس پر ترس نہ کھایا ہوتا تو وہ مرگئی ہوتی۔ کیسی کیسی مصیبتیں جمیل کر جی رہی ہے۔ مزدوری بھی تو اس حالت میں نہیں کر سکتی۔ اب نادم اور نرم ہو کر وہ سلیا کو ہوری کی معرفت دو روپے دینے آیا ہے۔ اگر ہوری یہ روپے اسے دے دے تو اس کا بڑا احسان مانے گا۔

ہوری نے کہا ”تصمیم جا کر کیوں نہیں دے دیتے؟“

ماتا دین نے عاجزی سے کہا ”مجھے اس کے پاس نہ بھیجو ہوری مہتو! کون سا منہ لے کر جاؤں؟ ڈر بھی لگ رہا ہے کہ مجھے دیکھ کر کہیں ڈانٹنے نہ لگے۔ تم مجھ پر اتنی مہربانی کرو۔ ابھی مجھ سے چلا نہیں جاتا مگر اسی روپے کے لیے ایک جہان کے پاس کوس دوڑا گیا تھا۔ اپنی کرنی کا پھل بہت بھوک چکا۔ اس بائسن کا بوجھ اب نہیں اٹھائے اٹھتا چھپ کر چاہے کلکرم کر دو کوئی نہیں بولتا مگر کھل کر کچھ نہیں کر سکتے۔ نہیں تو کل میں کلنگ لگ جائے گا۔ تم اسے سمجھا دینا دادا! کہ میرا اپرا دھ چھما کر دے۔ یہ دھرم کا بندھن بہت کڑا ہوتا ہے۔ جس سماج میں پیدا ہوئے اور پلے اس کی مر جاد تو نبھا ہی ہی پڑتی ہے۔ اور کسی جات کا دھرم بگڑ جائے تو اس کا کچھ بہت نہیں بگڑتا مگر بائسن کا دھرم بگڑ جائے تو وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ اس کا دھرم ہی اس کے پرکھوں کی کماٹی ہے۔ اسی کی وہ روٹی کھاتا ہے۔ اس پر اچت کے پیچھے ہمارے تین سو روپے بگڑ گئے۔ تو جب بے دھرم ہی ہو کر رہنا ہے تو پھر جو کچھ کرنا ہے وہ کھل کر کر دوں گا۔ سماج کے ناتے اگر آدمی کا کچھ دھرم ہے تو آدمی کے ناتے بھی تو اس کا کچھ دھرم ہے۔ سماج کا دھرم رکھنے سے سماج آدر کرتا ہے۔ مگر آدمی کا دھرم رکھنے سے تو ایٹور پارسن ہوتا ہے۔“

شام کو جب ہوری نے سلیا کو ڈرتے ڈرتے روپے دیے تو وہ جیسے اپنی ریاضت کا ثمر پا گئی۔ دکھ کا بوجھ تو وہ اکیلی اٹھا سکتی تھی مگر سکھ کا بوجھ تو تنہا نہیں اٹھتا۔ کسے یہ خوشخبری سنائے؟ دھنیا سے وہ اپنے دل کی باتیں نہیں کہہ سکتی۔ گاؤں میں اور کوئی نہیں جس سے اس کا کافی ربط و ضبط ہو۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ سونا ہی اس کی سہیلی تھی۔ سلیا اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ رات بھر کیسے صبر کرے؟ دل میں ایک آندھی سی اٹھ رہی تھی اب وہ ٹیکس نہیں ہے۔ ماتا دین نے اس کی بانہہ پھر پکڑ لی ہے۔ زندگی کے راستے میں اس کے سامنے اب خوفناک منہ والی اندھیری خندک نہیں ہے، بلکہ لہلہاتا ہوا ہرا بھرا میدان ہے جس میں جھرنے اپنا سہاونا گیت گاتے ہیں اور ہرن کلیلیں کر رہے ہیں اس کی

روٹی ہوئی محبت آج سرمست ہو گئی ہے۔ ماتادین کو اسی نے دل میں کتنا پانی پی پی کر کو سا تھا اب وہ ان سے چھما مانگے گی۔ اس سے بچ بچ بڑی بھول ہوئی کہ اس نے سارے گاؤں کے آگے ان کی ہنک کی۔ وہ تو چھارن ہے، جات کی کم، اس کا کیا بگڑا۔ آج دس بیس لگا کر برادری کو روٹی دے دے تو پھر برادری میں ہو جائے گی ان بے چارے کا تو سدا کے لیے دھرم ہی ناس ہو گیا۔ وہ مر جاد اب انھیں پھر نہیں مل سکتی۔ وہ اس سے کتنی اندھی ہو گئی تھی کہ سب سے ان کے پریم کا ڈھنڈورا پیٹتی پھری ان کا تو دھرم بگڑ گیا تھا، انھیں تو رس تھی ہی، پر اس کے سر پر کیوں بھوت سوار ہو گیا؟ وہ اپنے ہی گھر چلی جاتی تو کون برائی ہو جاتی؟ گھر میں اسے کوئی باندھ تو نہ لیتا؟ ماتادین کی سب اسی لیے تو پوجا کرتے ہیں کہ وہ نیم دھرم سے رہتے ہیں، تو وہی دھرم جب نہ رہ گیا تو وہ کیوں نہ اس کے لبہ کے پیاسے ہو جاتے؟

ذرا دیر پہلے تک اس کی نگاہوں میں سارا قصور ماتا دین کا تھا، اور اب سارا قصور اپنا تھا۔ ہمدردی نے ہمدردی پیدا کر دی تھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ اب اسے دیکھ کر ندامت یا پشیمانی نہ ہوتی۔ وہ اب صرف اس کے رحم کا مستحق نہیں اب اس کی پوری مادرانہ محبت کا مستحق ہے۔

کاتک کی رو پہلی چاندنی ساری فضا پر کسی بیٹھے راگ کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ سلیم گھر سے نکلی۔ وہ سونا کے پاس جا کر اسے یہ مژدہ سنائے گی اب اس سے نہیں رہا جاتا۔ ابھی تو شام ہوئی ہے۔ ڈوگی اس پار تھی اور ملال کا کہیں پتہ نہیں۔ چاند گھل کر جیسے ندی میں بہا جا رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ کمزری سوچتی رہی، پھر ندی میں گھس پڑی۔ ندی میں کچھ ایسا زیادہ پانی تو کیا ہوگا۔ اُس خوشی کے سمندر کے آگے ندی کیا چیز تھی۔ پانی پہلے تو گھٹنے تک تھا پھر کمر تک آیا اور آخر گلے تک پہنچ گیا۔ سلیم ڈری کے کہیں ڈوب نہ جائے۔ کہیں کوئی گڑھا نہ پڑ جائے مگر اس نے جان پر کھیل کر پھر آگے بڑھایا اب وہ منجھدار میں ہے۔ موت اس کے سامنے ناچ رہی ہے۔ مگر وہ گھبرائی نہیں۔ اسے تیرنا آتا ہے۔ لڑکپن میں وہ کتنے ہی بار اسی ندی میں تیر چکی ہے، اور کھڑے کھڑے ندی کو پار بھی کر چکی ہے۔ پھر اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ مگر پانی کم ہونے لگا اب کوئی ڈر نہیں ہے اس نے جلد جلد ندی کو پار کیا اور کنارے پہنچ کر اپنے کپڑے نچڑے اور شٹنڈ سے کانپتی ہوئی آگے بڑھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا گیڈروں

کی آواز بھی سنائی نہ پڑتی تھی اور سونا سے ملنے کا خوش کن خیال اسے اڑائے لیے جاتا تھا۔ مگر اس گاؤں میں پہنچ کر اسے سونا کے گھر جاتے ہوئے تامل ہونے لگا۔ متھرا کیا کہے گا؟ اس کے گھر والے کیا کہیں گے؟ سونا بھی بگڑے گی کہ اتنی رات گئے تو کیوں آئی؟ دیہاتوں میں دن بھر کے ماندے کسان سرشام ہی سو جاتے ہیں۔ سارے گاؤں میں سونا پڑ گیا تھا۔ متھرا کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ سلیا اسے نہ کھلا سکی۔ لوگ اسے اس بھیس میں دیکھ کر کیا کہیں گے۔ وہیں دروازے پر الاؤ میں آگ چمک رہی تھی۔ سلیا اپنے کپڑے سکھانے لگی۔ یکا یک دروازہ کھلا اور متھرا نے باہر آکر پکارا ”ارے کون بیٹھا ہے الاؤ کے پاس؟“

سلیا نے جلد ہی آنچل کو سر پر کھینچ لیا اور قریب جا کر بولی ”میں ہوں سلیا۔“

”سلیا اتنی رات گئی کیسے آئی؟ وہاں تو سب اچھائی بھلائی ہے؟“

”ہاں سب اچھائی بھلائی ہے۔ جی گھبرا رہا تھا، سوچا کہ سب سے بھیٹ کر آؤں، دن کو تو چھٹی ہی نہیں۔“

”تو کیا اپنے آپ ندی پار کر کے آئی ہے؟“

”اور کیسے آئی؟ پانی؟ پانی کم تھا۔“

متھرا اسے اندر لے گیا۔ بروٹھے میں اندھیرا تھا۔ اس نے سلیا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ سلیا نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور غصے سے بولی ”دیکھو متھرا، مجھے چھیڑو گے تو میں سونا سے کہہ دوں گی۔ تم میرے چھوٹے بہنوئی ہو، یہ سمجھ لو، جان پڑتا ہے کہ سونا سے من نہیں بھرتا۔“

متھرا نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا ”تم بڑی بے درد ہو سلو! اس بکھٹ کون دیکھتا ہے؟“

”کیا میں سونا سے سندر ہوں؟ اپنا بھاگ نہیں سراہتے کہ ایسی اندر کی پری پائے۔ اب بھونرا بننے کو من چلا ہے اس سے کہہ دوں تو تمہارا منہ نہ دیکھے۔“

متھرا عیاش نہ تھا۔ سونا سے اسے محبت بھی تھی۔ اس وقت تاریکی اور تھلیہ اور سلیا کا شباب دیکھ کر اس کا جی ڈانوا ڈول ہوا تھا۔ یہ تنبیہ پا کر ہوش میں آگیا۔ سلیا کو چھوڑنا ہوا بولا ”تمہارے پیروں پڑتا ہوں، سلو، اس سے نہ کہنا۔ ابھی جو ڈنڈ چاہو لے لو۔“

سلو کو اس پر رحم آگیا۔ آہستہ سے اس کے منہ پر چپت جما کر بولی ”اس کا ڈنڈ یہی

ہے کہ بھر مجھ سے ایسی چیمیز نہ کرنا اور نہ کسی اور سے کرنا، نہیں تو سوتا تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

”میں کسم کھاتا ہوں سلو! کہ اب کبھی ایسا نہ ہوگا۔“

اس کی آواز میں التجا تھی۔ سلو کا جی بھی ڈانوا ڈول ہونے لگا۔ اس کا رحم پر کیف

ہو چلا۔

”اور جو کرو؟“

”تو تم جو چاہتا سو کرنا۔“

سلو کا منہ اس کے منہ کے پاس آگیا تھا۔ اور دونوں کے سانس جسم اور آواز میں لرزش ہو رہی تھی کہ دفعتاً سونا نے پکارا ”کس سے باتیں کرتے ہو وہاں؟“ سلو پیچھے ہٹ گئی۔ متھرا آگے بڑھ کر آنگن میں آگیا اور بولا ”سلو تمہارے گاؤں سے آئی ہے۔“

سلو بھی پیچھے پیچھے آکر آنگن میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ سونا وہاں کتنے آرام سے رہتی ہے۔ دالان میں چارپائی ہے جس پر سوزنی کا نرم بستر بچھا ہوا ہے، بالکل دیباہی ماتا دین کی چرپائی پر بچھا رہتا ہے۔ تکیہ بھی ہے اور لحاف بھی۔ چارپائی کے نیچے لوٹے میں پانی رکھا ہوا ہے۔ صحن میں چاندنی نے آئینہ سا بچھا رکھا ہے۔ ایک طرف تلسی کا چبوترا ہے اور دوسری طرف جوار کے ڈنٹھلوں کے کئی بوجھ دیوار کے سہارے رکھے ہوئے ہیں اور بیچ میں پوال کے گٹھے ہیں۔ پاس ہی اوکھلی ہے جس کے پاس کٹا ہوا دھان پڑا ہے۔ کھیریل پر کدو کی تیل چڑھی ہوئی ہے اور کئی کدو بھی دکھائی پڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف کے دالان میں ایک گائے بندھی ہوئی ہے۔ اس حصے میں متھرا اور سونا سوتے ہیں اور لوگ دوسرے حصے میں ہوں گے۔ سلو نے سمجھا کہ سونا کی زندگی کتنے آرام کی زندگی ہے۔ سونا اٹھ کر آنگن میں آگئی تھی۔ مگر سلو سے بے اختیار گلے نہیں ملی۔ سلو نے سوچا کہ شاید متھرا کے کھڑے ہونے سے سونا سوچ کر رہی ہے۔ یا کون جانے اب اسے گھمنڈ ہو گیا ہو۔ سلو چمارن سے گلے ملنے میں اپنی جگہ سمجھتی ہو۔ اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس ملاقات سے خوشی کے بجائے حسد پیدا ہوئی۔ سونا کا رنگ کیسا کھل گیا ہے اور بدن کیسا کنپن سا نکھر آیا ہے۔ گھٹن بھی سڈول ہو گئی ہے۔ چہرے پر اگرست پن کی رونق کے ساتھ شباب کی ہنسی ہوئی بہار ہے۔ سلو ایک لمحے کے لیے گویا مبہوت سی تکتی ہوئی کھڑی رہ گئی۔ یہ وہی سونا ہے جو سوکھا سا

بدن لیے ، بال بکھرائے ادھر ادھر دوڑا کرتی تھی ۔ مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا تھا۔ پٹے پرانے چیتھڑے لپیٹے پھرتی رہتی تھی ۔ آج اپنے گھر کی رانی ہے ۔ گلے میں ہنسی اور حسیل ۔ کانوں میں کرن پھول اور سونے کی بالیاں ، ہاتھوں میں چاندی کے کڑے اور کنکشن ، آنکھوں میں کاجل اور ماگمہ میں سندور ۔ سلیم کی زندگی کا بہشت یہی تھا اور سونا کو وہاں دیکھ کر وہ خوش نہ ہوئی ۔ اسے کتنا گھمنڈ ہو گیا ہے ۔ کہاں تو سلیم کے گلے میں بانٹیں ڈالے گھاس چھیلنے جاتی تھی اور آج سامنے دیکھتی بھی نہیں ۔ اس نے سوچا تھا کہ سونا اس کے گلے لگ کر ذرا روئے گی ۔ اسے آدے سے بٹھائے گی ، اسے کھلائے پلائے گی ، اس سے گاؤں گھر کی سیکڑوں باتیں پوچھے گی اور اس سے اپنی نئی زندگی کی تجربے ، سہاگ رات کی کیفیت بیان کرے گی ۔ اور یہاں سونا کے منہ میں دی جما ہوا ہے ۔ وہ تو یہاں آکر پچھتائی ۔

آخر سونا نے رکھائی سے پوچھا ” اتنی رات گئے کیسے چلیں ، سلو ؟ “
سلو نے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا ” تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا اتنے دن ہو گئے تو بھینٹ کرنے چلی آئی ۔ “

سونا کا لہجہ اور سخت ہوا ” مگر آدمی کسی کے گھر آتا ہے تو دن کو کہ اتنی رات بیٹے ؟ “
واقعی سونا کو اس کا آنا برا لگ رہا تھا ۔ یہ وقت اس کے عیش و آرام اور ہنسنے بولنے کا تھا ۔ سلو نے اسی میں دخل دے کر گویا اس کے آگے سے پردی ہوئی تھالی کھینچ لی تھی ۔
سلو مساکت سے بیٹھی ہوئی زمین کی طرف تاک رہی تھی ۔ دھرتی کیوں نہیں پھٹ جاتی کہ وہ اس میں سما جائے اتنی ہنک ! اس نے اپنی اتنی سی زندگی میں بہت ہنک سہی ، بڑی درگت دیکھی تھی مگر آج یہ کانٹا جس طرح اس کے دل میں چھب گیا تھا ویسی کبھی کوئی اور بات نہ جھبی تھی ۔ مگر گھر کے اندر مکلوں میں بند رکھا ہو تو کتنی ہی موسلا دھار بارش ہو ۔ پھر بھی کوئی نقصان نہیں ہوتا ، مگر جس وقت وہ دھوپ میں سوکھنے کے لیے باہر پھیلا یا گیا ہو تب تو پانی کا ایک چھینٹا بھی اسے بالکل خراب کر دے گا ۔ سلیم کے دل کے سارے نازک جذبات اس وقت منہ کھولے ہوئے تھے کہ آسمان سے امرت برسے گا مگر برسا کیا ؟ امرت کی جگہ ہس ، جو سلیم کے روئیں روئیں میں دوڑ گیا ۔ مارگریڈہ کی طرح لہریں آئیں ۔ گھر میں فاتح سے سو رہنا اور بات ہے مگر دعوت کے صف سے اٹھادیا جانا تو ذوب مرنے کا مقام ہے ۔
سلیم کو یہاں ایک لمحہ ٹھہرنا بھی برا معلوم ہوا ، جیسے کوئی اس کا گلا دباؤے ہوئے ہو ۔ وہ کچھ نہ

پوچھ سکی۔ سونا کے دل میں کیا ہے اس وقت وہ قیاس کر رہی تھی۔ بل میں بیٹھا ہوا سانپ کہیں باہر نہ نکل آئے، اس کے پہلے ہی وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ کیسے بھاگے؟ کیا بھانہ کرے؟ اس کی جان کیوں نہیں نکل جاتی؟۔

متھرا نے توشہ کھانے کی کٹنگی اٹھالی کہ سلیا کے ناشتہ کے لیے کچھ نکال لائے۔ مگر دم بجنود سا کھڑا ہوا تھا۔ ادھر سلیا کا سانس معلق تھا؛ جیسے سر پر ننگی تلوار لٹک رہی ہو۔

سونا کی نظر میں سب سے بڑا گناہ کسی مرد کا دوسری عورت کو اور عورت کا کسی دوسرے مرد کو تاکنا تھا۔ اس خطا کے لیے اس کے پاس کوئی معافی نہ تھی۔ ڈاکہ، قتل، جعل، کوئی جرم اتنا سنگین نہ تھا۔ ہنسی دل لگی کو وہ برا نہ سمجھتی تھی، اگر اعلانیہ ہو، مگر پوشیدہ مذاق کو بھی وہ کابل گرفت سمجھتی تھی بچپن ہی سے وہ بہت سی رواجی باتیں جاننے اور سمجھنے لگی تھی۔ ہوری کو جب کبھی باہر سے گھر آنے میں دیر ہو جاتی تھی اور دھنیا کو پتہ لگ جاتا تھا کہ وہ دلاری کی دکان پر گیا تھا۔ خواہ تمباکو، ہی لینے کیوں نہ گیا ہو، تو وہ کئی کئی روز تک ہوری سے بولتی نہ تھی۔ اور نہ گھر کا کوئی کام کاج کرتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اسی بات پر اپنے میکے بھاگ گئی تھی۔ وہی خیال سونا میں زیادہ ترقی کر گیا تھا۔ جب تک اس کا بیاہ نہ ہوا تھا وہ خیال اتنا زبردست نہ تھا۔ مگر بیاہ ہو جانے کے بعد تو اس میں کافی پختگی اور مضبوطی آگئی تھی۔ ایسے عورتوں مردوں کی اگر کھال بھی کھینچ لی جائے تو اسے رحم نہ آتا۔ عشق کے لیے ازدواجی دائرے کے باہر اس کی نظر میں کوئی جگہ نہ تھی۔ عورت مرد کا ایک دوسرے کے متعلق جو عین فرض ہے اسی کو وہ عشق سمجھتی تھی۔ پھر سلو سے تو اس کا بہنا پا تھا۔ وہ سلو کو پیار کرتی تھی اور اس پر بھروسہ رکھتی تھی، وہی سلو آج اس سے دسواں گھات کر رہی ہے۔ متھرا اور سلو میں ضرور پہلے سے تعلقات رہا ہوگا۔ متھرا اس سے ندی کے کنارے یا کھیتوں میں ملتا ہوگا اور آج وہ اتنی رات گئے ندی پار کر کے اسی لیے یہاں آئی ہے۔ اگر اس نے ان دونوں کی یہ باتیں نہ سن لی ہوتیں تو اسے خبر تک نہ ہوتی۔ متھرا عشقیہ ملاقات کے لیے یہی موقع سب سے زیادہ مناسب سمجھا ہوگا۔ مگر میں سنا تا جو ہے! اس کا دل سب کچھ جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ سارا بھید جان لینا چاہتی تھی تاکہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچ سکے۔ اور یہ متھرا یہاں کیوں کھڑا ہے؟ کیا وہ اسے کچھ بولنے بھی نہ دے گا؟

اس نے غصے میں کہا ”تم باہر کیوں نہیں جاتے، کیا یہیں پہرا دیتے رہو گے؟“

مٹھرا کچھ بولے بغیر باہر چلا گیا۔ اس کا خون خشک ہو رہا تھا کہ کہیں سلوسب کچھ کہہ نہ ڈالے۔ اور سلو کی جان سوکھ رہی تھی کہ اب وہ لگتی ہوئی تلوار سر پر گرا ہی چاہتی ہے۔ تب سونا نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا ”دیکھو سلو! سب ٹھیک ٹھیک بتا دو نہیں میں تمہارے سامنے یہیں اپنی گردن پر گنڈا سا مار لوں گی پھر تم میری سوت بن کر راج کرنا۔ دیکھو گنڈا سا سامنے پڑا ہے۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔“

اس نے لپک کر گنڈا سا اٹھا لیا اور اسے ہاتھ میں لے کر پھر بولی ”یہ مت سمجھنا کہ میں نری دھکی دے رہی ہوں۔ رس میں میں کیا کر بیٹھوں، نہیں کہہ سکتی۔ ٹھیک ٹھیک بتا دو۔“

سلو کا نپ اٹھی۔ اس کے منہ سے ایک ایک لفظ اس طرح نکل پڑا جیسا گراموفون میں بھری ہوئی آواز ہو۔ وہ ایک بات بھی چھپا نہ سکی۔ سونا کے چہرے سے خوفناک ارادہ ظاہر ہو رہا تھا گویا اس پر خون سوار ہو۔

سونا نے اس کی طرف بر جھی سی چہہ جانے دالی نگاہوں سے دیکھا اور کٹار سے چوٹ کرتی ہوئی سی بولی۔ ”ٹھیک ٹھیک کہتی ہو؟“

”بالکل ٹھیک۔ اپنے بچے کی سوگند۔“

”کچھ چھپایا تو نہیں؟“

”اگر میں نے رتی بھر بھی چھپایا ہو تو میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔“

”تو نے اس پاپی کو لات کیوں نہیں ماری؟ اسے دانت سے کاٹ کیوں نہیں لیا؟ اس کا لہو کیوں نہ پل لیا۔ تو چلائی کیوں نہیں؟“

سلو کیا جواب دے؟

سونا نے پاگل کی طرح انگاروں کی سی آنکھیں نکال کر کہا ”بولتی کیوں نہیں؟ کیوں تو نے اس کی ناک دانتوں سے نہیں کاٹ لی کیوں نہیں دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا یا؟ تب میں تیرے چہرے پر سر جھکاتی۔ اب تو تو میری آنکھوں میں ہر جائی ہے، پوری بیسوا! اگر یہی کرتا تھا تو ماتا دین کے نام کو کیوں کلنک لگا رہی ہے؟ کیوں کسی کو لے کر بیٹھ نہیں جاتی؟ کیوں اپنے گھر نہیں چلی گئی؟ یہی تو تیرے گھر والے چاہتے تھے۔ تو ایلے اور گھاس لے کر ہاٹ جاتی، وہاں سے پیسے لاتی اور تیرا ہاپ بیٹھا ہوا اس پیسے کی تاڑی پیتا۔ پھر

کیوں اس باصن کی جھک کرائی؟ کیوں اس کی آبرو میں بٹھ لگایا؟ کیوں ستونچی بنی بیٹھی ہے؟ جب اکیلے نہیں رہا جاتا تو کیوں کسی سے سگائی نہیں کر لیتی؟ کیوں ندی تالاب میں ڈوب نہیں مرتی؟ کیوں دوسروں کی جھنگی میں بس گھولتی ہے۔ آج میں تجھ سے کہے دیتی ہوں کہ اگر اس طرح کی بات پھر کبھی ہوئی اور مجھے پتہ چلا تو ہم تینوں میں سے ایک بھی جیتا نہ رہے گا۔ بس اب منہ میں کالکھ لگا کر چل دے۔ آج سے تیرے اور میرے بیچ میں کوئی ناتا نہیں ہے۔“

سلو چپکے سے اٹھی اور سنبھل کر کھڑی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ایک لمحہ تک ہمت کی فراہمی کی کوشش کرتی رہی مگر اپنی صفائی میں کچھ سوجھ نہ پڑا۔ آنکھوں میں اندھیرا تھا، سر میں چکر، گلا سوکھ رہا تھا اور سارا بدن بے حس تھا، جیسے مسامات سے جان نکل رہی ہو۔ ایک ایک قدم اس طرح رکھتی ہوئی جیسے سامنے کوئی گڈھا ہو، وہ باہر آئی اور ندی کی طرف چلی۔

دورازے پر مٹھرا کھڑا تھا ”اس بکھٹ کہاں جاتی ہو، سلو۔“

سلو نے کچھ جواب نہ دیا۔ مٹھرا نے بھی پھر کچھ نہ پوچھا۔

وہ ہی رو پہلی چاندنی اب بھی چھائی ہوئی تھی۔ ندی کی لہریں اب بھی چاندنی میں نہا رہی تھیں اور سلو دیوانگی کی سی حالت میں خواب کے سائے کی طرح ندی میں چلی جا رہی تھی۔

مزدوروں کی ہڑتال جاری ہے مگر اب اس سے مل کے مالکوں کا کوئی خاص نقصان نہیں ہے۔ نئے آدمی کم اجرت پر مل گئے ہیں اور جان توڑ کر کام کرتے ہیں، کیونکہ ان میں کبھی ایسے ہیں جو بیکاری کی تکلیفیں اٹھا چکے ہیں اور اب اپنی سکت بھر کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے، جس سے رزق میں خلل پڑے۔ چاہے جتنا کام لو اور چاہے جتنی کم چھٹیاں دو، انھیں کوئی شکایت نہیں۔ سر جھکائے ہوئے، بیلوں کی طرح کام میں لگے رہتے ہیں۔ گھڑکیوں، گالیوں یہاں تک کہ ڈنڈوں کی مار سے بھی انھیں شکایت نہیں ہوتی۔ اور اب پرانے مزدوروں کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے کہ وہ اس گھٹی ہوئی مزدوری پر کام کرنے آئیں اور کھنا صاحب کی خوشامد کریں۔ پنڈت اونکار ناتھ پر تو انھیں ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔ انھیں وہ اب تنہا پائیں تو شاید بری طرح خبر لیں۔ مگر پنڈت جی بہت بچے ہوئے رہتے ہیں۔ چراغ جلنے کے بعد اپنے دفتر سے باہر نہیں نکلتے۔ اور افسروں کی خوشامد میں بھی لگے ہی رہتے ہیں۔ مرزا خورشید کی دھاک اب بھی جیوں کی تیوں ہے۔ لیکن مرزا ان غریبوں کی تکلیف اور اس کے دور کرنے کی کوئی سبیل نہ دیکھ کر دل سے چاہتے ہیں کہ سب کے سب بحال کر دیے جائیں، مگر اس کے ساتھ ہی نئے آدمیوں کی تکلیف کا خیال کر کے پوچھنے والوں سے یہی کہہ دیا کرتے ہیں کہ جیسی مرضی ہو ویسا کریں۔

مسٹر کھنانے پرانے آدمیوں کو پھر نوکری کرنے کا خواہش مند دیکھا تو اور بھی اکڑ گئے، حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس اجرت پر پرانے آدمی نئے لوگوں سے کہیں بہتر ہیں۔ پرانے آدمیوں میں زیادہ تر تو بچپن ہی سے مل میں کام کرنے کے عادی تھے اور خوب مشاق تھے۔ نئے آدمیوں میں زیادہ تر دیہاتوں کے دکھی کسان جنھیں کھلی ہوا اور میدان میں پرانے زمانے کے چوہی اوزاروں سے کام کرنے کی عادت تھی۔ مل کے اندر ان کا دم گھٹتا تھا اور مشینری کے تیز چلنے والے پرزوں سے انھیں ڈر لگتا تھا۔ آخر جب پرانے آدمی خوب پست ہو گئے تب کھنا انھیں بحال کرنے پر راضی ہوئے مگر نئے آدمی اس سے کم اجرت پر کام کرنے

کو تیار تھے اور اب ڈائریکٹروں کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ پرانے لوگوں کو بحال کریں یا نئے آدمیوں کو ہی رہنے دیں۔ ڈائریکٹروں میں نصف تو نئے آدمیوں کو اجرت گھٹا کر رکھنے کے حق میں تھے اور بقیہ نصف کی یہ رائے تھی کہ پرانے ہی آدمیوں کو موجودہ اجرت پر رکھ لیا جائے۔ کچھ روپے زیادہ خرچ ہوں گے ضرور، مگر کام اب سے کہیں زیادہ ہوگا۔ کھنا مل کے روح رواں تھے اور ڈائریکٹر تو ان کے ہاتھ کی کٹھ پتلیاں تھے۔ فیصلہ کھنا ہی کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اپنے دوستوں ہی سے نہیں بلکہ دشمنوں سے بھی اس بارے میں رائے لے رہے تھے۔ سب سے پہلے تو انھوں نے گوبندی کی رائے لی۔ جب سے مالٹی کی طرف سے انھیں مایوسی ہو گئی تھی اور گوبندی کو معلوم ہو گیا تھا کہ مہتا جیسا عالم، تجربہ کار اور دانا شخص میری کتنی عزت کرتا ہے اور مجھ سے کسی قسم کی ریاضت کی امید رکھتا ہے، تب سے زن و شوہر میں پھر محبت پیدا ہو گئی تھی۔ محبت نہ سہی تو باہمی ربط و ضبط تو تھا ہی۔ آپس میں وہ جلن اور بے چینی نہ تھی درمیانی دیوار ٹوٹ گئی تھی۔

مالٹی کے رنگ ڈھنگ کی بھی کایا پلٹ ہو رہی تھی۔ مہتا کی زندگی اب تک مطالعہ اور غور و خوض میں گزری تھی۔ سب کچھ پڑھ چکے، اور دینداری و کفر کو خوب پرکھ لینے کے بعد وہ اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ تعلق و بے تعلق دونوں کے بیچ کا جو خدمتی راستہ ہے وہی زندگی کو بامعنی، اور ہستی کو بلند و پاکیزہ بنا سکتا ہے۔ کسی ہمہ داں خدا پر ان کا اعتقاد نہ تھا۔ اگرچہ وہ اپنی دہریت کو ظاہر نہ کرتے تھے، اس لیے کے اس کے متعلق قطعی طور سے کوئی رائے قائم کرنا وہ اپنے لیے ناممکن سمجھتے تھے، مگر یہ خیال ان کے دل میں مضبوطی سے قائم ہو گیا تھا کہ جانداروں کی پیدائش و موت اور ان کے تکلیف و آرام یا عذاب و ثواب کے متعلق کوئی خدائی قانون نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان نے اپنی خودی میں اپنے کو اتنا عظیم بنا لیا ہے کہ اسے ہر ایک کام کی تحریک خدا ہی سے ملا کرتی ہے۔ اسی طرح وہ مڈیاں بھی خدا کو ذمہ دار ٹھہراتی ہوں گی جو اپنی راہ میں سمندر کو حائل ہو جانے پر اربوں کی تعداد میں مرجاتی ہیں۔ اگر خدائی قوانین اتنے ناقابل فہم ہیں کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتے تو انھیں ماننے ہی سے انسان کو ڈھارس مل سکتی ہے؟ خدائی تصور کا ایک ہی مقصد ان کی سمجھ میں آتا تھا اور وہ تھا انسانی زندگی کا ایک ہونا۔ وحدت یا کثرت یا عدم تشدد کو روحانی نہیں، بلکہ مادی نقطہ خیال سے دیکھتے تھے۔ اگرچہ ان ہاتوں کا کسی تاریخی زمانے میں بھی بول بالا نہیں رہا پھر بھی

بنی نوع انسان کے جبلی ارتقاء میں ان کا درجہ بڑی اہمیت کا ہے۔ انسانوں کی یکسانیت میں مہتا کا بہت بڑا اعتقاد تھا مگر اس اعتقاد کے لیے انھیں خدائی وجود کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہ معلوم ہوتی تھی۔ ان کی انسانی محبت کا انحصار اس پر نہ تھا کہ جملہ جانداروں میں ایک روح ہے۔ توحید و شرک کا مسئلہ ان کی نظر میں رواجی اہمیت کے سوا کوئی اور اہمیت نہ رکھتا تھا اور وہ استعمالی اہمیت ان کے نزدیک انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے، ان کی باہمی تفریق کے مٹانے اور ان میں اخوت کا جذبہ پیدا کرنے ہی میں مضمر تھی۔ یہ یکسانیت ان کے دل میں کچھ ایسی قائم ہو گئی تھی کہ اس کے لیے کسی روحانی بنیاد کا پیدا کرنا ان کی نظر میں بالکل فضول تھا۔ پھر ایک بار اس اصلیت کو جان کر وہ خاموش نہ بیٹھ سکتے تھے۔ بے لوثی کے ساتھ بلا کسی ذاتی غرض کے زیادہ سے زیادہ کام کرنا ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ جس کے بغیر ان کے دل کو سکون نہ مل سکتا تھا۔ شہرت، منفعت یا فرض کی ادائیگی کے خیالات ان کے دل میں آتے ہی نہ تھے۔ ان کی بے مائیگی ہی انھیں ان سے بچانے کے لیے کافی تھی۔ خدمت ہی اب ان کی خاص غرض ہوتی جاتی تھی اور ان کی اس فراخ دلی کا اثر درپردہ مالتی پر بھی پڑتا جاتا تھا۔ اب تک جتنے مرد اسے ملے سب نے اس کی عیاشانہ رغبت ہی کو اکسایا۔ اس کے ترک و ایثار کی طاقت روز بروز کھٹتی ہی تھی مگر مہتا کی محبت سے اس پر تازگی آنے لگی۔ سبھی حقیقی انسانوں میں یہ جذبہ چھپا رہتا ہے اور روشنی پا کر چمک اٹھتا ہے۔ انسان اگر دولت یا شہرت کے پیچھے پڑا ہے تو سمجھ لو کہ ابھی تک وہ کسی اہل دل کے لگاؤ میں نہیں آیا۔ مالتی اب اکثر غریبوں کے گھر بلائیں لیے مریضوں کو دیکھنے چلی جاتی تھی اور مریضوں کے ساتھ اس کے برتاؤ میں بڑی نرمی آگئی تھی۔ ہاں ابھی تک وہ بناؤ سنگار سے اپنا دل نہ ہٹا سکی تھی۔ رنگ اور پاؤں کا چھوڑنا اسے اپنی باطنی تہذیبوں سے بھی کہیں زیادہ مشکل معلوم ہوتا تھا۔

ادھر کبھی کبھی وہ دونوں دیہاتوں کی طرف چلے جاتے تھے اور کسانوں کے ساتھ دو چار گھنٹے رہ کر اور کبھی کبھی ان کے جموئیزوں میں رات کاٹ کر اور ان ہی کا سا کھانا کھا کر اپنے کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔ ایک روز وہ سری پتھج گئے اور گھومتے ہوئے بیلاری بھی جا پہنچے۔ ہوری دروازے پر بیٹھا چلم پی رہا تھا کہ مالتی اور مہتا آکر کھڑے ہو گئے۔ مہتا نے ہوری کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور بولا ”یہی تمہارا گاؤں ہے؟ یاد ہے جب ہم لوگ رائے صاحب کے یہاں آئے تھے اور تم دھنس یکہ میں مالی بنے تھے؟“

ہوری کی یاد تازہ ہو گئی۔ پہچان گیا اور پیشوری کے گھر کی طرف کرسیاں لانے چلا۔
 مہتا نے کہا ”کرسیوں کا کوئی کام نہیں۔ ہم لوگ اسی چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔
 یہاں کرسی پر بیٹھنے نہیں، تم سے کچھ سیکھنے آئے ہیں۔“
 دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہوری تعمیر کھڑا رہا۔ ان لوگوں کی کیا خاطر کرے؟ بڑے آدمی
 ہیں۔ ان کی خاطر کرنے لائق ان کے پاس ہے کیا؟ آخر اس نے پوچھا ”پانی لاؤں؟“
 مہتا نے کہا ”ہاں پیاس تو لگی ہے۔“
 ”کچھ میٹھاکی بھی لیتا آؤں؟“
 ”لاؤ۔ اگر گھر میں ہو۔“

ہوری گھر میں منٹائی اور پانی لانے گیا تب تک گاؤں کے لڑکوں نے آکر ان دونوں کو
 گھیر لیا اور دیکھنے لگے۔ گویا عجائب خانے سے دو نئے نمونے آگئے ہوں۔
 سلیا بچے کو لیے کسی کام سے چلی جا رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر تعجب سے ٹھہر گئی۔
 مالتی نے آکر اس کے بچے کو گود میں لے لیا اور پیار کرتی ہوئی بولی ”کتنے دنوں
 کا ہے؟“

سلیا کو ٹھیک معلوم نہ تھا۔ ایک دوسری عورت نے بتلایا ”کوئی سال بھر کا ہوگا؟“
 سلو نے تائید کی۔

مالتی نے مذاق کیا ”پیارا بچا ہے اسے ہمیں دے دو۔“
 سلیا نے گھمنڈ سے پھول کر کہا ”آپ ہی کا تو ہے۔“
 ”تو میں اسے لے جاؤں؟“

”لے جائیے آپ کے ساتھ رہ کر آدمی ہو جائے گا۔“

گاؤں کی دوسری عورتیں آگئیں اور مالتی کو ہوری کے مکان میں لے گئیں کیونکہ یہاں
 مردوں کے سامنے مالتی سے گفتگو کرنے کا موقع انھیں نہ ملتا تھا۔ مالتی نے دیکھا کہ چارپائی
 بچھی ہے اور اس پر ایک دری پڑی ہوئی ہے جو پیشوری کے یہاں سے مانگ کر لائی گئی تھی۔
 مالتی جا کر بیٹھی۔ بچوں کی حفاظت اور پرورش کی باتیں چلی۔ عورتیں جی لگا کر سنتی رہیں۔
 دھنیا نے کہا ”یہاں یہ سب کام کیسے ہوگا، سرکار؟ کھانے تک کا ٹھکانا تو ہے نہیں۔“
 مالتی نے سمجھایا ”صفائی میں خرچ نہیں، صرف تھوڑی سی محنت اور ہوشیاری سے کام چل

سکتا ہے۔“

دلاری نے پوچھا ”یہ سب باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں سرکار؟ آپ کا تو ابھی بیاہ نہیں ہوا؟“

مالتی نے مسکرا کر پوچھا ”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میرا بیاہ نہیں ہوا؟“
سبھی عورتیں منہ پھیر کر مسکرائیں۔ پنپا بولی ”بھلا یہ بھی چھپا رہتا ہے، سرکار! منہ دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے۔“

مالتی نے جھپٹتے ہوئے کہا ”اسی لیے بیاہ نہیں کیا کہ آپ لوگوں کی خدمت کیسے کرتی۔“
سب نے ایک زبان سے کہا ”دھن ہو سرکار، دھن ہو!“

سلیم مالتی کے پیر دبانے لگی ”سرکار کتنی دور سے آئی ہیں۔ تھک گئی ہوں گی۔“
مالتی نے پیر کھینچ کر کہا ”نہیں نہیں، میں تھکی نہیں ہوں۔ میں تو موٹر پر آئی ہوں۔
میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگ اپنے بچے لائیں تو میں انہیں دیکھ کر بتاؤں کہ آپ لوگ اسے کس طرح تندرست رکھ سکتی ہیں۔“

ذرا دیر میں بیس بچیں بچے آگئے۔ مالتی انہیں دیکھنے لگی۔ کئی بچوں کی آنکھیں ابھی تھیں، ان کی آنکھوں میں دوا ڈالی۔ زیادہ تر بچے کمزور تھے جس کا سبب تھا والدین کو اچھا کھانا نہ ملنا۔ مالتی کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ دزدہ بہت کم گھروں میں ہوتا تھا اور کبھی کے تو برسوں درشن نہ ہوتے تھے۔

مالتی نے یہاں بھی انہیں کھانے کی اہمیت بتائی جیسا وہ سبھی گاؤں میں بتایا کرتی تھی۔
اس کا جی اس لیے کڑھتا تھا کہ یہ لوگ اچھا کھانا کیوں نہیں کھاتے اسے دیہاتیوں پر غصہ آجاتا تھا۔ کیا تمہارا جنم اسی لیے ہوا ہے کہ تم مرمر کر کماؤ اور جو کچھ پیدا ہو اسے کھانہ سکو؟
جہاں دو چار بیلوں کے لیے چارا ہے وہاں دو ایک گائے بھینسوں کے لیے چارا نہیں ہے۔
کیوں یہ لوگ غذا کو زندگی کی خاص چیز نہ سمجھ کر اسے صرف جان بچانے کی چیز سمجھتے ہیں۔
کیوں سرکار سے نہیں کہتے کہ برائے نام سو دپر رو پیہ دے کر انہیں سو دخور مہاجنوں کے بچے سے بچائے۔ اس نے جس کسی سے پوچھا تو یہی معلوم ہوا کہ اس کی کمائی کا بڑا حصہ مہاجنوں کا قرض ادا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ بوزارے کا مرض بھی بڑھتا جاتا تھا۔ آپس میں اتنی مغفرت تھی کہ شاید ہی کوئی دو بھائی ایک ساتھ رہتے ہوں۔ ان کی اس درگت کا سبب

بہت کچھ ان کی تنگ خیالی اور خود غرضی تھی۔ مالتی بھی باتیں عورتوں سے کرتی رہی۔ ان کی عقیدت دیکھ کر اس کے دل میں خدمت کی تحریک اور بھی زور پکڑ رہی تھی۔ اس قربانی کی زندگی کے سامنے وہ عیش و آرام کی زندگی کتنی حقیر اور مصنوعی تھی۔ آج اس کے وہ ریشمی کپڑے جن پر زری کا کام تھا، اور وہ خوشبو سے مہکتا ہوا بدن اور پاؤں لگا ہوا چہرہ اسے شرمندہ کرنے لگا۔ اس کی کلائی پر بندھی ہوئی سونے کی گھڑی جیسے ٹنگی لگائے اسے گھور رہی تھی۔ اس کے گلے میں چمکتا ہوا جواؤ نکلیں جیسے اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ ان تیاگ اور بھگتی کی دیویوں کے سامنے وہ اپنی ہی نظر میں حقیر ہو رہی تھی۔ وہ ان دیہاتیوں سے بہت سی باتیں زیادہ جانتی تھی، وقتی رفتار سے زیادہ واقف تھی لیکن جن حالات میں یہ غریب عورتیں اپنی زندگی کو کارآمد بنا رہی ہیں ان میں کیا وہ ایک دن بھی رہ سکتی ہے؟ دل میں غرور کا نام بھی نہیں، دن بھر کام کرتی ہیں، فائدہ کرتی ہیں، روتی ہیں، پھر بھی اتنی ہنس کھ اور زندہ دل ہیں! بیگانے ان کے لیے اس قدر یگانے ہو گئے ہیں کہ ان کا اپنا وجود ہی نہیں رہا۔ ان کی یگانگت اپنے بچوں میں، اپنے شوہر میں اور اپنے رشتے داروں میں ہے۔ اسی خیال کی حفاظت کرتے ہوئے اور اسی کے دائرے کو بڑھاتے ہوئے مستقبل کا نسائی معیار بنے گا۔

بیدار عورتوں میں اس کے بجائے خود پروری کا جو خیال پیدا ہو گیا ہے، یعنی سب کچھ اپنے لیے، اپنے ہی عیش و آرام کے لیے، اس سے تو یہ خواب کی حالت ہی بھلی! مانا کے مرد بے رحم ہے مگر ہے تو ان ہی ماؤں کا جلیا ہوا۔ کیوں ماں نے لڑکے کو ایسی تعلیم نہیں دی کہ وہ ماں کی اور اس کے ناطے کل انسانی طبقہ کی پرستش کرتا؟ اسی لیے کہ ماں کو ویسی تعلیم دینا نہیں آتی؛ اسی لیے کہ اس نے خود کو اتنا مٹا دیا ہے کہ اس کی بہیت ہی تبدیل ہو گئی ہے، اس کی شخصیت ہی ختم ہو گئی ہے!

نہیں، خود کو مٹانے سے کام نہ چلے گا۔ عورت کو سماج کی فلاح کے لیے اپنے حقوق کی حفاظت کرنی ہوگی، اسی طرح جیسے ان کسانوں کو اپنی حفاظت کے لیے اپنی اس فرشتہ خصلتی کو کسی قدر ترک کرنا پڑے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ مالتی کو عورتیں اب تک گھیرے ہوئے تھیں۔ اس کی باتوں سے جیسے ان کا جی ہی نہ بھرتا تھا۔ کئی عورتوں نے ان سے رات میں یہیں رہنے کا اصرار کیا۔ مالتی کو بھی ان کا سادہ پریم ایسا پیارا لگا کہ اس نے ان کی دعوت منظور کر لی۔ رات کو عورتیں اسے

اپنا گانا سنائیں گی۔ مالتی نے گھر گھر میں جا کر ہر جگہ کی حالت سے واقفیت حاصل کرنے میں اپنا وقت صرف کیا۔ اس کی پر خلوص ہوا خواہی اور ہمدردی دیہاتی عورتوں کے لیے دیوی کے بردان سے کم نہ تھی۔

ادھر مہتا صاحب چارپائی پر بیٹھے ہوئے کسانوں کی کشتی دیکھ رہے تھے۔ پچھتا رہے تھے کہ مرزا صاحب کو کیوں نہ ساتھ لے لیا، ورنہ ان کی بھی ایک کشتی ہو جاتی۔ انھیں تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے مضبوط اور معصوم لڑکوں کے ساتھ تعلیم یافتہ لوگ کیسے بے رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ نادانی کی طرح دانتائی بھی سادا، صاف اور سنہرے سپنوں والی ہوتی ہے۔ انسانیت پر اس کا اتنا زبردست اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ مخالفانہ سلوک کو انسانیت کے خلاف سمجھنے لگتی ہے۔ وہ بھول جاتی ہے کہ بھیڑیوں نے بھیڑوں کی معصومیت اور بے چارگی کا جواب ہمیشہ پنہوں اور دانتوں سے دیا ہے۔ وہ اپنی ایک معیاری دنیا بنا کر اسے معیاری شخصیتوں سے آباد کرتی ہے اور اسی میں گمن رہتی ہے۔ حقیقت کتنی ناقابل فہم، مشکل اور غیر قدرتی ہے، یہ خیال کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ مہتا صاحب اس وقت ان گنواروں کے پتچ میں بیٹھے ہوئے اسی مسئلے کو حل کر رہے تھے کہ ان کی حالت اتنی قابل رحم کیوں ہے۔ وہ اس سچائی سے سامنا کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے کہ ان کی فرشتہ خصلتی ہی ان کی تباہ حالی کا سبب ہے۔ کاش یہ لوگ زیادہ تر انسان اور کم تر فرشتہ ہوتے تو اس طرح نہ ٹھکرائے جاتے۔ ملک میں کچھ بھی ہو، انقلاب ہی کیوں نہ آجائے مگر ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی جماعت ان کے سامنے طاقتور بن کر آئے اس کے سامنے یہ سر جھکانے کو تیار ہیں۔ ان کی معصومیت بے حسی کی حد تک پہنچ گئی ہے، جسے کوئی سخت صدمہ ہی ذی حس اور متحرک بنا سکتا ہے۔ ان کی آتما گویا ہر طرف سے مایوس ہو کر اب اپنے اندر ہی پیر توڑ کر بیٹھ گئی ہے، گویا ان میں زندگی کا احساس ہی نہیں ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ جو لوگ اب تک کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہ بھی دوڑے چلے آتے تھے۔ اسی وقت مہتا نے مالتی کو گاؤں کی کئی عورتوں کے ساتھ ایسی محویت سے ایک بچے کو گود میں لیے دیکھا وہ بھی ان ہی میں سے ایک ہو۔ مہتا کا دل خوشی سے بھر گیا۔ مالتی نے ایک طرح سے خود کو مہتا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کے متعلق مہتا کو اب کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ مگر ابھی تک ان کے دل میں مالتی کے لیے وہ پاک اور بلند خواہش پیدا نہ ہوئی تھی جس

کے بغیر شادی کی تجویز کرنا ان کے لیے مشکلہ انگیز تھا۔ مالتی ناخواندہ مہمان کی طرح ان کے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی تھی اور مہتا نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس میں محبت کا جذبہ نہ تھا، صرف مردیت کا جذبہ تھا۔ اگر مالتی اسے اس قابل سمجھتی ہے کہ ان پر عنایت نظر کرے تو مہتا ان کی اس عنایت کو نا منظور نہ کر سکتے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مالتی کو گوبندی کے راستے سے ہٹا دینا چاہتے تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ جب تک مالتی اپنا پیر آگے نہ جمائے گی پچھلا پیر نہ اٹھائے گی۔ وہ جانتے تھے کہ مالتی کے ساتھ فریب کر کے وہ کمینگی ہی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے لیے ان کا ضمیر انھیں برابر ملامت کرتا رہتا تھا، مگر جیوں جیوں وہ مالتی کو قریب سے دیکھتے تھے ان کے دل میں کشش بڑھتی جاتی تھی۔ حسن کی دلکشی تو ان پر کوئی اثر نہ ڈال سکتی تھی، یہ اوصاف کی دلکشی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جسے سچی محبت کہہ سکتے ہیں وہ ایک رشتے میں منسلک ہو جانے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے قل جو محبت ہوتی ہے۔ وہ تو محض فریٹنگی ہے، جسے ذرا بھی قیام و قرار نہیں۔ مگر اس سے پہلے یہ تصفیہ تو کر لینا ضروری تھا کہ جو پتھر باہمی قربت کی خردا پر چڑھے گا وہ خردا کے لیے موزوں بھی ہے یا نہیں۔ سبھی پتھر تو خردا پر چڑھ کر خوبصورت موتیوں کی شکل نہیں اختیار کر لیتے۔ اتنے دنوں میں مالتی نے ان کے دل کے مختلف حصوں پر اپنی شعائیں ڈالی تھیں جو ابھی تک مرکوز ہو کر شعلے کی صورت میں نہ پھوٹ پڑی تھیں جس سے ان کا سارا دل روشن ہو جاتا۔ آج مالتی نے اپنی دیہاتی بہنوں سے مل کر اور ساری تفریق کو مٹا کر گویا ان شعاعوں کو مرکوز کر دیا اور آج پہلی بار مہتا کو مالتی کے متعلق یگانگت کا احساس ہوا۔ جیوں ہی مالتی گاؤں کا گشت لگا کر لوٹی، انھوں نے اسے ساتھ لے کر ندی کی طرف رخ کیا۔ رات یہیں گزارنے کا ارادہ ہو گیا۔ مالتی کا دل آج نہ جانے کیوں دھڑکنے لگا۔ مہتا کے چہرے پر آج اسے ایک عجیب روشنی اور خواہش جھلکتی ہوئی نظر آئی۔

ندی کے کنارے چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا اور ندی جواہرات سے جڑے ہوئے گہنے پہنے ہوئے میٹھے سروں میں گا گا کر چاند اور تاروں، اور غنودگی کی حالت میں سر جھکائے ہوئے پیڑوں کو اپنا رقص دکھا رہی تھی۔ مہتا قدرت کی متوالی بچھن پر جیسے مست ہو گئے، گویا ان کا بچھن اپنے سارے کھیلوں کے ساتھ لوٹ آیا ہو۔ ریت پر کودتے اور دوڑتے ہوئے، ندی میں جا کر گھٹنے تک پانی میں کھڑے ہو گئے۔

”مالتی نے کہا ”پانی میں نہ کھڑے ہو، کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔“

مہتا نے پانی اچھال کر کہا ”میرا تو جی چاہتا ہے کہ تیر کر ندی کے اس پار چلا جاؤں۔“

”نہیں نہیں، پانی سے نکل آؤ۔ میں نہ جانے دوں گی۔“

”تم میرے ساتھ نہ چلو گی؟ اس سونی بستی میں جہاں سپنوں کا راج ہے۔“

”مجھے تو تیرنا نہیں آتا۔“

”اچھا آؤ ایک ناؤ بنائیں اور اس پر بیٹھ کر چلیں۔“

وہ باہر نکل آئے۔ آس پاس بڑی دور تک جھاؤ کا جنگل کھڑا تھا۔ مہتا نے جب سے چاقو نکالا اور بہت سی ٹہنیاں کاٹ کر جمع کیں۔ کنارے پر سرپت اگا ہوا تھا۔ وہاں جا کر ایک گٹھا کاٹ لائے اور وہیں بالو کے فرش پر بیٹھ کر سی باٹنے لگے۔ ایسے خوش گویا بہشت جانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ کئی بار انگلیاں چرگئیں، خون نکلا۔ مالتی ناراض ہو رہی تھی اور بار بار گاؤں واپس جانے کے لیے اصرار کر رہی تھی مگر انھیں کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہی بچوں کی سی خوشی تھی، وہی الزھ پن تھا، وہی ہٹ تھی۔ فلسفہ اور سائنس سبھی اس بہاؤ میں بہہ گئے تھے۔

رتی تیار ہو گئی۔ جھاؤ کا بڑا تختہ سا بن گیا۔ ٹہنیاں دونوں سروں سے رسی سے جوڑ دی گئی تھیں۔ اس کے سوراخوں میں جھاؤ کی پیتاں بھر دی گئیں تاکہ پانی اوپر نہ آئے۔ ناؤ تیار ہو گئی۔ رات اور بھی خواب آلود ہو گئی تھی۔

مہتا نے ناؤ پانی میں ڈال کر مالتی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ”آؤ بیٹھو۔“

مالتی نے ڈرتے ہوئے کہا ”دو آدمیوں کا بوجھ سنبھال سکے گی؟“

مہتا نے فلسفیانہ تبسم سے کہا ”جس ناؤ پر بیٹھے ہوئے ہم لوگ زندگی کا سفر پورا کر رہے ہیں وہ تو اس سے کہیں زیادہ کمزور ہے مالتی! کیا ڈر رہی ہو؟“

”ڈر کس بات کا جب تم ساتھ ہو؟“

”سچ کہتی ہو؟“

”اب تک میں نے بلا کسی کی مدد کے مشکلوں کو سر کیا ہے۔ اب تمہارے ساتھ ہوں۔“

دونوں اس جھاؤ کے تختے پر بیٹھے اور مہتا نے جھاؤ کے ایک ڈٹے سے اسے کھینا شروع کیا۔ تختہ ڈگمگاتا ہوا بہہ چلا۔

مالتی نے دل سے اس خطرے کا خیال دور کرنے کے لیے پوچھا۔ ”تم تو ہمیشہ شہروں میں رہے، دیہاتی زندگی کے عادی کیسے ہو گئے؟ میں تو ایسا تختہ کبھی نہیں بنا سکتی۔“

مہتا نے اسے چاہت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا ”شاید یہ میرے پچھلے جنم کا سنسکار ہے۔ قدرت سے مس ہوتے ہی جیسے مجھ میں نئی زندگی سی آ جاتی ہے۔ رگ رگ میں جنبش ہونے لگتی ہے۔ ایک ایک چڑیا، ایک ایک جانور جیسے مجھے خوشی کی دعوت دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جیسے بھولے ہوئے سکھوں کی یاد دلا رہا ہو! یہ خوشی مجھے اور کہیں نہیں ملتی مالتی! موسیقی کے رلانے والے راگوں میں بھی نہیں، فلسفہ کی بلند پروازیوں میں بھی نہیں! جیسے یہ سب میرے اپنے سگے ہوں، قدرت کے بیچ میں پڑ کر جیسے میں اپنے آپ کو پا جاتا ہوں، جیسے پرند اپنے گھونسلے میں آجائے۔“

تختہ ڈنگاتا، کبھی ترچھا، کبھی سیدھا، کبھی پتھر کھاتا ہوا جا رہا تھا۔

دفعۃً مالتی نے آرزوگی سے پوچھا ”اور میں تمہاری زندگی میں کبھی نہیں آتی؟“

مہتا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ”آتی ہو، بار بار آتی ہو، خوشبو کے ایک جھونکے کی طرح، تصور کے ایک عکس کی طرح، اور پھر غائب ہو جاتی ہو، دوڑتا ہوں کہ تمہیں ہاتھوں سے جکڑ لوں، مگر ہاتھ کھلے رہ جاتے ہیں اور تم ہوا ہو جاتی ہو۔“

مالتی نے مجنونا نہ کہا ”مگر تم نے اس کا سبب بھی سوچا یا سمجھنا چاہا؟“

”ہاں مالتی، بہت سوچا اور بار بار سوچا۔“

”تو کیا معلوم ہوا!“

”یہی کہ میں جس بنیاد پر اپنی زندگی کا گھر کھڑا کرتا چاہتا ہوں وہ نا پائدار ہے۔ یہ کوئی بڑا محل نہیں، بلکہ صرف ایک چھوٹی سی کٹی ہے، مگر اس کے لیے بھی تو کوئی مستقل بنیاد چاہیے۔“

مالتی نے اپنا ہاتھ چھڑا کر جیسے روٹھتے ہوئے کہا ”یہ جھوٹا حملہ ہے۔“

”یہ جھوٹا حملہ ہے۔ تم نے مجھے ہمیشہ استثنائی نظروں سے دیکھا۔ کبھی محبت کی نگاہوں سے نہیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ عورت امتحان نہیں چاہتی، بلکہ محبت چاہتی ہے، امتحان تو اوصاف کو عیوب اور حسن و قبح بنانے والی چیز ہے۔ محبت اس کے برعکس کر دکھاتی ہے۔ میں نے تم سے محبت کی تو میں خیال ہی نہ کر سکتی کہ تم میں کوئی عیب ہے، مگر تم نے

میرا امتحان لیا اور تم مجھے متلون، شوخ اور نہ جانے کیا کیا سمجھ کر مجھ سے ہمیشہ دور بھاگتے رہے۔ نہیں میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ مجھے کہہ لینے دو۔ میں کیوں متلون اور شوخ تھی؟ اسی لیے کہ مجھے وہ محبت نہیں ملی۔ جو مجھے مستقل اور متین بناتی۔ اگر تم نے اپنے آپ کو اسی طرح میرے لیے وقف کر دیا ہوتا جیسا میں نے تمہارے لیے کیا ہے تو تم آج مجھ پر ایسا نامناسب حملہ نہ کرتے۔“

مہتا نے مالتی کے روٹنے کا لطف اٹھاتے ہوئے کہا ”تم نے میرا امتحان کبھی نہیں لیا؟“

”کبھی نہیں،“

”تو تم نے غلطی کی۔“

”میں اس کی پرواہ نہیں کرتی۔“

”جذبے میں نہ آؤ مالتی۔ محبت کرنے سے پہلے ہم سب امتحان لیتے ہیں اور تم نے بھی لیا، درپردہ ہی سہی۔ میں آج تم سے صاف کہتا ہوں کہ پہلے میں نے تمہیں اسی طرح دیکھا جیسے ہر روز ہزاروں عورتوں کو دیکھا کرتا ہوں، صرف تفریحی خیال سے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو تم نے بھی مجھے اپنی تفریح کے لیے ایک نیا کھلونا سمجھا۔“

مالتی نے ٹوکا ”غلط کہتے ہو۔ میں نے کبھی تم کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میں نے پہلے ہی دن تمہیں اپنا دیوتا بنا کر اپنے دل“

مہتا نے بات کاٹ کر کہا ”پھر وہی جذبہ! مجھے ایسے اہم معاملے میں جذبے کو دخل دینا پسند نہیں۔ اگر تم نے پہلے ہی دن سے مجھے اس عنایت کے قابل سمجھا تو اس کا یہی سبب ہو سکتا ہے کہ میں بھیس بنانے میں تم سے زیادہ ہوشیار ہوں، ورنہ جہاں تک میں نے نسوانی فطرت پر غور کیا ہے، عورتیں محبت کے بارے میں کافی چھان بین کرتی ہیں۔ پہلے تو سوئمر سے مردوں کی آزمائش ہوتی تھی۔ وہی بات اب بھی موجود ہے، چاہے اس کا روپ کچھ بدل گیا ہو۔ میں نے تب سے برابر یہی کوشش کی ہے کہ خود کو سراپا تمہارے سامنے رکھ دوں اور اس کے ساتھ ہی تمہارے دل تک پہنچ جاؤں۔ اور میں جیوں جیوں تمہارے دل کی گہرائی میں گیا ہوں مجھے جواہرات ہی ملے ہیں۔ میں تفریح کے لیے آیا اور آج پرستار بنا ہوا ہوں۔ تم نے میرے اندر کیا پایا، یہ مجھے معلوم نہیں۔“

ندی کا دوسرا کنارہ آگیا۔ دونوں اتر کر اسی ریت کے فرش پر جا بیٹھے اور مہتا پھر اس رو میں بولے ”اور آج میں یہاں تمہیں وہی پوچھنے کے لیے لایا ہوں۔“

مالتی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ”کیا ابھی تمہیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت باقی ہے؟“

”ہاں اس لیے کے میں آج تمہیں اپنا وہ روپ دکھاؤں گا جو شاید ابھی تک تم نے نہیں دیکھا اور جسے میں نے بھی چھپایا ہے۔ اچھا مان لو کہ تم سے شادی کر کے کل بے وفائی کروں تو تم مجھے کیا سزا دو گی؟“

مالتی نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اس کا مطلب وہ نہ سمجھی بولی ”ایسا سوال کیوں کرتے ہو؟“

”میرے لیے یہ بہت اہم بات ہے۔“

”میں اسے ممکن نہیں سمجھتی۔“

”دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا مہاتما بھی ایک لمحے میں بھرپور ہو سکتا ہے۔“

”میں اس کا سبب کھوجوں گی اور اسے دور کروں گی۔“

”مان لو کہ میری عادت نہ چھوٹے۔“

”پھر میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا کروں گی۔ شاید زہر کھا کر سو رہوں۔“

”لیکن تم مجھ سے اگر یہی سوال کر دو گی تو میں اس کا دوسرا جواب دوں گا؟“

مالتی نے ڈرتے ہوئے پوچھا ”بتاؤ؟“

مہتا نے استقلال سے کہا ”میں پہلے تمہاری جان لے لوں گا، پھر اپنی دے دوں گا۔“

مالتی نے زور سے قہقہہ مارا اور سر سے حیرت تک کانپ اٹھی۔ اس کا قہقہہ اس لرزش کے چھپانے ہی کے لیے تھا۔

مہتا نے پوچھا ”تم نہیں کیوں؟“

”اسی لیے کہ تم ایسے ہنسنے والے نہیں معلوم ہوتے۔“

”نہیں مالتی، اس معاملے میں پورا حیوان ہوں اور اس پر لپانے کا کوئی سبب نہیں دیکھتا۔ روحانی محبت اور ایثار آمیز محبت اور بے غرضانہ محبت جس میں آدمی خود کو مٹا کر صرف

معشوق کے لیے جیتا ہے، اس کی خوشی میں خوش ہوتا اور اس کے پھروں پر اپنی روح قربان کر دیتا ہے، یہ سب میرے لیے محض بے معنی الفاظ ہیں۔ میں نے کتابوں میں ایسی محبت کے قصے پڑھے ہیں۔ جہاں عاشق نے معشوق کے لیے اپنی جان دے دی ہے۔ مگر اس جذبے کو میں حقیقت کہہ سکتا ہوں، اطاعت کہہ سکتا ہوں، مگر محبت کبھی نہیں۔ محبت سیدھی سادھی گائے نہیں بلکہ خوں خوار شیرنی ہے جو اپنے شکار پر کسی کی آنکھ بھی نہیں پڑنے دیتی۔“

مالتی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ”اگر محبت خونخوار شیرنی ہے تو میں اس سے دور ہی رہوں گی۔ میں نے تو اسے گائے ہی سمجھ رکھا تھا۔ میں محبت کو بدگمانی سے بالاتر سمجھتی ہوں۔ وہ جسمانی نہیں، بلکہ روحانی چیز ہے۔ بدگمانی کی وہاں مغبائش نہیں، اور ہنسا تو بدگمانی ہی کا پھل ہے۔ وہ محبت، روح کا پورے طور پر وقف کر دیتا ہے۔ اس کے مندر میں تم آزمائش سے نہیں بلکہ عبادت ہی سے بردان پاسکتے ہو۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور تیزی سے ندی کی طرف چلی، جیسے اسے نے اپنا کھویا ہوا راستہ پایا ہو۔ ایسی زبردست تحریک کا اسے کبھی احساس نہ ہوا تھا۔ اس نے آزادانہ زندگی میں خود میں ایک کمزوری محسوس کی تھی جو اسے ہمیشہ متزلزل اور بے قرار رکھتی تھی۔ اس کا دل جیسے کسی سہارے کی تلاش میں تھا۔ جس کے ذریعے وہ دنیا کا مقابلہ کر سکے۔ خود میں اسے وہ سکت نہ ملتی تھی۔ دانائی اور کردار کی طاقت دیکھ کر وہ اس کی طرف راغب ہو جاتی تھی۔ پانی کی طرح ہر ایک برتن کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ اس کی اپنی کوئی شکل نہ تھی۔

اس کی طبیعت ابھی کسی امتحان دینے والے معلم کی سی تھی۔ معلم کو کتابوں سے محبت ہو سکتی ہے اور ہو بھی جاتی ہے مگر وہ کتاب کے ان ہی حصوں پر زیادہ توجہ دیتا ہے جو امتحان میں آسکتے ہیں۔ اس کی اول غرض امتحان میں کامیاب ہونا ہے۔ واقفیت حاصل کرنا اس کے بعد کا کام ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ممتحن بڑا رحم دل یا اندھا ہے اور معلموں کو یوں ہی پاس کر دیا کرتا ہے تو شاید وہ کتابوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ مالتی جو کچھ کرتی تھی وہ مہتا کو خوش کرنے کے لیے۔ اس کی غرض تھی مہتا کی محبت اور عقیدت حاصل کرنا، ان کے دل کی رانی بن جانا، لیکن اسی معلم کی طرح اپنی قابلیت کا یقین دلا کر قابلیت آجانے پر ممتحن خود بخود اس سے مطمئن ہو جائے گا۔ اتنا مبرا اس میں نہ تھا۔

مگر آج مہتا نے جیسے اسے ٹھکرا کر اس کی روحانی قوت کو بیدار کر دیا۔ مہتا کو جب

اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا جیسی سے اس کا دل ان کی طرف جھک رہا تھا۔ اسے وہ اپنے شناساؤں میں قابل ترین معلوم ہوئے۔ ان کی پاکیزہ زندگی میں عقل کی تیزی اور خیالوں کی مضبوطی ہی بہترین شے تھی۔ دولت اور اقتدار کو تو وہ صرف کھلونا سمجھتی تھی جسے کھیل کر لڑکے توڑ پھوڑ ڈالتے ہیں۔ صورت میں اب اس کے لیے کوئی خاص کشش نہ تھی اگرچہ اسے بد صورتی سے نفرت تھی۔ اس کو تو اب عقلی قوت ہی اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی جس کا سہارا پا کر اس میں خود اعتمادی پیدا ہو، نئی ترقی کی تحریک ملے، اپنے میں طاقت آئے اور اپنی زندگی کو کارآمد بنانے کی واقفیت ہو۔ مہتا کی عظمت و دانائی نے اس پر اپنا سکہ جما دیا تھا اور تب سے وہ اپنی اصلاح کرتی چلی آ رہی تھی۔ جس حرکت دینے والی طاقت کی اسے ضرورت تھی وہ مل گئی تھی اور پوشیدہ طور پر اسے طاقت اور حرکت دے رہی تھی۔ زندگی کا نیا معیار جو اس کے سامنے تھا وہ خود کو اس تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہوئی اور کامیابی کا احساس کرتی اس دن کا تصور کر رہی تھی جب وہ اور مہتا ایک سے ہو جائیں گے۔ آج یہ تصور اسے اور بھی مستقل اور مضبوط بنا رہا تھا۔

مگر آج جب مہتا نے اس کی امیدوں کو دروازے تک لاکر محبت کا وہ معیار اس کے سامنے رکھا جس میں محبت کو روحانیت اور ایمان کی بلندی سے گرا کر مادی سطح تک پہنچا دیا گیا تھا۔ جہاں بدگمانی اور حسد کا راج ہے، تب اس کی پاک و صاف عقل کو چوٹ لگی اور مہتا سے اس کو جو عقیدت تھی اسے ایک دھکا سا لگا، جیسے کوئی شاگرد اپنے استاد کو کوئی کینی حرکت کرتے ہوئے دیکھ لے۔ اس نے دیکھا کہ مہتا کی تیز فہمی محبت کو حیوانیت کی طرف کھینچنے لیے جاتی ہے اور اس کی فرشتہ صفتی کی جانب سے آنکھیں بند کیے لیتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔

مہتا نے کچھ نادم ہو کر کہا ”آؤ کچھ دیر اور بیٹھیں۔“

مالتی بولی ”نہیں اب لوٹنا چاہیے۔ دیر ہو رہی ہے۔“

رائے صاحب کا ستارا بلند تھا۔ ان کے تینوں منصوبے پورے ہو گئے تھے۔ لڑکی کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی تھی، مقدمہ بھی جیت گئے تھے اور چنناؤ میں بھی کامیاب ہی نہ ہوئے تھے بلکہ ہوم ممبر بھی ہو گئے تھے۔ چاروں طرف سے مبارک بادل رہی تھی۔ وقار تو ان کا پہلے بھی کسی سے کم نہ تھا مگر اب تو اس کی جڑ اور بھی گہری اور مضبوط ہو گئی تھی۔ وقتی اخباروں میں ان کی تصویر اور سوانح عمری زوروں سے نکل رہی تھی۔ قرض بہت بڑھ گیا تھا مگر رائے صاحب کو اس کی اب پرواہ نہ تھی۔ وہ اس نئی جائیداد کا ایک چھوٹا سا جزو فروخت کر کے قرض سے سبکدوش ہو سکتے تھے۔ راحت و آرام کا بلند سے بلند تصور جو انھوں نے کیا تھا، اب نئی تال، مسوری، اور شملہ تینوں مقاموں پر ایک ایک بنگلہ بنوانا ضروری ہو گیا۔ اب انھیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ان مقامات میں جائیں تو کسی ہوٹل میں یا کسی دوسرے راجا کے بنگلے میں ٹھہریں۔ جب راجا پر تاپ سنگھ کے بنگلے ان سبھی مقاموں میں تھے تو رائے صاحب کے لیے یہ بڑی شرم کی بات تھی کہ ان کے بنگلے وہاں نہ ہوں۔ اتفاق سے بنگلے بنوانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ بنے بنائے بنگلے سستے داموں میں مل گئے۔ ہر بنگلے کے لیے مالی، چوکیدار، کارندہ، خانساں وغیرہ بھی رکھ لیے گئے تھے اور سب سے بڑی خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ اب کے ہر مجبشی کی سالگرہ کے موقع پر انھیں راجا کا خطاب بھی مل گیا تھا۔ اب ان کی اعلیٰ خواہشیں تمام وکمال پوری ہو گئی تھیں۔ اس دن خوب جشن منایا گیا اور ایسی شاندار دعوت ہوئی کہ سارے پچھلے رکارڈ ٹوٹ گئے۔ جس وقت ہزار کسلنسی گورنر صوبہ نے انھیں خطاب دیا تو غرور کے ساتھ راج بھگتی کی ایسی ترتیلیں ان کے من میں اٹھیں کہ ان کا رواں رواں پھول اٹھا۔ یہ ہے زندگی! درنہ باغیوں کے پھیر میں پڑ کر مفت کی بدنامی لی، جیل گئے اور افسروں کی نظروں سے گر گئے۔ جس سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انھیں پچھلی مرتبہ گرفتار کیا تھا وہ اس وقت ان کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔ شاید اپنی خطاؤں کی معافی مانگ رہا تھا۔

مگر زندگی کی اعلیٰ ترین فتح تو انھیں اس وقت ملی جب ان کے پرانے اور ہارے ہوئے

رقیب سورج پر تاپ سنگھ نے ان کے بڑے لڑکے رور پال سنگھ سے اپنی لڑکی کے بیاہ کا پیغام دیا۔ رائے صاحب کو نہ مقدمہ چیتنے کی اتنی خوشی ہوئی تھی، نہ ہوم ممبر ہونے کی۔ وہ ساری باتیں خیال میں آتی تھیں، مگر یہ بات تو خلاف امید ہی نہیں، بلکہ خیال سے بھی باہر تھی۔ وہی سورج پر تاپ سنگھ جو ابھی کئی ماہ قبل انھیں اپنے کتے سے بھی کمتر سمجھتا تھا وہ آج ان کے لڑکے سے اپنی لڑکی کا بیاہ کرنا چاہتا ہے۔ کتنی ناممکن بات! رور پال اس وقت ایم، اے میں پڑھتا تھا، نہایت بے خوف، پکا معیار پرست، اپنے اوپر بھروسہ رکھنے والا، مغرور، رنگین مزاج اور کامل نوجوان تھا، جسے اپنے باپ کی زبردستی اور جاہ طلبی بری معلوم ہوتی تھی۔

رائے صاحب اس وقت نینی تال میں تھے۔ یہ پیغام پا کر پھول اٹھے۔ اگرچہ وہ شادی کے معاملہ میں لڑکے پر کسی طرح کا دباؤ نہ ڈالنا چاہتے تھے مگر انھیں یقین تھا کہ وہ جو کچھ طے کر لیں گے اس میں رور پال کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور راجا سورج پر تاپ سنگھ سے رشتہ ہو جانا ایک ایسی خوش قسمتی کی بات تھی کہ رور پال کا حقیق نہ ہونا ان کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ انھوں نے فوراً راجا صاحب کو قول دے دیا اور اسی وقت رور پال کو فون کیا۔ رور پال نے جواب دیا ”مجھے منظور نہیں۔“

رائے صاحب کو اپنی زندگی میں نہ کبھی اتنی مایوسی ہوئی تھی اور نہ اتنا غصہ آیا تھا۔ پوچھا ”کوئی وجہ؟“

”وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔“

”میں ابھی جاننا چاہتا ہوں۔“

”میں نہیں بتانا چاہتا۔“

”تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا۔“

”جس بات کو میرا دل قبول نہیں کرتا اسے میں آپ کے حکم سے نہیں مان سکتا۔“

رائے صاحب نے بڑی التجا سے سمجھایا ”بیٹا تم معیار کے لیے اپنے پیروں میں کلہاڑی مار رہے ہو۔ اس رشتے سے سوسائٹی میں تمہارا درجہ کتنا اونچا ہو جائے گا، کچھ تم نے سوچا ہے؟ اسے خدائی تحریک سمجھو۔ اس خاندان کی اگر کوئی ٹیکس لڑکی بھی مجھے ملتی تو میں اپنے بھاگ کو سراہتا، یہ تو راجا سورج پر تاپ کی لڑکی ہے جو ہمارے سرتاج ہیں۔ میں اسے روز دیکھتا ہوں۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ روپ، گن، سُنداؤ میں ایسی لڑکی میں نے آج تک نہیں

دیکھی۔ میں تو چار دن کا اور مہمان ہوں تمہارے سامنے ساری زندگی پڑی ہے۔ میں تم پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم جانتے ہو کہ شادی کے بارے میں میرے خیال کتنے وسیع ہیں۔ لیکن میرا یہ بھی فرض ہے کہ اگر تمہیں غلطی کرتے دیکھوں تو آگاہ کر دوں۔“

رور پال نے جواب دیا ”میں اس بارے میں بہت پہلے طے کر چکا ہوں اور اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔“

رائے صاحب کو لڑکے کی ہٹ اور نادانی پر غصہ آ گیا۔ گرج کر بولے۔ ”معلوم ہوتا ہے تمہارا سر پھر گیا ہے۔ آکر مجھ سے ملو توقف نہ کرنا۔ میں راجا صاحب کو قول دے چکا ہوں۔“

رور پال نے جواب دیا ”افسوس کے ابھی مجھے فرصت نہیں ہے۔“
دوسرے دن رائے صاحب خود آ گئے۔ دونوں اپنے اپنے ہتیاروں سے مسلح ہو کر تیار کھڑے تھے۔ ایک طرف پوری زندگی کا حاصل کیا ہوا زبردست تجربہ تھا، مصلحتوں سے بھرا ہوا، اور دوسری طرف خام معیار پرستی تھی، ضدی، شریر اور بے مروت!۔

رائے صاحب نے سیدھا وار کیا ”میں جانتا چاہتا ہوں کہ وہ کون لڑکی ہے؟“
رور پال نے استقلال سے کہا ”اگر آپ اتنے خواہش مند ہیں تو سنیے وہ مالٹی دیوی کی بہن سروج ہے۔“

رائے صاحب جیسے چوٹ کھا کر گر پڑے ”اچھا وہ!،،
”آپ نے سروج کو دیکھا ہوگا؟“
”خوب دیکھا ہے۔ تم نے راج کمار کو دیکھا ہے یا نہیں؟“
”جی ہاں، خوب دیکھا ہے۔“
”پھر بھی“
”میں صورت کو کوئی چیز نہیں سمجھتا۔“

”تمہاری سمجھ پر مجھے رنج ہوتا ہے۔ مالٹی کو جانتے ہو کیسی عورت ہے تو اس کی بہن کیا کچھ ہوگی؟“

رور پال نے تیوری چا کر کہا ”میں اس بارے میں آپ سے اور کچھ نہیں کہنا چاہتا، مگر میری شادی ہوگی تو سروج سے۔“

”میرے جیتے جی کبھی نہیں ہو سکتی۔“

”تو آپ کے بعد ہوگی۔“

”اچھا تمہارے یہ ارادے ہیں!“

اور رائے صاحب کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں گویا ساری زندگی اجڑ گئی ہو۔ ہوم بمبری اور علاقہ اور خطاب، سب جیسے باسی پھولوں کی طرح بے کیف اور نا خوشگوار ہو گئے ہوں۔ زندگی کی ساری ریاضت اور عیش و آرام بے کار گئی۔ ان کی اہلیہ کا جب انتقال ہوا تھا تو ان کی عمر چھتیس سال سے زیادہ تھی۔ وہ شادی کر سکتے تھے اور عیش و آرام کا لطف بھی اٹھا سکتے تھے۔ سبھی ان سے شادی کے لیے اصرار کر رہے تھے مگر انھوں نے ان لڑکوں کا منہ دیکھا اور تجربہ زندگی کی مشق و ریاضت قبول کر لی۔ ان ہی لڑکوں پر زندگی کے سارے عیش و آرام کو قربان کر دیا۔ آج تک اپنے دل کی ساری محبت ان ہی لڑکوں کو دیتے ہوئے چلے آئے، اور آج یہ لڑکا اتنی بے مروتی سے باتیں کر رہا ہے گویا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر وہ کیوں جائداد اور عزت اور اقتدار کے لیے جان دیں؟ ان ہی لڑکوں کے لیے تو وہ سب کچھ کر رہے تھے۔ جب لڑکوں کو ان کا ذرا بھی لحاظ نہیں تو وہ کیوں یہ تپتیا کریں؟ انھیں کون دنیا میں بہت دن رہنا ہے۔ انھیں بھی آرام سے پڑے رہنا آتا ہے۔ ان کے اور ہزاروں بھائی مونچھوں پر تاؤ دے کر زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں اور مست گھومتے ہیں، پھر وہ کیوں نہ وہی رویہ اختیار کرے؟ انھیں اس وقت یاد نہ رہا کہ وہ جو تپتیا کر رہے ہیں وہ لڑکوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے، اور صرف شہرت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ کام کرنے کے عادی ہیں اور انھیں زندہ رہنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ وہ عیاش اور کابل بن کر اپنے دل کو مطمئن نہیں رکھ سکتے۔ انھیں معلوم نہیں کہ لوگوں کی طبیعت ہی ایسی ہوتی ہے۔ وہ عیاشی اور کابلی کو پسند نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے جگر کا خون پینے کے لیے بنے ہیں۔ جب تک زندہ ہیں پیتے ہی جائیں گے۔

مگر اس صدمے کا رد عمل بھی فوراً ہی ہوا۔ ہم جس کے لیے ایثار کرتے ہیں ان سے کسی صلے کی امید نہ رکھ کر بھی ان کے دل پر حکومت کرنا چاہتے ہیں، خواہ وہ حکومت انھیں کے فائدے کے لیے ہو۔ اگرچہ اس فائدے کو ہم اس قدر اپنا بنا لیتے ہیں کہ گویا وہ ہمارا ہی فائدہ بن جاتا ہے۔ خرک جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، حکومت کا خیال بھی اتنا ہی زبردست ہوتا

ہے۔ اور جب دفعتاً ہمیں احتجاج کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو ہم بھڑک اٹھتے ہیں اور ترک گويا انتقام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ رائے صاحب کو یہ ضد پڑ گئی کہ رور پال کی شادی سروج سے نہ ہونے پائے، چاہے اس کے لیے انھیں پولیس سے مدد کیوں نہ لینی پڑے۔ دھرم کی ہتیا کیوں نہ کرنی پڑے۔

انھوں نے جیسے تلوار کھینچ کر کہا ”ہاں، میری بعد ہی ہوگی، اور ابھی اسے بہت دن ہیں۔“

رور پال نے جیسے گولی چلا دی ”ایشور کرے آپ امر ہوں! سروج سے میرا بیاہ ہو چکا۔“
”جھوٹ۔“

”بالکل نہیں۔ سند موجود ہے۔“

رائے صاحب صدمے سے گر پڑے۔ اتنی تیز انتقامانہ نظر سے انھوں نے کبھی کسی دشمن کو بھی نہ دیکھا تھا۔ دشمن زیادہ سے زیادہ ان کے نفع پر چوٹ کر سکتا تھا یا ان کے جسم پر، یا وقار پر، مگر یہ چوٹ تو اس نازک جگہ پر تھی جہاں زندگی کی ساری رغبتوں کا اجتماع تھا۔ ایک آندھی تھی جس نے ان کی زندگی کو بخ و بُن سے اکھاڑ دیا تھا۔ اب وہ بالکل بے دست و پا ہیں، پولیس کی ساری طاقت ہاتھ میں رکھتے ہوئے بھی بے دست و پا ہیں! تشدد ان کا آخری ہتھیار تھا۔ وہ ہتھیار ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ رور پال بالغ ہے، سروج بھی بالغ ہے، اور رور پال اپنی ریاست کا مالک ہے، ان کا اس پر کوئی دباؤ نہیں آہ! اگر جانتا کہ یہ لوٹا ایسی مخالفت کرے گا تو اس ریاست کے لیے لڑتا ہی کیوں؟ اس مقدمے بازی میں دو ڈھائی لاکھ بگڑ گئے۔ زندگی ہی تباہ ہو گئی۔ اب تو ان کی لاج اس طرح بچے کے اس لونڈے کی خوشامد کرتے رہیں۔ وہ ذرا بھی خلل انداز ہوئے اور عزت خاک میں مل گئی۔ وہ اپنی زندگی کو قربان کر کے بھی اب مالک نہیں۔ آہ ساری زندگی برباد ہو گئی، ساری زندگی!

رور پال چلا گیا۔ رائے صاحب نے موٹر منگوایا اور مہتا صاحب سے ملنے چلے۔ مہتا اگر چاہے تو مالتی کو سمجھا سکتے ہیں۔ سروج بھی ان کی عدول حکمی نہ کرے گی۔ اگر دس بیس ہزار روپے غم کھانے سے بھی یہ شادی رک جائے تو وہ اس کے لیے تیار تھے۔ انھیں خود غرضی کے نشے میں بالکل یاد نہ رہا کہ وہ مہتا کے پاس ایسی تجویز لے کر جا رہے ہیں جس پر مہتا کی ہمدردی ان کے ساتھ نہ ہوگی۔

مہتانے کل ماجرا سن کر انہیں بتانا شروع کیا۔ سنجیدگی سے بولے ”یہ تو آپ کی عزت کا سوال ہے؟“

رائے صاحب بھانپ نہ سکے۔ اچھل کر بولے ”جی ہاں خالص عزت کا! راجا پر تپ سنگھ کو تو آپ جانتے ہیں۔“

”میں نے ان کی لڑکی کو بھی دیکھا ہے۔ سروج اس کی پاؤں کی دھول بھی نہیں ہے۔“

”مگر اس لوٹے کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔“

”تو ماریے گولی، آپ کو کیا کرنا ہے؟ وہی پچھتائے گا۔“

”آہ! یہی تو نہیں دیکھا جاتا مہتا جی! ملتی ہوئی عزت نہیں چھوڑی جاتی۔ میں اس عزت پر اپنی ریاست قربان کرنے کو تیار ہوں۔ آپ مالٹی دیوی کو سمجھادیں تو سب کام بن جائے۔ ادھر انکار ہو جائے تو رور پال سر پیٹ کر رہ جائے گا۔ اور یہ نشہ دس پانچ دن میں اپنے آپ ہی اتر جائے گا۔ پریم نہیں صرف سک ہے۔“

”لیکن مالٹی بلا کچھ رشوت لیے مانے گی نہیں۔“

”آپ جو کچھ کہیے، میں اسے دے دوں گا۔ وہ چاہے تو میں اسے یہاں کے ڈفرن اسپتال کا انچارج بنا دوں۔“

”مان لیجیے کہ وہ آپ ہی کو چاہے تو آپ راضی ہوں گے؟ جب سے آپ کو ہوم ممبری ملی ہے، آپ کے بازے میں اس کی رائے ضرور بدل گئی ہو گی۔“

رائے صاحب نے مہتا کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس پر مسکراہٹ سی نظر آئی۔

”سمجھ گئے۔ ٹھنکین لہجے میں بولے ”آپ کو مجھ سے مذاق کرنے کا یہی موقع ملا۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا تھا کہ مجھے یقین تھا کہ آپ میری حالت پر غور کریں گے اور مناسب رائے دیں گے۔ اور آپ مجھے بتانے لگے۔ جس کے دانت نہیں دکھے وہ دانتوں کا درد کیا جانے؟“

مہتا نے متانت سے کہا ”معاف کیجیے گا، آپ سوال ہی ایسا لے کر آئے ہیں کہ اس پر سنجیدگی سے غور کرنا میں مضحکہ انگیز سمجھتا ہوں۔ آپ اپنی شادی کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ لڑکے کی شادی کی ذمہ داری آپ کیوں اپنے اوپر لیتے ہیں، خصوصاً جب آپ کا لڑکا بالغ ہے اور اپنا نفع و نقصان سمجھتا ہے؟ کم سے کم میں تو شادی جیسے اہم معاملے میں عزت کی کوئی

مجبائش نہیں دیکھتا۔ عزت، دولت سے ہوتی تو راجا صاحب اس نیچے بابا کے سامنے گھٹنوں غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے نہ کھڑے رہتے۔ معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے مگر راجا صاحب اپنے علاقے کے سب انجکڑنیک کو سلام کرتے ہیں۔ اسے آپ عزت کہتے ہیں؟ لکھنؤ میں آپ کسی دوکاندار، کسی اہلکار، کسی راہ گیر سے پوچھیے، تو ان کا نام سن کر گالیاں دے گا۔ اسی کو آپ عزت کہتے ہیں، جاکر آرام سے بیٹھیے۔ سروج سے بہتر بہو آپ کو بہت مشکل سے ملے گی۔“

رائے صاحب نے احتجاج کیا۔ ”بہن تو مالتی ہی کی ہے!“
 مہتا نے گرم ہو کر کہا ”مالتی کی بہن ہونا کیا ذلت کی بات ہے؟ مالتی کو آپ نے جانا نہیں نہ جاننے کی پروا کی۔ میں نے بھی یہی سمجھا تھا، مگر اب معلوم ہوا وہ آگ میں پڑ کر چمک اٹھنے والی سچی دھات ہے۔ وہ ان جانبازوں میں سے ہے جو موقع پڑنے پر اپنا جوہر دکھاتے ہیں، تلوار گھماتے نہیں چلتے۔ آپ کو معلوم ہے، کھٹا کی کیا حالت ہے؟“
 رائے صاحب نے ہمدردی سے سر ہلا کر کہا ”سن چکا ہوں، اور بار بار خواہش ہوئی کہ ان سے ملوں مگر فرصت نہ ملی۔ اس میل میں آگ لگنا ان کی تباہی اور بربادی کا باعث ہو گیا۔“

”جی ہاں، اب وہ ایک طرح سے دوستوں کی عنایتوں پر گزر بسر کر رہے ہیں۔ اس پر گوبندی مہینوں سے بیمار ہے۔ اس نے کھانا پر خود کو قربان کر دیا، اس حیوان پر جس نے ہمیشہ اسے جلایا۔ اب وہ مر رہی ہے اور مالتی رات کی رات اس کے سرہانے بیٹھی رہ جاتی ہے، وہی مالتی جو کسی راجا یا مہاراج سے پانچ سو روپے فیس پا کر بھی رات بھر نہ بیٹھے گی۔ کھانا کے خورد سال بچوں کی پرورش کا بار بھی مالتی پر ہے۔ یہ مادریت اس میں کہاں سوئی ہوئی تھی، معلوم نہیں۔ مجھے تو مالتی کا یہ رویہ دیکھ کر اپنے دل میں عقیدت کا احساس ہونے لگا، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ میں زبردست دہریہ ہوں۔ اور باطنی صفائی کے ساتھ اس کے چہرے پر بھی فوق البشریت کی چمک آنے لگی ہے۔ انسانیت اتنے زیادہ رنگوں والی اور اتنی زیادہ طاقتور ہے، اس کا مجھے کھلا تجربہ ہو رہا ہے۔ آپ ان سے ملنا چاہیں تو چلیے۔ اس بہانے میں بھی چلا چلوں گا۔“

رائے صاحب نے شبہ سے کہا ”جب آپ ہی میرے درد کو نہیں سمجھ سکے تو مالتی دیوی

کیا سمجھیں گی؟ مفت میں شرمندگی ہوگی۔ مگر آپ کو ان کے پاس جانے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت کیوں؟ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ نے ان پر اپنا جادو ڈال دیا ہے۔“

مہتا نے حسرت بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ”وہ باتیں اب خواب و خیال ہو گئیں۔ اب تو کبھی ان کے درشن بھی نہیں ہوتے۔ انھیں اب فرصت بھی نہیں رہتی۔ دوچار بار گیا مگر مجھے معلوم ہوا کہ مجھ سے مل کر وہ بہت خوش نہیں ہوئیں۔ تب سے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہاں خوب یاد آیا، آج نسوانی ورزش گاہ کا جلسہ ہے، آپ چلیں گے؟“

رائے صاحب نے بے دلی کے ساتھ کہا ”جی نہیں، مجھے فرصت نہیں ہے۔ مجھے تو فکر سوار ہے کہ راجا صاحب کو کیا جواب دوں گا۔ میں انھیں قول دے چکا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلے۔ جس گتھی کو سلجھانے آئے تھے وہ اور بھی الجھ گئی، تاریکی اور بھی زیادہ تاریک ہو گئی۔ مہتا نے انھیں موڑ تک آکر رخصت کیا۔

رائے صاحب سیدھے اپنے بنگلے تک آئے اور روز نامہ اٹھایا ہی تھا کہ ٹٹھا کا ملاقاتی کارڈ ملا۔ ٹٹھا سے انھیں نفرت تھی اور ان کا منہ بھی نہ دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اس وقت دل کی کمزور حالت میں انھیں کسی ہمدرد کی تلاش تھی جو اور کچھ نہ کر سکے مگر ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار تو کر سکے، فوراً بلا لیا۔

ٹٹھا دبے پیروں روئی صورت بنائے کمرے میں داخل ہوئے اور زمین تک جھک کر سلام کرتے ہوئے بولے ”میں تو حضور کے درشن کرنے نئی تال جا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے یہیں درشن ہو گئے۔ حضور کا مزاج تو اچھا ہے؟“

اس کے بعد انھوں نے بڑی لچھے دار زبان میں اور اپنے پچھلے سلوک کو بالکل بھول کر رائے صاحب کی تعریف کرنی شروع کی ”ایسی ہوم مہری کوئی کیا کرے گا؟ جدھر دیکھو حضور ہی کا چہ چاہے۔ یہ عہدہ حضور کی شان کے شایاں ہے۔“

رائے صاحب دل میں سوچ رہے تھے کہ یہ شخص بھی کتنا بڑا مکار ہے، اپنی غرض پڑنے پر گلدھے کودا کہنے والا، پرلے سرے کا بے وفا اور بے شرم۔ مگر انھیں اس پر غصہ نہ آیا۔ رم آگیا۔ پوچھا ”آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں حضور، بے کار بیٹھا ہوں۔ اسی امید سے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے

جار ہا تھا کہ اپنے خادموں پر عنایت کی نظر رہے۔ آج کل بڑی مصیبت میں پڑا ہوا ہوں۔ راجا پرتاپ سنگھ کو تو حضور جانتے ہیں کہ وہ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ ایک روز آپ کی جھو کرنے لگے۔ مجھ سے نہ سنا گیا۔ میں نے کہا ”بس کیجیے مہاراج، رائے صاحب میرے مالک ہیں، اور میں ان کی برائی نہیں سن سکتا۔“ بس اسی بات پر بگڑ گئے۔ میں نے بھی سلام کیا اور گھر چلا آیا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ آپ چاہے جتنی شان و شوکت دکھلائیں مگر رائے صاحب کی جو عزت ہے وہ آپ کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ عزت لیاقت سے ہوتی ہے اور آپ میں جو لیاقت ہے وہ دنیا جانتی ہے۔“

رائے صاحب نے کچھ بن کر کہا ”آپ نے تو سیدھے گھر میں آگ لگادی۔“ ٹٹھا نے اکر کر کہا ”میں تو حضور صاف کہتا ہوں خواہ کسی کو اچھا لگے یا برا۔ جب حضور کے قدموں کو پکڑے ہوئے ہوں تو کسی سے کیوں ڈروں؟ حضور کے تو نام سے چلتے ہیں۔ جب دیکھو حضور کی بد گوئی۔ جب سے آپ ہوم ممبر ہوئے ہیں، ان کے سینے پر سانپ لوٹ رہا ہے۔ میری ساری کی ساری اجرت راجا صاحب ہضم کر گئے۔ دینا تو جانتے ہی نہیں حضور۔ اسامیوں پر اتنا ظلم کرتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کسی کی آبرو سلامت نہیں۔ دن دھاڑے عورتوں کو“

موٹر کی آواز آئی اور راجا سورج پرتاپ سنگھ اترے۔ رائے صاحب نے کمرے سے نکل کر ان کا خیر مقدم کیا اور اس عزت افزائی کے بارے میں جھکتے ہوئے بولے ”میں تو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے ہی والا تھا۔“

یہ پہلا موقع تھا کہ راجا سورج پرتاپ سنگھ نے اس مکان میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ یہ خوش قسمتی!

ٹٹھا بھیگی ملی بنے ہوئے بیٹھے تھے۔ راجا صاحب یہاں! کیا ادھر ان دو اصحاب میں دوستانہ ہو گیا ہے؟ انھوں نے رائے صاحب کی آتش حد کو مشتعل کر کے اپنے ہاتھ سینکے چاہے تھے۔ مگر نہیں، راجا صاحب یہاں چاہے ملنے کے لیے آگئے ہوں مگر دلوں میں جو آگ ہے وہ تو کھار کے بجھنے کی طرح صرف اوپر کی لیپا پوتی سے بجھنے والی نہیں۔

راجا صاحب نے سگار جلاتے ہوئے ٹٹھا کی طرف بے رحمانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا ”تم نے تو صورت ہی نہیں دکھائی مسٹر ٹٹھا۔ مجھ سے اس دعوت کے کل روپے وصول کر لیے اور

ہوٹل والوں کو ایک پائی نہ دی۔ اب وہ میرا سر کھا رہے ہیں۔ اسے دغا سمجھتا ہوں۔ چاہوں تو ابھی قسمیں پولیس کے حوالے کر دوں۔“

یہ کہتے ہوئے انھوں نے رائے صاحب کو مخاطب کر کے کہا ”ایسا بے ایمان آدمی میں نے نہیں دیکھا، رائے صاحب میں سچ کہتا ہوں کہ میں کبھی آپ کے مقابلے میں نہ کھڑا ہوتا مگر مجھے اسی شیطان نے بہکایا اور میرے ایک لاکھ روپے برباد کرا دیے بلکہ خرید لیا، موٹر رکھ لیا، ایک بیسوا سے آسنائی بھی کر رکھی ہے۔ پورے رئیس بنے ہوئے ہیں اور اب دغا بازی شروع کی ہے۔ رئیسوں کی شان نبھانے کے لیے ریاست چاہیے اور آپ کی ریاست اپنے احباب کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔“

رائے صاحب ٹٹھا کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے بولے ”آپ چپ کیوں ہیں، مسٹر ٹٹھا؟ جواب دیجیے۔ راجا صاحب نے تو آپ کا سارا محتانہ ہنم کر لیا تھا۔ اس کا کوئی جواب آپ کے پاس؟ آپ براہ کرم یہاں سے چلے جائیے اور خبردار، پھر اپنی صورت نہ دیکھائیے گا۔۔۔ دو پھلے مانسوں کو لڑا کر اپنا الو سیدھا کرتا بے پونجی کا روزگار ہے مگر اس کے نفع یا نقصان دونوں ہی جان جوکھم ہیں، یہ سمجھ لیجیے۔“

ٹٹھا نے ایسا سر جھکایا کہ پھر نہ اٹھا سکے۔ چپکے سے چلے گئے، جیسے کوئی چور کتا مالک کے اندر آجانے پر دب کر نکل جائے۔

جب وہ چلے گئے تو راجا صاحب نے پوچھا ”میری برائی کرتا ہوگا؟“

”جی ہاں، مگر میں نے بھی خوب بنایا۔“

”شیطان ہے۔“

”پورا“

”باپ بیٹے کو لڑا دے، میاں بیوی کو لڑا دے، اس فن میں استاد ہے۔ خیر، آج

حضرت کو اچھا سبق مل گیا۔“

اس کے بعد دروپال کے میاہ کی بات چیت شروع ہوئی۔ رائے صاحب کی جان سوکھی جا رہی تھی۔ گویا ان پر کوئی نشانہ لگانے جا رہا ہو۔ کہاں چھپ جائیں؟ کیسے کہیں کہ دروپال پر ان کا کوئی قابو نہیں رہا؟ مگر راجا صاحب کو حالات معلوم ہو چکے تھے۔ رائے صاحب کو خود کچھ نہ کہنا پڑا۔ جان بچ گئی۔

انھوں نے پوچھا ”آپ کو اس کی خبر کیوں کر ہوئی؟“
 ”ابھی ابھی دور پال نے لڑکی کے نام ایک خط بھیجا ہے جو اس نے مجھے دے دیا۔“
 ”آج کل کے لڑکوں میں اور تو کوئی خوبی نظر نہیں آتی، بس آزادی کی سنک سوار ہے۔“
 ”سنک تو ہے ہی، مگر اس کی دفا میرے پاس ہے۔ میں اس چھوڑی کو ایسا غائب کر دوں گا کہ کہیں پتہ نہ لگے گا۔ دس پانچ روز میں یہ سنک ٹھنڈی ہو جائے گی۔ سمجھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔“

رائے صاحب کانپ اٹھے۔ ان کے دل میں بھی اس طرح کی بات آئی تھی مگر انھوں نے اسے کوئی صورت نہ پکڑنے دی تھی۔ سنکار (سرشت) دونوں صاحبوں کے ایک سے تھے۔ گھپاؤں میں رہنے والی شخصیت دونوں ہی اصحاب میں زندہ تھی۔ رائے صاحب نے اسے بیرونی لباس سے ڈھانک دیا تھا، راجا صاحب میں وہ عریاں تھی۔ اپنی عظمت دکھانے کے اس موقع کو رائے صاحب نہ چھوڑ سکے، لجاتے ہوئے بولے ”مگر یہ بیسویں صدی ہے بارہویں نہیں۔“

دور پال کے ادھر اس کا کیا اثر ہوگا، میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر انسانیت کے نقطہ خیال سے

.. ..

راجا صاحب نے بات کاٹ کر کہا ”آپ انسانیت لیے پھرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ دنیا میں آج بھی انسانیت کی حیوانیت ہی اس کی انسانیت پر فتح پار ہی ہے، ورنہ سلطنتوں میں لڑائیاں کیوں ہوتیں؟ پچاچتوں سے جھگڑے طے نہ ہو جاتے۔ جب تک انسان رہے گا اس کی حیوانیت بھی رہے گی۔“

چھوٹی موٹی بحث چھڑ گئی جو بالآخر بات کا جتنکڑ بن گئی اور راجا صاحب ناراض ہو کر چلے گئے۔ دوسرے دن رائے صاحب بھی نئی تال روانہ ہو گئے اور اس کے ایک روز بعد رو رہاں نے سروج کو ساتھ لے کر انگلستان کی راہ لی۔ اب ان میں باپ بیٹے کا رشتہ نہ تھا۔ ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے تھے۔ نٹھا صاحب اب دور پال کے مشیر دہیر دکار تھے۔ انھوں نے دور پال کی طرف سے رائے صاحب پر حساب قہمی کا دعویٰ کیا۔ رائے صاحب پر دس لاکھ کی ڈگری ہو گئی۔ انھیں ڈگری ہو جانے کا اتنا ملال نہ ہوا تھا جتنا اپنی بے عزتی کا۔ بے عزتی سے بھی زیادہ انھوں تھا زندگی کی مجتمع خواہشات کے خاک میں مل جانے کا، اور سب

سے بڑا رنج تھا اس بات کا کہ اپنے ہی بیٹے نے دغا کی۔ فرماں بردار بیٹے کے باپ بننے کا فخر ان کے ہاتھ سے بڑی بے دردی کے ساتھ چھین لیا گیا تھا۔

مگر ابھی شاید ان کے غم کا پیمانہ لبریز نہ ہوا تھا۔ جو کچھ سرتمی وہ لڑکی اور داماد کے قطع تعلق نے پوری کر دی۔ عام ہندو لڑکیوں کی طرح میناکشی بھی بے زبان تھی۔ باپ نے جس کے ساتھ بیاہ کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ چلی گئی۔ لیکن زن و شوہر میں محبت نہ تھی۔ دگ بجے سنگھ عیاش بھی تھے اور شرابی بھی۔ میناکشی اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔ اور کتابوں اور رسالوں سے دل بہلایا کرتی تھی۔ دگ بجے سنگھ کی عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی، پڑھا لکھا بھی تھا، مگر بڑا مغرور اور اپنے خاندانی وقار کے ڈینگ مارنے والا اور بے رحم و بخیل۔ گاؤں کی کم ذات والی بہو بیٹیوں پر ڈورے ڈالا کرتا تھا۔ صحبت بھی کینوں کی تھی۔ جن کی خوشامد نے اسے اور بھی خوشامد پسند بنا دیا تھا۔ میناکشی ایسے شخص کی عزت دل سے نہ کر سکتی تھی۔ پھر اخباروں میں عورتوں کے حقوق کا تذکرہ پڑھ پڑھ کر اس کی آنکھیں بھی کھلنے لگی تھیں۔ اور وہ زنانہ کلب میں آنے جانے لگی تھی۔ جہاں کتنی ہی تعلیم یافتہ اور خاندانی عورتیں آتی رہتی تھیں۔ ان میں ووٹ اور حقوق اور آزادی اور نسوانی بیداری کا خوب چرچا ہوتا تھا، جیسے مردوں کے خلاف کوئی سازش کی جارہی ہو۔ زیادہ تر وہی عورتیں تھیں جن کی اپنے شوہروں سے غنی نہ تھی اور جو تعلیم یافتہ ہونے کے سبب قدیم رواجی بندشوں کو توڑ ڈالنا چاہتی تھیں۔ کئی ایسی لڑکیاں بھی تھیں۔ جو ڈگریاں لے چکی تھیں اور ازواجی زندگی کو خوداری کے لیے مہلک سمجھ کر ملازمت کی تلاش میں تھیں۔ ان ہی میں ایک سلطانہ تھیں جو ولایت سے بیرسٹر ہو کر آئی تھیں اور یہاں پردہ نشین عورتوں کو قانونی مشورہ دینے کا پیشہ کرتی تھیں۔ ان ہی کی رائے سے میناکشی نے شوہر پر نان نفعے کا دعویٰ کیا۔ وہ اب اس کے گھر میں نہ رہنا چاہتی تھی۔ گزارے کی اسے ضرورت نہ تھی اور وہ میکے میں بڑے آرام سے رہ سکتی تھی، مگر وہ دگ و بے سنگھ کے چہرے پر کالکھ لگا کر یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ دگ بجے سنگھ نے اس پر الٹا بدچلتی کا الزام لگایا۔ رائے صاحب نے اس لڑائی کو رفع کرنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر میناکشی اب شوہر کی صورت سے بیزار تھی۔ اگرچہ دگ بجے کا دعویٰ خارج ہو گیا تھا۔ اور میناکشی نے ان پر گزارے کی ڈگری پائی مگر وہ بے عزتی اس کے دل میں کانٹا بن کر کھکتی رہی۔ وہ علیحدہ ایک کوشی میں رہتی تھی اور سوشلٹ تحریک میں نمایاں حصہ لیتی تھی، پھر بھی وہ

جلن ٹھنڈی نہ ہوئی تھی۔

ایک روز وہ غصے میں آکر ہنر لیے ہوئے دگ بے سنگھ کے بنگلے میں پہنچی۔ شہدے جمع تھے اور رقاصہ ناچ رہی تھی۔ اس نے جنگ کی دیوی کی طرح شیطانوں کے اس مجمع میں پہنچ کر جھلکا مچا دیا۔ ہنر کھا کر لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس کے رعب کے سامنے وہ کہنے کیا ٹھہرتے؟ جب دگ بے سنگھ تنہا رہ گئے تو اس نے ان پر تراق تراق ہنر جمانے شروع کیے اور اتنا مارا کہ کنور صاحب بے دم ہو گئے۔ رنڈی ابھی تک گوشے میں دبکی ہوئی کھڑی تھی۔ اب اس کا نمبر آیا۔ میناکشی ہنر تان کر اس پر جمانا ہی چاہتی تھی کہ وہ اس کے پیروں میں گر پڑی اور رو کر بولی ”بھوجی، آج میری جان بخشی کریں، میں پھر کبھی یہاں نہ آؤں گی۔ میں بے قصور ہوں۔“

میناکشی نے اس کی طرف نفرت سے دیکھ کر کہا ”ہاں تو بے قصور ہے۔ جانتی ہے ناکہ میں کون ہوں؟ چلی جا، اب یہاں کبھی نہ آنا ہم عورتوں مردوں کی تفریح قییش کا سامان ہی تو ہیں، تیرا کوئی قصور نہیں۔“

میسوانے اس کے پیروں پر سر رکھ کر جوش میں کہا ”خدا آپ کو خوش رکھے، جیسا نام سنتی تھی ویسا ہی پایا۔“

”خوش رکھنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”آپ جو سمجھ مہارانی جی۔“

”نہیں، تم ہی بتاؤ۔“

میسوا کی جان ناخونوں میں آگئی، کہاں سے دعا بھی دینے چلی! جان بچ گئی تھی، چپکے سے اپنی راہ لینا چاہتی تھی۔ دعا دینے کا خط سوار ہوا۔ اب جان کیسے بچے؟ ڈرتے ڈرتے بولے ”سرکار کا اقبال بڑھے، رتبہ بڑھے، نام بڑھے۔“

میناکشی مسکرائی ”ہاں ٹھیک ہے۔“

وہ آکر اپنی موٹر میں بیٹھی، حاکم ضلع کے بنگلے پر پہنچ کر اس واقعہ کی اطلاع دی اور پھر اپنی کوشی کو چلی گئی۔ اس وقت سے عورت مرد ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ دگ بے سنگھ ریوالور لیے اس کی تاک میں پھرا کرتے تھے اور وہ بھی اپنی حفاظت کے لیے دو پہلوان ٹھاکروں کو اپنے ساتھ لیے رہتی تھی۔ اور رائے صاحب نے سکھوں کا جو سورگ بتایا

تھا اسے اپنی ہی زندگی میں غارت ہوتے دیکھ رہے تھے۔ اب دنیا سے مایوس ہو کر ان کی روح اندر کی طرف متوجہ ہو رہی تھی۔ اب تک خواہشات سے جیتے رہنے کی تحریک ملتی رہتی تھی، اب ادھر کا راستہ بند ہو جانے پر ان کا دل خود بخود عبادت کی طرف جھکا۔ جس میں خواہشات سے کہیں زیادہ سچائی تھی۔ جس نئی جائداد کے بھروسے قرض لیا تھا وہ جائداد ادائی کے بغیر ہی ہاتھ سے نکل گئی تھی اور وہ بوجھ سر پر لدا ہوا تھا۔ ہوم ممبری سے اچھی رقم ملتی تھی۔ مگر وہ سب کی سب عہدے کا وقار قائم رکھنے ہی میں صرف ہو جاتی تھی۔ اور رائے صاحب کو اپنی شاہانہ شان و شوکت نباہنے کے لیے وہی اسامیوں پر اضافہ اور بے دخلی کا۔ تا اور ان سے نذرانہ لینا پڑتا تھا جس سے انھیں دلی نفرت تھی۔ وہ رعایا کو تکلیف نہ دینا چاہتے تھے۔ ان کی حالت پر انھیں رحم آتا تھا، مگر اپنی ضروریات سے مجبور تھے مگر موہ انھیں چھوڑنا نہ تھا اور اس کشش میں بھی انھیں سکون نہ ملتا تھا۔ وہ موہ کو چھوڑنا چاہتے تھے مگر موہ انھیں چھوڑنا نہ تھا اور اس کشش میں پڑ کر انھیں ذلت، افسوس اور اضطراب سے چھٹکارا نہ ملتا تھا۔ اور جب دل میں سکون نہیں تو جسم کیسے ٹھیک رہتا؟ صحت قائم رکھنے کی پوری تدبیر کرنے پر بھی ایک نہ ایک روگ لگا رہتا تھا۔ رسوائی میں کبھی طرح کے لذیذ کھانے پکتے تھے مگر ان کی تقدیر میں تو وہی موہ کی دال اور پھلکے تھے۔ اپنے اور بھائیوں کو دیکھتے تھے جو ان سے بھی زیادہ مقروض، پست اور مغموم تھے، جن کی عیش و عشرت و شان و شوکت میں کوئی کمی نہ تھی، مگر ایسی بے حیائی کرنا ان کے امکان سے بعید تھا۔ ان کی روح کے اونچے سنسکaroں کی بربادی نہ ہوئی تھی۔ ظلم، مکاری، بے عزتی اور تکلیف رسانی کو وہ تعلقہ داری کی زینت اور شان و شوکت کا نام دے کر اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکتے تھے، یہی ان کی سب سے بڑی شکست تھی۔

مرزا خورشید نے اسپتال سے نکل ایک نیا کام شروع کر دیا تھا بے فکری سے بیٹھے رہنا ان کے مزاج میں داخل نہ تھا۔ یہ کام کیا تھا۔؟ شہری بیسواؤں کی ایک ٹانگ منڈی منانا۔ فارغ البالی کے زمانے میں انھوں نے خوب عیاشی کی تھی اور ان دنوں اسپتال کے تحفے میں رنخوں کی تکلیف سہتے سہتے ان کا دل بھگتی سے بھر گیا تھا۔ اس زندگی کی یاد کر کے انھیں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اس وقت اگر ان میں سمجھ ہوتی تو وہ لوگوں کی کتنی بھلائی کر سکتے تھے، کتنوں کے رنج و افلاس کا بوجھ ہلکا کر سکتے تھے، مگر وہ دولت انھوں نے عیاشی میں اڑائی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں بکہ مصیبت ہی میں ہماری روح پیدا ہوتی ہے بڑھاپے میں کون اپنی جوانی کی غلطیوں پر افسوس نہیں کرتا؟ کاش وہ وقت عقل اور طاقت کے حاصل کرنے میں لگایا جاتا، نیک اعمالی کا خزانہ بھریا جاتا، تو آج دل کو کتنی تسکین ملتی! وہیں ان کو اس امر کا افسوسناک تجربہ ہوا کہ دنیا میں کوئی اپنا نہیں، کوئی ان کی موت پر دو آنسوں بہانے والا نہیں۔ انھیں رہ رہ کر زندگی کا ایک پرانہ واقعہ یاد آتا تھا۔ بصرہ کے ایک گاؤں میں جب وہ ایک کیپ میں لہیریا سے بیمار پڑے تھے اس وقت ایک دیہاتی لڑکی نے ان کی تیمارداری کتنی جانفشانی سے کی تھی۔ صحت ہو جانے پر جب انھوں نے اسے روپے اور زیوروں سے اس کے احسانوں کا بدلہ چکانا چاہا تو اس نے کس طرح آنکھوں میں آنسوں بھر کر سر نیچا کر لیا تھا اور ان تحائف کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دایوں کی خدمت میں ضبط ہے، قاعدہ ہے، سچائی ہے، مگر وہ محبت کہاں، وہ انہماک کہاں، جو اس لڑکی کی بے مشق اور طفلانہ خدمت میں تھا؟ وہ محبت کی مورت ان کے دل سے کب کی مٹ چکی تھی۔ وہ اس سے پھر آنے کا وعدہ کر کے پھر اس کے پاس نہ گئے۔ عیش و عشرت کی مصروفیتوں میں اس کی یاد ہی نہیں آئی۔ آئی بھی تو اس میں صرف رحم تھا، محبت نہ تھی۔ معلوم نہیں اس لڑکی پر کیا گزری، مگر آج اس کا وہ انکسار، سکون اور سادگی سے بھرا ہوا چہرہ برابر ان کی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتا تھا۔ کاش اس سے شادی کر لی ہوتی تو آج زندگی کتنی پر کیف ہوتی۔ اور اس کے متعلق اس منصفانہ سلوک کی دکھ

بھری یاد نے کل لسوانی طبقے کو ان کی خدمت اور ہمدردی کا مستحق بنا دیا تھا۔ جب تک ندی بڑھاؤ پر تھی، گدے، تیز اور جھاگ دار بہاؤ میں روشنی کی شعائیں بکھر کر رہ جاتی تھیں۔ اب پانی برابر اور برقرار ہو گیا تھا اور کرنیں اس کی تہہ تک پہنچ رہی تھیں۔

مرزا صاحب بسنت کی اس ٹھنڈی شام میں اپنے جھوپڑے کے برآمدے میں دو طوائفوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے کہ مسٹر مہتا آپہنچے۔ مرزا نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور بولے ”میں تو آپ کی خاطر داری کا سامان لیے ہوئے آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔“

دونوں بیسوائیں مسکرائیں۔ مہتا کٹ گئے۔

مرزا نے دونوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور مہتا کو مسند پر بیٹھاتے ہوئے بولے ”میں تو خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میں جو کام کرنے جا رہا ہوں وہ آپ کی مدد کے بغیر پورا نہ ہوگا۔ آپ بس میری پشت پر ہاتھ رکھے رہیے اور لٹکارتے جائیے، ہاں مرزا، بڑھا چل پٹھے!“

مہتا نے ہنس کر کہا ”آپ جس کام میں ہاتھ لگائیں گے اس میں ہم جیسے کتابی کیزوں کی امداد کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ کی عمر مجھ سے زیادہ ہے، دنیا بھی آپ نے خوب دیکھی ہے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمیوں پر اپنا اثر ڈالنے کی جو طاقت آپ میں ہے وہ مجھ میں ہوتی تو میں نے خدا جانے کیا کچھ کر دیا ہوتا۔“

مرزا صاحب نے مختصر الفاظ میں اپنی نئی تجویز بیان کی۔ ان کی رائے تھی کہ حسن کے بازار میں دبی دعوتیں آتی ہیں جنہیں یا تو اپنے گھر میں کسی وجہ سے باعزت قیام نہیں ملتا یا جو مالی تکلیفوں سے مجبور ہو جاتی ہیں اور اگر یہ دونوں مسئلے حل کر دیے جائیں تو بہت کم عورتیں اس طرح ذلیل و خوار ہوں۔

مہتا نے بھی دوسرے سمجھدار لوگوں کی طرح اس مسئلہ پر کافی غور کیا تھا، اور ان کا خیال تھا کہ زیادہ تر فطرتی رجحان اور عیش و عشرت کا شوق ہی عورتوں کو اس طرف کھینچتا ہے۔ اسی بات پر دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑ گئے۔

مہتا نے مٹھی باندھ کر ہوا میں پھٹکتے ہوئے کہا ”آپ نے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا، مرزا صاحب! رزق کے لیے اور بہت سے ذرائع ہیں مگر عیش و آرام کی بھوک

روٹیوں سے نہیں مٹی۔ اس کے لیے دنیا کی بڑھیا بڑھیا چیزیں چاہیے۔ جب تک سوشل نظام اوپر سے نیچے تک بدل نہ ڈالا جائے، اس طرح کی منڈلی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“

مرزا نے سوچیں کھڑی کیں ”اور میں کہتا ہوں کہ یہ محض رزق کا سوال ہے، ہاں یہ سوال سبھی لوگوں کے لیے یکساں نہیں ہے۔ مزدور کے لیے وہ صرف آٹا دال اور ایک پھولس کی جھونپڑی کا سوال ہے۔ وکیل کے لیے وہ ایک موٹر، بنگلہ اور خدمت گاروں کا سوال ہے۔ آدمی صرف روٹی نہیں چاہتا اور بھی بہت سی چیزیں چاہتا ہے۔ اگر عورتوں کے سامنے بھی وہ سوال انواع و اقسام کی صورتوں میں آتا ہے تو ان کا کیا قصور ہے؟“

ڈاکٹر مہتا اگر غور کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ ان میں اور مرزا میں کوئی فرق نہیں، صرف الفاظ کا رد و بدل ہے، مگر بحث کی گرما گرمی میں غور کرنے کے لیے صبر کہاں؟ گرم ہو کر بولے ”معاف کیجیے گا مرزا صاحب، جب تک دنیا میں دولت والے رہیں گے، بیسوائیں بھی رہیں گی، آپ کی منڈلی اگر کامیاب بھی ہو جائے، حالانکہ مجھے اس میں بہت شک ہے، تو آپ دس پانچ عورتوں سے زیادہ اس میں کبھی نہ لے سکیں گے اور وہ تھوڑے دنوں کے لیے۔ سبھی عورتوں میں نانک کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی، اسی طرح جیسے سبھی لوگ شاعر نہیں ہو سکتے، اور یہ بھی مان لیں کہ یہ عورتیں آپ کی منڈلی میں مستقل طور پر ٹھہر جائیں گی تو بھی بازار میں ان کی جگہ خالی نہ رہے گی۔ جڑ پر جب تک کھلاڑے نہ چلیں گے، پتیاں توڑنے سے کوئی نتیجہ نہیں۔ دولت والوں میں کبھی کبھی ایسے لوگ نکل آتے ہیں جو سب کچھ چھوڑ کر خدا کی راہ میں جا بیٹھتے ہیں۔ مگر دولت کا راج بدستور قائم ہے۔ اس میں ذرا بھی زوال نہیں آنے پایا۔“

مرزا کو مہتا کی ہٹ دھرمی پر رنج ہوا۔ اتنا پڑھا لکھا سمجھدار آدمی ایسی باتیں کرے! سوشل نظام کیا آسانی سے بدل جائے گا؟ وہ تو صدیوں کا معاملہ ہے۔ تب تک کیا یہ اندھیر ہونے دیا جائے؟ اس کی روک تھام نہ کی جائے؟ کیوں نہ شیر کو ہنجرہ میں بند کر دیا جائے کہ وہ دانت اور ناخون رکھتے ہوئے بھی کسی کو نقصان نہ پہنچا سکے؟ کیا اس وقت تک خاموش بیٹھا رہا جائے جب تک شیر اہنسا کا برت نہ لے لے؟ دولت والے اور جس طرح چاہیں اپنی دولت اڑائیں، مرزا کو غم نہیں۔ شراب میں ڈوب جائیں، موٹر کی مالا گلے میں ڈال لے، قلعے بنوائیں، دھرم شالیں اور مسجدیں کھڑی کریں، مرزا کو کوئی پرواہ نہیں۔

ہاں عورتوں کی زندگی نہ خراب کریں۔ اسے مرزا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ حسن کے بازار کو ایسا سنان کر دیں گے کہ دولت مندوں کی اشرافیوں پر کوئی تھوکنے والا بھی نہ ملے۔ کیا جن دنوں شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ ہوتی تھی بڑے بڑے شرابی پانی پی کر دل کی آگ نہیں بجھا لیتے تھے؟

مہتا نے مرزا کی بے وقوفی پر ہنس کر کہا ”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں کسبیاں نہیں ہیں، مگر امیروں کی دولت وہاں بھی اپنی دلچسپیوں کا سامان پیدا کر ہی لیتی ہے۔“

مرزا بھی مہتا کی نادانی پر ہنسے ”جانتا ہوں مہریان، جانتا ہوں! آپ کی دعا سے دنیا دیکھ چکا ہوں، مگر یہ ہندستان ہے، یورپ نہیں ہے۔“

”انسانی سرشت ساری دنیا میں ایک سی ہے۔“

”مگر یہ بھی معلوم رہے کہ ہر قوم میں ایک ایسی چیز ہوتی ہے جسے اس کی روح کہہ

سکتے ہیں، اور عصمت ہندوستانی تہذیب کی روح ہے۔“

”اپنے منہ میاں مٹھو بن لیجیے۔“

”دولت کی آپ اتنی برائی کرتے ہیں پھر بھی کھانا کی حمایت کرتے نہیں تھکتے نہ

کہیے گا!“

مہتا کی تیزی رخصت ہو گئی، انکسار سے بولے ”میں نے کھانا کی حمایت اس وقت کی جب وہ دولت کے پونجے سے چھوٹ گئے ہیں، اور آج کل ان کی حالت آپ دیکھیں تو آپ کو رحم آئے گا۔ اور میں کیا حمایت کروں گا جسے اپنی کتابوں اور لائبریری سے فرصت نہیں؟ زیادہ سے زیادہ خشک ہمدردی ہی تو کر سکتا ہوں۔ حمایت کی ہے مس مالتی نے کہ کھانا کو بچا لیا۔ انسان کی گہرائیوں میں ایثار کی کتنی طاقت چھپی ہوتی ہے۔ اس کا مجھے اب تک تجربہ نہ ہوا تھا۔ آپ بھی ایک دن کھانا سے مل آئیے۔ طبیعت خوش ہو جائے گی اس وقت اسے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہمدردی ہے۔“

مرزا نے جیسے اپنے مرضی کے خلاف کہا ”آپ کہتے ہیں تو جاؤں گا۔ آپ کے ساتھ جہنم میں بھی عذر نہیں۔ مگر مس مالتی سے تو آپ کی شادی ہونے والی تھی۔ بڑی گرم خبر تھی۔“

مہتا نے جھینپتے ہوئے کہا ”ریاضت کر رہا ہوں ، دیکھے، ثمرہ کب ملے۔“
”اجی وہ تو آپ پر مرتی تھی۔“

”مجھے بھی وہم ہوا تھا ، مگر جب میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا تو دیکھا کہ وہ آسمان میں جا بیٹھی ہے۔ اس بلندی تک تو میں کیا پہنچوں گا ، ہاں اسی سے التجا کر رہا ہوں کہ نیچے آجائے۔ آج کل تو وہ مجھ سے بولتی بھی نہیں۔“

یہ کہتے ہوئے مہتا زور سے ایک روتی ہوئی ہنسی بنے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

مرزانے پوچھا ”اب پھر کب ملاقات ہوگی؟“

”اب کے آپ کو تکلیف کرنی پڑے گی۔ کھانا کے پاس جاییے گا ضرور!“
”جاؤں گا۔“

مرزانے کھڑکی سے مہتا کو جاتے دیکھا۔ رفتار میں وہ تیزی نہ تھی ، جیسے کسی فکر میں

ڈوبے ہوئے ہوں۔

ڈاکٹر مہتا مٹجن سے محض ہو گئے ہیں۔ مالتی سے دور دور رہ کر انھیں یہ شک ہونے لگا ہے کہ کہیں اسے کھو نہ بیٹھیں۔ کئی مہینے سے مالتی ان کے پاس نہ آئی تھی اور جب وہ بے قرار ہو کر اس کے گھر گئے تو ملاقات نہ ہوئی۔ جن دنوں رور پال اور سروج کا عشقیہ واقعہ ہو رہا تھا تو مالتی ان کی صلاح لینے عموماً روزانہ دو ایک بار آتی تھی۔ مگر جب سے دونوں انگلستان چلے گئے تھے، ان کا آنا جانا بند ہو گیا تھا گھر پر بھی مشکل سے ملتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے بچتی ہے، گویا ان کی طرف سے اپنے دل کو جبراً ہٹا لینا چاہتی ہے۔ جس کتاب کو وہ آج کل لکھ رہے تھے وہ آگے بڑھنے سے انکار کر رہی تھی گویا ان کی توجہ مفقود ہو گئی ہو۔ خانہ داری کے انتظام میں تو وہ کبھی بڑے ہوشیار تھے۔ فی الجملہ ایک ہزار روپے سے زیادہ مہینے میں کما لیتے تھے۔ مگر بچت کی ایک کوزی بھی نہ ہوتی تھی۔ روٹی دال کھانے کے سوا اور ان کے ہاتھ کچھ نہ لگتا تھا۔ تکلف کا اگر کوئی سامان تھا تو وہ ان کا موثر تھا جسے وہ خود چلاتے تھے۔ کچھ روپے کتابوں میں اڑ جاتے تھے، کچھ چندوں میں، کچھ غریب طلبا کی امداد میں اور کچھ باغ کی آرائش میں جس سے انھیں عشق سا تھا۔ طرح طرح کے پودے اور نباتاتی نمونے بدیسوں سے مہنگے داموں منگانا اور ان کی داشت کرنا، یہی ان کا چنورا پن تھا۔ مگر ادھر کئی مہینے سے اس باغیچے کی طرف سے بھی کچھ بیزار سے ہو رہے تھے۔ اور گھر کا انتظام بھی اتر ہو گیا تھا۔ کھاتے دو پھلکے اور خرچ ہوتا ایک سو سے زیادہ۔ اچکن پرانی ہو گئی تھی مگر اسی میں انھوں نے کڑا کے کا جاڑا کاٹ دیا، نئی اچکن سلانے کی توفیق نہ ہوئی۔ کبھی کبھی بلا سگی کی دال کھا کر اٹھ آتا پڑتا۔ کب سگی کا کنسر منگایا تھا، اس کی انھیں یاد ہی نہ تھی، اور مہراج سے پوچھیں بھی تو کیسے؟ وہ سمجھے گا نہیں کہ اس پر بے اعتباری ہو رہی ہے؟ آخر ایک روز جب تین مرتبہ کی مایوسیوں کے بعد چھوٹی مرتبہ ملاقات ہوئی اور اس نے ان کی حالت دیکھی تو اس سے نہ رہا گیا۔ بولی ”تم کیا اب کے جاڑا یوں ہی کاٹ دو گے؟ یہ اچکن پہنتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی؟“

مالتی ان کی بیوی نہ ہو کر بھی ان کے اتنے پاس تھی کہ یہ سوال اس نے اسی معمولی انداز سے کیا جس طرح وہ اپنے کسی یگانے سے کرتی۔

مہتا نے بلاشرمائے ہوئے کہا ”کیا کروں مالتی پیسہ تو بچتا ہی نہیں۔“

مالتی کو تعجب ہوا ”تم ایک ہزار سے زیادہ کماتے ہو اور تمہارے پاس اپنے کپڑے بنوانے کو بھی پیسے نہیں؟ میری آمدنی کبھی چار سو سے زیادہ نہ تھی مگر میں اس میں ساری گرتی چلاتی ہوں اور کچھ بچا بھی لیتی ہوں۔ آخر تم کیا کر ڈالتے ہو؟“

”میں ایک پیسہ بھی فالتو نہیں خرچ کرتا۔ مجھے کوئی ایسا شوق بھی تو نہیں ہے۔“

”اچھا تو مجھ سے روپیہ لے جاؤ اور دو اچکنیں بنالو۔“

”مہتا نے خجالت سے کہا ”اب کے بنالوں کا، سچ کہتا ہوں۔“

”اب آپ یہاں آئیں تو آدمی بن کر آئیں۔“

”یہ تو بڑی کڑی شرط ہے۔“

”کڑی سہی۔ تم جیسے کے ساتھ کڑائی کیے بغیر بھی تو کام نہیں چلتا۔“

مگر وہاں تو صندوق خالی تھا اور پیسے کے بغیر کسی دوکان پر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مالتی کے گھر جائے کس منہ سے؟ دل تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ ایک دن ایک نئی مصیبت آپڑی۔ ادھر کئی مہینے سے مکان کا کرایہ نہیں دیا تھا۔ پچھتر روپے ماہوار بڑھتے جاتے تھے۔ مالک مکان نے جب کئی تقاضوں کے بعد بھی روپے نہ وصول کر پائے تو نوٹس دے دیا۔ مگر نوٹس روپے بنانے کی مشین تو ہے نہیں۔ تاریخ نکل گئی اور روپے نہ پہنچے۔ تب مالک مکان نے مجبور ہو کر تالش کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ مہتا جی بڑے شریف اور فیاض آدمی ہیں مگر اس سے زیادہ بھلمنسی وہ کیا کرتا کہ چھ ماہ تک صبر کیے بیٹھا رہا؟ مہتا نے کوئی پیر دی نہ کی اور ایک طرفہ ڈگری ہو گئی۔ مالک نے فوراً ڈگری جاری کرائی اور قرق امین مہتا صاحب کے پاس پہلی اطلاع دینے آیا؛ کیونکہ اس کا لڑکا یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور اسے مہتا صاحب کچھ وظیفہ بھی دیتے تھے۔ اتفاقاً اس وقت مالتی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ بولی ”کیسی قرتی ہے؟ کس بات کی؟“

امین نے کہا ”وہی کرایہ کی ڈگری جو ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ حضور کو اطلاع دے

دوں۔ چار پانچ سو کا معاملہ ہے، کون سی بڑی رقم ہے؟ دس دن میں بھی روپے دے دیجیے تو

کوئی خرچ نہیں۔ میں مہاجن کو دس دن تک الجھائے رکھوں گا۔“

جب امین چلا گیا تو مالتی نے حقارت کے لہجے میں پوچھا ”تو اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی! مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تم اتنی موٹی موٹی کتابیں کیسے لکھتے ہو۔ مکان کا کرایہ چھ ماہ سے باقی پڑا ہے اور تمہیں خبر نہیں۔“

مہتا شرم سے سر جھکا کر بولے ”خبر کیوں نہیں ہے، لیکن روپے بچتے ہی نہیں۔ میں ایک پیسہ بھی فضول صرف نہیں کرتا۔“

”کوئی حساب کتاب بھی ہے؟“

”حساب کیوں نہیں لکھتا۔ جو کچھ پاتا ہوں وہ سب درج کر لیتا ہوں ورنہ انکم ٹیکس والے زندہ نہ چھوڑیں۔“

”جو کچھ خرچ کرتے ہو وہ؟“

”اس کا تو کوئی حساب نہیں رکھتا۔“

”کیوں؟“

”کون لکھے؟ بوجھ سا لگتا ہے۔“

”اور یہ پوتھے کیسے لکھ ڈالتے ہو؟“

”اس میں تو زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ قلم لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور لکھنے لگتا ہوں۔ ہر وقت خرچ کا کھانا کھول کر تو نہیں بیٹھتا۔“

”تو یہ روپے کیسے ادا کر دے؟“

”کسی سے قرض لے لوں گا، تمہارے پاس ہو تو تم ہی دے دو۔“

”میں تو ایک ہی شرط پر دے سکتی ہوں کہ تمہاری آمدنی سب میرے ہاتھ آئے اور خرچ بھی میرے ہی ہاتھ ہو۔“

مہتا خوش ہو کر بولے ”واہ! اگر یہ ذمہ داری لے لو تو کیا کہنا! موسلوں سے ڈھول بجاؤں!“

مالتی نے ڈگری کے روپے دے دیے اور دوسرے ہی روز مہتا کو بنگلہ خالی کر دینے پر مجبور کیا۔ اپنے بنگلے میں اس نے انھیں دو بڑے بڑے کمرے دے دیے۔ ان کے کھانے وغیرہ کا بندوبست بھی اپنے ہی گھر میں کر دیا۔ مہتا کے پاس اور سامان تو زیادہ نہ تھا مگر کتابیں کئی

گازی تھیں۔ ان کے دونوں کمرے کتابوں سے بھر گئے۔ باغیچہ چھوڑنے کا انھیں ضرور قلق ہوا لیکن مالتی نے اپنا پورا احاطہ ان کے لیے چھوڑ دیا تھا کہ جو پھول پودے چاہیں، لگائیں۔

مہتا تو بے فکر ہو گئے مگر مالتی کو ان کی اور خرچ کے ٹھیک کرنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے دیکھا کہ آمدنی تو ہزار سے زیادہ ہے مگر وہ ساری کی ساری خفیہ خیرات میں صرف ہو جاتی ہے۔ بیس پچیس لڑکے انھیں سے وظیفہ پا کر اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ بیواؤں کی تعداد بھی اس سے کم نہ تھی۔ کس خرچ میں کمی کرے اسے یہ نہ سوچتا تھا۔ سارا الزام اسی کے سر منڈھا جائے گا۔ ساری بدنامی اسی کے حصہ میں آئے گی۔ کبھی مہتا پر جھنجھلائی، کبھی اپنے اوپر اور کبھی سالکوں کے اوپر جو ایک سادہ اور سخی آدمی پر اپنا بار رکھتے ہوئے ذرا بھی نہ شرماتے تھے۔ یہ دیکھ کر اور بھی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ ان خیرات لینے والوں میں کچھ تو اس کے مستحق نہ تھے۔ ایک روز مہتا کو آڑے ہاتھوں لیا۔

مہتا نے اس کا اعتراض سن کر بے فکری سے کہا ”تمہیں اختیار ہے کہ جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو۔ مجھ سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ جواب بھی تم ہی کو دینا پڑے گا۔“

مالتی نے چڑھ کر کہا ”ہاں، اور کیا؟ نیک نامی تم لو اور بدنامی میری ہو۔ میں نہیں سمجھتی کہ تم کس دلیل سے اس خیرات کی حمایت کر سکتے ہو۔ انسانوں کو اس رواج نے جتنا کابل اور مفت خور بنایا ہے اور اس کی خودداری کو جتنا دھکا پہنچایا ہے، اتنا بے انصافی نے بھی نہ کیا ہوگا؛ بلکہ میرے خیال میں بے انصافی نے انسانوں میں انقلابی جذبہ پیدا کر کے سماج کو برا نفع پہنچایا ہے۔“

مہتا نے تسلیم کیا ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”تمہارا یہ خیال نہیں ہے۔“

”نہیں مالتی، میں سچ کہتا ہوں۔“

”تو خیال اور عمل میں اتنا فرق کیوں؟“

مالتی نے تیسرے مہینے بہتوں کو مایوس کیا۔ کسی کو صاف جواب دیا کسی سے مجبوری جتائی اور کسی کی فضیلت کی۔

مہتا صاحب کا بجٹ تو رفتہ رفتہ ٹھیک ہو گیا۔ مگر اس سے انھیں ایک طرح کا رنج ہوا۔

مالتی نے جب تیسرے مہینے میں تین سو کی بچت دکھائی تب وہ اس سے کچھ بولے تو نہیں مگر ان کی نظر میں ان کی عظمت کچھ کم ضرور ہو گئی۔ عورت میں دان اور تیاگ ہونا چاہیے۔ یہی اس کی سب سے بڑی پونجی ہے۔ اسی کی بنیاد پر سوسائٹی کا محل کھڑا ہوا ہے۔ تجارتی عقل کو وہ ضروری برائی ہی سمجھتے تھے۔

جب مہتا کی اچکنیں بن کر آئیں اور نئی گھڑی بھی آئی تو وہ شرم کے مارے کئی دن باہر نہ نکلے۔ خود آرائی سے بڑا ان کی نظر میں کوئی گناہ نہ تھا۔

مگر راز کی بات یہ تھی کہ مالتی ان کو تو حسابی ٹکٹے میں کس کر رکھنا چاہتی تھی۔ ان کی مالی خیرات کا دروازہ بند کر دینا چاہتی تھی اور خود ذاتی ایثار میں اپنے وقت اور اپنی خیراندیشی کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتی تھی، امیروں کے گھر تو وہ بلا فیس لیے نہ جاتی تھی، مگر غریبوں کو مفت دیکھتی تھی اور مفت دوا بھی دیتی تھی۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہی تھا کہ مالتی گھر کی تھی اور باہر کی بھی۔ جبکہ مہتا صرف باہر کے تھے، مگر ان کے لیے نہ تھا۔ اپنے کو دونوں مٹا دینا چاہتے تھے۔ مہتا کا راستہ صاف تھا۔ ان پر ذاتی ذمہ داری کے سوا اور کوئی بندش نہ تھی۔ مالتی کا راستہ مشکل تھا۔ اس پر ذمہ داری تھی اور بندش تھی جسے نہ تو وہ توڑ سکتی تھی اور نہ توڑنا چاہتی تھی۔ اس بندش میں اسے زندگی کی تحریک ملتی تھی۔ اسے اب مہتا کو پاس دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کھلے جنگل میں گھومنے والے جیو کو بنجرے میں بند نہیں کر سکتی، اور بند کر دے گی، تو وہ بانٹنے اور نوچنے دوڑے گا۔ بنجرے میں سب طرح کا آرام ملنے پر بھی اس کا دل ہمیشہ جنگل کے لیے بے قرار رہے گا۔ مہتا کے لیے گھر کی دنیا ایک اجنبی دنیا تھی۔ جس کے رسم و رواج سے وہ نا آشنا تھے۔

انھوں نے دنیا کو باہر سے دیکھا تھا اور اسے مکرو فریب ہی سے معمور سمجھتے تھے۔ جدھر دیکھتے تھے، ادھر ہی برائیاں نظر آتی تھیں۔ مگر سماج میں جب گہرائی تک جا کر دیکھا تو انھیں معلوم ہوا کہ ان برائیوں کے نیچے ایثار بھی ہے، محبت بھی ہے، اس شک و شبہ کے حالت میں جب مالتی کا تاریکی سے ٹکٹا ہوا دیوی کا روپ انھیں نظر آیا تب وہ اس کی طرف عجلت اور بے مبری کے ساتھ دوڑ پڑے اور چاہا کہ اسے ایسی حکمت سے چھپا کر رکھیں کہ کسی دوسرے کی آنکھ بھی نہ پڑے۔ یہ خیال نہ رہا کہ یہ انتہائی رغبت ہی تباہی کی جڑ ہے۔ محبت جیسی بے مروت شے کیا خوف سے باندھ کر رکھی جاسکتی ہے؟ وہ تو پورا اعتبار چاہتی ہے،

پوری آزادی چاہتی ہے اور پوری ذمہ داری چاہتی ہے۔ اس کے نشو و نما کی طاقت اس کے اندر ہے۔ اسے روشنی اور فضا ملتی چاہیے۔ وہ کوئی دیوار نہیں ہے جس پر اوپر سے اینٹیں رکھی جاتی ہیں۔ اس میں تو جان ہے، ارتقاء ہے اور پھیلنے کی بے حد سکت ہے۔

جب سے مہتا اس بنگلے میں آئے، انھیں مالٹی سے دن میں کئی بار ملنے کا موقع ملا ہے۔ ان کے دوست سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے بیاہ کی تیاری ہے اور صرف رسم ادا کی کی دیر ہے۔ مہتا بھی یہی خواب دیکھتے ہیں۔ اگر مالٹی نے انھیں سدا کے لیے ٹھکرا دیا ہوتا تو کیوں اس سے اتنی محبت رکھتی؟ شاید وہ انھیں سوچنے کا موقع دے رہی ہے، اور وہ خوب سوچ کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مالٹی کے بغیر وہ نصف ہیں اور وہی انھیں تکمیل کی طرف لے جاسکتی ہے۔ باہر سے وہ رنگین مزاج ہے مگر اندر سے وہی رجمان طاقت کا مرکز ہے۔ حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ پہلے مالٹی پیاسی تھی اور اب مہتا پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور ایک مرتبہ جواب پا جانے کے بعد انھیں اس مسئلہ پر مالٹی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی، اگرچہ ان کے دل میں اب شک کا نام بھی نہیں رہا۔ مالٹی کو قریب سے دیکھ کر ان کی کشش بڑھتی ہی جاتی ہے۔ دور سے کتاب کے جو حروف ملے جلے سے لگتے تھے اب قریب سے وہ صاف ہو گئے ہیں۔ ان میں مطلب ہے، اور پیغام ہے!

ادھر مالٹی نے باغ میں مالی کا کام کرنے کے لیے گوبر کو رکھ لیا تھا۔ ایک روز وہ کسی مریض کو دیکھ کر آ رہی تھی کہ راستے میں پیٹرول ختم ہو گیا۔ وہ خود موٹر چلا رہی تھی فکر ہوئی کہ پیٹرول کیسے آئے۔ رات کے نو بج گئے تھے اور ماگھ کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ سڑکوں پر سناٹا ہو گیا تھا۔ کوئی ایسا آدمی نظر نہ آتا تھا جو موٹر کو دھکیل کر پیٹرول کی دکان تک لے جائے۔ بار بار نوکر پر جھنجھلا رہی تھی۔ ”حرام خور کہیں کا! بے خبر پڑا رہتا ہے!“

اتفاقاً گوبر ادھر سے آ نکلا مالٹی کو کھڑے دیکھ کر اس نے سب سمجھ لیا اور گاڑی کو دو فرلانگ دھکیل کر پیٹرول کی دکان تک لایا۔

مالٹی نے خوش ہو کر پوچھا ”نوکری کرو گے؟“

گوبر نے شکریے کے ساتھ منظور کیا۔ پندرہ روپے تنخواہ ملے ہوئی۔ مالی کا کام اسے پسند تھا۔ یہی کام اس نے کیا تھا اور اس میں مشاق تھا۔ مل کی مزدوری میں اجرت زیادہ ملتی تھی مگر اس میں اس کو ابھرن ہوتی تھی۔

دوسرے دن سے گوہر نے مالتی کے یہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ اسے رہنے کو ایک کوٹھری بھی مل گئی۔ جھنڈا بھی آگئی۔ مالتی باغ میں آتی تو اسے جھنڈا کا بچہ دھول مٹی میں کھلتا ہوا ملتا۔ ایک دن مالتی نے اسے مٹھائی دے دی۔ بچہ اس دن سے مانوس ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے پیچھے لگ جاتا اور جب تک مٹھائی نہ لے لیتا پیچھا نہ چھوڑتا۔

ایک دن مالتی باغ میں آئی تو بچہ نہ دکھائی دیا۔ جھنڈا سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بچہ کو بخار آگیا ہے۔ مالتی نے گھبرا کر کہا ”بخار آگیا تو میرے پاس کیوں نہیں لائی؟ چل دیکھوں۔“

بچہ کھولے میں بخار سے غافل پڑا تھا۔ کچیریل کی کوٹھری میں اتنی نمی، اتنی تاریکی اور ان جازوں کے دنوں میں بھی محسوس کی اتنی کثرت تھی کہ مالتی ایک منٹ بھی وہاں نہ ٹھہر سکی۔ فوراً آکر تھرما میٹر لیا۔ اور پھر جاکر دیکھا تو بخار ایک سو چار تھا۔ مالتی کو اندیشہ ہوا کہ کہیں بچہ نہ ہو۔ بچے کے ابھی تک ٹینک نہ لگا تھا اور اگر اس غم کوٹھری میں رہا تو اندیشہ تھا کہ بخار نہ بڑھ جائے۔

دفعتاً بچے نے آنکھیں کھول دیں اور مالتی کو کھڑا دیکھ کر رونی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی گود کے لیے ہاتھ پھیلا دیے۔ مالتی نے اسے گود میں اٹھا لیا اور تھکیاں دینے لگی۔

بچہ مالتی کی گود میں جا کر جیسے کسی بڑے سکھ کا احساس کرنے لگا اور اپنی جلتی ہوئی انگلیوں سے اس کے گلے کی موتیوں کی مالا پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ مالتی نے نکلیں اتار کر اس کے گلے میں ڈال دی۔ بچے کی خود غرضانہ فطرت اس حالت میں بھی بے قرار تھی۔ نکلیں پا کر اب اسے گود میں رہنے کی کوئی ایسی ضرورت نہ رہی۔ یہاں نکلیں کے چھن جانے کا خوف تھا۔ اس وقت جھنڈا کی گود زیادہ محفوظ تھی۔

مالتی نے نگاہتہ دلی سے کہا ”بڑا چالاک ہے، چیز لے کر کیسا بھاگا!“

جھنڈا نے کہا ”دے دو بیٹا، مس صاحب کا ہے۔“

بچے نے مالا کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور ماں کی طرف غصہ سے دیکھا۔ مالتی بولی ”

تم پہنے رہو بچہ، میں مانگتی نہیں ہوں۔“

اسی وقت جنگلے میں آکر اس نے اپنی نشست کا کمرہ خالی کر دیا اور اسی وقت جھنڈا اس

میں آکر مقیم ہو گئی۔ منگل نے اس بہت کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھا۔ چھت میں پنگھا تھا، رنگین برقی بلب تھے، دیواروں پر تصویریں تھیں۔ ان چیزوں کو دیر تک گنگلی لگائے دیکھتا رہا۔ مالتی نے بڑے پیار سے پکارا ”منگل!“

منگل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ”آج تو ہنسنا نہیں جاتا صاحب! کیا کروں؟ آپ سے کچھ ہو سکے تو کیجیے۔“

مالتی نے جھینا کو بہت سی باتیں سمجھائیں اور جاتے ہوئے پوچھا ”تیرے گھر میں کوئی دوسری عورت ہو تو گوبر سے کہہ دے کہ دو چار روز کے لیے بلالائے۔ مجھے چچک کا اندیشہ ہے۔ کتنی دور ہے تیرا گھر؟“

جھینا نے اپنے گاؤں کا نام اور پتہ بتایا۔ ”اٹھارہ بیس کوس کے قریب ہوگا۔“ مالتی کو بلاری یاد تھا۔ بولی ”وہی گاؤں تو نہیں جس کے پچھم طرف آدھے میل پر ندی ہے؟“

”ہاں ہاں صاحب، وہی گاؤں ہے۔ آپ کو کیسے معلوم؟“

”ایک بار ہم لوگ وہاں گئے تھے اور ہواری کے گھر ٹھہرے تھے۔ تو، اسے جانتی ہے؟“

”وہ تو میرے سر ہیں، مس صاحب، میری ساس بھی ملی ہوں گی۔“

”ہاں ہاں، بڑی سمجھدار عورت معلوم ہوتی تھی۔ مجھ سے خوب باتیں کرتی رہی۔ تو گوبر کو بھیج دے، اپنی ماں کو بلالائے۔“

”وہ انھیں بلانے نہ جائیں گے۔“

”کیوں؟“

”کچھ ایسا ہی کارن ہے۔“

جھینا کو اپنے گھر کا چوکا برتن، روٹی پانی اور جھاڑنا سبھی کچھ کرنا پڑتا تھا۔ دن کو تو دونوں چر بن پر رہ جاتے تھے اور رات کو جب مالتی آ جاتی تو جھینا اپنا کھانا پکاتی اور مالتی بچے کے پاس بیٹھتی۔ جھینا بار بار چاہتی کے بچے کے پاس بیٹھے مگر مالتی اسے نہ آنے دیتی۔ رات کو بچے کا بخار تیز ہو جاتا اور وہ بے چینی سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیتا۔ مالتی اسے گود میں لے کر گھنٹوں کمرے میں شہلٹی، چوتھے دن چچک نکل آئی۔ مالتی نے سارے گھر کو ٹیکہ لگایا،

خود اپنے لگایا اور مہتا کو بھی لگایا۔ گوہر، جھنڈا، مہراج کوئی نہ بچا۔ پہلے دن تو دانے چھوٹے اور الگ الگ تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹی چپک ہے۔ دوسرے دن دانے جیسے کھل اٹھے اور انگوڑے کے برابر ہو گئے۔ اور پھر کئی کئی دن لے کر بڑے بڑے آنولہ سے ہو گئے۔ منگل جلن اور کھجلی اور درد سے بے چین ہو کر دکھ بھری آواز میں کراہتا اور عاجزی اور بے چارگی بھری نظروں سے مالٹی کی طرف دیکھتا۔ اس کا کراہتا بھی بڑوں کا سا تھا اور نگاہوں میں بھی پتھلی تھی، گویا وہ یکا یک جوان ہو گیا ہو۔ اس نہ سہنے قابل تکلیف نے گویا اس کے معصوم بچپن کو مٹا ڈالا تھا۔ اس کی مظلانہ عقل گویا وسعت پا کر یہ سمجھ رہی تھی کہ مالٹی ہی کے جتن سے وہ اچھا ہو سکتا ہے۔ مالٹی جیوں ہی کسی کام سے چلی جاتی تو وہ رونے لگتا اور مالٹی کے آتے ہی چپ ہو جاتا۔ رات کو اس کی بے چینی بڑھ جاتی اور مالٹی کو عموماً ساری ساری رات بیٹھنا پڑ جاتا۔ مگر وہ نہ کبھی جھنجھلاتی نہ کبھی چڑھتی۔ ہاں، جھنڈا پر اسے ضرور کبھی کبھی غصہ آتا، کیونکہ وہ اپنی نادانی کے سبب نہ کرنے والا کام بھی کر بیٹھتی۔ گوہر اور جھنڈا دونوں کا جھاڑ پھونک پر زیادہ اعتقاد تھا، مگر یہاں اس کا کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اس پر جھنڈا دو بچوں کی ماں ہو کر بھی بچے کی داشت کرنا نہیں جانتی تھی۔ منگل دق کرتا تو اسے ڈانٹی، ڈپٹی۔ ذرا بھی موقع پاتی تو زمین پر سو جاتی اور صبح سے پہلے نہ اٹھتی۔ اور گوہر تو اس کمرے میں جیسے آتے ڈرتا تھا۔ مالٹی وہاں بیٹھی ہے، کیسے جائے؟ جھنڈا سے بچے کا حال پوچھ لیتا اور کھاپی کر سو جاتا۔ اس پرانی چوٹ کے بعد وہ پورا تندرست نہ ہو پایا تھا۔ ذرا سا کام کر کے بھی تھک جاتا تھا۔ ان دنوں جب جھنڈا گھاس بیجتی تھی اور وہ آرام سے پڑا رہتا تھا تب کچھ سنبھل گیا تھا۔ مگر ادھر کئی مہینوں تک بوجھ ڈھونے اور چونے مارے کا کام کرنے سے اس کی حالت پھر گر گئی تھی۔ اس پر یہاں کام بہت تھا۔ سارے باغ کو سینچنا، کیاریوں کو گوزنا، گھاس چھیلنا، گایوں کو چارہ پانی دینا اور دوہنا۔ اور جو مالک اتنا رحم دل ہو اس کے کام میں تساہلی کیسے کرے؟ یہ احسان اسے ایک منٹ بھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ اور جب مہتا خود کھرہ لے کر گھنٹوں باغ میں کام کرتے تھے تو وہ کیسے آرام کرتا؟ وہ خود سوکھتا جاتا مگر باغ ہرا ہو رہا تھا۔

مہتا کو بھی بچے سے محبت ہو گئی تھی۔ ایک روز مالٹی نے اسے گود میں لے کر اس کی مونچھیں اکھڑوالی تھیں۔ دُشت نے مونچھوں کو ایسا پکڑا تھا جیسے جڑ سے اکھاڑے گا۔ مہتا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور انھوں نے گہر کر کہا تھا، ”بڑا شیطان لونڈا ہے۔“

مالتی نے انھیں ڈانٹا تھا ”تم مونچھیں صاف کیوں نہیں کر لیتے۔“

”میری مونچھیں مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔“

”اب کے پکڑ لے گا تو اکھاڑ ہی کے چھوڑے گا۔“

”میں اس کے کان بھی اکھاڑ لوں گا۔“

منگل کو اس کی مونچھیں اکھاڑنے میں کوئی خاص مزا آتا تھا۔ وہ خوب کھلکھلا کر ہنستا تھا اور مونچھوں کو اور زیادہ زور سے کھینچتا تھا۔ مگر مہتا کو بھی شاید مونچھیں اکھڑوانے میں مزا آتا تھا کیونکہ وہ عموماً دو ایک بار روزانہ اس سے اپنی مونچھوں کی رسہ کشی کرا لیا کرتے تھے۔

ادھر جب سے منگل کو چچک نکل آئی تھی۔ مہتا کو بڑی تشویش ہو گئی تھی۔ اکثر کمرے میں جا کر منگل کو مغموم آنکھوں سے دیکھا کرتے۔ اس کی تکلیف کے خیال سے ان کا نرم و نازک دل کانپ جاتا تھا۔ ان کی دوڑ دھوپ سے وہ اچھا ہو جاتا تو وہ زمین کے دوسرے سرے تک بھی دوڑ لگاتے۔ روپے خرچ کرنے سے اچھا ہوتا تو خواہ انھیں بھیک ہی مانگنا پڑتا وہ اسے اچھا کر ہی کے رہتے مگر یہاں کوئی بس نہ تھا۔ اسے چھوتے ہوئے بھی ان کے ہاتھ لرزتے تھے۔ کہیں اس کے آبلے نہ ٹوٹ جائیں۔ مالتی کتنی آہستگی سے اٹھاتی ہے، کندھے پر بیٹھا کر کمرے میں نہلتی ہے اور کتنی محبت سے اسے بہلا کر دودھ پلاتی ہے، یہ مادرانہ محبت مالتی کو ان کی نظروں میں نہ جانے کتنا اونچا اٹھا دیتی ہے۔ مالتی صرف عورت نہیں بلکہ ایک ماں بھی ہے، اور ایسی ویسی ماں نہیں بلکہ اصلی معنی میں ماں اور دیوی، اور زندگی دینے والی۔ جو پرائے بچوں کو بھی اپنا سمجھ سکتی ہے گویا اس نے مادری جذبات کو سدا سے فراہم کیا ہو اور آج انھیں دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہو! اس کے عضو عضو سے مادریت پھوٹی پڑتی تھی گویا یہ ہی اس کا اصلی روپ ہو۔ وہ ناز و انداز، وہ بناؤ اور سنگار اور اس کی مادریت کے ٹھنڈے پردے تھے، تاکہ اس کے اندر وہ پونجی خوب محفوظ رہے۔

رات کا ایک بج گیا منگل کا روتا سن کر مہتا چوک پڑے۔ سوچا بے چاری مالتی آدمی رات تک تو جاگتی رہی ہوگی، اس وقت اسے اٹھنے میں کتنی تکلف ہوگی، پس اگر دروازہ کھلا ہو تو میں خود ہی بچے کو چپ کرادوں۔ وہ فوراً اٹھ کر اس کمرے کے دروازے پر گئے اور شیشے سے اندر جھانکا۔ مالتی بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور بچہ یوں ہی روہا تھا۔ شاید اس نے خواب دیکھا تھا، یا کسی اور وجہ سے ڈر گیا تھا۔ مالتی پچکارتی تھی، تھپکتی تھی، تصویریں دکھاتی

تھی، گود میں لے کر ٹہلتی تھی، مگر بچہ چپ نہ ہوتا تھا۔ مالتی کے یہ بے حد محبت اور لا زوال مادریت دیکھ کر ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ دل میں ایسی گد گدی اٹھی کہ اندر جا کر مالتی کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیں۔ دل سے محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کا ایک ہجوم نکل پڑا، پیاری، میرے بہشت کی دیوی، میری رانی

اور اسی مجنونا نہ محبت میں وہ پکار اٹھے ”مالتی ذرا دروازہ کھول دو۔“

مالتی نے آکر دروازہ کھولا اور ان کی طرف سوالیاں نگاہوں سے دیکھا۔

مہتا نے پوچھا ”کیا جھپٹا نہیں اٹھی؟ یہ تو بہت رو رہا ہے؟“

مالتی نے تکلیف کے لہجے میں کہا ”آج آٹھواں دن ہے، درد زیادہ ہوگا اسے۔“

”تولاؤ، میں کچھ دیر بٹھلا دوں، تم تھک گئی ہوگی۔“

مالتی نے مسکرا کر کہا ”تمہیں ذرا ہی دیر میں غصہ آجائے گا۔“

بات سچ تھی، مگر اپنی کمزوری کون تسلیم کرتا ہے؟ مہتا نے ضد سے کہا ”تم نے مجھے اتنا

سبک سمجھ رکھا ہے۔“

مالتی نے بچے کو ان کی گود میں دے دیا۔ ان کی گود میں جاتے ہی وہ یک دم چپ ہو گیا۔ بچوں میں جو ایک فطری سمجھ ہوتی ہے اسی نے اس کو بتا دیا کہ رونے میں اب تمہارا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ نیا آدمی عورت نہیں بلکہ مرد ہے اور مرد غصہ ور ہوتا ہے اور بے رحم بھی ہوتا ہے، اور چارپائی پر لٹا کر اور باہر اندھیرے میں ڈال کر وہ دور بھی چلا جاسکتا ہے اور کسی کو پاس آنے بھی نہ دے گا۔

مہتا نے فخر یہ کہا ”دیکھا، کیسا چپ کر دیا۔“

مالتی نے مذاق کیا ”ہاں تم اس فن میں بھی طاق ہو۔ کہاں سیکھا؟“

”تم سے۔“

”میں عورت ہوں اور مجھ پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“

مہتا نے شرم سے کہا ”مالتی میں تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ اب میری ان باتوں کو

بھول جاؤ۔ ان کی مہینوں میں کتنا پچھتایا ہوں، کتنا تادم اور طول ہوا ہوں، ان کا اندازہ شاید تم نہ کر سکو گی۔“

مالتی نے سادگی سے کہا ”میں تو بھول گئی، سچ کہتی ہوں۔“

”مجھے کیسے یقین آئے؟“

”اس کا ثبوت یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، ایک ہی ساتھ کھاتے ہیں، ہنستے ہیں، بولتے ہیں۔“

”کیا مجھے کچھ مانگنے کی اجازت نہ دوگی؟“

انھوں نے منگل کو چارپائی پر لٹا دیا جہاں وہ سکڑ کر سو رہا اور مالتی کی طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھا، گویا اسی اجازت پر ان کا پورا دارو مدار ہو۔

مالتی نے متاثر ہو کر کہا ”تم جانتے ہو تم سے زیادہ قریبی دنیا میں میرا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ میں نے بہت دن ہوئے کہ خود کو تمہارے چرنوں کی بھیٹ کر دیا ہے۔ تم میرے رہنما ہو، میرے دیوتا ہو، میرے استاد ہو، تمہیں مجھ سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں، صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ جب تک مجھے تمہارے درشن نہ ہوئے تھے اور میں نے تمہیں پہچانا نہ تھا اس وقت تک عیش اور خود پروری ہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ تم نے آکر اسے تحریک دی، پابندی دی۔ میں تمہارا احسان کبھی بھول نہیں سکتی۔ میں نے نڈی کے کنارے والی تمہاری باتیں گرہ کر لیں۔ رنج یہی ہوا کہ تم نے بھی مجھے وہی سمجھا جو دوسرا مرد سمجھتا اور جس کی امید مجھے تم سے نہ تھی۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے، یہ میں جانتی ہوں۔ مگر میں تمہاری گراں بہا محبت پا کر بھی وہی بنی رہوں گی، ایسا سمجھ کر تم نے میرے ساتھ بے انصافی کی، میں اس وقت کتنے غرور کا احساس کر رہی ہوں، یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ تمہارا عشق اور اعتماد پا کر اب میرے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ یہ برکت میری زندگی بامعنی بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ یہی میری تکمیل ہے۔“

یہ کہتے ہوئے مالتی کے دل میں ایسی رغبت پیدا ہوئی کہ مہتا کے سینے سے لپٹ جائے۔ اندر کی خواہش باہر آ کر گویا سچ ہو گئی تھیں۔ اس کا رواں رواں پھول اٹھا۔ جس سرور کو اس نے نایاب سمجھ رکھا تھا وہ اتنا قابل حصول اور اتنا قریب ہے! اور دل کا سرور چہرے پر آکر اسے ایسی رونق دینے لگا کہ مہتا کو اس میں دیوتا پن کی سی جھلک دکھائی پڑی۔ یہ عورت ہے یا خیر اور پاکیزگی اور ایثار کی مجسم صورت!

اسی وقت جھنڈیا جاگ کر اٹھ بیٹھی اور مہتا اپنے کمرے میں چلے گئے اور پھر دو ہفتے تک مالتی سے بات چیت کرنے کا موقع انھیں نہ ملا۔ مالتی کبھی ان سے تہائی میں نہ ملتی۔ مالتی کے

وہ الفاظ اس کے دل میں گونجتے رہتے۔ ان میں کتنی تشفی تھی، کتنی عاجزی تھی، کتنا نشہ تھا! دو ہفتے میں منگل اچھا ہو گیا۔ البتہ منہ پر کے داغ نہ بھر سکے۔ اس دن مالتی نے پڑوس کے لڑکوں کو خوب مٹھائی کھلائی اور جو مٹیس کر رکھی تھی وہ بھی پوری کیں۔ تربانی کی زندگی میں کتنی خوشی ہے، اس کا اب اسے تجربہ ہو رہا تھا۔ بھینیا اور گویر کی خوشی گویا اس کے دل میں منعکس ہو رہی تھی۔ دوسروں کی تکلیف دور کرنے میں اس نے جو خوشی محسوس کی وہ کبھی عیش و آرام کی زندگی میں نہ ملی تھی۔ وہ ہوس اب ان پھولوں کی طرح کمزور ہو گئی تھی۔ جن میں پھل لگ رہے ہوں۔ اب وہ اس درجے سے آگے نکل چکی تھی جب انسان مادی خوشی کو اصلی خوشی سمجھتا ہے۔ وہ خوشی اب اسے بیچ اور پستی کی طرف لے جانے والی، اور ہلکی بلکہ بھیا تک سی لگتی تھی۔ اس بڑے بیگلے میں رہنے کا لطف جب اس کے آس پاس مٹی کے جھونپڑے گویا فریاد کر رہے ہوں؟ موٹر پر چڑھ کر اب اسے فخر نہیں ہوتا۔ منگل جیسے نادان بچے نے اس کی زندگی کو کتنا منور کر دیا تھا۔ اس کے لیے حقیقی خوشی کا دروازہ سا کھول دیا تھا! ایک روز مہتا کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے پلنگ پر پڑے تڑپ رہے تھے کہ مالتی نے آکر ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا ”یہ درد کب سے ہو رہا ہے؟“

مہتا کو ایسا معلوم ہوا گویا ان نرم و نازک ہاتھوں نے سارا درد کھینچ لیا۔
 انھہ کر بیٹھ گئے اور بولے ”درد تو دوپہر ہی سے ہو رہا تھا اور ایسا درد مجھے آج تک نہیں ہوا تھا، مگر تمھارا ہاتھ رکھتے ہی سر ایسا ہلکا ہو گیا ہے گویا درد تھا ہی نہیں۔ تمھارے ہاتھوں میں شفا ہے۔“

مالتی نے انھیں کوئی دوا لا کر کھانے کو دے دی اور آرام سے لیٹے رہنے کی تاکید کر کے فوراً ہی کمرے سے نکل جانے کو ہوئی تو مہتا نے اصرار سے کہا ”دو منٹ بیٹھو گی نہیں؟“
 مالتی نے دروازہ پر سے مڑ کر کہا ”اس وقت باتیں کرو گے تو شاید پھر درد ہونے لگے۔ آرام سے لیٹے رہو۔ آج کل میں تمھیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پڑھتے یا لکھتے دیکھتی ہوں۔ دو چار دن پڑھنا لکھنا بند کر دو۔“

”تم ایک منٹ بیٹھو گی نہیں؟“

”مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔“

”اچھی بات ہے جاؤ۔“

مہتا کے چہرے پر کچھ ایسی اداسی چھا گئی کہ مالتی لوٹ پڑی اور سامنے آکر بولی ”اچھا کہو، کیا کہتے ہو؟“

مہتا نے بے دلی سے کہا ”کوئی خاص بات نہیں۔ یہی کہہ رہا تھا کہ اتنی رات مجھے کس مریض کو دیکھنے جاؤ گی؟“

”وہی رائے صاحب کی لڑکی ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی، مگر اب کچھ سنبھل گئی ہے۔“

اس کے جاتے ہی مہتا پھر لیٹ رہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ مالتی کے ہاتھ رکھتے ہی درد کیوں رفع ہو گیا۔ ضرور اس میں کوئی عجیب طاقت ہے، اور یہ اس کی ریاضت، اس کی عملی انسانیت ہی کی برکت ہے۔ مالتی نسائیت کے اس بلند معیار پر پہنچ گئی تھی جہاں وہ نور کے ایک ستارے کی طرح روشن نظر آتی تھی۔ اب وہ عشق کی چیز نہیں، عقیدت کی چیز تھی۔ اب وہ نایاب ہو گئی تھی اور ایسا ہونا فہم و فراست والوں کے لیے سعی و کوشش کرنے کا ایک منتر ہے۔ مہتا عشق میں جس خوشی کا تصور کر رہے تھے اسے عقیدت نے اور بھی گہرائی اور جاننداری دے دی تھی۔ عشق میں کچھ گھمنڈ بھی ہوتا ہے اور کچھ لگاؤ بھی، مگر عقیدت تو خود کو فنا کر دیتی ہے اور اپنی اس فنا ہی کو اپنا اعلیٰ مقصد بنا لیتی ہے۔ عشق اقتدار جمانا چاہتا ہے، جو کچھ دیتا ہے اس کے عوض میں کچھ چاہتا بھی ہے، مگر عقیدت کی انتہائی خوشی نئی قربانی میں ہے جس میں خودی کا فقدان ہو جاتا ہے!۔

مہتا کی وہ بڑی کتاب ختم ہو گئی تھی جسے وہ تین سال سے لکھ رہے تھے اور جس میں انھوں نے دنیا کی سبھی فلسفیانہ اجزاء کو شامل کیا تھا۔ یہ کتاب انھوں نے مالتی کے نام معنون کی اور جس دن اس کی جلدیں انگلستان سے آئیں اور انھوں نے ایک جلد مالتی کی نذر کی تو وہ اسے اس طرح معنون دیکھ کر متعجب بھی ہوئی اور مغموم بھی۔

اس نے کہا ”یہ تم نے کیا کیا؟ میں تو اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتی۔“

مہتا نے فخریہ کہا ”مگر میں سمجھتا ہوں۔ یہ تو کوئی چیز نہیں، مجھ میں تو اگر سو جائیں ہوتیں تو وہ سب تمہارے قدموں پر ٹار کر دیتا۔“

”مجھ پر، جس نے خود غرضی کے سوا اور کچھ جانا ہی نہیں۔“

”تمہارے تیاگ کا ایک ٹکڑا بھی میں پا جاتا تو خود کو خوش نصیب سمجھتا۔ تم دیوی ہو۔“
 ”پتھر کی، اتنا اور کیوں نہیں کہتے؟“
 ”قربانی کی، راحت کی، پاکیزگی کی!“

”تب تم نے مجھے خوب سمجھا۔ میں اور تیاگ! میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ سیوا یا تیاگ کا خیال میرے دل میں کبھی نہیں آیا۔ میں جو کچھ کرتی ہوں وہ پوشیدہ یا علانیہ غرض کے لیے کرتی ہوں۔ میں گاتی اس لیے نہیں کہ تیاگ کرتی ہوں یا اپنے گیتوں سے غم زدوں کو تسکین دیتی ہوں، بلکہ صرف اس لیے کہ اس سے میرا دل خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح دوا بھی غریبوں کو دے دیتی ہوں، اپنے دل کو خوش کرنے کے لیے۔ شاید دل کی خودی اس میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ تم مجھے خواہ مخواہ دیوی بنائے ڈالتے ہو۔ اب تو اتنی ہی کسر رہ گئی ہے کہ آرتی اور چڑھاوا وغیرہ لے کر میری پوجا کرو۔“

مہتا بولے ”وہ تو میں برسوں سے کر رہا ہوں مالتی، اور اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک بردان نہ مل جائے گا۔“

مالتی نے چٹکی لی ”تو بردان پا جانے کے بعد شاید دیوی کو مندر سے نکال پھینکو۔“
 مہتا نے سنہل کر کہا ”تب تو میری جدا گانہ ہستی ہی نہ رہے گی۔ عابد معبود میں جذب ہو جائے گا۔“

مالتی نے سنجیدگی سے کہا ”نہیں مہتا، میں مہینوں سے اس مسئلے پر غور کر رہی ہوں اور آخر میں میں نے طے کیا ہے کہ دوست بن کر رہنا زن و شوہر بن کر رہنے سے کہیں زیادہ آرام دہ ہے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھ پر اعتبار کرتے ہو، اور مجھے بھروسہ ہے کہ آج موقع آئے تو تم اپنی جان دے کر بھی میری حفاظت کرو گے۔ تم میں میں نے اپنا ہادی ہی نہیں بلکہ اپنا محافظ بھی پایا ہے۔ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں اور تم پر اعتبار کرتی ہوں اور تمہارے لیے کوئی ایسی قربانی نہیں جو میں نہ کر سکوں۔ ایٹور سے میری یہی یتنی ہے کہ وہ زندگی بھر مجھے اسی راہ پر قائم رکھے۔ ہماری تکمیل کے لیے، ہمارے روحانی ارتقاء کے لیے اور کیا چاہیے؟ اپنی چھوٹی سی گڑہستی بنا کر، اپنی روحوں کو چھوٹے سے پنجرے میں بند کر کے اپنے سکھ دکھ کو اپنے ہی تک رکھ کر کیا ہم لا محدود کے قریب تک پہنچ سکتے ہیں؟ دیا کرنا تو ہماری راہ میں رکاوٹ ہی ڈالے گا۔ محدود سے چند آدمی ایسے بھی ہیں جو پیروں میں بیڑیاں

وال کر بھی ارتقائی راستے پر چل سکتے ہیں اور چل رہے ہیں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تکمیل کے لیے اس محبت اور ترک وایثار میں بڑی اہمیت ہے جو کنبے کے لیے کیے جاتے ہیں، لیکن میں اپنے دل کو اتنا مضبوط اور مستقل نہیں پاتی۔ جب تک محبت نہیں ہے، خودی نہیں ہے، اس وقت تک زندگی کا لالچ نہیں ہے، خود غرضی کا زور نہیں ہے۔ جس روز دل لالچ میں پڑا اس روز ہمارے لیے بندش تیار ہو گئی۔ اسی وقت ہماری انسانیت کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔ نئی نئی ذمہ داریاں پیدا ہوں گی اور ہماری ساری طاقت انھیں کو پورا کرنے میں لگنا شروع ہو جائے گی۔ تم جیسے طباع و دانش مند انسان کی روح کو میں اس قید میں بند نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی تک تمہاری زندگی کی ایک یکیدہ تھی جس میں خود غرضی کے لیے بہت کم گنجائش تھی۔ میں اسی کو پستی کی طرف نہ لے جاؤں گی۔ دنیا کو تم جیسے مرتاضوں کی ضرورت ہے جو اپنے دل کو اتنا وسیع بنا دیں کہ ساری دنیا ان کی اپنی ہو جائے۔ دنیا میں بے انصافی کی، ظلم کی اور خوف کی ڈہائی بچی ہوئی ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا، مذہبی مکاری کا اور خود غرضی کا دور دورہ ہے۔ ہم نے وہ پکار سنی۔ تم بھی نہ سنو گے تو سننے والے آئیں گے کہاں سے؟ دوسرے ظاہری انسانوں کی طرح تم بھی اس کی طرف سے اپنے کان نہیں بند کر سکتے۔ تمہیں ویسی زندگی ہی دیا ہو جائے گی۔ اپنے علم اور اپنی عقل کو، اپنی بیدار انسانیت کو زیادہ حوصلہ اور زور کے ساتھ اسی رستے پر لے جاؤ۔ میں بھی تمہارے پیچھے پیچھے چلوں گی۔ اپنی زندگی کے ساتھ میری زندگی بھی سمجھ کر دو؛ تم سے میرا یہی کہنا ہے۔ اگر تمہارا دل دینویت کی طرف دوڑتا ہے، جب بھی میں اپنا بس چلتے تمہیں ادھر سے ہٹاؤں گی اور ایثار نہ کرے کہ مجھے اپنے اس ارادے میں ناکامیاب ہونا پڑے۔ لیکن اس حالت میں میں دو بوند آنسو گرا کر تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گی۔ اور کہہ نہیں سکتی کہ پھر میرا کیا انجام ہوگا، میں کس گھاٹ لگوں گی۔ مگر چاہے وہ کوئی گھاٹ ہو پھر بھی اس دنیوی بندش کا گھاٹ نہ ہوگا۔ بولو مجھے کیا حکم دیتے ہو؟“

مہتا سر جھکائے سنتے رہے۔ ایک ایک لفظ گویا ان کی دل کی آنکھیں اس طرح کھولے دیتا تھا جیسے اب تک کبھی نہ کھلی تھیں۔ وہ خیالات جو ابھی تک ان کے سامنے خواب کی تصویروں کی طرح آئے تھے اب زندگی کی سچائیوں سے معمور ہو کر متحرک ہو رہے تھے۔ وہ اپنے روئیں روئیں میں روشنی اور ترقی کا احساس کر رہے تھے۔ زندگی کے بڑے ارادوں کے سامنے ہمارا بچپن ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ مہتا کی آنکھوں میں بھی میٹھی یاد والا بچپن

پھر گیا جب وہ اپنی بیوہ ماں کی گود میں بیٹھ کر بہت بڑے سکھ کا احساس کیا کرتے تھے۔ کہاں ہے وہ ماں؟ آئے اور دیکھے اپنے بیٹے کی اس شہرت و نیک نامی کو! مجھے دعا دو۔ تمہارا وہ ہٹی لڑکا آج ایک نیا جنم لے رہا ہے!۔

انہوں نے مالتی کے پیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیے اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے ”تمہارا حکم منظور ہے، مالتی!“

اور دونوں ایک سے دل والے ہو کر باہم بغلیں ہو گئے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

سلیا کا لڑکا اب دو سال کا ہو رہا تھا اور سارے گاؤں کی دوڑ لگاتا تھا۔ اپنے ساتھ ایک عجیب بولی لایا تھا اور اسی میں بولتا تھا، خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔ اس کی بول میں ٹ، ل اور گھ کی کثرت تھی اور سر وغیرہ غائب تھے۔ اس بولی میں روٹی کا نام اوٹی، دودھ کا توت، ساگ کا چھاگ اور کوڑی کا تولی۔ جانوروں کی بولی کی ایسی نقل کرتا ہے کہ ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتا ہے۔ کسی نے پوچھا ”رامو، کتا کیسے بولتا ہے، تو رامو سنجیدگی سے کہا ”بھوں بھوں،، اور کانٹے دوڑتا۔ بلی کیسے بولے؟ اور رامو ”میاؤں، میاؤں،، کر کے آنکھیں نکال کر کتا کتا اور بچوں سے نوچتا۔ بڑا مست لڑکا تھا۔ جب دیکھو کھیلنے میں مگن رہتا، کھانے پینے کی سدھ نہ تھی۔ گود سے اسے چڑھ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوشی کے لمحے تب ہوتے جب وہ دروازے پر نیم کے نیچے منوں دھول اکٹھا کر کے اس میں لوٹتا، اسے سر پر چڑھاتا، اس کی ڈھیریاں لگاتا، اس کے گھروندے بناتا۔ اپنے ہم عمروں سے اس کی ایک لمحہ بھی نہ ہٹتی۔ وہ شاید ان کو اپنے ساتھ کھیلنے کے قابل ہی نہ سمجھتا تھا۔

کوئی پوچھتا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

فوراً کہتا ”لامو“

”تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟“

”ماتادین“

”اور تمہاری ماں کا؟“

”چھلیا“

”اور ماتادین کون ہے؟“

”وہ امالا چھالا ہے۔“

نہ جانے کس نے ماتادین سے اس کا یہ رشتہ بتا دیا تھا۔

رامو اور روپا میں خوب جھڑپیں تھیں۔ وہ روپا کا کھلونا تھا۔ اسے ابٹن ملتی، کاہل لگتی،

نہلاتی ، ہال سنواری اور اپنے ہاتھوں لقمے بنا بنا کر کھلاتی اور کبھی کبھی اسے گود میں لے کر رات کو سو بھی جاتی ۔ دھنیا ڈانٹتی کہ تو ، سب چھو اچھوت کیے دیتی ہے ۔ مگر وہ کسی کی نہ سنتی ۔ چھترے کی گزریوں نے اسے ماں بنا سکھایا تھا ۔ وہ مادرانہ جذبہ جیتا جاگتا بچہ پاکر اب گزریوں سے مطمئن نہ ہو سکتا تھا ۔ ہوری کے پچھواڑے جس مکان میں کسی دقت اس کے تیل بندھتے تھے اسی کے کھنڈر میں سلیا اپنا ایک پھوس کا جھونپڑا ڈال کر رہنے لگی تھی ۔ ہوری کے گھر میں عورتو نہیں کٹ سکتی تھی ۔

ماتادین کو کوئی سو روپے خرچ کرنے کے بعد اخیر میں کاشی کے پنڈتوں نے پھر برہمن بنا دیا تھا ۔ اس روز بڑا بھاری ہوم ہوا ، بہت سے برہمنوں نے کھانا کھایا اور بہت سے منتر اور اشلوک پڑھے گئے ۔ ماتادین کو خدہ گوہر اور گنوموتر کھانا پینا پڑا ۔ گوہر سے اس کا دل پاک ہو گیا ۔ اور گنوموتر سے اس کی روح کے ناپاک جراثیم ہلاک ہو گئے ۔

لیکن اس طرح سے اس پر اپچت نے اسے سچ مچ پوتر کر دیا ۔ ہوم کے جلتے ہوئے کنڈ میں اس کی بشریت نکھر گئی ۔ اور ہوم کے شعلوں کی روشنی میں اس نے مذہبی ارکان کو اچھی طرح پرکھ لیا ۔ اس دن سے اسے دھرم کے نام سے پڑ ہو گئی ۔ اس نے جینیو اتار کر پھینک دیا اور پردہتی کو گنگا میں ڈبو دیا ۔ اب وہ پکا کسان تھا ۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اگرچہ علماء نے اس کا برہمن ہونا تسلیم کر لیا لیکن لوگ اب بھی اس کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے ۔ اس سے مہورت پوچھتے ہیں ، ساعت اور لگن کا بچار کراتے ہیں ، اسے تیوہار کے موقعوں پر دان دکھنا دیتے ہیں مگر اپنے برتن نہیں چھونے دیتے ۔

جس دن سلیا کے بچہ پیدا ہوا اس نے گنی مقدار میں بھنگ لی اور گھمنڈ سے جیسے اس کا سینہ تن گیا اور انگلیاں بار بار مونچھوں پر پڑنے لگیں ۔ بچہ کیسا ہوگا اسی کا سا ؟ کیسے دیکھیں ؟ اس کا دل موس کر رہ گیا ۔

تیسرے دن روپا کھیت میں اس سے ملی تو اس نے پوچھا ” روپا تو نے سلیا کا لڑکا دیکھا ؟ “

روپا بولی ” دیکھا کیوں نہیں ؟ لال لال ہے ، کھوب موٹا ، بڑی بڑی آنکھیں ہیں ، سر میں جھبرالے بال ہیں ، مگر ککر تاکتا ہے ۔ “

ماتادین کے دل میں جیسے وہ لڑکا آبیٹھا تھا اور ہاتھ پیر مار رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں میں

نشر سا چھا گیا اس نے اس بچی کو گود میں اٹھا لیا ، پھر کندھے پر بیٹھا لیا اور پھر کندھے سے اتار کر اس کے گالوں کو چوم لیا ۔

روپا بال سنبھالتی ہوئی ڈھیٹ ہو کر بولی ” چلو میں تم کو دور سے دکھا دوں ۔ دالان ہی میں تو ہے ۔ سلیا بہن نہ جانے کیوں ہر دم روتی رہتی ہے ۔“

ماتا دین نے منہ پھیر لیا ۔ اس کی آنکھیں پر نم ہو گئی تھیں اور ہونٹ کا نپ رہے تھے ۔ اس رات جب سارا گاؤں سو گیا اور پیڑ تاریکی میں سا گئے تو وہ سلیا کے دروازے پر آیا اور پوری توجہ سے بچے کا رونا سنا جس میں ساری دنیا کی موسیقیت ، مسرت اور حلاوت بھری ہوئی تھی ۔

سلیا بچے کو ہوری کے مکان میں کھولے پر لٹا کر مجوری کرنے چلی جاتی ماتا دین کسی نہ کسی بہانے سے ہوری کے گھر آتا اور کنکھیوں سے بچے کو دیکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا ۔ دھنیا مسکرا کر کہتی ” لجاتے کیوں ہو؟ گود میں لے لو ، پیار کر دو ! کیسا کاٹھ کا کلیجہ ہے تمہارا؟ بالکل تم پر پڑا ہے ۔“

ماتا دین دو ایک روپے سلیا کے لیے پھینک کر باہر نکل آتا ۔ بچہ کے ساتھ اس کی روح میں بھی بالیدگی ، شکستگی اور چمک آ رہی تھی ۔ اب اس کی زندگی کا بھی ایک ہی مقصد تھا ، ایک ہی عہد تھا ۔ اس میں باقاعدگی آگئی ، سنجیدگی آگئی ، ذمہ داری آگئی !

ایک دن رامو کھولے پر لیٹا ہوا تھا ۔ دھنیا کہیں گئی تھی ۔ روپا لڑکوں کا شور وغل سن کر کھیلنے چلی گئی تھی ۔ گھر سونا تھا ۔ اسی وقت ماتا دین پہنچا ۔ بچہ نیلے آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھینک رہا تھا ، ہمک رہا تھا ۔ زندگی کی اس خوشی کے ساتھ جو ابھی اس میں تازہ تھی ۔ ماتا دین کو دیکھ کر وہ ہنس پڑا ۔ ماتا دین محبت سے بے چین ہو گیا ۔ اس نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا ۔ اس کا دل اور سارا بدن خوشی سے کانپ اٹھا ؛ گویا پانی کی لہروں میں نور کی شعاعیں کانپ رہی ہوں ۔ بچہ کی گہری ، صاف ، اتھاہ خوشی بھری آنکھوں میں گویا اس کی زندگی کی سچائی مل گئی ۔ اسے ایک طرح کا ڈر سا لگا گویا وہ نگاہیں اس کے دل میں کبھی جاتی ہوں ، وہ کتنا ناپاک ہے ! ایثار کی اس دین کو کیسے چھو سکتا ہے ؟ اس نے بچے کو خوف بھرے دل کے ساتھ پھر لٹا دیا ۔ اسی وقت روپا باہر سے آگئی اور وہ باہر نکل گیا ۔

ایک دن خوب اولے پڑے ۔ سلیا گھاس لے کر بازار گئی ہوئی تھی اور روپا اپنے کھیلنے

میں گمن تھی۔ رامو نے آنگن میں بنولے بچے دیکھے تو سمجھا کے بتا شے پھیلے ہوئے ہیں۔ کئی بنولے اٹھا کر کھائے اور آنگن میں خوب کھیلا۔ رات کو اسے بخار آگیا اور دوسرے دن نمونیا ہو گیا اور تیسرے دن شام کو سلیا کی گود میں بچے کی روح پرواز کر گئی۔

لیکن بچہ مرکز بھی سلیا کی زندگی کا مرکز بنا رہا۔ اس کے سینے میں دودھ کا ابال سا آتا اور آچل تر ہو جاتا۔ اسی وقت آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ پہلے سب کاموں سے فراغت پا کر رات کو جب وہ رامو کو سینے سے لگا کر اس کے منہ میں دودھ ڈالتی تو گویا اس کا دل بچے کی تازگی سے بھر جاتا۔ تب وہ پیارے پیارے گیت گاتی اور ٹیٹھے ٹیٹھے سنے دیکھتی۔ اور نئی نئی دنیا بتاتی جس کا راجا رامو ہوتا۔ اب سب کاموں سے فرصت پا کر وہ اپنی سونی جھونپڑی میں روتی، اور اس کی روح تڑپتی رہتی تھی، اڑ جانے کے لیے اس لوک میں جہاں اس کی گودی کا لال اس وقت کھیل رہا ہوگا! اس کے غم میں کل گھاؤں شریک تھا۔ رامو کتنا چلبلا تھا، جو کوئی بلاتا اسی کی گود میں چلا جاتا۔ مرکز اور پہنچ سے باہر ہو کر وہ اب اور بھی عزیز ہو گیا تھا۔ اس کا عکس اسے کہیں زیادہ سندر، چلبلا اور لہاؤنا تھا!۔

ماتادین اس دن کھل پڑا۔ پردہ ہوتا ہے ہوا کے لیے۔ آندھی میں پردے اٹھا کر رکھ دیے جاتے ہیں کہ آندھی کے ساتھ اڑ نہ جائیں۔ اس نے لاش کو دونوں ہتھیلیوں پر اٹھا لیا اور تنہاندی کے کنارے تک لے گیا جو ایک میل کا پاٹ چھوڑ کر ایک پتلی سی دھار میں سا گئی تھی۔ آٹھ روز تک اس کے ہاتھ سیدھے نہ ہو سکے۔ اس دن وہ ذرا بھی نہ شرمایا۔ ذرا بھی نہ جھجکا۔

اور کسی نے کچھ کہا بھی نہیں، بلکہ سب نے اس کی ہمت اور استقلال کی تعریف کی۔

ہوری نے کہا ”یہی مرد کا دھرم ہے۔ جس کی بانہہ پکڑی اسے کیا چھوڑنا۔“

دھنیا نے آنکھیں نچا کر کہا ”مت بکھان کرو، جی جلتا ہے۔ وہ مرد ہے؟ میں تو ایسے

مرد کو نامرد کہتی ہوں۔ جب بانہہ پکڑی تھی تب کیا دودھ پیتا تھا کہ سلیا باہمی ہو گئی تھی؟“

ایک مہینہ بیت گیا سلیا پھر مزدوری کرنے لگی تھی۔ شام ہو گئی تھی۔ پورنہاسی کا چاند ہنستا ہوا سا نکل آیا تھا۔ سلیا نے کئے ہوئے کھیت میں سے گرے ہوئے جو کے خوشے چن کر ٹوکری میں رکھ لیے تھے اور گھر جانا چاہتی تھی کہ چاند پر نظر پڑی اور درد بھری یاد کا جیسے سوتھ سا کھل گیا۔ آچل دودھ سے بھگ گیا اور چہرا آنسوؤں سے۔ اس نے سر جھکا لیا اور گویا

رونے کا لطف اٹھانے لگی۔

دفعتاً کسی کی آہٹ پا کر چونک پڑی۔ ماتادین پیچھے سے آکر سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا
”کب تک روئے جائے گی سلیا؟ رونے سے وہ پھر تو نہ آجائے گا۔“

اور یہ کہتے کہتے وہ خود رو پڑا۔

سلیا کے منہ میں آئے ہوئے شکوے کے الفاظ پکھل گئے اور آواز سنبھال کر بولی ”تم
آج ادھر کیسے آ گئے؟“

ماتادین نے رنجیدہ ہو کر کہا ”ادھر سے جا رہا تھا، تجھے بیٹھے دیکھا تو چلا آیا۔“

”تم تو اسے کھلا بھی نہ پائے۔“

”نہیں سلیا، ایک دن کھلا آیا تھا۔“

”سچ؟“

”سچ!“

”میں کہاں تھی؟“

”تو ہاٹ میں گئی ہوئی تھی۔“

”تمھاری گود میں رو یا نہیں؟“

”نہیں سلیا ہنستا تھا۔“

”سچ؟“

”سچ!“

”بس ایک ہی دن کھلایا؟“

”ہاں، ایک ہی دن۔ مگر دیکھنے نہ آتا تھا۔ اسے کھنولے پر کھیلتے دیکھتا تھا اور دل

تھام کر چلا جاتا تھا۔“

”تم ہی پر پڑا تھا۔“

”مجھے تو پچھتاوا ہوتا ہے کہ ناک اس دن اسے گود میں لیا۔ یہ میرے پاؤں کا

ڈنڈ ہے۔“

سلیا کی آنکھوں میں غمو جھلک رہا تھا۔ اس نے نوکری سر پر رکھی اور مگر چلی۔ ماتادین

بھی اس کے ساتھ چلا۔

سلیا نے کہا ”میں تو اب دھنیا کا کی کے بروٹھے میں سوتی ہوں ، اپنے گھر میں اچھا نہیں لگتا۔“

”دھنیا مجھے برابر سمجھاتی رہتی تھی۔“

”سچ؟“

”ہاں سچ ! جب ملتی تھی سمجھانے لگتی تھی۔“

گھاؤں کے قریب جا کر سلیا نے سمجھا ”اچھا، ادھر سے اپنے گھر چلے جاؤ۔ کہیں پنڈت دیکھ نہ لیں۔“

ماتادین نے گردن اٹھا کر کہا ”میں اب کئی سے نہیں ڈرتا۔“

”گھر سے نکال دیں گے تو کہاں جاؤ گے؟“

”میں نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔“

”سچ؟“

”ہاں سچ !“

”کہاں؟ میں نے تو نہیں دیکھا!“

”چل تو، دکھاتا ہوں۔“

دونوں اور آگے بڑھے۔ ماتادین آگے تھا اور سلیا پیچھے۔ ہوری کا گھر آگیا۔ ماتادین اسی کے پچھواڑے جا کر سلیا کی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور بولا ”یہی میرا گھر ہے!“

سلیا نے بے اعتباری، غمو، طنز اور درد سے بھرے لہجے میں کہا ”یہ تو سلیا چمارن کا گھر ہے۔“

ماتادین نے دروازے کی ٹٹی کھولتے ہوئے کہا ”یہ میری دیوی کا مندر ہے۔“
سلیا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بولی ”مندر ہے تو ایک لوٹا پانی انڈیل کر چلے جاؤ گے۔“

ماتادین نے اس کے سر کی ٹوکری اتارتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ”نہیں سلیا‘ جب تک جان ہے تیری سرن میں رہوں گا اور تیری ہی پوجا کروں گا۔“
”جھوٹ کہتے ہو۔“

”نہیں تیرے چرن چھو کر کہتا ہوں۔ سنا کہ پنواری کا لونڈا بھنسیری تیرے پیچھے بہت پڑا تھا۔ تو نے اسے کھوب ڈانٹا۔“

”تم سے کس نے کہا؟“
”بھنسیری آپ ہی کہتا تھا۔“

”جج؟“

”ہاں جج!“

سلیانے دیا سلائی سے ٹکٹی جلائی۔ ایک طرف مٹی کا گھڑا تھا اور دوسری طرف چولہا، جہاں دو تین پیتل اور لوہے کے برتن صاف کیے رکھے تھے۔ درمیان میں پوال بچھا ہوا تھا۔ وہی سلیا کا بستر تھا۔ اس بستر کے سرہانے رامو کا چھوٹا سا کھٹولا پڑا ہوا گویا رو رہا تھا اور اسی کے پاس دو تین مٹی کے ہاتھی گھوڑے ٹوٹی ہوئی حالت میں پڑے تھے۔ جب مالک ہی نہ رہا تو کون ان کی دیکھ بھال کرتا؟ ماتادین پوال پر بیٹھ گیا۔ دل میں ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ خوب روئے۔

سلیانے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ”تمہیں کبھی یاد آتی تھی؟“
ماتادین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا ”تو ہر دم میری آنکھوں میں پھرتی رہتی تھی۔ تو بھی مجھے کبھی یاد کرتی تھی؟“

”میرا تو تم سے جی جلتا تھا۔“

”اور دیا نہیں آتی تھی؟“

”کبھی نہیں۔“

”تو بھنسیری“

”اچھا گالی مت دو۔ میں ڈر رہی ہوں کہ گاؤں والے کیا کہیں گے۔“
”جو بھلے آدمی ہیں وہ کہیں گے کہ یہی اس کا دھرم تھا۔ جو برے ہیں ان کی میں پرواہ نہیں کرتا۔“

”اور تمہارا کھانا کون پکائے گا؟“

”میری رانی سلیا۔“

”تو باہن کیسے رہو گے؟“

”میں بائسن نہیں، چمار ہی رہنا چاہتا ہوں۔ جو اپنا دھرم پالے وہی بائسن ہے، جو
دھرم سے منھ موڑے وہی چمار ہے!“
سلیا نے اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔

ہوری کی حالت روز بروز اتر ہوتی جا رہی تھی۔ زندگی کی جدوجہد میں اسے ہمیشہ شکست ملی، مگر اس نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ ہر شکست گویا اسے قسمت سے لڑنے کی طاقت دے دیتی تھی۔ مگر اب وہ اس آخری حالت میں پہنچ گیا تھا جب اس میں خود اعتمادی بھی رہ گئی تھی۔ مگر وہ اپنے دھرم پر اٹل رہ سکتا تو بھی کچھ اٹک شوئی ہو جاتی۔ مگر یہ بات نہ تھی اس نے نیت بھی بگاڑی، ادھر م بھی کمایا، کوئی ایسی برائی نہ تھی جس میں وہ نہ پڑا ہو۔ پھر بھی زندگی کی کوئی خواہش پوری نہ ہوئی اور اچھے دن سراب کی طرح دور ہی ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اب اسے وہ دھوکا بھی نہ رہ گیا تھا، جھوٹی امید کی ہریالی اودھ چمک بھی اب نہ دکھائی دیتی تھی۔ ہارے ہوئے راجا کی طرح اس نے خود کو اس تین بیگھے کھیت کے قلعے میں بند کر دیا تھا اور اسے جان کی طرح بچا رہا تھا۔ فاتے کیے، بدنام ہوا، مزدوری کی، مگر قلعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مگر اب وہ قلعہ بھی قبضہ سے نکالا جاتا تھا۔ تین سال سے لگان باقی پڑا ہوا تھا اور اب پنڈت نوکھے رام نے اس پر بید غلی دائر کر دی تھی۔ کہیں سے روپے ملنے کی امید نہ تھی۔ زمین اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی اور اس کی بقیہ زندگی مزدوری میں کٹے گی۔ بھگوان کی ایتھا! رائے صاحب کو کیوں دوکھ دے۔ اسامیوں ہی سے تو ان کا بھی گھڑ ہے۔ اسی گاؤں پر آدھے سے اڑھک گھروں پر بید کھلی آ رہی ہے۔ آوے۔ اوروں کی جو دسا ہوگی، وہی اس کی بھی ہوگی۔ بھاگ میں سکھ بڑا ہوتا تو لڑکا کیوں ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جاتا؟

شام ہو گئی تھی۔ وہ اسی فکر میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا کہ پنڈت داتا دین نے آکر کہا ”کیا ہوا ہو رہی ہماری بید غلی کا؟ ان دنوں نوکھے رام سے میری بول چال بند ہے۔ کچھ پتہ نہیں۔ سنا ہے کہ تاریکھے کے پندرہ دن اور رہ گئے ہیں۔“

ہوری نے ان کے لیے کھاٹ ڈال کر کہا ”وہ مالک ہیں جو چاہیں سو کریں۔ میرے پاس روپیہ ہوتا تو یہ درگت کیوں ہوتی؟ کھایا نہیں، اڑایا نہیں، پر اچ ہی نہ ہو اور جو ہو بھی

وہ کوڑی مول جائے تو کسان کیا کرے؟“

”پر دھرتی تو بچانا ہی پڑے گی۔ نباہ کیسے ہوگا! باب دادوں کی اتنی ہی نسانی بچ رہی

ہے۔ وہ نکل گئی تو کہاں رہو گے؟“

”بھگوان کی مرجی ہے، میرا کیا بس ہے؟“

”ایک اپائے ہے جو تم کرو۔“

ہوری کو جیسے جان سی مل گئی۔ اس کے پاؤں پڑ کر بولا ”بڑا دھرم ہوگا مہراج،

تمہارے سوا میرا کون ہے؟ میں تو زراس ہو گیا تھا۔“

زراس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بس اتنا ہی سمجھ لو کہ سکھ میں آدمی کا دھرم کچھ اور ہوتا

ہے، دکھ میں کچھ اور۔ سکھ میں آدمی دان دیتا ہے پر دکھ میں بھیک تک مانگتا ہے۔ تب آدمی

کا یہی دھرم ہو جاتا ہے۔ پولا اچھا رہتا ہے تو ہم انسان پوچا کیے بنا منہ میں پانی تک نہیں

ذالتے، پھر بیمار ہو جاتے ہیں تو بنا نہائے دھوئے کپڑے پہنے اور کھاٹ پر بیٹھے ہوئے

کھالیتے ہیں۔ اس سے کا یہی دھرم ہے۔ یہاں ہم میں تم میں کتنا پھرک ہے مگر جتنا تھ

پوری میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اونچے نیچے سبھی ایک پنکٹ میں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ برے

دنوں میں رام چندر جی نے سیوری کے جوٹھے بیر کھائے تھے اور بال کو چھپ کر مارا تھا۔

جب سکٹ میں بڑے بڑے لوگوں کی مرچاڈ ٹوٹ جاتی ہے تو ہماری تمہاری کون چلاوے؟

رام سیوک مہتو کو تو جانتے ہوتا؟“

ہوری نے بیدلی سے کہا ”ہاں، جانتا کیوں نہیں۔“

”میرا جمان ہے۔ بڑا اچھا جمان ہے اس کا۔ کھیتی باڑی الگ، لین دین الگ۔ ایسے

رعب داب کا آدمی ہی نہیں دیکھا۔ کئی مہینے ہوئے اس کی عورت مر گئی۔ اولاد کوئی نہیں ہے۔

اگر روپا کا بیاہ اس سے کرنا چاہو تو میں اسے راجی کر لوں گا۔ میری بات وہ کبھی نہ ٹالے گا۔

لڑکی سیانی ہو گئی ہے اور سے برا ہے کہیں کوئی بات ہو جائے تو منہ میں کالکھ لگے۔ یہ بڑا

اچھا موکا ہے۔ لڑکی کا بیاہ بھی ہو جائے گا۔ اور تمہارے کھیت بھی بچ جائیں گے۔ بیاہ کے

کھرچ سے بھی بچے جاتے ہو۔“

رام سیوک ہوری سے دو ہی چار برس چھوٹا تھا۔ ایسے آدمی سے روپا کا بیاہ کرنے کی

تجویز جتنک آمیز تھی۔ کہاں پھول سی روپا اور کہاں وہ بوڑھا ٹھوٹھ۔ زندگی میں ہوری نے بڑی

بڑی چوٹیں سہی تھیں مگر یہ چوٹ سب سے گہری تھی۔ آج اس کے ایسے دن آگئے ہیں کہ اس سے لڑکی بیچنے کی بات کہی جاتی ہے اور اس میں انکار کرنے کی ہمت نہیں ہے!۔ رنج سے اس کا سر جھک گیا۔

داتا دین نے ایک منٹ کے بعد پوچھا ”تو کیا کہتے ہو؟“

ہوری نے صاف جواب نہ دیا ”سوچ کر کہوں گا۔“

”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟“

”دنیا سے بھی تو پوچھ لوں۔“

”تم راجی ہو کہ نہیں؟“

”نک سوچ لینے دو مہراج۔ آج تک گھرانے میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اس کی مر جاد

بھی تو رکھنی ہے۔“

”پانچ چھ دن کے اندر جواب دے دینا۔ ایسا نہ ہو کہ تم سوچتے ہی رہو اور بے دھلی

ہو جائے۔“

داتا دین چلے گئے۔ ہوری کی طرف سے انھیں کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اندیشہ تھا دنیا کی

طرف سے۔ اس کی ناک بڑی لمبی ہے۔ چاہے آپ مٹ جائے، مر جاد نہ چھوڑے گی۔ مگر

ہوری، ہاں، کر لے تو وہ بھی رو دھو کر مان ہی جائے گی۔ کھیتوں کے نکل جانے میں بھی تو

مر جاد بگڑتی ہے۔

دنیا نے آکر پوچھا ”پنڈت کیوں آئے تھے؟“

”کچھ نہیں، یہی بید غلی کی بات چیت تھی۔“

”آنسو پوچھنے آئے ہوں گے، یہ تو نہ ہوگا کہ سو روپے ادھار دے دیں۔“

”مانگنے کا منہ بھی تو نہیں ہے۔“

”تو یہاں آتے ہی کیوں ہیں؟“

”روپیا کی سگائی کی بات بھی تھی۔“

”کس سے؟“

”رام سیوک کو جانتی ہے؟ ان ہی سے۔“

”میں نے انھیں کب دیکھا؟ ہاں نام بہت دن سے سنتی ہوں۔ وہ تو بوڑھا ہوگا؟“

”بوڑھا نہیں ہے، ہاں اڈھیڑ ہے۔“

”تم نے پنڈت کو پھنکارا نہیں، مجھ سے کہتے تو ایسا جواب دیتی کہ یاد کرتے۔“

”پھنکارا نہیں، مگر انکار کر دیا۔ کہتے تھے کہ بیاہ بھی بنا کھرچ کے ہو جائے گا اور کھیت بھی بیج جائیں گے۔“

”کھل کر کیوں نہیں کہتے کے لڑکی بیچنے کو کہتے تھے۔ کیسے اس بوڑھے کی ہمت پڑی۔“

لیکن ہوری اس مسئلے پر جتنا ہی غور کرتا تھا اتنی ہی اس کی ہٹ کمزور ہوتی جاتی تھی۔ مرجاد کی لاج اسے کم نہ تھی، لیکن جس مریض کا عارضہ مہلک ہو گیا ہو وہ کھانے پینے میں پرہیز کی کب پروا کرتا ہے؟ داتا دین کے سامنے ہوری نے کچھ ایسے طرز کا اظہار کیا تھا جسے منظوری نہیں کہا جاسکتا تھا۔ مگر اندر سے وہ پکھل گیا تھا۔ عمر کی ایسی کوئی بات نہیں۔ مرنا جینا بھاگ کے ہاتھ ہے۔ بوڑھے بیٹھے رہتے ہیں، جوان چلے جاتے ہیں۔ روپا کے بھاگ میں سکھ لکھا ہے تو وہاں بھی سکھ اٹھاوے گی اور دکھ لکھا ہے تو کہیں بھی سکھ نہیں پاسکتی۔ اور لڑکی بیچنے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ہوری اس سے جو کچھ لے گا ادھار لے گا اور ہاتھ میں روپیہ آتے ہی ادا کر دے گا۔ اس میں شرم یا ہتک کی کوئی بات نہیں۔ ہاں اس میں سمائی ہوتی تو وہ روپا کا بیاہ کسی جوان لڑکے سے اونچے گھرانے میں کرتا۔ مگر جب ایٹور نے اسے اس لائق نہیں بنایا تو کسا کنیا دینے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے؟ لوگ نہیں گے، مگر جو لوگ صرف ہنستے ہیں اور کوئی مدد نہیں کرتے ان کی ہنسی کی وہ کیوں پرواہ کرے؟ مشکل یہی ہے کہ دھنیا نہ مانے گی۔ گدھی تو ہے ہی! وہی پرانی لاج لیے بیٹھی رہے گی۔ یہ گھرانے کی مرجاد بنانے کا سہ نہیں ہے، اپنی جان بچانے کا سہ ہے۔ ایسی ہی بڑی لاج مرجاد والی ہے تو لائے پانچ سو روپے نکالے۔ کہاں دھرے ہیں؟

دو دن گزر گئے اور اس کے متعلق دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ ہاں، دونوں اشارتاً گفتگو کرتے رہتے تھے۔

دھنیا کہتی ”بر اور کنیا جوڑ کے ہوں تبھی بیاہ کا سکھ ہے۔“

ہوری جواب دیتا ”بیاہ سکھ کا نام نہیں ہے پلگی، یہ تو تپسیا ہے۔“

”چلو، تپسیا ہے!“

”ہاں میں کہتا جو ہوں ، بھگوان آدی کو جس دسا میں ڈال دیں اس میں سکھی رہتا تپیا نہیں تو اور کیا ہے ؟“

دوسرے دن دھنیا ازدواجی مسرت کا دوسرا پہلو ، سوچ نکالا ”گھر میں جب تک ساس سر ، دیورائیاں جھنائیاں نہ ہوں تب تک سسرال کا سکھ ہی کیا ، کچھ دن تو لڑکی بہو بننے کا سکھ پائے۔“

ہوری نے کہا ”یہ بیاہ کا سکھ نہیں ہے ، دکھ ہے !۔“
دھنیا بگڑ اٹھی ”تمھاری باتیں بھی زالی ہوتی ہیں ۔ اکیلی بہو گھر میں کیسے رہے گی ؟ نہ کوئی آگے نہ پیچھے !۔“

ہوری بولا ”تو اس گھر میں آئی تو ایک نہیں دو دو دیور تھے ، ساس تھی ، سسر تھا ، تو نے کون سا سکھ اٹھا لیا ؟ بتا !۔“

”کیا سبھی گھروں میں ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں ؟“
”اور نہیں تو کیا ، آسمان کی دیویاں آجاتی ہیں ؟ اکیلی تو بہو اور اس پر حکم چلانے والا سارا گھر۔ بے چاری کس کس کا کہنا کرے جس کا حکم نہ مانے وہی ہیری ۔ سب سے بھلا اکیلا۔“

پھر بھی بات یہیں تک رہ گئی ۔ مگر دھنیا کا پلڑا ہلکا ہو جاتا تھا ۔ چوتھے دن رام سیوک مہتو خود آپہنچے ۔ کلاں راس گھوڑے پر سوار ، ساتھ میں ایک نائی اور ایک خدمت گار لیے ، جیسے کوئی بڑا زمیندار ہو ۔ عمر چالیس سے اوپر تھی اور بال کچھڑی ہو گئے تھے ، مگر چہرے پر رونق تھی اور بدن مضبوط تھا ۔

ہوری ان کے سامنے بالکل بوڑھا لگتا تھا ۔ کسی مقدمے کی پیروی کرنے جا رہے تھے ۔ یہاں ذرا دوپہر گزراتا چاہتے تھے ۔ دھوپ کتنی تیز ہے اور لو کتنے زوروں کی چل رہی ہے ! ہوری دلاری کی دوکان سے گیہوں کا آٹا اور گھی لایا ۔ پوریاں بنیں ۔ تینوں مہمانوں نے کھایا ۔ داتا دین بھی دعا دینے آپہنچے تھے ۔ باتیں ہونے لگیں ۔

داتا دین نے پوچھا ”کیسا مقدمہ ہے مہتو ؟“

رام سیوک نے شان جماتے ہوئے کہا ”مقدمہ تو ایک نہ ایک لگا ہی رہتا ہے مہراج ! دنیا میں گنو بننے سے کام نہیں چلتا ، جتنا دبتے جاؤ اتنا ہی لوگ دباتے ہیں ۔ تھانہ پولیس ،

کچہری عدالت ، سب ہے ہماری رہنما کے لیے مگر رچھا کوئی نہیں کرتا ۔ ہر جگہ لوٹ ہے ، جو گریب ہے ، لاچار ہے ، اس کی گردن کاٹنے کے لیے کبھی تیار رہتے ہیں ۔ بھگوان نہ کرے کوئی بے ایمانی کرے ۔ یہ بڑا پاپ ہے ۔ تم ہی سوچو کہ آدمی کہاں تک دبے ۔ یہاں تو جو کسان ہے وہ سب کا ملائم چارا ہے ۔ پنواری کو نجر اور دستوری نہ دیں تو گاؤں میں رہنا کٹھن ، جمیندار کے چہرہ سیوں اور کارندوں کا پیٹ نہ بھریں تو نباہ نہیں ۔ تھانیدار اور کانشیل تو جیسے اس کے داماد ہیں ۔ جب ان کا دورا گاؤں میں ہو جائے تو کسانوں کا دھرم ہے کہ وہ ان کی ہر طرح آؤ بھگت کریں ، نہیں تو ایک رہٹ میں گاؤں کا گاؤں بندھ جائے ۔ کبھی کانوں گو ، کبھی تحصیلدار ، کبھی ڈپٹی ، کبھی جنٹ ، کبھی کلر ، کبھی کپتان آتے ہی رہتے ہیں اور کسانوں کو ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا رہنا چاہیے ۔ ان کے لیے رسد چارا ، انڈا مرغی ، دودھ گھی کا بندوبست کرنا چاہیے ۔ تم پر بھی تو وہی بیت رہی ہے مہراج ۔ ایک نہ ایک حاکم نت نئے بڑھتے جاتے ہیں ۔ ایک ڈاکٹر کنوؤں میں دوائی ڈالنے کے لیے آنے لگا ہے ۔ ایک دوسرا ڈاکٹر کبھی کبھی آکر ڈھوروں کو دیکھتا ہے ۔ لڑکوں کا امتحان لینے والا انسپٹر ہے اور نہ جانے کون کون اپسر ہیں ، نہر کے الگ ، جنگل کے الگ ، سراب تازی کے الگ ، گاؤں سدھار کے الگ ، کھیتی کے الگ ، کہاں تک گناؤں ؟ پادری آجاتا ہے تو اسے بھی رسد دینا پڑتا ہے ۔ اور جو کہو کہ اتنے حکموں اور اتنے اپسروں سے کسانوں کا کچھ بھلا ہوتا ہے تو نام کو نہیں ۔ ابھی جمیندار نے ہل پیچھے دو دو روپیہ چندا لگایا ۔ کسی بڑے اپسر کی دعوت تھی ۔ کسانوں نے دینے سے انکار کر دیا ۔ بس اس نے گاؤں بھر پر اجا پھا کر دیا ۔ حاکم بھی جمیندار کا پیچھ کرتے ہیں ۔ یہ نہیں سوچتے کہ کسان بھی آدمی ہے ۔ اس کے بھی بال بچے ہیں ، اس کی بخت آبرو ہے ۔ اور یہ سب ہمارے دبو پن کا نتیجہ ہے ۔ میں نے گاؤں بھر میں ڈھول بجوادی کہ کوئی بیسی لگان نہ دو اور نہ کھیت چھوڑو ۔ ہم کو کوئی کائل کر دے تو ہم بیسی دینے کو تیار ہیں ، پر جو تم چاہو کہ بے منہ کے کسانوں کو پیس کر لپی جاؤ تو یہ نہ ہوگا ۔ گاؤں والوں نے میری بات مان لی اور سب نے بیسی دینے سے انکار کر دیا ۔ جمیندار نے دیکھا کہ سارا گاؤں ایک ہو گیا ہے تو لاچار ہو گیا ۔ کھیت بے کھل بھی کر دے تو جوتے کون ؟ آج جب تک کڑے نہ پڑو کوئی نہیں سنتا ۔ روئے ہتا تو لڑکا بھی ماں سے دودھ نہیں پاتا ۔“

رام سیوک تیسرے پہر چلا گیا مگر دھنیا اور موری پر ایک نہ مٹنے والا اثر چھوڑ گیا ۔

داتا دین کا جادو چل گیا۔ انھوں نے پوچھا ”اب کیا کہتے ہو ہوری؟“
 ہوری نے دھنیا کی طرف اشارہ کر کے کہا ”اس سے پوچھو۔“
 ”تم دونوں سے پوچھتے ہیں۔“

دھنیا بولی ”عمر تو ادھک ہے پر تم لوگوں کی رائے ہے تو مجھے بھی منور ہے۔ بھاگ
 میں جو لکھا ہوگا وہ تو آگے آوے ہی گا پر آدمی اچھا ہے۔“

اور ہوری کو رام سیوک پر ویسا ہی بھروسہ ہو گیا جیسا کمزور کو طاقتور پر ہوتا ہے۔ وہ شیخ
 چلی کے منصوبے باندھنے لگا تھا۔ آدمی اس کا ہاتھ پکڑنے لے تو بیڑا پار ہے۔

بیاد کا مہورت ٹھیک ہو گیا۔ گوہر کو بھی بلانا ہوگا۔ لکھنا چاہیے۔ پھر آنا نہ آنا اس کے
 من کی بات ہے۔ یہ کہنے کو تو منہ نہ رہے کہ مجھے بلایا کب تھا۔ سونا کو بھی بلانا ہوگا۔

دھنیا نے کہا ”گوہر تو ایسا نہیں تھا۔ مگر جب بھنیا آنے دے۔ پردیس جا کر ایسا
 بھول گیا کہ نہ چننی نہ پتری۔ نہ جانے کیسے ہے۔“ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

گوہر کو خط ملا تو چلنے کو تیار ہو گیا۔ بھنیا کو جانا تو اچھا نہ لگتا تھا مگر اس موقع پر کچھ نہ
 کہہ سکی۔ بہن کے بیاد میں بھائی کا نہ جانا کیسے ممکن ہے۔ سونا ہی کے بیاد میں نہ جانے کا
 کلک کیا کم ہے۔

گوہر بھرے ہوئے گھگے سے بولا ”ماں باپ سے کھنے رہنا کوئی اچھا کام نہیں۔ اب
 ہمارے ہاتھ پاؤں ہیں تو ان سے کھنچیں چاہے لڑیں، مگر جنم تو ان ہی نے دیا، پال پوس کر
 جوان تو ان ہی نے کیا۔ اب وہ ہمیں چار بات بھی کہیں تو گم کھانا چاہیے۔ ادھر مجھے بار بار
 اماں بابا کی یاد آیا کرتی ہے۔ اس سے مجھے نہ جانے کیوں ان پر کسہ آگیا تھا تیرے کارن
 ماں باپ کو بھی چھوڑنا پڑا۔“

بھنیا بگڑ اٹھی ”مجھے یہ پاپ نہ لگاؤ، ہاں تم ہی کو لڑنا سوچھا تھا۔ میں تو اماں کے پاس
 اتنے دن کبھی سانس تک نہ لیا۔“

”لڑائی تیرے کارن ہوئی۔“

”اچھا میرے ہی کارن سہی، میں نے بھی تمہارے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیا۔“
 ”تیرے گھر میں کون تجھے پیار کرتا تھا؟ بھائی بگڑتے تھے، بھادھیں ستاتی تھیں اور
 بھولا تجھے پاتے تو کچا ہی کھا جاتے۔“

”تمہارے ہی کارن۔“

”اب کی جب تک رہیں اس طرح رہیں کہ انہیں بھی جندگانی کا کچھ سکھ ملے۔ ان کی مرضی کے پنا پر کوئی کام نہ کریں۔ دادا اتنے اچھے ہیں کہ کبھی مجھے ڈانٹا بھی نہیں۔ اماں نے کئی بار مارا ہے مگر جب وہ مارتی تھیں تب کچھ نہ کچھ کھانے کو بھی دے دیتی تھیں۔ مارتی تھیں۔ پر جب تک مجھے ہنسا نہ لیں انہیں چین نہ آتا تھا۔“

دونوں نے مالتی سے ذکر کیا۔ مالتی نے چھٹی ہی نہیں دی بلکہ کنیا کی بھیٹ کے لیے ایک چرخہ اور ہاتھوں کا کنگن بھی دیا۔ وہ خود جانا چاہتی تھی مگر کنی ایسے مریض اس کے زیر علاج تھے جنہیں ایک دن کے لیے نہ چھوڑ سکتی تھی، ہاں شادی کے دن آنے کا وعدہ کیا۔ اور بچے کے لیے کھلونوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اسے بار بار چومتی اور پیار کرتی تھی۔ گویا سب کچھ پیشگی لے لینا چاہتی ہے، اور بچہ اس کے پیار کی بالکل پرواہ نہ کر کے گھر جانے کے لیے خوش تھا؛ اسی گھر کے لیے جس کو اس نے دیکھا تک نہ تھا۔ اس کے طفلانہ تصور میں گھر بہشت سے بڑھ کر کوئی چیز تھا۔

گوبر نے گھر پہنچ کر وہاں کی حالت دیکھی تو بڑی مایوسی ہوئی کہ اسی وقت واپس جائے۔ گھر کا ایک حصہ مرنے کے قریب تھا۔ دروازے پر صرف ایک تیل بندھا ہوا تھا اور وہ بھی ادھ مرا سا۔ دھنیا اور ہوری دونوں خوشی سے پھولے نہ سائے۔ مگر گوبر کا جی اچاٹ تھا۔ اب اس گھر کے سنہلنے کی کیا امید ہے؟ وہ غلامی کرتا ہے مگر پیٹ بھر کھاتا تو ہے۔ صرف ایک ہی مالک کا تو نوکر ہے۔ یہاں تو جسے دیکھو وہی رعب جھاتا ہے۔ غلامی ہے مگر خشک! محنت کر کے اناج پیدا کرو اور جو روپے ملیں اسے دوسرے کو دے دو۔ اور آپ بیٹھے ہوئے ”رام رام“ چبو۔ دادا ہی کا کلیجہ ہے کہ یہ سب سہتے ہیں۔ اس سے تو ایک دن نہ سہا جائے۔ اور یہ حالت کچھ ہوری ہی کی نہ تھی سارے گاؤں پر یہی مصیبت تھی۔ ایسا ایک آدمی بھی نہیں جس کی حالت زار نہ ہو۔ گویا جسم میں جان کے بجائے کلفت ہی بیٹھی ہوئی لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہی تھی۔ چلتے پھرتے تھے، کام کرتے تھے، پستے تھے، صرف اس لیے کے ایسا ہوتا ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ زندگی میں نہ کوئی امید ہے اور نہ کوئی امنگ، گویا ان کی زندگی کے سوتے سوکھ گئے ہوں اور ساری ہریالی مر جھا گئی ہو۔ جیٹھ کے دن ہیں، ابھی تک کھلیانوں میں اناج موجود ہے۔ مگر کسی کے چہرے پر خوشی نہیں ہے۔ بہت کچھ اناج

تو کھلیان ہی میں ٹل کر مہاجنوں اور کارندوں کی نذر ہو چکا ہے اور جو کچھ بچ رہا ہے وہ بھی دوسروں ہی کا ہے۔ مستقبل تاریکی کی طرح ان کے سامنے ہے جس میں انھیں کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ ان کی ساری حیات مردہ ہوگئی ہیں۔ دروازے پر منوں کوڑا کرکٹ جمع ہے، بدبو اڑ رہی ہے۔ مگر ان کی ناک میں نہ بو ہے اور نہ آنکھوں میں نور۔ سرشام سے دروازے پر گیدڑ رونے لگتے ہیں، مگر کسی کو غم نہیں۔ سامنے جو کچھ موٹا جھوٹا آجاتا ہے وہ کھالیتے ہیں، اسی طرح جیسے انجن کوئلہ کھالیتا ہے۔ ان کے تیل چونی چوکر کے بغیر تاند میں منہ نہیں ڈالتے۔ مگر انھیں صرف پیٹ میں کچھ ڈالنے کو چاہیے۔ ڈالتے سے کچھ مطلب نہیں۔ ان کی قوت ذائقہ مرچکی ہے۔ ان کی زندگی میں اس کا فقدان ہو گیا ہے۔ ان سے دھیلے دھیلے کے لیے بے ایمانی کراو، مٹھی بھر اناج کے لیے لٹھیاں چلوالو۔ پستی کی وہ انتہا ہے جب آدمی عزت وغیرت کو بھی بھول جاتا ہے۔

لڑکپن سے گوبر نے گاؤں کی یہی حالت دیکھی تھی اور اس کا عادی ہو چکا تھا۔ مگر آج چار سال کے بعد اس نے جیسے ایک نئی دنیا دیکھی۔ بھلے آدمیوں کے ساتھ رہنے سے اس کی عقل کچھ جاگ اٹھی ہے۔ اس نے سیاسی جلسوں میں جا کر لیکچر سنے ہیں جو اس کے عضو عضو میں بیوست ہو گئے ہیں۔ اس نے سنا ہے اور سمجھا کہ اپنا بھاگ خود بنانا ہوگا، اپنی عقل ہمت سے ان تکلیفوں پر فتح پانا ہوگا۔ کوئی دیوتا کوئی پوشیدہ طاقت، ان کی مدد کرنے نہ آئے گی۔ اس میں احساس آگیا ہے۔ اب اس میں وہ پہلے کا گنوار پن اور گھمنڈ نہیں ہے۔ وہ منکسر مزاج اور مدتر ہو گیا ہے۔ جس حالت میں پڑے ہوئے ہو اسے خود غرضی اور حرص میں مبتلا ہو کر اور کیوں بگاڑتے ہو؟ غم نے تم کو ایک رشتے میں باندھ دیا ہے۔ اخوت کی اس قدر بندش کو کیوں اپنی بیچ اغراض سے توڑے ڈالتے ہو؟ اس بندش کو اتحاد کی بندش بنا لو۔ اس طرح کے خیالات نے اس کی بشریت کو گویا پر لگا دیے ہیں۔ دنیوی نشیب و فراز دیکھے لینے کے بعد سیدھے سادے لوگوں میں جو فراخ دلی آجاتی ہے وہ گویا اب آسمان میں اڑنے کے لیے پروں کو تول رہی ہے۔ ہواری کو جب کوئی کام کرتے دیکھتا ہے تو اسے ہٹا کر خود کرنے لگتا ہے گویا اگلی بدسلوکیوں کا کفارہ کرنا چاہتا ہو۔ کہتا ہے کہ دادا اب تم کوئی چننا مت کرو۔ سارا بار مجھ پر چھوڑ دو، میں اب ہر مہینے خرچ بھیجوں گا۔ اتنے دن تو مرتے کھپتے رہے، اب کچھ دن تو آرام کرلو۔ مجھ پر لعنت ہے کہ میرے رہتے تم کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ اور

ہوری کے روئیں روئیں سے بیٹے کے لیے دعا نکلتی ہے۔ اسے اپنے کمزور جسم میں قدرتی طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس وقت اپنے فرض کی صراحت کر کے اس کی اٹھتی جوانی کا نظر اور تردد کی بجلی کیوں گرائے؟ وہ آرام سے کھائے پیے، زندگی کا سکھ اٹھائے۔ مرنے کھنے کے لیے وہ تیار ہے۔ یہی اس کی زندگی ہے۔ ”رام رام“، جب کہ وہ جی بھی تو نہیں سکتا۔ اسے تو پھاؤڑا اور کدال چاہیے۔ رام کے نام کی مالا پھیر کر اس کے دل کو سکون نہ ہوگا۔

گوبر نے کہا ”کہو تو سب سے رست کروا دوں اور ہر مہینے ادا کرتا جاؤں۔ کل ملا کر کتنا ہوگا؟“

ہوری نے سر ہلا کر کہا ”نہیں بیٹا، تم کا بے کوکٹ اٹھاؤ گے۔ تم ہی کو کون بہت ملتا ہے۔ میں سب دیکھ لوں گا۔ ایسا ہی سے تھوڑے رہے گا۔ روپا چلی جاتی ہے۔ اب کرج ہی چکانا تو ہے۔ تم کوئی چتا مت کرنا۔ اچھی طرح کھانا پینا۔ ابھی بدن بنالو گے تو سدا سکھ سے رہو گے۔ میری کون؟ مجھے تو مرنے کھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ابھی تم کو کھتی میں نہیں جوتا چاہتا۔ مالک اچھا مل گیا ہے۔ اس کی کچھ دن سیوا کر لو گے تو آدمی بن جاؤ گے۔ وہ تو یہاں آچکی ہیں۔ پوری دیوی ہیں۔“

”بیابا کے دن پھر آنے کو کہا ہے۔“

”ہمارے سر آنکھوں پر آویں۔ ایسے بھلے مانسوں کے ساتھ رہنے میں چاہے پیسے کم بھی ملیں مگر گیان بڑھتا ہے اور آنکھیں کھلتی ہیں۔“

اسی وقت پنڈت دادا دین نے ہوری کو اشارہ سے بلایا اور دور لے جا کر کمر سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکالتے ہوئے بولے ”تم نے میری صلاح مان لی، بڑا اچھا کیا۔ دونوں کام بن گئے۔ کنیا سے بھی ارن ہو گئے، اور باپ دادوں کی نسانی بھی بچ گئی۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا۔ میں نے تمہارے لیے کر دیا، اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔“

ہوری نے روپے لیے تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کا سر اوپر نہ اٹھ سکا، منہ سے ایک لفظ نہ نکلا، گویا زلت کے اتھاہ سمندر میں گر پڑا ہو اور گرتا چلا جا رہا ہو۔ آج تیس سال زندگی سے لڑتے رہنے کے بعد وہ ہار گیا اور ایسا ہارا کہ گویا اسے شہر کے پھاٹک پر کھڑا کر دیا گیا ہے اور جو جاتا ہے وہ اس کے منہ پر تھوک دیتا ہے۔ اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ

بھائیو! میں رحم کا مستحق ہوں، میں نے نہیں جانا کہ جیٹھ کی لو کیسی ہوتی ہے اور ماگھ کی برکھا کیسی ہوتی ہے۔ اس بدن کو چیر کر دیکھو اس میں کتنی جان رہ گئی ہے اور وہ کتنی چوٹوں سے چور اور ٹھوکروں سے کچلا ہوا ہے۔ اس سے پوچھو، کبھی تو نے آرام کے درشن کیے ہیں، کبھی تو چھاؤں میں بیٹھا ہے؟ اس پر یہ ذلت! اور وہ اب بھی جیتا ہے، نامرد، لالچی، کینہ! اس کا سارا اعتقاد جو بہت گہرا ہو کر ٹھوس اور اندھا ہو گیا تھا۔ گویا کلڑے کلڑے ہو گیا ہو۔

واتا دین نے کہا ”تو میں جاتا ہوں۔ نہ ہو، تم ابھی نوکھے رام کے پاس چلے جاؤ۔“

ہوری نے عاجزی سے کہا ”چلا جاؤں گا مہراج، مگر میری آبرو تمہارے ہاتھ ہے۔“

دو دن تک گاؤں میں خوب دھوم دھام رہی۔ باجے بجے، گانا بجانا ہوا اور روپا رو دھو کر رخصت ہو گئی۔ مگر ہوری کو کسی نے گھر سے نکلنے نہ دیکھا۔ ایسا چھپا بیٹھا تھا جیسے منہ میں کالکھ لگی ہو۔ مالٹی کے آجانے سے چہل پہل اور بڑھ گئی۔ دوسرے گاؤں کی عورتیں بھی آگئیں۔

گوبر نے اپنے انس و اخلاق سے سارے گاؤں کو گرویدہ بنا لیا ہے۔ ایسا کوئی گھر نہ تھا جہاں وہ اپنے سلوک کی یاد نہ چھوڑ آیا ہو۔ بھولا تو اس کے پیروں پر گر پڑے۔ اس کی عورت نے اسے پان دیے اور ایک روپیہ رخصتانہ دیا اور اس کا لکھنؤ کا پتہ بھی پوچھا۔ کبھی لکھنؤ آئے گی تو اس سے ضرور ملے گی۔ اپنے روپے کا اس نے کوئی ذکر نہ کیا۔

تیسرے دن جب گوبر چلنے لگا تو ہوری نے دھنیا کے سامنے آنکھوں میں آنسوؤں بھر کر اس گناہ کا اعتراف کر لیا جو کئی روز سے اس کے دل کو پریشان و پشیمان کر رہا تھا اور رو کر بولا ”بیٹا، میں نے اس دھرتی کے مومہ سے یہ پاپ کی گٹھری سر پر لادی۔ نہ جانے بھگوان مجھے اس کا کیا ڈنڈ دیں گے۔“

گوبر ذرا بھی ناخوش نہ ہوا، کسی طرح کی خفگی اس کے چہرے پر نہ تھی۔ عقیدت سے بولا ”اس میں پاپ کی تو کوئی بات نہیں ہے، دادا! ہاں رام سیوک کے روپے ادا کر دینا چاہیے۔ اور تم کرتے کیا؟ میں کسی لایک نہیں، تمھاری کھیتی میں اناج نہیں۔ ادھار کہیں مل نہیں سکتا، مہینے بھر کے لیے بھی گھر میں اناج نہیں۔ ایسی حالت میں تم کر ہی کیا سکتے تھے؟ کھیت نہ بچاتے تو رہتے کہاں؟ جب آدمی کا کوئی بس نہیں چلتا تو اپنے کو بھاگ ہی پرچھوڑ دیتا ہے۔ نہ جانے یہ دھاندلی کب تک چلتی رہے گی۔ جسے پیٹ کی روٹی میسر نہیں اس کے لیے آبرو اور مر جاد سب ڈھونگ ہے۔ اوروں کی طرح تم نے بھی دوسروں کا گلا دبایا ہوتا، ان کا روپیہ مارا ہوتا تو تم بھی بھلے مانس ہوتے۔ تم نے کبھی دھرم کو نہیں چھوڑا یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو یا تو جیل میں ہوتا یا پھر پھانسی پا گیا ہوتا۔ مجھ سے یہ کبھی نہ سہا

جاتا کہ میں کما کما کر سب کا گھر بھروں اور آپ اپنے بال بچوں کے ساتھ منہ میں جالی لگائے بیٹھا رہوں۔“

دھنیا بہو کو اس کے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ ہوئی۔ جھنڈا بھی چاہتی تھی کہ ابھی کچھ دن یہیں رہے۔ طے ہوا کہ گوہر اکیلا ہی جائے۔

دوسرے روز علی الصباح گوہر سب سے رخصت ہو کر لکھنؤ چلا ہوئی اسے گاؤں کے باہر تک بھیجنے گیا۔ گوہر سے اسے اتنی محبت اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ جب گوہر اس کے پیروں پر جھکا تو ہوئی روپڑا جیسے پھر اسے بیٹے کے درشن نہ ہوں گے۔ اس کی آتما میں خوشی تھی، غرور تھا اور عزم تھا۔ بیٹے سے یہ عقیدت اور محبت پا کر اس میں رونق اور بالیدگی آگئی۔ کئی روز پہلے اس پر جو سستی سی چھا گئی تھی، ایک ایسی تاریکی سی جس میں وہ اپنا راستہ بھول رہا تھا، وہاں اب مستعدی ہے اور روشنی ہے۔

روپا اپنے سرال میں خوش تھی۔ جس حالت میں اس کا بچپن بیٹا تھا اس میں پیسہ سب سے قیمتی چیز تھا۔ دل میں کتنی خواہشیں تھیں جو دل میں ہی گھٹ گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ وہ اب انھیں پورا کر رہی تھی اور رام سیوک ادھیڑ ہو کر بھی جوان ہو گیا تھا۔ روپا کے لیے وہ شوہر تھا۔ اس کے جوان، ادھیڑ یا بوڑھے ہونے سے اس کے نسانی جذبے میں کوئی فرق نہ آسکتا تھا۔ یہ جذبہ شوہر کے رنگ روپ یا سن پر منحصر نہ تھا، اس کی بنیاد اس سے بہت گہری تھی۔ اُبلے نسلی رواجوں کی تہہ میں، جو صرف کسی زلزلے ہی سے مل سکتی تھی۔ اس کا شباب اپنے ہی میں مست تھا، وہ اپنے ہی لیے اپنا بناؤ سنگھار کرتی تھی اور آپ ہی خوش ہو جاتی تھی۔ رام سیوک کے لیے اس کا دوسرا روپ تھا۔ تب وہ گرسٹن بن جاتی تھی۔ کسی طرح کی خامی کا خیال اس کے دل میں نہ آتا تھا۔ اناج سے بھری ہوئی کھتیاں اور گاؤں کے سرے تک پھیلی ہوئی کھیتی اور دروازے پر مویشی کی قطاریں، یہ سب اور کسی طرح کے عدم تکمیل والے خیال کو اس کے دل میں نہ آنے دیتی تھیں۔

اور اس کی سب سے بڑی خواہش تھی اپنے گھر والوں کو سکھی دیکھنا۔ ان کی غریبی کیسے دور کر دے؟ اس گائے کی یاد ابھی تک اس کے دل میں تازہ تھی جو مہمان کی طرح آئی تھی اور سب کو روتا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ یاد اتنے دنوں بعد اب اور بھی شیریں ہو گئی تھی۔ ابھی اس کا فچی پن اس نے گھر میں نہ قائم ہو پایا تھا۔ وہی پرانا گھر اس کا اپنا گھر تھا۔

وہیں کے لوگ اپنے یگانے تھے۔ ان ہی کا دکھ اپنا دکھ اور ان ہی کا سکھ اپنا سکھ تھا۔ اس دروازے پر موسیٰوں کا ایک جھنڈ دیکھ کر اسے وہ خوشی نہ ہو سکتی تھی جو اپنے دروازے پر ایک گائے دیکھ کر ہوتی۔ انھیں کتنی خوشی ہوئی تھی، جیسے آسمان سے کوئی دیوی آگئی ہو۔ تب سے بھر انھیں اتنی سمانی نہ ہوئی کہ کوئی دوسری گائے لاتے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ آج بھی ہوری کے دل میں وہ خواہش اتنی ہی تازہ ہے۔ اب کے وہ جائے گی تو وہ اپنے ساتھ وہ دھوری گائے ضروری لیتی جائے گی۔ نہیں، وہ نوکر سے کیوں نہ بھجوادے۔ رام سیوک سے پوچھنے بھر کی دیر تھی۔ منظوری ہوگئی اور دوسرے دن ایک ابیر کی معرفت روپانے گائے بھیج دی۔ ابیر سے کہا کہ دادا سے کہہ دینا منگل کے دودھ پینے کے لیے گائے بھیجی ہے۔ ہوری بھی گائے لینے کی فکر میں تھا۔ یوں ابھی گائے لینے کی غلت نہ تھی۔ مگر منگل یہیں ہے اور وہ بلا دودھ کے کیسے رہ سکتا ہے؟ روپیہ ملتے ہی وہ سب سے پہلے گائے لے گا۔ منگل اب صرف اس کا پوتا نہیں ہے، صرف گوبر کا بیٹا نہیں ہے، بلکہ ماہی دیوی کا کھلونا بھی ہے۔ اس کی پرورش و پرداخت اسی طرح ہونی چاہیے۔

مگر روپے کہاں سے آئیں؟ اتفاقاً اسی روز ایک ٹھیکہ دار نے سڑک کے لیے گاؤں کے اوسر میں کنکر کی کھدائی شروع کی۔ ہوری نے سنا تو فوراً وہاں جا پہنچا اور آٹھ آنے روز پر کھدائی کرنے لگا۔ اگر یہ کام دو مہینے بھی چل گیا تو اسے گائے بھر کو روپے مل جائیں گے۔ دن بھر لو اور دھوپ میں کام کرنے کے بعد وہ گھر آتا تو بالکل مرا ہوا سا، لیکن ٹکان کا نام نہیں، اسی حوصلے سے دوسرے روز پھر کام کرنے جاتا۔ رات کو بھی کھاپی کر گہٹی کے سامنے بیٹھ جاتا اور تلی کاتا۔ کہیں بارہ ایک بجے سونے کی نوبت آتی۔ دھنیا بھی پاگل ہوگئی تھی۔ اسے اتنی محنت کرنے سے روکنے کے بدلے وہ خود اس کے ساتھ سوتلی کاتے بیٹھ جاتی۔ گائے تو لینی ہی ہے، رام سیوک کے روپے بھی تو ادا کرنے ہیں۔ گوبر کہہ گیا ہے۔ اسے بڑی فکر ہے۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ دونوں بیٹھے تلی کات رہے تھے۔ دھنیا نے کہا ”تھیں نیند لگی ہو تو جا کر سو رہو، تڑکے سے پھر تو کام کرتا ہے۔“

ہوری نے آسمان کی طرف دیکھا ”چلا جاؤں گا۔ ابھی تو دس بجے ہوں گے۔ تو جا،

سورہ!“

”میں تو دوپہر کو تھوڑی دیر سو لیتی ہوں۔“

”میں بھی چپیتا کر کے تھوڑی دیر سو لیتا ہوں۔“

”بڑی لو لگتی ہوگی۔“

”لو کیا لگے گی، اچھی چھانہہ ہے۔“

”میں ڈرتی ہوں کہ کہیں تم بیمار نہ ہو جاؤ۔“

”چل بیمار وہ پڑتے ہیں جنہیں بیمار پڑنے کی پھر صحت ہوتی ہے۔ یہاں تو یہ دھن

ہے کہ اب کی گوبر آوے تو رام سیوک کے آدھے روپے جمع رہیں۔ کچھ وہ بھی لاوے ہی گا۔

بس اس سال اس روپے سے گلا جھوٹ جائے تو دوسری جندگی ہو۔“

”گوبر کی اب کی بڑی یاد آتی ہے۔ کتنا بھلا بن گیا ہے۔“

”چلتے سے میرے پاؤں پر گر پڑا۔“

”منگل وہاں سے آیا تو کتنا موٹا تھا۔ یہاں آکر دبلا ہو گیا۔“

”وہاں دودھ، بکھن، کیا نہیں پاتا تھا۔ یہاں روٹی مل جائے تو بہت ہے۔ ٹھیکہ دار

سے روپے ملے اور گائے لایا۔“

”گائے تو کبھی کی آگئی ہوتی، مگر جب تم کہنا مانو۔ اپنی کھیتی تو سنبھالے نہ سنبھلتی تھی

، پُپیا کا بوجھ بھی اپنے سر پر لا دیا۔“

”کیا کرتا؟ اپنا دھرم بھی تو کچھ ہے۔ ہیرا نے نالائقی کی تو اس کے بال بچوں کی

سنبھال کرنے والا بھی تو کوئی ہوتا چاہیے تھا۔ کون تھا میرے سوائے؟ بتا! میں نہ مدد کرتا

تو آج ان کی کیا درگت ہوتی، سوچ! اتنا سب کرنے پر بھی تو منگرو نے ان پر نالس کر

ہی دی۔“

”روپے گاڑ کر رکھے گی تو نالس نہ ہوگی؟“

”کیا بکتی ہے؟ کھیتی سے پیٹ بھر کو ہوتا جائے، یہی بہت ہے۔ گاڑ کر کوئی کیا

رکھے گا۔“

”ہیرا تو جیسے سنسار ہی سے چلا گیا۔“

”میرا من بولتا ہے وہ آوے گا کبھی نہ کبھی جرور۔“

دونوں سو گئے۔ ہوری منہ اندھیرے اٹھا تو دیکھا کہ ہیرا سانے کھڑا ہے۔ بال بڑھے

ہوئے ، کپڑے تار تار ، منہ سوکھا ہوا ، بدن میں گوشت اور خون کا نام نہیں ، جیسے قد بھی چھوٹا ہو گیا ہو ۔ دوڑ کر ہوری کے قدموں پر گر پڑا ۔

ہوری نے اسے سینے سے لگا کر کہا ” تم تو بالکل گھل گئے ہیرا! کب آئے ؟ آج تمہاری بار بار یاد آ رہی تھی ۔ پیار ہو کیا ؟“

آج اس کی آنکھوں میں وہ ہیرا نہ تھا جس نے اس کی زندگی تلخ کر دی تھی ۔ بلکہ وہ ہیرا تھا جو بے ماں باپ کا چھوٹا سا بچہ تھا ۔ درمیانی بچپن میں سال مٹ گئے تھے ۔ ان کا نشان بھی نہ تھا ۔

ہیرا نے کچھ جواب نہ دیا ۔ کھڑا رو رہا تھا ۔

ہوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بھرے گلے سے کہا ” کیوں روتے ہو بھیا ؟ آدمی سے بھول چوک ہوتی ہی ہے ۔ کہاں رہے اتنے دن ؟“

ہیرا نے بے چارگی سے کہا ” کہاں بتاؤں دادا ، بس یہی سمجھ لو کہ تمہارا درس بدلتا تھا سو بچ گیا ۔ ہتیا سر پر سوار تھی ۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گنو میرے سامنے کھڑی ہے ۔ ہر دم سوتے جاگتے کبھی آنکھوں کی اوٹ نہ ہوتی تھی ۔ میں پاگل ہو گیا ۔ اور پانچ سال تک پاگل کھانے میں بند رہا ۔ آج وہاں سے نکلے چھ مہینے ہوئے ۔ مانگتا کھاتا پھرتا رہا ۔ یہاں آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی ۔ دنیا کو کون منہ دکھاؤں گا ؟ آکھر جی نہ مانا ۔ کلیجہ کڑا کر کے چلا آیا ۔ تم نے بھی میرے بال بچوں کو“

ہوری نے بات کاٹی ” تم ناک بھاگے ۔ ارے ، ورد گا کو دس پانچ روپے دے کر معاملہ دیوا دیا جاتا ، اور کیا ہوتا ؟“

” تم سے جیتے جی اُون ہوں گا دادا ۔“

” میں کوئی گیر تھوڑے ہی ہوں بھیا ۔“

ہوری خوش تھا ۔ زندگی کی ساری تکلیفیں اور ساری مایوسیاں گویا اس کے قدموں پر لوٹ رہی تھیں ۔ کون کہتا ہے کہ زندگی کی جدو جہد میں وہ ہارا ہے ؟ یہ خوشی ، یہ غرور ، یہ حوصلہ ، کیا ہار کی علامت ہے ؟ ایسی شکستوں میں اس کی فتح ہے ۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ہتھیار اس کی فتح کے جھنڈے ہیں ۔ اس کا سینہ پھول اٹھا ہے اور چہرے پر چمک آگئی ہے ۔ ہیرا کی ممنونیت میں اس کی زندگی کی ساری کامیابی مجسم ہو گئی ہے ۔ اس کے بکھارے میں سو

دوسو من غلہ بھرا ہوتا، اس کی ہانڈی میں ہزار پانچ سو روپے گڑے ہوتے۔ لیکن اس سے یہ جنت کی خوشی کیا مل سکتی تھی؟

ہیرا نے اسے سر سے پیر تک دیکھ کر کہا ”تم بھی تو بہت دبلے ہو گئے دادا!“،
ہوری نے ہنس کر کہا ”تو کیا یہ میرے موٹے ہونے کے دن ہیں؟ موٹے وہ ہوتے ہیں جنہیں نہ روپے کا سوچ ہوتا ہے نہ مرچا دکا۔ اس جگہ میں موٹا ہونا بے حیائی ہے۔ سو کو دہلا کر کے تب ایک موٹا ہوتا ہے۔ ایسے موٹاپے میں کیا سکھ؟ سکھ تو تب ہے کہ کبھی موٹے ہوں۔ سو بھاسے بھینٹ ہوئی؟“

”اس سے تو رات ہی کو بھیت ہو گئی تھی۔ تم نے تو اپنے کو بھی پالا اور جو تم سے ہیرا کرتے تھے ان کو بھی پالا اور اپنی آبرو بنائے بیٹھے ہو۔ اس نے تو کھیتی باڑی سب بیچ ڈالی اور اب بھگوان ہی جانے اس کا نباہ کیسے ہو گا۔“

آج ہوری کھدائی کرنے چلا تو بدن بھاری تھا۔ رات کی تھکن دور نہ ہو پائی تھی۔ مگر اس کے قدم تیز تھے اور چال میں بے پروائی کی اکر تھی۔ آج دس ہی بجے سے لو چلنے لگی اور دوپہر ہوتے ہوتے تو آگ برس رہی تھی۔ ہوری کنکر کے ٹوکرے اٹھا اٹھا کر کان سے سڑک پر لاتا تھا اور گاڑی پر لادتا تھا۔ جب دوپہر کی چھٹی ہوئی تو وہ بے دم ہو گیا تھا۔ ایسی تھکن اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں تک نہ اٹھتے تھے۔ بدن اندر سے جھلسا جا رہا تھا۔ وہ نہ نہایا اور نہ کچھ چمایا۔ اسی تھکان میں اپنا انگو چھا بچھا کر ایک بیڑ کے تلے سو رہا۔ مگر پیاس کے مارے گلا سوکھا جاتا ہے۔ خالی پیٹ پانی پینا ٹھیک نہیں۔ اس نے پیاس کو روکنے کی کوشش کی مگر ہر لمحہ اندر کی جلن بڑھتی جاتی تھی۔ اس سے نہ رہا گیا۔ ایک مزدور نے بالٹی بھر کے رکھ لی تھی اور چربن چبا رہا تھا۔ ہوری نے اٹھ کر ایک لوٹا پانی کھوب کھج کر پیا اور پھر جاکر لیٹ رہا۔ مگر آدھ گھنٹے میں اسے تپ ہو گئی اور چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔

اس مزدور نے کہا ”کیسا جی ہے ہوری بھیا؟“

ہوری کا سر چکرا رہا تھا۔ بولا ”کچھ نہیں، اچھا ہوں۔“

یہ کہتے کہتے اسے پھرتے ہوئی اور ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ وہ گھبرایا۔ یہ سر میں چکر کیوں آ رہا ہے؟ آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھایا جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور زندگی کی ساری باتوں کی یاد مجسم ہو کر دل میں آنے لگیں، مگر بے سلسلہ، خواب کی

تصویروں کی طرح بے ربط اور مجڑی ہوئی۔ وہ خوشگوار بچپن یاد آیا جب وہ ٹھکیاں کھیلتا تھا اور ماں کی گود میں سوتا تھا۔ پھر دیکھا کہ جیسے گوبر آیا ہے اور اس کے پیروں پر گر رہا ہے۔ پھر منظر بدلا، دھنیا دہن بنی ہوئی سرخ چندری پنپنے اسے کھانا کھلا رہی ہے۔ پھر ایک گائے کی تصویر سامنے آئی۔ اس نے اس کا دودھ دوہا اور منگل کو پلارہا تھا کہ گائے ایک دیوی بن گئی اور“

اسی مزدور نے پھر پکارا ”دوپہری ڈھل گئی ہوئی، چلو تھو اٹھاؤ۔“
 ہوئی کچھ نہ بولا اس کی روح تو نہ جانے کس کس دنیا میں اڑ رہی تھی۔ اس کا بدن جل رہا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ لوگ گئی تھی۔
 اس کے گھر آدمی دوڑا گیا۔ گھنٹہ بھر میں دھنیا دوڑی ہوئی آ پہنچی۔ سو بھا اور ہیرا پیچھے پیچھے کھٹولے کی ڈولی بنا کر لا رہے تھے۔

دھنیا نے ہوئی کا بدن جھوا تو اس کا دل دھڑک اٹھا، چہرا اتر گیا، کانپتی ہوئی آواز میں بولی، کیسا جی ہے تمہارا؟“

ہوئی نے مضطربانہ اور مجنونانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا ”تم آگئے گوبر۔ میں نے منگل کے لیے گائے لے لی ہے۔ یہ کھڑی ہے، دیکھو؟“

دھنیا نے موت کی صورت دیکھی تھی۔ اسے پہنچاتی تھی۔ اسے دبے پاؤں بھی آتے دیکھا تھا اور آندھی کی طرح بھی آتے دیکھا تھا۔ اس کے سامنے ساس مری، سرمرا، اس کے دو بچے مرے، گاؤں کے پچاسوں آدمی مرے۔ دل میں ایک دھکا سا لگا۔ وہ بنیاد جس پر زندگی قائم تھی، گویا مٹی جا رہی تھی۔ لیکن نہیں، یہ صبر کرنے کا وقت ہے، اس کا اندیشہ بے بنیاد ہے، لوگ گئی ہے، اسی سے بے ہوشی ہے۔ امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر بولی ”میری طرح دیکھو، میں ہوں، کیا مجھے نہیں پہچانتے؟“

ہوئی کو کچھ ہوش ہوا۔ موت قریب آگئی تھی۔ آگ جل اٹھنے والی تھی۔ دھواں دور سا ہو گیا۔ دھنیا کو بیکسانہ انداز سے دیکھا۔ دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکل پڑے۔ کزور آواز میں بولا ”میرا کہا سنا معاف کرنا دھنیا! اب جاتا ہوں۔ گائے کا ارمان من ہی میں رہ گیا۔ اب تو یہاں کے روپے کریا کرم میں لگ جائیں گے۔ رومت دھنیا! اب کب تک چلائے گی؟ سب طرح کی درگت تو ہو گئی۔ اب مرنے دے!،،

اور اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ اسی وقت ہیرا اور سو بھا ڈولی لے کر پہنچ گئے۔
ہوری کو اٹھا کر ڈولی پر لٹایا اور گاؤں کی طرف چلے۔

گاؤں میں یہ خبر ہوا کی طرح پھیل گئی۔ سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ ہوری چارپائی پر پڑا
شاید سب کچھ دیکھتا تھا، سب کچھ سمجھتا تھا، مگر زبان بند ہو گئی تھی۔ البتہ اس کی آنکھوں سے
بہتے آنسو بتا رہے تھے کہ موہ کا بندھن توڑنا کتنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو کچھ اپنے سے نہیں بن
پڑا اسی کے دکھ کا نام تو موہ ہے۔ ادا کیے ہوئے فرائض اور پورے کیے ہوئے کاموں کا کیا
موہ؟ موہ تو ان بیکسوں کے چھوڑ جانے میں ہے جن کے ساتھ ہم اپنا فرض نہ نبھاسکے، ان
ادھورے منصوبوں میں ہے جنہیں ہم پورا نہ کر سکے!

مگر سب کچھ سمجھ کر بھی دھنیا امید کے شے ہوئے نکس کو پکڑے ہوئے تھی۔ آنکھوں
سے آنسو جاری تھے۔ مگر مشین کی طرح دوڑ دوڑ کر کبھی آم بھون کر پٹنا بتاتی اور کبھی ہوری
کے بدن پر گیہوں کے چوکر کی مالش کرتی۔ کیا کرے، پیسے نہیں ہیں ورنہ کسی کو بھیج کر
ڈاکٹر بلاتی۔

ہیرا نے روتے ہوئے کہا ”بھابی دل کڑا کرو، گنودان کرا دو، دادا چلے۔“
دھنیا نے اس کی طرف حقارت سے دیکھا۔ اب وہ دل کو اور کتنا کڑا کرے؟ اپنے
شوہر کے ساتھ اس کا جو دھرم ہے کیا یہ اس کو بتانا پڑے گا۔ جو زندگی کا ساتھی تھا اس
کے نام کو رونا ہی کیا اس کا دھرم ہے؟

اور کئی آوازیں آئیں ”ہاں گنودان کرا دو، اب یہی سُنے ہے۔“
دھنیا مشین کی طرح اٹھی۔ آج جو سٹی بیچی تھی اس کے بیس آنے پیسے لائی اور
ہوری کے ٹھنڈے ہاتھ میں رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے داتا دین سے بولی ”مہراج! مگر
میں نہ گائے ہے، نہ بچھیا، نہ پیسہ۔ یہی پیسے ہیں۔ یہی ان کا گنودان ہے!،“
اور غش کھا کر گر پڑی۔

منگل سوتر

بڑے بیٹے سنت کمار کو وکیل بنا کر، چھوٹے بیٹے سادھو کمار کو بی۔ اے کی ڈگری
 دلا کر اور چھوٹی لڑکی پنکجا کے دیواہ کے لیے استری کے ہاتھوں میں پانچ ہزار روپے نقد
 رکھ کر دیو کمار نے سمجھ لیا کہ وہ جیون کے کرتویہ سے مکت ہو گئے اور جیون میں جو کچھ شیش
 رہا ہے، اسے ایثار چٹن کے ارپن کر سکتے ہیں۔ آج چاہے کوئی ان پر اپنی جائداد کو
 بھوگ ولاس میں اڑا دینے کا الزام لگائے، چاہے ساہتیہ کے انوشٹھان میں۔ لیکن اس
 سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کی آتما دشال تھی! یہ افسوس تھا کہ کوئی ان سے مدد
 مانگے اور نراش ہو۔ بھوگ ولاس جوانی کا نشہ تھا اور جیون بھر وہ اس چھٹی کی پورتی
 کرتے رہے، لیکن ساہتیہ سیوا کے سوا انھیں اور کسی کام میں روپی نہ ہوئی اور یہاں دھن
 کہاں؟ ہاں، لیش ملا اور ان کے آتم سنوتش کے لیے اتنا کافی تھا! سچے میں ان کا
 وشواس بھی نہ تھا۔ سمسھو ہے پرتھتی نے اس وشواس کو ورڑھ کیا ہو، لیکن انھیں کبھی سچے نہ
 کر سکنے کا دکھ نہیں ہوا۔ ستمان کے ساتھ اپنا نباہ ہوتا جائے اس سے زیادہ وہ اور کچھ بھی
 نہ چاہتے تھے۔ ساہتیہ رسیکوں میں جو ایک اکڑ ہوتی ہے، چاہے اسے شیخی ہی کیوں نہ کہہ
 لو، وہ ان میں بھی تھی۔ کتنے ہی رئیس اور راجے اچھوک تھے کہ وہ ان کے دربار میں
 آئیں، اپنی رچنائیں سنائیں، ان کو بھینٹ کریں، لیکن دیو کمار نے آتم ستمان کو کبھی
 ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کسی نے بلایا بھی تو دھنواد دے کر ٹال گئے۔ اتنا ہی نہیں وہ یہ
 نہیں چاہتے تھے کہ راجے اور رئیس میرے دوار پر آئیں اور میری خوشامد کریں جو انہونی
 بات تھی۔ اپنے کئی مند بڑی سہہ پاٹھیوں کو وکالت یا دوسرے سیکوں میں دھن کے ڈھیر
 لگاتے، جائدادیں خریدتے، نئے نئے مکان بنواتے دیکھ کر کبھی کبھی انھیں اپنی دشا پر کھید
 ہوتا تھا، ویش کر جب ان کی جنم سنگنی شیویا گرہستی کی چٹاؤں سے جل کر انھیں کٹو وچن

سانے لگتی تھی، پر اپنی رچنا کو ٹیر میں قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہی وہ سب کچھ بھول سا ہتھ سورگ میں پہنچ جاتے تھے۔ آتم گورو جاگ اٹھتا تھا سارا اوساد اور وشاد شانت ہو جاتا تھا۔

مگر ادھر کچھ دنوں سے ساہتہ رچنا میں ان کا انوراگ کچھ غٹھا ہوتا جاتا تھا۔ انھیں کچھ ایسا جان پڑنے لگا تھا کہ ساہتہ پریمیوں کو ان سے وہ پہلے کی سی بھگتی نہیں رہی۔ ادھر انھوں نے جو دو پتکیں بڑے پریشم سے لکھی تھی اور جن میں انھوں نے اپنے جیون کے سارے انوبھو اور کلا کی ساری پروڑھتا بھر دی تھی ان کا وشیش آدر نہ ہوا تھا۔ اس کے پہلے اس کی دو رچنائیں نکلی تھیں، انھوں نے ساہتہ سنسار میں ہلچل مچا دی تھی۔ ہر ایک پتر میں ان پتکوں کی وسرت آلوچنائیں ہوتی تھیں، ساہتہ سنسٹھانوں نے انھیں بدھائیاں دی تھیں، ساہتہ مرکبو نے گن گراہتا سے بھرے پتر لکھے تھے۔ یہی ان رچناؤں کا دیوکار کی نظر میں اب اتنا آدر نہ تھا، ان کے بھاؤ انھیں بھاوکتا کے دوش سے پورن لگتے تھے۔ شلی میں بھی کرتھیا اور بھاری پن تھا پر جتنا کے ورثی میں وہی رچنائیں اب بھی سرور پر یہ تھیں۔ ان نئی کرتیوں سے بن بلائے مہمان کا سا آدر کیا گیا، مانو ساہتہ سنسار سنگٹھیت ہو کر ان کا اندر کر رہا ہو۔ کچھ تو یوں بھی ان کی اچھا وشرام کرنے کی ہو رہی تھی، اس شجھتا نے اس دچار کو اور بھی ورڑھ کر دیا۔ ان کو دو چار سچے سائیک متروں نے اس ترک سے ان کو ڈھارس دینے کی چھٹا کی کہ بڑی بھوک میں معمولی بھوجن بھی جتنا پر یہ لگتا ہے، بھوک کم ہو جانے پر اس سے کہیں زچی کر پدارتھ بھی اتنے پر یہ نہیں لگتے، پر اس سے انھیں آشاوس نہ ہوا۔ ان کے دچار میں کسی ساہتہ کار کی بجوتا کا یہی پرمان تھا کہ اس کی رچناؤں کی بھوک جتنا میں برابر بنی رہی جب وہ بھوک نہ رہے تو اس کو چھیر سے پرستھان کر جانا چاہیے۔ انھیں کیول پنکجا کے دیواہ کی چتا تھی اور جب انھیں ایک پرکاشک نے ان کی پھچلی دونوں کرتیوں کے پانچ ہزار دے دیے تو انھوں نے اسے ایٹھوریہ پر یڑنا سمجھا اور لیکھنی اٹھا کر سدپو کے لیے رکھ دی۔ مگر ان چھ مہینوں میں انھیں بار بار انوبھو ہوا کہ انھوں نے دان پرستھ سے لے کر بھی اپنے کو

بندھنوں سے نہ چھڑا پایا۔ شیویا کے دراکرہ کی تو انھیں کچھ ایسی پرواہ نہ تھی۔ وہ ان دیویوں میں تھی جن کا من سنسار سے کبھی نہیں چھوٹتا۔ اسے اب بھی اپنے پر یوار پر شاشن کرنے کی لالسا بنی ہوئی تھی، اور جب تک ہاتھ میں پیسے بھی نہ ہوں، وہی لالسا پوری نہ ہو سکتی تھی۔ جب دیو کمار اپنے چالیس درش کے دیواہت جیون میں اس کی حشرنا نہ مٹا سکے تو اب اس کا پرچن کرنا وہ پانی پینے سے کم دیرتھ نہ سمجھتے تھے۔ دکھ انھیں ہوتا تھا سنت کمار کے دچار اور بیودھار پر جو ان کے گھر کی سمجھتی لٹا دینے کے لیے اس دشا میں بھی چھما نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتی جو پچاس سال پور دس ہزار میں پھینک دی گئی، آج ہوتی تو اسے دس ہزار سال کی نکاسی ہو سکتی تھی۔ ان کی جس آراضی میں دن کو سیار لوٹتے تھے وہاں اب مگر کا سب سے گلزار بازار تھا جس کی زمین سو روپے درگ فٹ پر بک رہی تھی۔ سنت کمار کا مہتو کانشی من رہ رہ کر اپنے پتا پر کڑھتا رہتا تھا۔ پتا اور پتر کے سوبھاو میں اتنا انتر کیسے ہو گیا، یہ رہیہ تھا۔ دیو کمار کے پاس ہمیشہ ضرورت سے کم رہا، پر ان کے ہاتھ سد پوکھے رہے۔ ان کا سوندریہ بھاونا سے جاگا ہوا من کبھی کنجن کی اپاسنا کو جیون کا لکھیہ نہ بنا سکا۔ یہ نہیں کہ وہ دھن کا مولیہ جانتے نہ ہوں مگر ان کے من میں یہ دھارنا جم گئی تھی کہ جس راشتریہ میں تین چوتھائی پرانی بھوکے مرتے ہوں وہاں کسی ایک کو بہت سا دھن کمانے کا کوئی ٹیک ادھیکار نہیں ہے، چاہے اس کی اس میں سار تھ ہو۔ مگر سنت کمار کی لپسا ایسے ٹیک آدرشوں پر ہستی تھی۔ کبھی کبھی تو نس سلوچ ہو کر وہ یہاں تک کہہ جاتا تھا کہ جب ”آپ کو ساہتیہ سے پریم تھا تو آپ کو گرہست بننے کا کیا حق تھا؟ آپ نے اپنا جیون تو چوٹ کیا ہی، ہمارا جیون بھی مٹی میں ملا دیا۔ اور اب آپ دان پرستھ لے کر بیٹھے ہیں، مانو آپ کے جیون کے سارے رزھ (قرض) چک گئے ہوں۔“

جاڑوں کے دن تھے۔ آٹھ بج گئے تھے۔ سارا گھر ناشتہ کے لیے جما ہو گیا تھا۔ ہنکجا تخت پر چائے سنترے اور سوکھے میوے تشریوں میں رکھ کر دونوں بھائیوں کو ان کے کمروں سے بلانے گئی اور ایک چمن میں آکر سادھو کمار بیٹھ گیا۔ اونچے قد کا سوگھٹھ، روپ دان، گورا، بیٹھے دجن بولنے والا، سومیہ پوک تھا جسے کیول کھانے اور سیر سپاٹے

سے مطلب تھا۔ جو کچھ جڑ جائے بھر پیٹ کھا لیتا تھا اور یار دوستوں میں نکل جاتا تھا۔
 شیویا نے پوچھا۔ سنتو کہاں رہ گیا؟ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی تو کہے گا یہ تو پانی ہے
 ۔ بلا لے تو سادھو، اسے جیسے کھانے پینے کی بھی چھٹی نہیں ملتی۔
 سادھو سر جھکا کر رہ گیا۔ سنت کمار سے بولتے ان کی جان نکلتی تھی۔
 شیویا نے ایک جھمن بعد پھر کہا۔ اسے بھی کیوں نہیں بلا لانا؟
 سادھو نے دبی زبان سے کہا۔ نہیں بگڑ جائیں گے تو سویرے سویرے میرا سارا دن
 خراب ہو جائے گا۔

اتنے میں سنت کمار بھی آگیا۔ شکل صورت میں چھوٹے بھائی سے ملتا جلتا، کیول
 شریر کا گھٹن اُٹا اچھا نہ تھا۔ ہاں کھ پر تیج اور گرد کی جھلک تھی اور کھ پر ایک شکایت سی
 بیٹھی ہوئی تھی جیسے کوئی چیز اسے پسند نہ آتی ہو۔
 تخت پر بیٹھ کر چائے کھ سے لگائی اور ناک سکڑ کر بولے۔ تو کیوں نہیں آتی
 چنگیا؟ اور پشپا کہاں ہے؟ میں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ ناشتہ کھانا پینا سب کا ایک ساتھ ہونا
 چاہیے۔

شیویا نے آنکھیں تریر کر کہا تم لوگ کھالو، یہ سب پیچھے کھالیں گی، کوئی ہنگت
 تھوڑی ہے کہ سب ایک ساتھ بیٹھیں۔
 سنت کمار نے ایک گھونٹ چائے پی کر کہا۔ وہی پرانا ڈھاپڑا کتنی بار کہہ چکا ہوں
 کہ اس پرانے لچر سنکوچ کا زمانہ نہیں رہا۔

شیویا نے منہ بنا کر کہا۔ سب ایک ساتھ تو بیٹھے مگر پکائے کون اور پروسے کون؟
 ایک مہاراج رکھو پکانے کے لیے، دوسرا پروسنے کے لیے، تب وہ ٹھاٹھ نیچے گا۔
 تو مہاتما جی اس کا انتظام کیوں نہیں کرتے یا دان پر سٹھ لینا ہی جانتے ہیں۔
 ان کا جو کچھ کرنا تھا کر چکیں۔ اب تمہیں جو کچھ کرنا ہے تم کرو!

”جب پروشارتھ نہیں تھا تو ہم لوگوں کو پڑھایا لکھایا کیوں؟ کسی دیہات میں لے
 جا کر چھوڑ دیتے۔ ہم اپنی کھیتی کرتے یا بجوری کرتے اور پڑے رہتے۔ یہ کھڑاگ ہی کیوں

تم اس وقت نہ تھے، صلاح کس سے پوچھتے؟

سنت کمار نے کڑوا منہ بنائے چائے پی، کچھ میوے کھائے، پھر سادھو کمار سے بولے۔ تمہاری ٹیم کب بمبئی جا رہی ہے جی؟

سادھو کمار نے گردن جھکائے حسرت سور میں کہا۔ پرسوں۔

تم نے نیا سوٹ بنوایا؟

”میرا پرانا سوٹ ابھی اچھی طرح کام دے سکتا ہے۔“

”کام تو سوٹ نہ رہنے پر بھی چل سکتا ہے۔ ہم لوگ تو ننگے پاؤں، دھوتی چھڑا کر کھلا کرتے تھے۔ مگر جب ایک آل انڈیا ٹیم میں کھیلنے جا رہے ہوں تو دیا ٹٹا بھی تو ہونا چاہیے۔ پچھنے حالوں جانے سے کہیں اچھا ہے، نہ جانا۔ جب وہاں لوگ جانے گے کہ تم مہاتما دیور کمار جی کے سو پٹر ہو تو دل میں کیا کہیں گے؟“

سادھو کمار نے کچھ جواب نہ دیا۔ چپ چاپ ناشتہ کر کے چلا گیا! وہ اپنے پتا کی مالی حالت جانتا تھا اور انھیں سکٹ میں نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر سنت کمار نے سوٹ کی ضرورت سمجھتے ہیں تو بنوا کیوں نہیں دیتے ہیں؟ پتا کے اوپر بھار ڈالنے کے لیے اسے کیوں مجبور کرتے ہیں؟

سادھو چلا گیا تو شیویا نے آہٹ کلٹھ سے کہا۔ جب انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب میرا گھر سے کوئی واسطہ نہیں اور سب کچھ تمہارے اوپر چھوڑ دیا ہے تو تم کیوں ان پر گرجتی کا بھار ڈالتے ہوں؟ اپنے سامر تھ اور بدھی کے انوسار جیسے ہو سکا انھوں نے اپنی عمر کاٹ دی! جو کچھ وہ نہیں کر سکے یا ان سے جو چوٹیں ہوئی اس پر فقرے کسنا تمہارے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔ اگر تم نے اس طرح انھیں ستایا تو مجھے ڈر ہے کہ کبھی وہ گھر چھوڑ کر انتر دھان نہ ہو جائے۔ وہ دھن نہ کما سکے، پر اتنا تو تم جانتے ہی ہو کہ وہ جوں بھی جائیں گے لوگ انھیں سر آنکھوں پر لیں گے۔

شیویا نے اب تک سد یو پتی کی بھرتسا ہی کی تھی اس وقت اسے ان کی دکالت

کرتے دیکھ کر سنت کمار مسکرا پڑا۔

بولا۔ اگر انھوں نے ایسا ارادہ کیا تو ان سے پہلے میں انتر دھان ہو جاؤں گا۔ میں یہ بھار اپنے سر پر نہیں لے سکتا۔ انھیں اس کو سنبھالنے میں میری مدد کرنی ہوگی۔ انھیں اپنی کمائی لٹانے کا پورا حق تھا، لیکن باپ دادا کی جائداد کو لٹانے کا انھیں کوئی ادھیکار نہ تھا۔ اس کا انھیں پرائیڈ کرنا پڑے گا! وہ جائداد ہمیں واپس کرنی ہوگی۔ میں خود بھی کچھ قانون جانتا ہوں۔ وکیلوں، مجسٹروں سے بھی صلاح کر چکا ہوں! جائداد واپس لی جا سکتی ہے! اب مجھے یہی دیکھنا ہے کہ انھیں اپنی سنتان پیاری ہے یا اپنا مہاتما پن۔
یہ کہتا ہوا سنت کمار چنگا سے پان لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا!

سنت کمار کی استری پشپا بالکل پھول سی تھی، سندر، نازک، ہلکی پھلکی، لچا دھور، لیکن ایک نمبر کی آتما بھیمانی ہے۔ ایک ایک بات کے لیے وہ کئی کئی دن روٹھی رہ سکتی ہے۔ اور اس کا روٹھنا بھی سرو تھا نئے ڈیزائن کا ہے! وہ کسی سے کچھ کہتی نہیں، ہڑتی نہیں، گہرتی نہیں، گھر کا سب کام کاج اسی سمجھتا سے کرتی ہے بلکہ اور زیادہ ایکا گرتا سے۔ بس جس سے ناراض ہوتی ہے اس کی اور تاکتی نہیں وہ جو کچھ کہے گا، وہ کرے گی۔ وہ جو کچھ پوچھے گا جواب دے گی؛ وہ جو کچھ مانگے گا، اٹھا کر دے دے گی، مگر بنا اس کی اور تاکے ہوئے ادھر کئی دن سے وہ سنت کمار سے ناراض ہو گئی اور اپنی پھری ہوئی آنکھوں سے اس کے سارے آگھاتوں کا سامنا کر رہی ہے!

سنت کمار نے سنبھلے کے ساتھ کہا۔ آج شام کو چلنا ہے نا؟

پشپا نے سر نیچا کر کے کہا۔ جیسی تمھاری اچھا

”چلو گی نہ؟“

”تم کہتے ہو تو کیوں نہ چلوں گی؟“

”تمھاری کیا اچھا ہے؟“

”میری کوئی اچھا نہیں ہے ا،“

”آخر کس بات سے ناراض ہو؟“

”کسی بات پر نہیں۔“

”خیر نہ بولو، لیکن وہ سمیایوں چچی سادھنے سے حل نہ ہوگی۔“

پشپا کے اس برہیدہ استر نے سنت کمار کو بوکھلا ڈالا تھا! وہ خوب جھگڑ کر اس ویو اد کو

شانت کر دینا چاہتا تھا۔ چھما مانگنے پر تیار تھا، ویسی بات اب پھر منہ سے نہ نکالے گا، لیکن اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اسے چڑھانے کے لیے نہیں ایک پرہیزگار تھ بات کو پشت کرنے کے لیے ہی کہا تھا۔ اس نے کہا تھا جو استری پرش پر اولمپت ہے، اسے پرش کی حکومت ماننا پڑی گی۔ وہ مانتا تھا کہ اس ادھر پر یہ بات اسے منہ سے نہ نکالنی چاہیے تھی۔ اگر کہنا اوشیک بھی ہوتا تو ملائم شبدوں میں کہنا تھا، لیکن جب ایک عورت اپنے ادھیکار کے لیے پرش سے لڑتی ہے، اس کی برابری کا دعویٰ کرتی ہے تو اسے کٹھور باتیں سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس وقت بھی وہ اسی لیے آیا تھا کہ پشپا کو قائل کرے اور سمجھائے کہ منہ پھیر لینے سے ہی کسی بات کا زرنہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اس میدان کو جیت کر یہاں ایک جھنڈا گاڑ دینا چاہتا تھا جس اس دشنے پر کوئی دیوانہ نہ ہو سکے۔ تب سے کتنی ہی نئی نئی یکتیاں اس کے من میں آگئی تھیں، مگر جب شتر و قلعے کے باہر نکلے ہی نہیں تو اس پر حملہ کیسے کیا جائے۔

ایک اپائے ہے شتر کو بہلا کر، اس پر اپنی سندھی پریم کا دھواں بجا کر، قلعے سے نکالنا ہوگا۔ اس نے پشپا کی ٹھنڈی پکڑ کر اپنی اور پھیرتے ہوئے کہا۔ اگر یہ بات تمہیں اتنی لگ رہی ہے تو میں اسے واپس لیے لیتا ہوں۔ اس کے لیے تم سے چھما مانگتا ہوں۔ تم کو ایسور نے وہ شکتی دی ہے کہ تم مجھ سے دس پانچ دن بنا بولے رہ سکتی ہوں، لیکن مجھے تو اس نے یہ شکتی نہیں دی۔ تم روٹھ جاتی ہو تو جیسے میری نازیوں میں رکت کا پرواہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر وہ شکتی تم مجھے بھی پر دان کر سکو تو میری اور تمہاری برابری کی لڑائی ہوگی اور میں تمہیں چھیڑنے نہ آؤں گا۔ لیکن اگر ایسا نہیں کر سکتی تو اس استر کا مجھ پر وار نہ کرو۔

پشپا مسکرا پڑی۔ اس نے اپنے استر سے پتی کو پراست کر دیا تھا۔ جب وہ دین بن کر اس سے چھما مانگ رہا ہے تو اس کا ہر دے کیوں نہ پھل جائے۔

سندھی پتر پر ہستا کشر سورپ پان کا ایک بیڑا لگا کر سنت کمار کو دیتی ہوئی بولی ”اب سے کبھی وہ بات منہ سے نہ نکالنا۔ اگر میں تمہاری آشریتا ہوں تو تم بھی میرے آشریت ہو۔ میں تمہارے گھر میں جتنا کام کرتی ہوں، اتنا ہی کام دوسروں کے گھر میں کروں تو اپنا نباہ کر سکتی ہوں یا نہیں، بولو؟

سنت کمار نے کڑا جواب دینے کی بجائے روک کر کہا۔ بہت اچھی طرح۔
 تب میں جب کچھ کماؤں گی وہ میرا ہوگا۔ یہاں میں چاہے پران بھی دے دوں پر
 میرا کسی چیز پر ادھیکار نہیں۔ تم جب چاہو مجھے گھر سے نکال سکتے ہو۔
 کہتی جاؤ، مگر اس کا جواب سننے کے لیے تیار رہو۔

تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہے، کیول ہٹھ دھرم ہے۔ تم کہو گے یہاں جو تمہارا
 ستان ہے وہ وہاں نہ رہے گا۔ وہاں کوئی تمہاری رکشا کرنے والا نہ ہوگا، کوئی تمہارے دکھ درد
 میں ساتھ دینے والا نہ ہوگا۔ اسی طرح کی اور بھی کتنی ہی دلیلیں تم دے سکتے ہوں۔ مگر میں
 نے بس بلکر کو آجیون کنواری رہ کر ستان کے ساتھ زندگی کا نئے دیکھا ہے۔ ان کا نجی جیون
 کیسا تھا، یہ میں نہیں جانتی۔ سمجھو ہے وہ ہندو گرجا کے آدرش کے انوکول نہ رہا ہوں،
 مگر ان کی عزت سبھی کرتے ہیں، اور انھیں اپنی رکشا کے لیے کسی پُرش کا آشرے لینے کی کبھی
 ضرورت نہیں ہوئی۔“

سنت کمار مس بلکر کو جانتا تھا۔ وہ مگر کی پرسدھ لیڈی ڈاکٹر تھی۔ پشپا کے گھر سے اس کا
 گھراؤ سا ہو گیا تھا۔ پشپا کے پتا ڈاکٹر تھے اور ایک پیٹھ کے ویکٹیوں میں کچھ گھنٹھٹھا ہو ہی
 جاتی ہے۔ پشپا نے جو سمیا اس کے سامنے رکھ دی تھی اس پر پیٹھے اور زریہ شبدوں میں کچھ کہنا
 اس کے لیے کھنن ہو رہا تھا۔ اور چپ رہنا اس کی پر دشتا کے لیے اس سے بھی کھنن تھا۔
 دُبدھا میں پڑ کر بولا ”مگر سبھی استریاں مس بلکر تو نہیں ہو سکتی؟“

پشپا نے آدرش کے ساتھ کہا ”کیوں؟“ اگر وہ ڈاکٹری پڑھ کر اپنا ویوسائے کر سکتی
 ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتی؟

ان کے سماج میں اور ہمارے سماج میں بڑا امتز ہے ”ارتھات ان کے سماج میں پردش
 شریٹ ہے، شیل وان اور ہمارے سماج کے پردش چتر پن ہے، لپٹ ہے، ویش کر جو
 پڑھے لکھے ہیں۔“

”یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اس سماج میں ناریوں میں آتم مل ہے، اپنی رکشا کرنے کی
 ہمتی ہے اور پردش کو قابو میں رکھنے کی کلا ہے۔“

”ہم بھی تو وہی آتم بل اور فکنتی اور کلا پراپت کرنا چاہتی ہیں لیکن تم لوگوں کے مارے جب کچھ چلنے پادے۔ مریدا اور آدرش اور جانے کن کن بہانوں سے ہمیں دبانے کی اور ہمارے اوپر اپنی حکومت جمائے رکھنے کی کوشش کرتے ہو۔“

سنت کمار نے دیکھا کہ بحث پھر اسی مارگ پر چل پڑی ہے جو انت میں پشپا کو انت سہیگ ڈھاڑن کرنے پر تیار کر دیتا ہے، اور اس سے وہ اسے ناراض کرنے نہیں، اسے خوش کرنے آیا تھا۔“

بولا۔ اچھا صاحب سارا دوش پردوشوں کا ہے، اب راضی ہوئیں۔ پردوش بھی حکومت کرتے کرتے تھک گیا ہے، اور اب کچھ دن وشرام کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے آدھین رہ کر اگر وہ اس سنگھرش سے بچ جائے تو وہ اپنا سنگھسان چھوڑنے کو تیار ہے۔
پشپا نے مسکرا کر کہا ”اچھا آج سے گھر میں بیٹھو۔“

”بڑے شوق سے بیٹھوں گا، میرے لیے اچھے اچھے کپڑے، اچھی اچھی سواریاں لادو۔ جیسا تم کہو دیا ہی کروں گا تمہاری مرضی کے خلاف ایک شبد بھی نہ بولوں گا۔“
پھر تو نہ کہو گی کہ استری پردوش کی محتاج ہے، اس لیے اسے پردوش کی غلامی کرنی چاہیے؟
”کبھی نہیں مگر ایک شرط پر۔“

”کون سی شرط۔“

”تمہارے پریم پر میرا ہی ادھیکار رہے گا۔“

”استریاں تو پردوشوں سے ایسی شرط کبھی نہ منوا سکی؟“

یہ ان کی درہلتا تھی۔ ایٹور نے تو انھیں پردوش پر شاشن کرنے کے لیے سبھی استری دیے تھے۔

سندھی ہو جانے پر بھی پشپا کا من آشوست نہ ہوا۔ سنت کمار کا سو بھاد وہ جانتی تھی۔ استری پر شاشن کرنے کا جو سنکار ہے وہ اتنی جلدی کیسے بدل سکتا ہے۔ اوپر کی باتوں میں سنت کمار اسے اپنے برابر کا استھان دیتے تھے۔ لیکن اس میں ایک پرکار کا احساس چھپا ہوتا تھا۔ مہو کی باتوں میں وہ لگام اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے۔ ایسا آدمی یکا یک اپنا ادھیکار

تیاگنے پر تیار ہو جائے ، اس میں کوئی رہسہ اوشیہ ہے ۔

بولی۔ ناریوں نے ان شستروں سے اپنی رکشا نہیں کی ، پردوشوں کی ہی رکشا کرتی

رہی۔ یہاں تک کہ ان میں اپنی رکھا کرنے کی سامرتھ ہی نہیں رہی۔“

سنت کمار نے مکدھ بھاؤ سے کہا ” یہی بھاؤ میرے من میں کئی بار آیا ہے پشپا، اور اس

میں کوئی سندھیہ نہیں کہ اگر استری نے پردوش کی رکشانہ کی تو آج دنیا ویران ہوگئی ہوتی۔ اس

کا سارا جیون تپ اور سادھنا کا جیون ہے۔“

تب اس نے اس سے اپنے منصوبے کہہ سنائے ۔ وہ ان مہاتماؤں سے اپنی موروی

جانداد واپس لینا چاہتا ہے ، اگر پشپا اپنے پتا سے ذکر کرے اور دس ہزار روپے بھی دلا دے تو

سنت کمار کو دولاکھ روپے کی جانداد مل سکتی ہے ۔ صرف دس ہزار۔ اتنے روپے کے بغیر اس

کے ہاتھ سے دولاکھ کی جانداد نکلی جاتی ہے۔

پشپا نے کہا ” مگر وہ جانداد تو بک چکی ہے۔“

سنت کمار نے سر ہلایا ۔ بک نہیں چکی ، لٹ چکی ہے۔“ جو زمین لاکھ دو لاکھ میں بھی

سستی ہے ، وہ دس ہزار میں کوزا ہوگئی ۔ کوئی بھی سمجھدار آدمی ایسا کچا نہیں کھا سکتا اور اگر

کھا جائے تو وہ اپنے ہوش دھواس میں نہیں ہے ۔ دادا گرحستی میں کشل نہیں رہے ۔ وہ تو

کلپناؤں کی دنیا میں رہتے تھے بد معاشوں نے انھیں چکھا دیا اور جانداد نکلوا دی ۔ میرا دھرم ہے

کہ وہ جانداد واپس لوں ، اور تم چاہوں تو سب کچھ ہو سکتا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے دس

ہزار کا انتظام کر دینا کوئی کٹھن بات نہیں ہے۔

پشپا ایک منٹ تک وچار میں ڈوبی رہی پھر سندھیہ بھاؤ سے بولی۔ مجھے تو آشنا نہیں کی

دادا کے پاس اتنے روپے قائلو ہوں ۔

” ذرا کہو تو۔“

کہوں کیسے۔ کیا۔ میں ان کا حال جانتی نہیں ،، ؟ ان کی ڈاکٹری اچھی چلتی ہے ، پر

ان کے خرچ بھی تو ہیں ، بید کے لیے ہر مہینے پانچ سو روپے انگلینڈ بھیجنے پڑتے ہیں ۔ تلو حتما

کی پردھائی کا خرچ بھی کچھ کم نہیں ۔ سچے کرنے کی ان کی عادت نہیں ہے ۔ میں انھیں سکٹ

میں نہیں ڈالنا چاہتی۔“

”میں ادھار مانگتا ہوں۔ خیرات نہیں۔“

”جہاں اتنا گھنٹ سمبندھ ہے وہاں ادھار کے معنی خیرات کے سیوا اور کچھ نہیں۔ تم روپے نہ دے سکتے تو وہ تمہارا کیا بنالیں گے؟ عدالت جانیں سکتے، دنیا بے گی: پنچایت کر نہیں سکتے، لوگ تانے دیں گے۔“

سنت کمار نے جیکھے پن سے کہا۔۔۔ ”یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں روپے نہ دے سکوں گا؟“
پشپا منہ پھیر کر بولی ”تمہاری جیت ہونا بچت نہیں ہے اور جیت بھی ہو جائے اور تمہارے ہاتھ میں روپے ابھی جائیں تو یہاں کتنے زمیندار ایسے ہیں جو اپنے قرض چکا سکتے ہوں؟ روز ہی تو ریاستیں کورڈ آف وارلڈ میں آیا کرتی ہیں۔ یہ بھی مان لیں کہ تم کفایت سے رہو گے اور دھن جما کر لو گے لیکن آدمی کا سوبھاؤ ہے کہ جس روپے کو وہ ہضم کر سکتا ہے اسے ہضم کر جاتا ہے۔ دھرم اور نیتی کو بھول جانا اس کی ایک عام کمزوری ہے۔

سنت نے پشپا کو بڑی آنکھوں سے دیکھا۔ پشپا کے کہنے میں جو ستیہ تھا وہ تیر کی طرح نشانے پر جا بیٹھا۔ اس کے من میں جو چور چھپا بیٹھا تھا اسے پشپا نے پکڑ کر سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ تمللا کر بولا۔ ”آدمی کو تم اتنا بچ سمجھتی ہو، تمہاری اس منوورتی پر مجھے اچرج بھی ہے اور دکھ بھی۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی سماج پر دھرم اور نیتی کا ہی شان ہے جس دن سنسار سے دھرم اور نیتی کا تاش ہو جائے گا اسی دن سماج کا انت ہو جائے گا۔

اس نے دھرم اور نیتی کی بیا پکٹا پر ایک لمبا دارھنک بیا کھیاں وے ڈالا۔ کبھی کسی گھر میں کوئی چوری ہو جاتی تو کتنی بل چل جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کے چوری ایک غیر معمولی بات ہے اگر سماج چوروں کا ہوتا تو کسی کا سہا ہونا اتنی ہی ہلچل پیدا کرتا۔ روگوں کی آج بہت بڑھتی سننے میں آتی ہے، لیکن غورے دیکھو تو سو میں سے ایک آدمی سے زیادہ بیمار نہ ہوگا۔ اگر بیماری عام بات ہوتی تو تندرستی کی نمائش ہوتی آدمی۔ پشپا درکت سی سنتی رہی اس کے پاس جواب تو تھے، پر وہ اس بحث کو تول نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے پتا سے روپے کے لیے نہ کہے گی اور کسی ترک یا پرمان کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو

سکتا تھا۔

سنت کمار نے بھاشن ختم کر کے جب اس سے کوئی جواب نہ پایا تو ایک چھن کے بعد بولا۔۔۔ کیا سوچ رہی ہوں؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں، میں بہت جلد روپے دے دوں گا۔ پشپا نے نچل بھاؤ سے کہا۔ تمہیں کہنا ہو جا کر خود کہو، میں تو نہیں لکھ سکتی۔ سنت کمار نے ہونٹ چبا کر کہا۔ ذرا سی بات تم سے نہیں لکھی جاتی، اس پر دعویٰ یہ ہے کہ گھر پر میرا بھی ادھیکار ہے۔

پشپا نے جوش کے ساتھ کہا ”میرا ادھیکار تو اسی چھن ہو گیا جب میری گانٹھ تم سے بندھی۔ سنت کمار نے گرد کے ساتھ کہا ”ایسا ادھیکار جتنی آسانی سے مل جاتا ہے اتنی ہی آسانی سے چھن بھی جاتا ہے۔

پشپا کو جیسے کسی نے دھکا دے کر اس وچار دھارا میں ڈال دیا جس میں پاؤں رکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اس نے یہاں آنے کے ایک دو مہینوں کے بعد ہی سنت کمار کا سوبھاؤ پہچان لیا تھا۔ ان کے ساتھ نباہ کرنے کے لیے اسے ان کی اشاروں کی لوٹھی بن کر رہنا پڑے گا۔ اسے اپنے ویکتو کو ان کے استو میں ملا دینا پڑے گا۔ وہ وہی سوچیں گی جو وہ سوچیں گے۔ وہی کرے گی جو وہ کریں گے۔ اپنی آتما کے دکاس کے لیے یہاں کوئی دوسر نہ تھا۔ ان کے لیے لوک یا پرلوک میں جو کچھ تھا وہ سمجھتی تھی۔ یہیں سے ان کے جیون کو پریرنا ملتی تھی۔ سمجھتی کے مقابلے میں جتنی یا پٹر کی ان کی نگاہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ ایک چینی کا پلیٹ پشپا کے ہاتھ سے ٹوٹ جانے پر انھوں نے اس کے کان اینٹھ لیے تھے۔ فرش پر سیاہی گرا دینے کی سزا انھوں نے پٹکچا سے سارا فرش دھلوا کر دی تھی۔ پشپا ان کے رکھے روپوں کو کبھی ہاتھ نہ لگاتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ دھن کو محض جمع کرنے کی چیز نہ سمجھتے تھے۔ دھن، بھوگ کرنے کی دستو ہے ان کا یہ سدھانت تھا۔ فضول خرچی یا لا پرواہی برداشت نہ کرتے تھے۔ انھیں اپنے سوا کسی پر دشو اس نہ تھا پشپا نے کٹھور آتم سمرپن کے ساتھ اس جیون کے لیے اپنے کو تیار کر لیا تھا۔ پر بار بار یہ یاد دلایا جاتا کہ یہاں اس کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ وہاں وہ کیول ایک لوٹھی کی طرح ہے اسے اسہیہ تھا۔ ابھی اس دن اسی طرح کی ایک بات

سن کر اس نے کئی دن کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور آج تک اس نے کسی طرح من کو سمجھا کر شانت کیا تھا کہ وہ دوسرا آگہات ہوا۔ اس نے اس کے رہے سہے دھیر یہ کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ سنت کمار تو اسے یہ چنوتی دے کر چلے گئے ، وہ وہی بیٹھی سوچنے لگی اب اس کو کیا کرنا چاہیے۔ اس دشامیں تو وہ اب نہیں رہ سکتی۔ وہ جانتی تھی کے پتا کہ گھر میں بھی اس کے لیے شانتی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی سنت کمار کو آدرش یووک سمجھتے تھے اور انھیں اس بات کا دھواں دلانا کھٹن تھا کہ سنت کمار کی اور سے کوئی بیجا حرکت ہوئی ہے۔ پشپا کا دیواہ کر کے انھوں نے جیون کی ایک سمیا حل کر لی تھی اس پر پھر دچار کرنا ان کے لیے اوجھ تھا۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی ابھیلا شانتی تھی کہ اب کہیں نہ چھٹ ہو کر دنیا کی سیر کریں۔ یہ سے اب نکٹ آتا جاتا ہے جوں ہی لڑکا انگلینڈ سے لوٹا اور چھوٹی لڑکی کی شادی ہوئی کہ وہ دنیا کے بندھن سے کٹت ہو جائیں گے۔ پشپا پھر ان کے سر پر ان کے جیون کے سب سے بڑے ارمان میں بادھانہ ڈالنا چاہتی تھی۔ پھر اس کے لیے دوسرا کون استھان نہیں ہے؟ تو کیا اس گھر میں رہ کر جیون پر یقین ایمان سہتے رہنا پڑے گا۔

سادھو کمار آکر بیٹھ گیا۔ پشپا نے چونک کر پوچھا ”تم بمبئی کب جا رہے ہو؟“
 سادھو نے ہچکچاتے ہوئے کہا ”جانا تو تھا کل، لیکن میری جانے کی اچھا نہیں ہوتی۔
 آنے جانے میں سیکڑوں کا خرچ ہے۔ گھر میں روپے نہیں، میں کسی کو ستانا نہیں چاہتا۔ بمبئی جانے کی ایسی ضرورت ہی کیا ہے جس ملک میں دس میں نو آدمی روٹی کو ترستے ہوں، وہاں دس میں آدمیوں کا کرکٹ کے ویسٹن میں پڑے رہنا مورکھتا ہے۔ میں تو نہیں جانا چاہتا۔

پشپا نے اٹھتے کیا۔۔۔ تمہارے بھائی صاحب تو روپے دے رہے ہیں۔
 سادھو نے مسکرا کر کہا۔ مجھے دادا کا گلا دہانے کو کہہ رہے ہیں۔ میں دادا کو کشت نہیں دیتا چاہتا۔ بھائی صاحب سے کہنا مت بھابی۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

پشپا اس کی اس نرم سرلتا پر ہنس پڑی۔ بائیس سال کا گروہلا یووک جس نے ستیا گرہ سنگرام میں پڑھنا چھوڑ دیا، دو بار جیل ہو آیا، جیلر کے کنو دچن سن کر اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا اور اس اودھرتا کی سزا میں تین مہینے کال کوٹھری میں رہا، وہ اپنے بھائی سے اتنا ڈرتا ہے،

مانو وہ ہوا ہوں - بولی۔ میں تو کہہ دوں گی۔

”تم نہیں کہہ سکتیں۔ اتنی زردی نہیں ہو۔“

پشپا پرسن ہو کر بولی۔ کیسے جانتے ہو؟

”چہرے سے۔“

”جھوٹے ہو۔“

”تو پھر اتنا اور کہے دیتا ہوں کہ آج بھائی صاحب نے تمہیں بھی کچھ کہا ہے۔“ پشپا

جھینپتی ہوئی بولی۔ بالکل غلط وہ بھلا مجھے کیا کہتے؟“

”اچھا میرے سر کی قسم کھاؤ۔“

”قسم کیوں کھاؤں؟ تم نے مجھے کبھی قسم کھاتے دیکھا ہے؟“

بھیا نے کچھ کہا ہے ضرور، نہیں تمہارا منہ اتنا اترا ہوا کیوں رہتا؟ بھائی صاحب سے

کہنے کی ہمت نہیں پڑتی، ورنہ سمجھاتا کہ آپ کون گڑے مردے اکھاڑ رہے ہیں جو جانداد بک

گئی اس کے لیے اب دادا کو کونا اور عدالت کرنا مجھے تو کچھ نہیں جچتا۔ غریب لوگ بھی تو دنیا

میں ہیں ہی، یا سب مالدار ہی ہیں۔ میں تم سے ایمان سے کہتا ہوں بھابھی، میں جب کبھی

دھنی ہونے کی کلپنا کرتا ہوں تو مجھے ہڈکا ہونے لگتی ہے کہ نہ جانے میرا من کیا ہو جائے۔

اتنے غریبوں میں دھنی ہونا تو مجھے گھمنڈ سا لگتا ہے۔ مجھے تو اس دشا میں بھی اپنے اوپر لچا آتی

ہے، جب دیکھتا ہوں کہ میرے ہی جیسے لوگ ٹھوکرے کھا رہے ہیں۔ ہم تو دونوں وقت چھڑی

ہوئی روٹیاں دودھ اور سیب اور سنترے اڑاتے ہیں۔ مگر سو میں ٹاڈے آدی تو ایسے بھی ہے

جنہیں ان چیزوں کے درشن بھی نہیں ہوتے۔ آخر ہم میں کیا سرخاب کے پر لگ گئے ہیں؟

پشپا ان دچاروں کے نہ ہونے پر بھی سادھو کی نکلپٹ سچائی کا آدر کرتی تھی۔ بولی تم

اتنا پڑھتے تو نہیں، یہ دچار تمہارے دماغ میں کہاں سے آجاتے ہیں؟

سادھو نے اٹھ کر کہا۔ شاید اس جنم میں بھکاری تھا۔

پشپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میری دیورانی بے چاری کہنے کپڑوں کو

ترس جائے گی۔

”میں اپنا بیاہ ہی نہ کروں گا۔

من میں تو منارہے ہو گے کہ کہیں سے سندیا آئے۔

نہیں بھابی تم سے جھوٹ نہیں کہتا۔

شادی کا تو مجھے خیال بھی نہیں آتا۔ زندگی اسی کے لیے ہے کہ کسی کے کام آئے۔

جہاں سیوکوں کی اتنی ضرورت ہے وہاں کچھ لوگوں کو تو کنوارے ہی رہنا چاہیے۔ کبھی شادی

کروں گا تو ایسی لڑکی سے جو میرے ساتھ غربی میں زندگی بسر کرنے پر راضی ہو اور جو

میرے جیون کی سچی سہ بھاگنی بنے۔“

پشپا نے اس پرتکیا کو بھی ہنسی میں اڑا دیا۔ پہلے بھی یووک اس طرح کی کلپنا کیا

کرتے تھے۔ لیکن شادی میں دیر ہوئی تو شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔

سادھو کمار نے جوش کے ساتھ کہا ”میں ان یووکوں میں نہیں ہوں بھابی، اگر کبھی من

چنچل ہوا تو زہر ضرور کھالوں گا۔

پشپا نے پھر کٹاکش کیا۔ تمہارے من میں تو بی بی (پنگجا) بسی ہوئی ہے۔“

تم سے کوئی بات کہو تو تم بنانے لگتی ہو، اسی سے میں تمہارے پاس نہیں آتا“

اچھا سچ کہنا پنگجا جیسی بیوی پاؤ تو دیواہ کر دیا نہیں،؟

سادھو کمار اٹھ کر چلا گیا۔ پشپا روکتی رہی مگر وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا۔ اس

آدرش وادی، سرل پر کرتی، سوشل سوپے یووک سے مل کر پشپا کا مرجھایا ہوا من کھل اٹھا تھا۔

وہ بھیتر سے جتنی بھاری تھی، باہر سے اتنی ہلکی تھی۔ سنت کمار سے تو اسے اپنے ادھیکاروں کی

پرچھن رکشا کرنا پڑتی تھی چونکہ رہنا پڑتا تھا کہ نہ جانے کب اس کا وار ہو جائے۔ شیویا سدپو

اس پر اپنا شاسن کرنا چاہتی تھی اور ایک چھن بھی نہ بھولتی تھی کہ وہ گھر کی سوامنی ہے اور ہر

ایک آدمی کو اس کا یہ ادھیکار سویکار کرنا چاہیے۔ دیو کمار نے سارا بھار سنت کمار پر ڈال کر

واستو میں شیویا کی گدڑی چھین لی تھی۔ وہ یہ بھول جاتی تھی کہ دیو کمار کے سوامی رہنے پر ہی

وہ گھر کی سوامنی ہے۔ اب وہ مانے کی دیوی تھی جو کیول اپنے آشرवादوں کے بل پر ہی چنچ

سکتی ہے۔ من کا یہ سندھیہ مٹانے کے لیے وہ سدپو اپنے ادھیکاروں کی پریشا لیتی رہتی تھی۔ یہ

چور کسی بیماری کی طرح اس کے اندر جڑ پکڑ چکا تھا اور اصلی بھوجن کو ناچھیننے کے کارن اس کی پرکرتی چٹوری ہوتی جاتی تھی۔ پشپا ان سے بولتے ڈرتی تھی، ان کے پاس جانے کا سانس نہ ہوتا تھا۔ رہی ہنکجا، اسے کام کرنے کا روگ تھا۔ اس کا کام ہی اس کا ونود، منورجن سب کچھ تھا۔ شکایت کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ بالکل دیوکار کا سا سوبھاؤ پایا تھا۔ کوئی چار بات کہہ دیں، سر جھکا کر سن لے گی۔ من میں کسی طرح کا دوش یا ملال نہ آنے دے گی۔ سویرے سے دس گیارہ بجے رات تک اسے دم مارنے کی مہلت نہ تھی۔ اگر کسی کے کرتے کے بٹن ٹوٹ جاتے تو ہنکجا ٹانگیں گی۔ کس کے کپڑے کہاں رکھے ہیں یہ رمیہ ہنکجا کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ اور اتنے کام کرنے پر بھی وہ پڑھنے اور نیل بوٹے بنانے کا سے بھی نا جانے کیسے نکال لیتی تھی۔ گھر میں جتنے نیچے تھے سمسوں پر ہنکجا کی کلا پڑتا کے چہہ انکت تھے۔ میزوں کے میز پوش، کرسیوں کے گدے، صندوقوں کے غلاف سب اس کی کلا کرتیوں سے رنجت تھے۔ ریٹم اور محفل کی طرح طرح کے پکشیوں اور پھولوں کے چتر بنا کر اس کے فریم بنا لیے تھے جو دیوان خانے کی شوبھا بڑے رہے تھے۔ اور اسے گانے بجانے کا شوق بھی تھا۔ ستار بجا لیتی تھی اور ہارمونیم تو اس کے لیے کھیل تھا۔ ہاں کسی کے سامنے گاتے بجاتے شرماتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسکول بھی جاتی تھی اور اس کا شمار اچھی لڑکیوں میں تھا۔ پندرہ روپیہ مہینہ اسے وظیفہ ملتا تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کی پشپا کے پاس گھڑی دو گھڑی کے لیے آہنیے اور ہنسی مذاق کرے۔ اسے ہنسی مذاق آتا بھی نہ تھا۔ نہ مذاق سمجھتی تھی نہ اس کا جواب دیتی تھی۔ پشپا کو اپنے جیون کا بھار ہلکا کرنے کے لیے سادھو ہی مل جاتا تھا پتی نے تو اگلے اس پر اور اپنا بوجھ ہی لا دیا تھا۔

سادھو چلا گیا تو پشپا پھر اسی کے خیال میں ڈوبی۔ کیسے اپنا بوجھ اٹھائے؟ اسی لیے تو پتی دیو اس پر روبرو جاتے ہیں۔ جانتے ہے کہ اسے چاہے کتنا ستاؤ، کہیں نہیں جاسکتی، کچھ بول نہیں سکتی، ہاں ان کا خیال ٹھیک ہے۔ اسے دلاس و ستوؤں سے روچی ہے۔ وہ اچھا کھانا چاہتی ہے۔ ایک بار وہ دلاس کا مودہ تیاگ دے اور تیاگ کرنا سیکھ لے، پھر اس پر کون روبرو جاسکے گا، پھر وہ کیوں کسی سے دبے گی۔

شام ہو گئی تھی۔ چمپا کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر کی اور دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا
 بیس، پچیس لڑکیوں اور ستر یوں کا ایک دل ایک سو سے ایک گیت گاتا چلا جا رہا تھا۔ کسی کی
 دیہہ پر ثابت کپڑے تک نہ تھے۔ سر اور منہ پر گرد جی ہوئی تھی۔ بال روکھے ہو رہے تھے جن
 میں شاید مہینوں سے تیل نہ پڑا ہو۔ یہ مجورنی تھیں جو دن بھر اینٹ اور گارا ڈھو کر گھر لوٹ
 رہی تھیں۔ سارے دن انھیں دھوپ میں تپنا پڑا ہوگا، مالک کی گھڑکیاں کھانی پڑی
 ہوں گی۔ شاید دوپہر کو ایک ایک۔ مٹی چبیتا کھا کر رہ گئی ہوں۔ پھر بھی کتنی پرسن تھیں کتنی
 سوتنتر۔ ان کی اس پرستیا کا، اس سوتنتر کا کیا رہیہ ہے؟

تین

مسز سنہا ان آدمیوں میں ہیں جن کا آدر اس لیے ہوتا ہے کہ لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر سبھی آدمی، آئیے، آئیے، کرتے ہیں، لیکن ان کے پیٹھ پھیرتے ہی کہتے ہیں۔ بڑا ہی موذی آدمی ہے اس کے کانٹے کا منتر نہیں۔ ان کا پیشہ ہے مقدسے بنانا۔ جیسے کوئی ایک کلپنا پر پورا کاویہ لکھ ڈالتا ہے، اسی طرح سنہا صاحب بھی کلپنا پر مقدموں کی سرکڑ کر ڈالتے ہیں۔ نہ جانے وہ کوئی کیوں نہیں ہوئے؟ مگر کوئی ہو کر وہ سلسلہ کی چاہے جتنی وردھی کر سکتے، اپنا کچھ اپکار نہ کر سکتے۔ قانون کی اپاننا کر کے انھیں سبھی سدھیاں مل گئیں۔ شاندار بنگلے میں رہتے تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں اور حکام سے دوستانہ تھا، پر تشفہ بھی تھی، روپ بھی تھا۔ قلم میں ایسا جادو تھا کہ مقدسے میں جان ڈال دیتے۔ ایسے ایسے پرسنگ سوچ نکالتے، ایسے ایسے چرتروں کی رچنا کرتے کہ کلپنا جیو ہو جاتی تھی۔ بڑے بڑے گھاگھ جج بھی اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکتے۔ سب کچھ اتنا سوا بھاوک، اتنا سنبندھ ہوتا تھا کہ اس پر ہتھیار کا بھرم تک نہ ہو سکتا تھا۔ وہ سنت کمار کے ساتھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ سنت کمار کے من میں ایک بھاوٹا انھی اور سنہا نے اس میں رنگ روپ بھر کر جیتا جاگتا پتلا کھڑا کر دیا اور آج مقدمہ دائر کرنے کا نچھے کیا جا رہا ہے۔

نوبے ہوں گے۔ وکیل اور موکل کچھری جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ سنہا اپنے بچے کمرے میں میج پر ٹانگ پھیلانے لیئے ہوئے ہیں۔ گورے چٹے آدمی اونچا قد، اکھرا بدن بڑے بڑے بال پیچھے کو کٹھنھی سے استھپے ہوئے، مونٹھیں صاف، آنکھوں پر ایک 'ہونٹوں' ہار، چہرے پر پرتھما کا پرکاش، آنکھوں میں ابھیمان، ایسا جان پڑتا ہے کوئی بڑا ریکر ہے۔ سنت کمار نیچی اچکن پہنے، بھیلٹ کیپ لگائے کچھ چشت سے بیٹھے ہیں۔

سنہا نے آشا سن دیا۔ تم ناک ڈرتے ہو۔ میں کہتا ہوں ہماری فتح ہے۔ ایسی سیکور نظیریں موجود ہیں۔ جس میں بیٹوں پوتوں نے بیٹے منسوخت کرائے ہیں۔ یہی شہادت

چاہیے اور اسے جما کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

سنت کمار نے دودھا میں پڑ کر کہا۔ لیکن فادر کو بھی تو راضی کرنا ہو گا۔ ان کی ہچکا کے بنا تو کچھ نہ ہو سکے گا۔

انھیں سیدھا کرنا تمھارا کام ہے۔

لیکن ان کا سیدھا ہونا مشکل ہے۔

تو انھیں بھی گولی مارو۔ ہم ثابت کریں گے کہ ان کے دماغ میں خلل ہے۔

یہ ثابت کرنا آسان نہیں ہے۔ جس نے بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالیں، جو سمجھ ساج کا

نیتا سمجھا جاتا ہے، جس کی عقل مندی کو سارا شہر مانتا ہے، اسے دیوانہ کیسے ثابت کرو گے؟

سنہا نے دشواس پورن بھاؤ سے کہا۔ یہ سب میں دیکھ لوں گا۔ کتاب لکھنا اور بات

ہے، ہوش و حواس کا ٹھیک رہنا اور بات۔ میں تو کہتا ہوں جتنے لیکھک ہیں، سبھی سنگی

ہیں۔ پورے پاگل، جو محض واہ واہ کے لیے یہ پیشہ مول لیتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے ہوش میں

ہوں تو کتابیں نہ لکھ کر دلائی کریں یا کھونچے لگائیں۔ یہاں کچھ تو محنت کا معاوضہ ملے گا۔

پستکیں لکھ کر تو بدبھمی، تپیدک ہی ہاتھ لگتا ہے۔ روپے کا جو گازم کرتے جاؤ، باقی سارا کام

مجھ پر چھوڑ دو۔ اور ہاں آج شام کو کلب میں ضرور آنا۔ ابھی سے کیمپین (محاصرہ) شروع کر

دینا چاہیے۔ تھی پر ڈورے ڈالنا شروع کرو۔ یہ سمجھ لو، وہ سب جج صاحب کی اکیلی لڑکی ہے

اور اس پر اپنا رنگ جما دو تو تمھاری گوئی لال ہے۔ سب۔ جج صاحب صبح کی بات کبھی نہیں

نال سکتے۔ میں یہ مرحلہ کرنے سے تم سے زیادہ کٹھن ہوں۔ مگر میں ایک خون کے معاملے

میں پیروی کر رہا ہوں اور سیول سرجن مسٹر کامت کی وہ پیلے منہ والی چھوکی آج کل میری

پریمیکا ہے۔ سیول سرجن میری اتنی آؤ بھگت کرتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔ اس چنیل سے

شادی کرنے پر آج تک کوئی راضی نہ ہوا، اتنے موٹے ہونٹ ہے اور سینا تو جیسے جھکا ہوا

سابان ہو۔ پھر بھی آپ کو دعو ہے کہ مجھ سے زیادہ روپ وقتی سنسار میں نہ ہوگی۔ عورتوں کو

اپنے روپ کا گھمنڈ کیسے ہو جاتا ہے، یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ جو روپ دان ہے وہ

گھمنڈ کرے تو واجب ہے، لیکن جس کی صورت دیکھ کرتے آئے، وہ کیسے اپنے کو اپرا

سمجھتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے گھومتے اور عاشقی کرتے جی تو جلتا ہے، مگر مہری رقم ہاتھ لگنے والی ہے، کچھ تپیا تو کرنی ہی پڑے گی۔ تبھی تو سچ سچ اہرا ہے اور چنچل بھی۔ ذرا مشکل سے قابو میں آئے گی۔ اپنی ساری کلا خرچ کرنی پڑے گی۔

”یہ کلا میں خوب سیکھ چکا ہوں۔“

”تو آج شام کو آتا کلب میں۔“

”ضرور آؤں گا۔“

”روپے کا پر بندھ بھی کرنا ہے۔“

”وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

اس طرح سنت کمار اور سنہا دونوں نے محاصرہ ڈالنا شروع کیا۔ سنت کمار نہ لپٹ تھا، نہ رسیک، مگر اچھینے کرنا جانتا تھا۔ روپ وان بھی تھا، زبان کا بیٹھا تھا، دوہرا شریر، ہنس کھ اور ذہین، چہرا گورا چٹھا۔ جب سوٹ پہن کر چھڑی گھماتا ہوا لکٹا تو آنکھوں میں خوب جاتا تھا۔ ٹینس، برتج، آدی فیشن اسبل کھیلوں میں پڑتا ہی، تبھی سے راہ رسم پیدا کرنے میں اسے دیر نہ لگی، تبھی یونیورسٹی کے پہلے سال میں تھی، بہت ہی تیز، بہت ہی مغرور، بڑی حاضر جواب۔ اسے سوادھیائے کا شوق نہ تھا، بہت تھوڑا پڑھتی تھی، مگر سنسار کی گتی سے واقف تھی، اور اپنی اوپری جانکاری کو وودتا کا روپ دینا چاہتی تھی۔ کوئی دٹے اٹھائیے چاہے وہ گھور دگیان ہی کیوں نہ ہوں، اس پر وہ کچھ نہ کچھ آلوچنا کر سکتی تھی، کوئی مولک بات کہنے کا اسے شوق تھا اور پرائیبل بھاشا میں۔ مزاج میں نفرت اتنی تھی کے سلیقہ یا تمیز کی ذرا بھی کمی اسے آسہیہ تھی۔ اس کے یہاں کوئی نوکر یا نوکرانی نہ ٹھہرنے پاتی تھی۔ دوسروں پر کڑی آلوچنائے کر کے اسے آند آتا تھا، اور اس کی نگاہ اتنی تیز تھی کہ کسی استری یا پرش میں ذرا بھی کوروچی یا بھونڈاہن دیکھ کر وہ بھسودوں سے یا ہونٹوں سے اپنا منو بھاو پرکٹ کر دیتی تھی۔ مہیلاؤں کے سماج میں اس کی نگاہ ان کے واسٹر بھوشن پر رہتی تھی اور پرش سماج میں ان کی منو رتی کی اور اسے اپنے آدھے روپ۔ لاونیا کا گیان تھا وہ اچھے سے پہناویں سے اسے اور بھی چمکاتی تھی۔ زیوروں میں اسے ویشل رہتی نہ تھی، یدہی اپنے سگار دان میں انھیں چمکتے دیکھ اسے ہر ش

ہوتا تھا۔ دن میں کتنی ہی بار وہ نئے نئے روپ دھارتی تھی۔ کبھی چٹالیوں کا ہمیش دھارن کر لیتی تھی، کبھی گھریوں کا، کبھی اسکت یا موزے پہن لیتی تھی۔ مگر اس کے من میں پردوشوں کو آکر شہ کرنے کا ذرا بھی بھاؤ نہ تھا۔ وہ سویم اپنے روپ میں گمن تھی۔

مگر اس کے ساتھ ہی وہ سُرل نہ تھی اور یودکوں کے کھ سے انوراگ بھری باتیں سن کر وہ ویسی ہی ٹھنڈی رہتی تھی۔ اس بیوپار میں سادھارن روپ پر ہنسا کے سوا اس کے لیے کوئی مہتو نہ تھا۔ اور یودک کسی طرح پر دتساہن نہ پا کر نراش ہو جاتے ہیں مگر سنت کمار کی ترسکتا میں اسے انتر گیان سے کچھ رہسیہ، کچھ ٹھٹھٹا کا آہاس ملا۔ ان یودکوں میں اس نے جو آسیم، جو اگر تا، جو دھولتا دیکھی تھی اس کا یہاں نام بھی نہ تھا۔ سنت کمار کے پرتی ایک دیہوار میں سنم تھا، ودھان تھا، چیتا تھی۔ اس لیے وہ ان سے سترک رہتی تھی اور ان کے منورہسیوں کو پڑھنے کی چوٹھا کرتی تھی۔ سنت کمار کا سنم اور وچار شیلٹا ہی اسے اپنی بھٹکا کے کاررن اپنی اور کھینچی تھی۔ سنت کمار نے اس کے سامنے اپنے کو ان میل دیواہ کے ایک شکار کے روپ میں پیش کیا تھا اور اسے ان سے کچھ ہمدردی ہو گئی تھی۔ پشپا کے رنگ روپ کی انھوں نے اتنی پر ہنسا کی تھی جتنی ان کو اپنے مطلب کے لیے ضروری معلوم ہوئی، مگر جس کا تہی سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے کیول پشپا کے پھوٹرپن، بے وقوفی، آسہر دیتا اور نشہر تا کی شکایت کی تھی، اور تہی پر اتنا پر بھاؤ جمایا تھا کہ وہ پشپا کو دیکھ پاتی تو سنت کمار کا کپش لے کر اس سے لڑتی۔

ایک دن اس نے سنت کمار سے کہا ”تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

سنت کمار نے حسرت کے ساتھ کہا۔ چھوڑ کیسے دوں مس تر دینی، سماج میں رہ کر سماج کے قانون تو ماننے ہی پڑیں گے۔ پھر پشپا کا اس میں کیا قصور ہے۔ اس نے تو اپنے آپ کو نہیں بنایا۔ ایٹور نے یا سنسکاروں نے یا پرستھتوں نے جیسا بتایا ویسی بن گئی۔

”مجھے ایسے آدمیوں سے ذرا بھی سہانوہوتی نہیں جو ڈھول کو اس لیے چنیں کہ وہ گلے میں پڑ گئی۔ میں چاہتی ہوں وہ ڈھول کو گلے سے نکال کر کسی خندق میں پھینک دیں۔ میرا بس چلے تو میں خود اسے نکال کر پھینک دوں۔“

سنت کمار نے اپنا جادو چلتے ہوئے دیکھ کر من میں پُرسن ہو کر کہا۔ لیکن اس کی کیا حالت ہوگی، یہ تو سوچو۔

تبھی ادھر ہو کر بولی ”تمہیں یہ سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اپنے گھر چلی جائے گی، یا کوئی کام کرنے لگے گی یا اپنے سوبھاؤ کے کسی آدمی سے دیواہ کر لے گی۔

سنت کمار نے قہقہہ مارا۔ تبھی۔ تمہارتھ اور کلپنا میں بھید بھی سمجھتی تھی، کتنی بھولی ہے۔

گنیمیر ادارتا کے بھاؤ سے بولے۔ یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے کمار جی! سماج کی نیتی کہتی ہے کہ چاہے پشپا کو دیکھ کر روز میرا خون ہی کیوں نہ جلتا رہے اور ایک دن میں اسی شوک میں اسے گلا کیوں نہ کاٹ دوں، لیکن اسے کچھ نہیں ہو سکتا، جھوڑا تو اکسھو ہے۔ کیول ایک ہی ایسا آچھپ ہے جس پر میں اسے جھوڑ سکتا ہوں، یعنی اس کی بیوفائی! لیکن پشپا میں اور چاہے جتنے دوش ہوں یہ دوش نہیں ہے۔

سندھیا ہو گئی تھی۔ تبھی نے نوکر کو بلا کر باغ میں گول چبوترے پر کرسیاں نکال کر رکھ دی اور مانو یہ کام سہا پت کر کے جانے کو ہوا۔

”تبھی نے ڈانٹ کر کہا۔ کرسیاں صاف کیوں نہیں کی؟ دیکھتا نہیں ان پر کتنی گرد پڑی ہے؟ میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں مگر تجھے یاد نہیں رہتی۔ بنا جرمانہ کیسے تجھے یاد نہ آئے گی۔

نوکر نے کرسیاں پونچھ پونچھ کر صاف کر دی اور جانے کو ہوا۔

تبھی نے پھر ڈانٹا ”تو بار بار بھانکتا کیوں ہے؟ میزیں رکھ دی؟ ٹی ٹیبل کیوں نہیں لایا؟ چائے کیا تیرے سر پر پئیں گے؟

اس نے بوڑھے نوکر کے دونوں کان گرما دیے اور دھکا دے کر بولی۔ بالکل گاودری ہے، برا پونگا، جیسے دماغ میں گوبر بھرا ہوا ہے۔

بوڑھا نوکر بہت دنوں کا تھا۔ سوامنی اسے بہت مانتی تھی ان کے دیہانت کے بعد گوکہ اسے کوئی ویشیش پرلوبھن نہ تھا، کیونکہ اس سے ایک دو روپے زیادہ وقین پر نوکری مل سکتی تھی،

پر سوامی کے پرتی جو اسے شردھا تھی وہ اسے اس گھر سے باندھے ہوئے تھی اور یہاں انادر اور ایمان سب کچھ سہہ کر بھی وہ چپٹا ہوا تھا۔ سب بچ صاحب بھی اسے ڈانٹتے رہتے تھے پر ان کے ڈانٹنے کا اسے دکھ نہ ہوتا۔ وہ عمر میں اس کے جوڑ کے تھے۔ لیکن تروڑی کو تو اس نے گود کھیلایا تھا۔ اب وہی تبھی اسے ڈانٹتی ہے، اس سے اس کے شریر کو جتنی چوٹ لگتی تھی اس سے کہیں زیادہ اس کے آتما بھیمان کو لگتی تھی۔ اس نے کیول دو گھروں میں نوکری کی تھی۔ دونوں ہی گھروں میں لڑکیاں بھی تھیں، بہوئیں بھی تھیں سب اس کا آدر کرتی تھیں۔ بہوئیں تو اس سے لجاتی تھی اگر اس سے کوئی بات مجز بھی جاتی تو من میں رکھ لیتی تھی اس کی سوامی تو آدرش مہیلا تھی اسے کبھی کچھ نہ کہا۔ بابو جی کبھی کچھ کہتے تو اس کا پیش لے کر ان سے لڑتی۔ اور یہ لڑکی چھوٹے بڑے کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتی۔ لوگ کہتے ہیں پڑھنے سے عقل آتی ہے۔ یہی ہے وہ عقل! اس کے من میں ودرودہ کا بھاؤ اٹھا کیوں یہ ایمان ہے؟ جو لڑکی اس کی اپنی لڑکی سے بھی چھوٹی ہو، اس کے ہاتھوں کیوں اپنی مونچھیں انچوائیں؟ اوستھا میں بھی ابھی مان ہوتا ہے جو سخت دھن کے ابھیمان سے کم نہیں ہوتا۔ وہ ستان اور پرتشٹھا کو اپنا ادھیکار سمجھتا ہے، اور اس کی جگہ ایمان پا کر مہمت ہو جاتا ہے۔

گھورے نے فی نیبل لا کر رکھ دی، پر آنکھوں میں ودرودہ بھرے ہوئے تھا۔

تبھی نے کہا ”جا کر بیرا سے کہہ دو، دو پیالے چائے دے جائے۔“

گھورے چلا گیا اور بیرا کو یہ حکم سنا کر اپنی اکانت کثیر میں جا کر خوب رویا۔ آج سوامی ہوتی تو اس کا انادر کیوں ہوتا!

بیرا نے چائے میز پر رکھ دی۔ تبھی نے پیالی سنت کمار کو دی اور فود بھاؤ سے بولی

”تو اب معلوم ہوا کہ عورتیں ہی پتی درتا نہیں ہوتی، مرد بھی پتی درتے والے ہوتے ہیں۔“

سنت کمار نے ایک گھونٹ پی کر کہا ”کم سے کم اس کا سوانگ تو کرتے ہی ہیں،“

”میں اسے ٹیک ڈر بلتا کہتی ہوں۔ جسے پیارا کہو، دل سے پیارا کہو، نہیں پرکٹ ہو

جائے۔ میں دیوا کو پریم بندھن کے روپ میں دیکھ سکتی ہوں، دھرم بندھن یا رواج بندھن

تو میرے لیے آسہ ہو جائے۔“

اس پر بھی تو پرشوں پر اکیسپ کیے جاتے ہیں۔“

تمہی چوکی۔ یہ جاتی گت پرش ہوا جارہا ہے۔

اب اسے اپنی جاتی کا پکیش لینا پڑے گا ”تو کیا آپ مجھ سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ کبھی پرش دیوتا ہوتے ہیں؟ آپ بھی جو وفاداری کر رہے ہیں وہ دل سے نہیں، کیول لوک بندہ کے بھئے سے۔ میں اسے وفاداری نہیں کہتی۔ بچھو کے ڈنک توڑ کر آپ اسے بالکل نیر یہہ بنا سکتے ہیں، لیکن اس سے بچھوؤں کا زہریلا پن تو نہیں جاتا۔

سنت کمار نے اپنی ہار مانتے ہوئے کہا ”اگر میں بھی یہ کہوں کہ ادھک ترناریوں کا پتی ورت بھی لوک نندا کا بھے ہے تو آپ کیا کہیں گی؟

تمہی نے پیلا میز پر رکھتے ہوئے کہا ”میں اسے کبھی نہیں سویکار کروں گی۔“

”کیوں؟“

اس لیے کے مردوں نے استریوں کے لیے اور کوئی آشرے چھوڑا ہی نہیں۔ پتی ورت ان کے اندر اتنا کوٹ کوٹ بھرا گیا کہ اب اپنا ویک تو رہا ہی نہیں۔ وہ کیول پُرش کے آدھار پر جی سکتی ہے۔ اس کا سوتنز کوئی استو نہیں۔ بن بیاہا پرش چین سے کھاتا ہے، وہار کرتا ہے اور مونچھوں پر داؤ دیتا ہے، بن بیاہی استری روتی ہے، کلہتی ہے اور اپنے کو سنسار کا سب سے ابھاما گرا پیانی سمجھتی ہے۔ یہ سارا مردوں کا اپرادھ ہے، آپ بھی پشپا کو نہیں چھوڑ رہے ہیں، اس لیے نہ کہ آپ پرش ہے جو قیدی کو آزاد نہیں کرنا چاہتا۔

سنت کمار نے کاثر سور میں کہا۔ آپ میرے ساتھ بے انصافی کرتی ہے۔ میں پشپا کو اس لیے نہیں چھوڑ رہا کہ میں اس کا جیون نشٹ نہیں کرنا چاہتا اگر میں اسے چھوڑ دوں تو شاید اوروں کے ساتھ آپ بھی میرا جرسکار کریں گی۔

تمہی مسکرائی ”میری طرف سے آپ نچھت رہیے،“ مگر ایک ہی چمن کے بعد اس نے گنہیر سور میں کہا۔ لیکن میں آپ کی کھٹنائیوں کا انومان کر سکتی ہوں۔

مجھے آپ کے منہ سے یہ شبد سن کر کتنا سنتوش ہوا۔ میں داستو میں آپ کی دیا کا پاتر ہوں اور شاید کبھی مجھے اس کی ضرورت پڑے۔

آپ کے اوپر مجھے سچ بچ دیا آتی ہے۔ کیوں نہ ایک دن ان سے کسی طرح میری ملاقات کرا دیجیے۔ شاید میں انہیں راستے پر لاسکوں۔

سنت کمار نے ایسا لبا منہ بنایا جیسے اس پر ستاؤ سے ان کے مرم پر چوٹ لگی ہے۔
ان کا راستے پر آنا اُسکو ہے مس تروینی! وہ اُلٹے آپ ہی کے اوپر آچھپ کرے گی
اور آپ کے دشنے میں نہ جانے کیسی دھکپٹنا کیں کر بیٹھے گی۔ اور میرا تو گھر میں رہنا مشکل ہو
جائے گا۔

تنبی کا سلسک من گرم ہواٹھا۔ جب تو میں اس سے ضرور ملوں گی۔
تو شاید آپ یہاں بھی میرے لیے دروازہ بند کر دیں گی۔
بہت ممکن ہے وہ آپ کی سہانو بھوتی پا جائے اور آپ اس کی حمایت کرنے لگیں۔
تو کیا آپ چاہتے ہیں میں آپ کو ایک طرفہ ڈگری دے دوں؟
میں کیول آپ کی دیا اور ہمدردی چاہتا ہوں۔ آپ سے اپنی منو دتھا کہہ کر دل کا
بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ اسے معلوم ہو جائے کہ میں آپ کے یہاں آتا جاتا ہوں تو ایک
نیاقصہ کھڑا کر دے۔

تنبی نے سیدھے ویگ کیا۔ تو آپ اس سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟ ڈرنا تو مجھے چاہیے۔
سنت کمار نے اور گہرے میں جا کر کہا۔ میں آپ کے لیے ہی ڈرتا ہوں، اپنے لیے نہیں۔
تنبی زبھیتا سے بولی۔ جی نہیں آپ میرے لیے نہ ڈریے۔
میرے جیتے جی، میرے پیچھے آپ پر کوئی شبہ ہو یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔
آپ کو معلوم ہے مجھے بھاؤ کتنا پسند نہیں۔
یہ بھاؤ کتنا نہیں من کے سچ بھاؤ ہیں۔
میں نے سچ بھاؤ والے یودک بہت کم دیکھے۔
دنیا میں سبھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔
اوہک تر شکاری قسم کے۔ استریوں میں تو ویشائیں ہی شکاری ہوتی ہیں۔ پرشوں میں
تو سرے سے سبھی شکاری ہوتے ہیں۔

”جی نہیں ان میں اپوا بھی بہت ہیں۔“

استری روپ نہیں دیکھتی۔ پرش جب گرے گا روپ پر۔ اسی لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ میرے یہاں کتنے ہی روپ کے پاسک آتے ہیں۔ شاید اس وقت بھی کوئی صاحب آرہے ہوں۔ میں روپ دتی ہوں اس میں نمرتا کا کوئی پرشن نہیں۔ مگر میں نہیں چاہتی کوئی مجھے کیول روپ کے لیے چاہے۔

سنت کمار نے دھڑکتے ہوئے من سے کہا۔ آپ ان میں میرا تو شمار نہیں کرتیں؟
تنبی نے تنہرتا کے ساتھ کہا۔ ”آپ کو تو میں اپنے چاہنے والوں میں سمجھتی ہی نہیں۔“
سنت کمار نے ماتھا جھکا کر کہا۔ یہ میرا ڈر بھاگیہ ہے۔
آپ دل سے نہیں کہہ رہے ہیں، مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ آپ کا من نہیں پاتی۔ آپ ان آدمیوں میں ہیں جو ہمیشہ رسیہ رہتے ہیں۔

”یہی تو میں آپ کے دشنے میں سوچا کرتا ہوں۔“

میں رسیہ نہیں ہوں۔ میں تو صاف کہتی ہوں میں ایسے منوشیہ کی کھوج میں ہوں، جو میرے ہر دے میں سوئے ہوئے پریم کو جگا دے۔ ہاں، وہ بہت نیچے گہرائی میں ہے اور اسی کو ملے گا جو گہرے پانی میں ڈوبنا جانتا ہو۔ آپ میں میں نے کبھی اس کے لیے بے چینی نہیں پائی۔ میں نے اب تک جیون کا روشن پہلو ہی دیکھا ہے۔ اور اس سے ادب گئی ہوں۔ اب جیون کا اندھیرا پہلو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جہاں تیاگ ہے، رودن ہے، اترگ ہے۔ سمجھو ہے مجھے اس جیون سے بہت جلد گھبرنا ہو جائے، لیکن میری آتما یہ نہیں سویکار کرنا چاہتی کہ وہ کسی اونچے عہدے کی غلامی یا قانونی دھوکے دھڑی یا ویاپار کے نام سے کی جانے والی لوٹ کو اپنے جیون کا آدھار بنائے۔ شرم اور تیاگ کا جیون ہی مجھے تنہ جان پڑتا ہے۔ آج جو سماج اور دیش کی ذوشت استھا ہے اس سے اُسہوگ کرنا میرے لیے جنون سے کم نہیں ہے۔ میں کبھی کبھی اپنے ہی سے گھرنا کرنے لگتی ہوں۔ بابو جی کو ایک ہزار روپے اپنے چھوٹے سے پرپوار کے لیے لینے کا کیا حق ہے اور مجھے بے کام دھندھے اتنے آرام سے رہنے کا کیا ادھیکار ہے؟ مگر یہ سب سمجھ کر بھی مجھ میں کرم کرنے کی شکتی نہیں ہے۔ اس بھوگ و لاس کی

جیون نے مجھے بھی گڑبھین بنا ڈالا ہے۔ اور میرے حراج میں امیری کتنی ہے یہ بھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ میرے منہ سے بات نکلتے ہی اگر پوری نہ ہو جائے تو میں باؤلی ہو جاتی ہوں۔ بڑھی کا من پر کوئی میٹرن نہیں ہے۔ جیسے شرابی بار بار حرام کام کرنے پر شراب نہیں چھوڑ سکتا وہی دشامیری ہے۔ اسی کی بھانٹی میری اچھا شکتی بے جان ہو گئی ہے۔

تمہی کے پرتی بھاؤن کھ منزل پر پرایہ۔ جچھلکا جھلکتی رہتی تھی۔ اس سے دل کی بات کہتے سنکوچ ہوتا کیونکہ شکا ہوتی تھی کہ وہ سہانو بھوتی کے ساتھ سننے کے بدلے فبتیاں کسے لگے گی۔ پر اس وقت ایسا جان پڑا اس کی آتما بول رہی ہے۔ اس کی آنکھیں آدر ہو گئی تھیں۔ کھ پر ایک نچھت نمرتا اور کوکٹا کھل اٹھی تھی۔ سنت کمار نے دیکھا ان کا ستم پھسلتا جا رہا ہے۔ جیسے کسی سائل نے بہت دیر کے بعد داتا کو منگرو دیکھ پایا ہو اور اپنا مطلب کہہ سنانے کے لیے ادھیر ہو گیا ہو۔

بولا۔ کتنی ہی بار۔ بالکل یہی میرے وچار ہیں۔ میں آپ سے اس سے بہت کٹ ہوں، جتنا سمجھتا تھا۔

تمہی پرسن ہو کر بولی۔ آپ نے مجھے کبھی بتایا نہیں۔

آپ بھی تو آج ہی کھلی ہیں۔

میں ڈرتی ہوں کہ لوگ یہی کہیں گے آپ اتنی شان سے رہتی ہیں، اور باتیں ایسی کرتی ہیں۔ اگر کوئی ایسی ترکیب ہوتی جس سے میری یہ امیرانہ عادتیں جھوٹ جاتیں تو میں اسے ضرور کام میں لاتی۔ اس دشے کی آپ کے پاس کچھ پستکیں ہوں تو مجھے دیجیے۔ مجھے آپ اپنی ششیا بنا لیجیے۔

سنت کمار نے رسک بھاؤ سے کہا۔ میں تو آپ کا ششے ہونے جا رہا تھا۔ اور اس کی اور مرمر بھری آنکھوں سے دیکھا۔

تمہی نے آنکھیں نیچی نہیں کیں۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ آپ تو دل لگی کرتے ہیں۔ مجھے ایسا بنا دیجیے کہ میں سنکوں کا سامنا کر سکوں۔ مجھے بار بار کھلکتا ہے اور اگر میں استری نہ ہوتی تو میرا من اتنا دربل نہ ہوتا۔

اور جیسے وہ آج سنت کمار سے کچھ بھی چھپانا ، کچھ بھی بچانا نہیں چاہتی ۔ مانو وہ جو
آشرے بہت دنوں سے ڈھونڈ رہی تھی وہ یکا یک مل گیا ہے ۔

سنت کمار نے روکھائی بھرے سور میں کہا ۔ استریاں پرشوں سے زیادہ دلیر ہوتی ہیں مس
تروینی !

اچھا آپ کا من نہیں چاہتا کہ بس ہو تو سنسار کی ساری دیوستھا بدل ڈالیں ؟
اس دھودھ من سے نکلے ہوئے پرشن کا بناؤنی جواب دیتے ہوئے سنت کمار کا ہر دے
کانپ اٹھا ۔

کچھ نہ پوچھو ۔ بس آدمی ایک آہ کھینچ کر رہ جاتا ہے ۔
میں تو اکثر اتوں کو یہ پرشن سوچتے سوچتے سو جاتی ہوں اور وہی سوہن دیکھتی ہوں ۔
دیکھیے دنیا والے کتنے خود غرض ہیں ۔ جس دیوستھا سے سارے سماج کا اڈھار ہو سکتا ہے وہ
تھوڑے سے آدمیوں کے سوارتھ کے کارن دبی پڑی ہوئی ہے ۔

سنت کمار نے اترے ہوئے کھ سے کہا ۔ اس کا سے آرہا ہے ۔ اور اٹھ کھڑے
ہوئے ۔ یہاں کی دایو میں ان کا جیسے دم گھٹنے لگا تھا ۔ ان کا کہنی من اس نکلپٹ نرل وانا تو رن
میں اپنی اڈھمٹا کے گیان سے دبا جا رہا تھا جیسے کسی دھرم بٹھہ من میں ادھرم دچار گھس تو گیا
ہو پر وہ کوئی آشرے نہ پا رہا ہو ۔

تمہی نے آگڑہ کیا ۔ کچھ دیر اور بیٹھیے نہ ؟

آج آگلیا دیجیے ، پھر کبھی آؤں گا ۔

کب آئیے گا ؟

جلد ہی آؤں گا ۔

کاش میں آپ کا جیون سکھی بنا سکتی ۔

سنت کمار برآمدے سے کود کر نیچے اترے اور تیزی سے حاٹے کے باہر چلے گئے ۔ تبھی
برآمدے میں کھڑی انھیں انورکت نیتروں سے دیکھتی رہی ۔ وہ کھور تھی ، چنچل تھی ، دُرلہ تھی
روپ گرد تھی ، چڑ تھی ، کسی کو کچھ سمجھتی نہ تھی ، کوئی اسے پریم کا سواگت بھر کر ٹھگ سکتا تھا ، پر

جیسے کتنی ہی دیشیاؤں میں ساری اسکٹیوں کے بچ۔ بھگتی بھاؤنا چھپی رہتی ہے، اسی طرح اس کے من میں بھی سارے اوشواں کے بچ میں کوئل، سہا ہوا وٹواں چھپا بیٹھا تھا اور اسے اسپرٹ کرنے کی کلا جسے آتی ہو وہ اسے بیوقوف بنا سکتا تھا۔ اس کوئل بھاگ کا اسپرٹ ہوتے ہی وہ سیدھی۔ سادی، سرل، وٹواں، کائر بالیکا بن جاتی تھی۔ آج اتفاق سے سنت کمار نے وہ آسن پالیا تھا اور اب وہ جس طرف چاہے اسے لے جا سکتا ہے، مانو وہ میسمارائز ہو گئی تھی۔ سنت کمار میں اسے کوئی دوش نہیں نظر آتا۔ ابھگتی پشپا اس ست پرش کا جیون کیسا نشٹ کیے ڈالتی ہے۔ انھیں تو ایسی سنگتی چاہیے جو انھیں پروتساہت کرے، ہمیشہ ان کے پیچھے پیچھے رہے۔ پشپا نہیں جانتی وہ ان کے جیون کا راہو بن کر سماج کا کتنا اُٹھ کر رہی ہے۔ اور اتنے پر بھی سنت کمار کا اسے گلے ہاندھے رکھنا دے تو سے کم نہیں۔ ان کی وہ کون سی سیوا کرے، کیسے ان کا جیون سکھی کرے۔

چار

سنت کمار یہاں سے چلے تو ان کا ہر دئے آکاش میں تھا۔ اتنی جلد دیوی سے انہیں وردان ملے گا اس کی انہوں نے آشانہ کی تھی۔ کچھ تقدیر نے ہی زور مارا، نہیں تو یووتی اچھے اچھوں کو اگلیوں پر نہ جاتی ہے، ان پر کیوں اتنی بھکتی کرتی۔ اب انہیں ولب نہیں کرنا چاہیے۔ کون جانے کب تہی وڑودھ ہو جائے۔ اور یہ دو ہی چار ملاقاتوں میں ہونے والا ہے۔ تہی انہیں کار یہ چمچہر میں آگے بڑھنے کی پریرنا کرے گی اور وہ پیچھے نہیں گے۔ وہیں مت بھید ہو جائے گا۔ یہاں سے وہ سیدھے مسر سنہا کے گھر پہنچے۔ شام ہو گئی تھی۔ کھرا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ مسر سنہا جے بجائے کہیں جانے کو تیار کھڑے تھے انہیں دیکھتے ہی پوچھا۔

کدھر سے؟

وہیں سے۔ آج تو رنگ جم گیا۔

جج!

ہاں جی۔ اس پر تو جیسے میں نے جا دو کی لکڑی پھیر دی ہو۔

پھر کیا، باجی مار لی ہے۔ اپنے فادر سے آج ہی ذکر چھیڑو۔

آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔

ہاں، ہاں میں تو چلوں گا ہی۔ مگر تم تو بڑے خوش نصیب نکلے۔ یہ مس کامت تو مجھ سے جج جج عاشقی کرنا چاہتی ہے۔ میں تو سوا گنگ رچتا ہوں اور وہ سمجھتی ہے، میں اس کا سچا پریمی ہوں۔ ذرا آج کل اسے دیکھو، مارے غرور کے زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتی۔ مگر ایک بات ہے عورت سمجھ دار ہے۔ اسے برابر یہ چٹنا رہتی ہے کہ میں اس کے ہاتھ سے نکل نہ جاؤں، اس لیے میری بڑی خاطر داری کرتی ہے، اور بناؤ سنگار سے قدرت کی کمی جتنی پوری ہو سکتی ہے اتنی کرتی ہے۔ اور اگر کوئی اچھی رقم مل جائے تو شادی کر لینے ہی میں کیا ہرج ہے۔

سنت کمار کو آٹھ رے ہوا، تم تو اس کی صورت سے بیزار تھے۔

ہاں اب بھی ہوں، لیکن روپے کی جو شرط ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں بچپن ہزار میری نذر کر دیں، شادی کر لوں۔ شادی کر لینے سے میں اس کے ہاتھ میں بکا تو نہیں جاتا۔

دوسرے دن دونوں حروں نے دیو کمار کے سامنے سارے منصوبے رکھ دیے۔ دیو کمار کو ایک چمن (لمحے) تک تو اپنے کانوں پر دھواں نہ ہوا۔ انھوں نے سوچند، زبھیک، نکلپٹ زندگی و حقیقت کی تھی۔ کلاکاروں میں ایک طرح کا جو آتم ابھیمان ہوتا ہے اس نے سد یو ان کو ڈھارس دیا تھا۔ انھوں نے تکلیفیں اٹھائی تھیں، فاقے بھی کیے تھے، ایمان ہے تھے لیکن کبھی اپنی آتما کو کھو دیتے نہ کیا تھا۔ زندگی میں کبھی عدالت کے دوار تک نہیں گئے۔ بولے، مجھے کھید ہوتا ہے کہ تم مجھ سے یہ پرستاء کیسے کر سکتے اور اس سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ ایسی گلیل چال تمہارے من میں آئی کیوں کر۔

سنت کمار نے نسل کوچ بھاؤ سے کہا۔ ضرورت سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ سوچ چکا پر کرتی کا پہلا نیم ہے۔ وہ جائیداد جو آپ نے بیس ہزار میں دے دی، آج دو لاکھ سے کم کی نہیں ہے۔

وہ دو لاکھ کی نہیں، دس لاکھ کی ہو۔ میرے لیے وہ آتما کو بیچنے کا پرش ہے۔ میں تھوڑے سے روپیوں کے لیے اپنی آتما نہیں بیچ سکتا۔

دونوں متروں نے ایک دوسرے کی اوڑ دیکھا اور مسکرائے۔ کتنی پرانی دلیل ہے اور کتنی لچر۔ آتما جیسی چیز ہے کہاں؟ اور جب سارا سنسار دھوکے دھڑی پر چل رہا ہے تو آتما کہاں رہی؟ اگر سو روپے قرض دے کر ایک ہزار وصول کرنا ادھرم نہیں ہے، اگر ایک لاکھ نیم جان، فاقے کش مزدوروں کی کمائی پر ایک سینٹھ کا چین کرنا ادھرم نہیں تو ایک پرانی کاغذی کارروائی کو رد کرانے کا پتہ کتنی کیوں ادھرم ہو؟

سنت کمار نے تھکے سورا میں کہا۔ اگر آپ اسے آتما کا بیچنا کہتے ہیں تو بیچنا پڑے گا۔ اس کے سوا دوسرا اپائے نہیں ہے۔ اور آپ اس درشتی سے اس معاملے کو دیکھتے ہی کیوں ہیں؟ ادھرم وہ ہے جس سے سماج کا ہٹ ہو۔ ادھرم وہ ہے جس سے سماج کا ہٹ ہو۔ اس

سے سماج کا کون سا اہم ہو جائے گا، یہ آپ بتا سکتے ہیں؟
 دیوکار نے سڑک ہو کر کہا۔ سماج اپنی مریداؤں پر نکا ہوا ہے۔ ان مریداؤں کو توڑ دو
 اور سماج کا انت ہو جائے گا۔

دونوں طرف سے شاستر اتھ ہونے لگے۔ دیوکار مریداؤں اور سدھانتوں اور دھرم
 بندھنوں کی آڑ لے رہے تھے، پر ان دونوں نوجوانوں کی دلیلوں کے سامنے ان کی ایک نہ
 چلتی تھی۔ وہ اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر اور کھلوٹ سر کھچا کھچا کر جو پرمان دیتے
 تھے اس کو یہ دونوں یووک جنگلی بجاتے توڑ ڈالتے تھے، ڈھونگ کر اڑا دیتے تھے۔

سنہا نے زردیتا کے ساتھ کہا۔ بابو جی، آپ نہ جانے کس زمانے کی بات کر رہے
 ہیں۔ قانون سے ہم جتنا فائدہ اٹھا سکیں، ہمیں اٹھانا چاہیے۔ ان دفعوں کا منشا ہی یہ ہے کہ
 ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ابھی آپ نے دیکھا زمینداروں کی جان مہاجنوں سے بچانے
 کے لیے سرکار نے قانون بنا دیا ہے اور کتنی ملکیتیں زمینداروں کو واپس مل گئیں۔ کیا آپ
 اسے ادھر م کہیں گے؟ ویساؤ ہارکتا کا ارتھ ہی ہے کہ ہم جن قانونی سادھنوں سے اپنا کام نکال
 سکیں، نکالیں۔ مجھے کچھ لینا دینا نہیں، نہ میرا کوئی سوارتھ ہے۔ سنت کمار میرے متر ہیں اور
 اسی واسطے میں آپ سے یہ نویدن کر رہا ہوں۔ مانیں یا نہ مانیں، آپ کو اختیار ہے۔

دیوکار نے لاچار ہو کر کہا۔ تو آخر تم لوگ مجھے کیا کرنے کو کہتے ہو؟
 کچھ نہیں، کیول اتنا ہی کہ ہم جو کچھ کریں آپ اس کے وردھ کوئی کاروائی نہ کریں۔
 میں ستیہ کی ہتیا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

سنت کمار نے آنکھیں نکال کر آنچھت سور میں کہا۔ تو پھر آپ کو میری بیٹیا دیکھنی
 پڑے گی۔

سنہا نے سنت کمار کو ڈانٹا، کیا فضول کی باتیں کرتے ہو سنت کمار! بابو جی کو دو چار دن
 سوچنے کا موقعہ دو۔ تم ابھی کسی بچے کے باپ نہیں ہو۔ تم کیا جانو باپ کو بیٹا کتنا پیارا ہوتا
 ہے۔ وہ ابھی کتنا ہی وردھ کریں۔ لیکن جب نالش دائر ہو جائے گی تو دیکھنا وہ کیا کرتے
 ہیں۔ ہمارا داوا یہی ہوگا کہ جس وقت آپ نے یہ بیچہ نامہ لکھا آپ کے ہوش حواس ٹھیک نہ

تھے اور اب بھی آپ کو کبھی کبھی جنون کا دورا ہو جاتا ہے۔ ہندستان جیسے گرم ملک میں یہ مرض بہتوں کو ہوتا ہے، اور آپ کو بھی ہو گیا تو کوئی آٹھریہ نہیں۔ ہم سول سرجن سے اس کی تصدیق کرا دیں گے۔

دیوکار نے حقارت کے ساتھ کہا۔ میرے جیتے جی یہ دھاندلی نہیں ہو سکتی۔ ہرگز نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر اور پرستشوں کے دباؤ سے کیا۔ مجھے اس کا بالکل افسوس نہیں ہے۔ اگر تم نے اس طرح کا کوئی دعو کیا تو اس کا سب سے بڑا وردھ میری اور سے ہوگا، میں کہہ دیتا ہوں۔

اور وہ آدیش میں آکر کمرے میں ٹپٹنے لگے۔

سنت کمار نے بھی کھڑے ہو کر دھمکاتے ہوئے کہا، تو میرا بھی آپ کو چیلنج ہے۔ یا تو آپ اپنے دھرم ہی کی رچھا کریں گے یا میری۔ آپ پھر میری صورت نہ دیکھیں گے۔ مجھے اپنا دھرم، ہتھی اور ہتھکڑی سب سے پیارا ہے۔

سنہا نے سنت کمار کو آدیش کیا، تم آج درخواست دے دو کہ آپ کے ہوش حواس میں فرق آگیا ہے اور معلوم نہیں آپ کیا کر بیٹھیں۔ آپ کو حراست میں لے لیا جائے۔

دیوکار نے مٹھی تان کر وردھ کے آدیش میں پوچھا۔ میں پاگل ہوں؟

جی ہاں آپ پاگل ہیں۔ آپ کے ہوش بجا نہیں ہیں۔ ایسی باتیں پاگل ہی کیا کرتے ہیں۔ پاگل وہی نہیں ہے جو کسی کو کانٹے دوڑے۔ آم آدمی جو دیو ہار کرتے ہوں اس کے وردھ دیو ہار کرنا بھی پاگل پن ہے۔

تم دونوں خود پاگل ہو۔

اس کا فیصلہ تو ڈاکٹر کرے گا۔

میں نے میں ہٹکتیں لکھ ڈالیں، ہزاروں دیاکھیان دے ڈالے، یہ پاگلوں کا کام ہے؟ جی ہاں یہ پکتے سر پھروں کا کام ہے۔ کل ہی آپ اس گھر میں رستوں سے باندھ لیے جائیں گے۔

تم میرے گھر سے نکل جاؤ، نہیں تو میں گولی مار دوں گا۔

بالکل پاگلوں کی سی دھمکی۔ سنت کمار اس درخواست میں یہ بھی لکھ دیتا کہ آپ کی بندوق چھین لی جائے ، ورنہ جان کا خطرہ ہے۔

اور دونوں متر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیو کمار کبھی قانون کے جال میں نہ پھنسے تھے۔ پرکاشکوں اور بک سٹروں نے انھیں بارہا دھوکے دیے ، مگر انھوں نے کبھی قانون کی شرٹن نہ لی۔ ان کے جیون کی نیتی تھی۔ آپ بھلا تو جگ بھلا ، اور انھوں نے ہمیشہ اس نیتی کا پالن کیا تھا۔ مگر وہ دغا یا ڈرپوک نہ تھے۔ خاص کر سدھانت کے معاملے میں تو وہ سمجھوتا کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ وہ اس ہڈیتر میں کبھی شریک نہ ہوں گے ، چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ مگر کیا یہ سب سچ سچ انھیں پاگل ثابت کر دیں گے؟ جس ورھڑتا سے سنہا نے دھمکی دی تھی وہ اُدھتھا کے یگیہ نہ تھی۔ اس کی دھونی سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کے داؤں سچ میں ابھیت ہے ، اور شاید ڈاکڑوں کو ملا کر سچ سچ انھیں سکی ثابت کر دے۔ ان کا آتم ابھیمان گرج اٹھا۔ نہیں ، وہ آستہ کی شرٹن نہ لیں گے چاہے اس کے لیے انھیں کچھ بھی سہنا پڑے۔ ڈاکڑ بھی کیا اندھا ہے؟ ان سے کچھ پوچھے گا ، کچھ بات چیت کرے گا یا یوں ہی قلم اٹھا کر انھیں پاگل لکھ دے گا۔ مگر کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان کے ہوش و حواس میں فتور پڑ گیا ہو۔ ہش! وہ بھی ان چھوکروں کی باتوں میں آئے جاتے ہیں۔ انھیں اپنے دیوہار میں کوئی اتتر نہیں دکھائی دیتا۔ ان کی بڑھی سوریہ کے پرکاش کی بھانتی زل ہے۔ کبھی نہیں وہ ان لونڈوں کے دھونس میں نہ آئیں گے۔

لیکن یہ وچار ان کے ہر دے میں متھ رہا تھا کہ سنت کمار کی یہ منوورتی کیسے ہو گئی۔ انھیں اپنے پتا کی یاد آتی تھی۔ وہ کتنے سومیہ ، کتنے ستیہ نشٹھ تھے۔ ان کے سر وکیل ضرور تھے ، پر کتنے دھر ماتما پرش تھے۔ اکیلے کھاتے تھے اور ساری گرمستھی کا پالن کرتے تھے۔ پانچ بھائیوں اور ان کے بال بچوں کا بوجھا خود سنبھالے ہوئے تھے۔ کیا مجال کہ اپنے بیٹے بیٹیوں کے ساتھ انھوں نے کسی طرح کا سمجھات کیا ہو۔ جب تک بڑے بھائی کو بھوجن نہ کرا لیں خود نہ کھاتے تھے۔ ایسے خاندان میں سنت کمار جیسا دغا باز کہاں سے دھنس پڑا؟ انھیں کبھی ایسی کوئی بات یاد نہ آتی تھی جب انھوں نے اپنی نیت بگاڑی ہو۔

لیکن یہ بدنامی کیسے سہی جائے گی۔ وہ اپنے ہی گھر میں جب جا کر تھی نہ لاسکے تو ایک پرکار سے ان کلید مارا جیون ٹسٹ ہو گیا۔ جو لوگ ان کے شکستہ سرگرم میں تھے، جب انھیں وہ آدمی نہ بنا سکے تو جیون پرینٹ کی سہیلہ سیوا سے کس کا کلیان ہوا؟ اور جب یہ مقدمہ دائر ہوگا اس وقت وہ کسے منہ دکھائیں گے؟ انھوں نے دھن نہ کیا، پریش تو سنجیدہ کیا ہی۔ کیا وہ بھی ان کے ہاتھ سے چھین جائے گا؟ ان کو اپنے سنتوش کے لیے اتنا بھی نہ ملے گا ایسی آتم دیدنا انھیں کبھی نہ ہوئی تھی۔

شیویا سے کہہ کر وہ اسے بھی کیوں دکھی کریں؟ اس کے کوئل ہردے کو کیوں چوٹ پہنچادیں؟ وہ سب کچھ خود جمیل لیس گے اور دکھی ہونے کی بات بھی کیوں؟ جیون تو انوبھوتیوں کا نام ہے۔ یہ بھی ایک انوبھو ہوگا۔ ذرا اس کی بھی سیر کر لیں۔

یہ بھاؤ آتے ہی ان کا من ہلکا ہو گیا۔ گھر میں جا کر پنکجا سے چائے بنانے کو کہا۔

شیویہ نے پوچھا۔ سنت کمار کیا کہتا تھا؟

انھوں نے سچ مکان کے ساتھ کہا۔ کچھ نہیں، وہی پرانا جنت۔

تم نے تو ہامی نہیں بھری نہ؟

دیوکار استری سے ایکاتھنا کا انوبھو کر کے بولے۔ کبھی نہیں۔

نہ جانے اس کے سر یہ بھوت کیسے سوار ہو گیا!

ساجک سنسکار ہیں اور کیا؟

اس کے یہ سنسکار کیوں ایسے ہو گئے؟ سادھو بھی تو ہے، پنکجا بھی تو ہے، دنیا میں کیا

دھرم ہی نہیں؟

مگر کسرت ایسے ہی آدمیوں کی ہے، یہ سمجھ لو۔

اس دن سے دیوکار نے سیر کرنے جانا چھوڑ دیا۔ دن رات گھر میں منہ چھپائے بیٹھے رہتے۔ جیسے سارا کلنگ ان کے ماتھے پر لگا ہو۔ مگر اور پرانت کے سبھی پر تشویش و چارواں آدمیوں سے ان کا دوستانہ تھا، سب ان کی سچلنا کا پالنہ کرتے تھے۔ مانو وہ مقدمہ دائر ہو۔ نہ پر بھی شاید کچھ نہ کہیں گے۔ لیکن ان کے اثر میں جیسے چور سا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنے انکار

میں اپنے کو آسمیوں کی بھلائی برائی کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ پچھلے دنوں جب سورہ گربن کے اوسر پر سادھو کمار نے بڑھی ہوئی ندی میں کود کر ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی جان بچائی تھی، اس وقت انھیں اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی تھی جتنی خود سارا لیش پانے سے ہوتی ہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، ایسا لگا تھا مانو ان کا مستک کچھ اونچا ہو گیا ہے، مانو مکھ پر بیج آ گیا ہے۔ وہی لوگ جب سنت کمار کی چتکبری آلوچنا کریں گے تو وہ کیسے سنیں گے؟

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا اور سنت کمار نے مقدمہ دائر نہ کیا۔ ادھر سول سرجن کو گانٹھتا تھا، ادھر مسٹر ملک کو۔ شہادتیں بھی تیار کرنی تھیں۔ انھیں حیار یوں میں سارا دن گزر جاتا تھا۔ اور روپے کا انتظام بھی کرتا ہی تھا۔ دیو کمار سہیوگ کرتے تو یہ سب سے بڑی بادھا ہٹ جاتی۔ پر ان کے ورودھ نے سستیا کو اور جمل کر دیا تھا۔ سنت کمار کبھی کبھی نراش ہو جاتا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کیا کرے۔ دونوں متر دیو کمار پر دانت نہیں۔ پیس کر رہ جاتے۔

سنت کمار کہتا۔ جی چاہتا ہے انھیں گولی ملاؤں میں انھیں اپنا باپ نہیں، شتر و سمجھتا ہوں۔ سنہا سمجھاتا۔ میرے دل میں تو بھئی، ان کی عزت ہوتی ہے۔ اپنے سوارتھ کے لیے آدمی نیچے سے نچا کام کر بیٹھتا ہے، پر تیاگیوں اور ستیہ وادیوں کا آدر تو دل میں ہوتا ہی ہے۔ نہ جانے تمھیں ان پر کیسے غصہ آتا ہے۔ جو ویکتی ستیہ کے لیے بڑے سے بڑا کشت سہنے کو تیار ہو وہ پوجنے کے لائق ہے۔

ایسی باتوں سے میرا جی نہ جلاؤ سنہا! تم چاہتے تو وہ حضرت اب تک پاگل خانے پہنچ گئے ہوتے۔ میں نہ جانتا تھا تم اتنے بھاؤک ہو۔

انھیں پاگل خانے بھیجا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔ اور اس کی کوئی ضرورت بھی تو نہیں۔ ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جس وقت بیچہ نامہ ہوا وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھے۔ اس کے لیے شہادتوں کی ضرورت ہے۔ وہ اب بھی اسی دشا میں ہیں، اسے ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر چاہیے اور مسٹر کامت بھی یہ لکھنے کا ساہس نہیں رکھتے۔

پنڈت دیو کمار کو دھمکیوں سے جھکانا تو اوسمبو تھا مگر خرک کے سامنے ان کی گردن آپ

ی آپ جھک جاتی تھی۔ ان دنوں وہ یہی سوچتے رہتے تھے کہ سنسار کی کو دیوستھا کیوں ہے؟ کرم اور سنسار کا آشر یہ لے کر وہ کہیں نہ پہنچ پاتے تھے۔ سُر و آتم واد سے بھی ان کی گتھی نہ سلجھتی تھی۔ اگر سارا دشا ایک آتم ہے تو پھر یہ ہمید کیوں ہے؟ کیوں ایک آدمی زندگی بھر بڑی سے بڑی محنت کر کے بھی بھوکوں مرتا ہے، اور دوسرا آدمی ہاتھ پاؤں نہ ہلانے پر بھی پھولوں کی بیج پر سوتا ہے۔ یہ سُر و آتم ہے یا گھور انا آتم؟ بڑھی جواب دیتی ہے، یہاں کبھی سوادھین ہے، کبھی کو اپنی شہتی اور سادھنا کے حساب سے اُتھی کرنے کا اُسر ہے۔ مگر شہکا پوچھتی ہے، سب کو سان اُسر کہاں ہے؟ بازار لگا ہوا ہے۔ جو چاہے وہاں سے اپنی ایتھا کی چیز خرید سکتا ہے۔ مگر خریدے گا وہی جس کے پاس پیسے ہیں۔ اور جب سب کے پاس پیسے نہیں ہیں تو سب کا برابر کا ادھیکار کیسے مانا جائے؟ اس طرح کا آتم منعش ان کے جیون میں کبھی نہ ہوا تھا۔ ان کی سائیک بڑھی ایسی دیوستھا سے شوش تو ہو ہی نہ سکتی تھی، پر ان کے سامنے ایسی کوئی گتھی نہ پڑی تھی جو اس پُزن کو ویکلگ آنت تک لے جاتی۔ اس وقت ان کی دشا اس آدمی کی سی تھی جو روز مارگ میں ایت پڑی دیکھتا ہے اور بیج کر نکل جاتا ہے۔ رات کو کتنے لوگوں کو شوکر لگاتی ہوگی، کتنوں کے ہاتھ پیر ٹوٹتے ہوں گے، اس کا دھیان اسے نہیں آتا۔ مگر ایک دن جب وہ خود رات کو شوکر کھا کر اپنے گٹھے پھوڑ لیتا ہے تو اس کی نوازن ٹھکتی ہٹھ کرنے لگتی ہے اور وہ اس سارے ڈھیر کو مارگ سے ہٹانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ دیوکار کو وہی شوکر لگی تھی۔ کہاں ہے نیائے؟ کہاں ہے؟ ایک غریب آدمی کسی کھیت سے بالیس نوج کر کھا لیتا ہے، قانون اسے سزا دیتا ہے۔ دوسرا امیر آدمی دن دھاڑے دوسروں کو لوٹا ہے اور اسے پدوی ملتی ہے، ستان ملتا ہے۔ کچھ آدمی طرح طرح کے جھھیار باندھ کر آتے ہیں اور بریہہ، ڈریل مزدوروں پر آنک بجا کر اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ لگان اور ٹیکس اور محصول اور کتنے ہی ناموں سے اسے لوٹا شروع کر دیتے ہیں، اور آپ لبھا لبھا ویشن اُڑاتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں، ناچتے ہیں، رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ یہی ہے الٹور کا رچا ہوا سنسار؟ یہی نیائے ہے؟

ہاں! دیوتا ہمیشہ رہیں گے اور ہمیشہ رہے ہیں۔ انھیں اب بھی سنسار دھرم اور تپتی پر

چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے جیون کی آہوتی دے کر سنسار سے پدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن انھیں دیوتا کیوں کہو؟ کار کہو، سوار تھی کہو، آتم سیوی کہو۔ دیوتا وہ ہے جو نیائے کی رکھا کرے اور اس کے لیے پران دے دے۔ اگر وہ جان کر انجان بنتا ہے تو دھرم سے گرتا ہے۔ اگر اس کی آنکھوں میں کدو پوسٹھا کھٹکتی ہی نہیں تو وہ اندھا بھی ہے اور موزکھ بھی، دیوتا کسی طرح نہیں۔ اور یہاں دیوتا بننے کی ضرورت بھی نہیں۔ دیوتاؤں نے ہی بھاگیہ اور امیشور اور بھگتی کی ہتھیائیں پھیلا کر اس امنتی کو امر بنایا ہے۔ منس نے اب تک اس کا آنت کر دیا ہوتا یا سماج کا ہی آنت کر دیا ہوتا جو اس دشا میں زندہ رہنے سے کہیں اچھا ہوتا۔ نہیں، منشیوں میں منس بننا پڑے گا۔ دیندوں کے بچ میں ان سے لڑنے کے لیے ہتھیار باندھنا پڑے گا۔ ان کے بچوں کا شکار بننا دیوتا بن نہیں، بڑتا ہے۔ آج جو اتنے تعلقہ دار اور راجے ہیں وہ اپنے پورو جوں کی لوٹ کا ہی آند تو اٹھا رہے ہیں۔ اور کیا انھوں نے وہ جائیداد بچ کر پاگل بن نہیں کیا؟ پتروں کو چنڈا دینے کے لیے گیا جا کر چنڈا دینا اور یہاں آکر ہزاروں روپے خرچ کرنا کیا ضروری تھا؟ اور راتوں کو بڑوں کے ساتھ بھرے سننا، اور ٹانگ منڈلی کھول کر ہزاروں روپے اس میں ڈبانا اُتواریہ تھا؟ وہ اوشیہ پاگل بن تھا۔ انھیں کیوں اپنے بال بچوں کی چتا نہ ہوئی؟ اگر انھیں مفت کی سمپتی ملی اور انھوں نے اڑایا تو ان کے لڑکے کیوں نہ مفت کی سمپتی بھوگیں؟ اگر وہ جوانی کی اُمتوں کو نہیں روک سکے تو ان کے لڑکے کیوں پستا کریں؟

اور آنت میں ان کی ہڈکاؤں کو اس دھرتا سے تسکین ہوئی کہ اس اُبتی بھرے سنسار میں دھرم اُدھرم کا وچار غلط ہے، آتم گھات ہے۔ اور بوا کھیل کر یا دوسروں کے لوبھ اور آسکتی سے فائدہ اٹھا کر سمپتی کھڑی کرنا اتنا ہی برا یا اچھا ہے جتنا قانونی داو بچ سے۔ بیشک وہ مہاجن کے بیس ہزار کے قرض دار ہیں۔ بیتی کہتی ہے کہ اس جائیداد کو بچ کر اس کے بیس ہزار دے دیے جائیں۔ باقی انھیں مل جائیں۔ اگر قانون قرض دار کے ساتھ اتنا نیائے بھی نہیں کرتی تو قرض دار بھی قانون میں جتنی کھینچ تان ہو سکے، کر کے مہاجن سے اپنی جائیداد واپس لینے کی چھٹا کرنے میں کسی اُدھرم کو دوشی نہیں ٹھہر سکتا۔ اس شکرش پر انھوں نے شاستر

اور نیتی کے ہر ایک پہلو سے وچار کیا اور وہ ان کے من میں تم گیا۔ اب کسی طرح نہیں بل سکتا۔ اور یہ بھی اس سے ان کے چرچہ سنسکاروں کو آگہات لگتا تھا، پر وہ ایسے پُرسن اور پھولے ہوئے تھے مانو انھیں کوئی نیا جیون منتر مل گیا ہو۔

ایک دن انھوں نے سینٹہ گردھر داس کے پاس جا کر صاف صاف کہہ دیا ”اگر آپ میری جائیداد واپس نہ کریں گے تو میرے لڑکے آپ کے اوپر دعو کریں گے۔“

گردھر داس نئے زمانے کے آدمی تھے، انگریزی میں کٹھن، قانون میں پتھر، راج نیتی میں بھاگ لینے والے، کمپنیوں میں حصہ لیتے تھے، اور بازار اچھا دیکھ کر بیچ دیتے تھے، ایک شکر کا بل خود چلاتے تھے۔ سارا کاروبار انگریزی ڈھنگ سے کرتے تھے۔ ان کے پتا سینٹہ مکولال بھی یہی سب کرتے تھے، پر پوجا پاٹ، دان دکھنا سے پرانچھت کرتے رہتے تھے، گردھر داس بخودادی تھے، ہر ایک کام دیاپار کے قاعدے سے کرتے تھے۔ کرچاریوں کا دیتن پہلی تاریخ کو دیتے تھے، مگر بیچ میں کسی کو ضرورت پڑے تو سود پر روپے دیتے تھے، مکولال جی سال بھر دیتن نہ دیتے تھے، پر کرچاریوں کو برابر پیشگی دیتے رہتے تھے۔ حساب ہونے پر ان کو کچھ دینے کے بدلے کچھ مل جاتا تھا۔ مکولال سال میں دو چار بار افسروں کو سلام کرنے جاتے تھے، ڈالیاں دیتے تھے، جوتے اتار کر کمرے میں جاتے تھے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ چلتے وقت آدمیوں کو دو چار روپے انعام دے آتے تھے۔ گردھر داس مینہل کشن تھے، سوٹ بوٹ پہن کر افسروں کے پاس جاتے تھے اور برابری کا دیوہار کرتے تھے، اور آدمیوں کے ساتھ کیول اتی رعایت کرتے تھے کہ تیوہاروں میں تیوہاری دے دیتے تھے، وہ بھی خوب خشاہد کرا کے۔ اپنے حقوں کے لیے لڑتا اور آندولن کرنا جانتے تھے، مگر انھیں ٹھگن اُسمھو تھا۔

دیوکار کا یہ کٹھن سن کر چکرا گئے۔ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کی کئی پستکیں پڑھی تھیں، اور ان کی رچناؤں کا پورا سیٹ ان کی پستکالیہ میں تھا۔ ہندی بھاشا کے پریمی تھے اور ناگری پرچار سبھا کو کئی بار اچھی رقیں دان دے چکے تھے۔ پنڈا بھاریوں کے نام سے جڑھتے تھے، دوشہ دان پر تھا پر ایک پمفلٹ بھی چھپوایا تھا۔ لبرل وچاروں کے

لیے مگر میں ان کی کھیاتی تھی۔ مکولال مارے موٹاپے کے جگہ سے بل نہ سکتے تھے، گردھر داس مٹیلے آدمی تھے اور مگر دیپام شالا کے پردھان ہی نہ تھے، اچھے شہسوار اور نشانے باز تھے۔

ایک چمن تو وہ دیوکار کے منہ کی اور دیکھتے رہے۔ ان کا آشیہ کیا ہے، یہ سمجھ میں ہی نہ آیا۔ پھر خیال آیا بے چارے آرتھک سنکٹ میں ہوں گے، اس سے بددی بھرشت ہو گئی ہے۔ بے لگی باتیں کر رہے ہیں۔ دیوکار کے کھ پر وجے کا گرد دیکھ کر ان کا یہ خیال اور بھی مضبوط ہو گیا۔

سنہری عینک اتار کر میز پر رکھ کر دود بھاؤ سے بولے، کہیے، مگر میں تو سب کشل ہے؟ دیوکار نے دوروہ کے بھاؤ سے کہا۔ جی ہاں سب آپ کی کرپا ہے۔

بڑا لڑکا تو دکالت کر رہا ہے نہ؟

جی ہاں۔

مگر چلتی نہ ہو گی اور آپ کی پٹنیں بھی آج کل کم بکتی ہوں گی۔ یہ دلش کا ڈر بھاگیہ ہے کہ آپ جیسے سروسٹی کے پٹروں کا یہ انا در! آپ یورپ میں ہوتے تو آج لاکھوں کے سوامی ہوتے۔

آپ جانتے ہیں، میں بچگی کے اپاسکوں میں نہیں ہوں۔

دھن، سنکٹ میں تو ہوں گے ہی۔ مجھ سے جو کچھ سیوا آپ کہیں، اس کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تو گرد ہے کہ آپ جیسے پرتھاشالی پرش سے میرا پرتیچے ہے۔ آپ کی کچھ سیوا کرنا میرے لیے گورد کی بات ہو گی۔

دیوکار ایسے اوسروں پر نرتا کے پتلے بن جاتے تھے۔

بھکتی اور پرتھنادیکھ کر کوئی ان کا سردیہ لے سکتا تھا۔ ایک لکھتی آدمی اور وہ بھی ساتھ کا پریگی جب ان کا اتنا ستان کرتا ہے تو اس سے جائیداد یا لین دین کی بات کرنا انہیں لجا جنک معلوم ہوا۔ آپ کی اڈارتا ہے جو مجھے اس لائق سمجھتے ہیں۔

میں نے سمجھا نہیں آپ کس جائیداد کی بات کر رہے تھے۔

دیوکار سکوچا جاتے ہوئے بولے۔ اچی وہی، جو سیٹھ مکولال نے مجھ سے لکھائی تھی۔

اچھا تو اس کے دشنے میں کوئی نئی بات ہے؟

اسی معاملے میں لڑکے آپ کے اوپر کوئی دعوہ کرنے والے ہیں۔ میں نے بہت سمجھایا، مگر ماننے نہیں۔ آپ کے پاس اسی لیے آیا تھا کہ کچھ لے دے کر سمجھوتا کر لیجیے، معاملہ عدالت میں کیوں جائے؟ تاکہ دونوں زیر بار ہوں گے۔

گردھر داس کا ذہن، مزوت دار چہرہ کھنور ہو گیا۔ جن مہاجنی کھنوں کو انھوں نے بھدرتا کی نرم گدڑی میں چھپا رکھا تھا، وہ یہ کھٹکا پاتے ہی پینے اور اُگر ہو کر باہر نکل آئے۔
کرودھ کو دباتے ہوئے بولے، آپ کو مجھے سمجھانے کے لیے یہاں آنے کی تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان لڑکوں ہی کو سمجھانا چاہیے تھا۔
انھیں تو میں سمجھا چکا۔

تو جا کر شانت بیٹھے۔ میں اپنے حقوں کے لیے لڑنا جانتا ہوں۔ اگر ان لوگوں کے دماغ میں قانون کی گرمی کا اثر ہو گیا ہے تو اس کی دوا میرے پاس ہے۔
اب دیوکار کی سائیک نہرتا بھی اوجھلیت نہ رہ سکی۔ جیسے لڑائی کا پیغام سویکار کرتے ہوئے بولے۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے وہ ملکیت آج دو لاکھ سے کم کی نہیں ہے۔
دو لاکھ نہیں، دس لاکھ کی ہو، آپ سے سروکار نہیں۔
آپ نے مجھے بیس ہزار ہی تو دیے تھے۔

آپ کو اتنا قانون تو معلوم ہی ہوگا، حالانکہ کبھی آپ عدالت میں نہیں گئے، کہ جو چیز یک جاتی ہے وہ قانوناً کسی دام پر بھی واپس نہیں کی جاتی۔ اگر اس نئے قائدے کو مان لیا جائے تو اس شہر میں مہاجن نہ نظر آئیں۔

کچھ دیر تک سوال جواب ہوتا رہا اور لڑنے والے کتوں کی طرح دونوں بھلے آدمی، گراتے دانت نکالتے، کھوکھیاتے رہے۔ آخر دونوں لڑ ہی گئے۔
گردھر داس نے پرچند ہو کر کہا۔ مجھے آپ سے ایسی آشنائیں تھیں۔
دیوکار نے بھی چھڑی اٹھا کر کہا۔ مجھے بھی نہ معلوم تھا کہ آپ کے ساتھ کا پیٹ اتنا گہرا ہے۔

آپ اپنا سروناش کرنے جا رہے ہیں۔
کچھ پرواہ نہیں۔

دیوکار وہاں سے چلے تو ماگھ کی اس اندھیری رات کی نزدیكے ٹھنڈ میں بھی انھیں پسینا ہو رہا تھا۔ دجے کا ایسا گرد اپنے جیون میں انھیں کبھی نہ ہوا تھا۔ انھوں نے ترک میں تو بہتوں پر دجے پائی تھی۔ یہ دجے تھی جیون میں ایک نئی پریرنا، ایک نئی ہمتی کا ادے۔

اسی رات کو سنہا اور سنت کمار نے ایک بار پھر دیوکار پر زور ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں آکر کھڑے ہی تھے کہ دیوکار نے پروتاہن بھرے ہوئے بھاؤ سے کہا۔ تم لوگوں نے ابھی تک معاملہ دائر نہیں کیا۔ ناک کیوں دیر کر رہے ہو؟

سنت کمار کے سوکھے ہوئے نراش من میں اُلاس کی آندھی سی آگئی۔ کیا سچ کہیں ایثار ہے جس پر اسے کبھی وشواس نہیں ہوا؟ ضرور کوئی دیوی ہمتی ہے۔ بھیک مانگنے آئے تھے ورنہ ان مل گیا۔

بولا۔ آپ ہی کی انومتی کا انتظار تھا۔

میں بڑی خوشی سے انومتی دیتا ہوں۔ میرے آشرود تمھارے ساتھ ہیں۔

انھوں نے گردھر داس سے جو باتیں ہوئیں وہ کہہ سنائیں۔

سنہا نے ناک پھلا کر کہا۔ جب آپ کی دعا ہے تو ہماری فتح ہے۔ انھیں اپنے دھن کا سمجھنا ہوگا، مگر یہاں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔

سنت کمار ایسا خوش تھا گویا آدمی منزل طے ہو گئی۔ بولا آپ نے خوب اُچھ جواب

دیا۔

سنہا نے تنی ہوئی ڈھولکی سی آواز میں چوٹ ماری۔ ایسے ایسے سیٹھوں کو انگلیوں پر

نچاتے ہیں یہاں۔

سنت کمار سوچنے دیکھنے لگے۔ یہیں ہم دونوں کے بچنے نہیں گے دوست۔

یہاں کیوں، سیول لائنس میں بنوائیں گے۔

انداز سے کتنے دن میں فیصلہ ہو جائے گا؟

چھ مہینے کے اندر۔

بابو جی کے نام سے سروسٹی مندر بنوائیں گے۔

مگر سسہ تھی روپے کہاں سے آویں۔ دیوکار سنہرہ آدی تھے۔ دھن کی کبھی اُپاسنا نہیں کی۔ کبھی اتنا زیادہ ملائی نہیں کہ سچے کرتے۔ کسی مہینے میں پچاس جمع ہوتے تو دوسرے مہینے میں خرچ ہو جاتے۔ اپنی ساری پستکوں کا کاپی رائٹ بچ کر انھیں پانچ ہزار ملے تھے۔ وہ انھوں نے جنگجا کے وواہ کے لیے رکھ دیے تھے۔ اب ایسی کوئی صورت نہیں تھی جہاں سے کوئی بڑی رقم ملتی۔ انھوں نے سمجھا تھا سنت کمار گھر کا خرچ اٹھالے گا اور وہ کچھ دن آرام سے بیٹھیں گے یا گھومیں گے۔ لیکن اتنا بڑا منصوبہ باندھ کر وہ اب شانت کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟ ان کے بھکتوں کی کافی تعداد تھی۔ دو چار راجے بھی ان کے بھکتوں میں تھے جن کی یہ پرانی لالسا تھی کہ دیوکار جی ان کے گھر کو اپنے جہنوں سے پوچھ کر لیں اور وہ اپنی شردھا ان کے جہنوں میں اپن کر لیں۔ مگر دیوکار تھے کہ کبھی کسی دربار میں قدم نہیں رکھا، اب اپنے پریموں اور بھکتوں سے آرتھک سنکٹ کا رونا رو رہے تھے اور کھلے شبدوں میں سہایتا کی یاچنا کر رہے تھے۔ وہ آتم گورو جیسے کسی قبر میں سو گیا ہو۔

اور شکھر ہی اس کا پرنام نکلا۔ ایک بھکت نے پرستاؤ کیا کہ دیوکار جی کی ساٹھویں سالگرہ دھوم دھام سے منائی جائے اور انھیں ساہتیہ پریمیوں کی اور سے ایک قلیل سمینٹ کی جائے۔ کیا یہ لہجہ اور دکھ کی بات نہیں ہے کہ جس مہاراجے نے اپنے جیون کے چالیس ورش ساہتیہ سیوا پر اُتر پین کر دیے، وہ اس ور ڈھا اوستھا میں بھی آرتھک چتاؤں سے مکت نہ ہو؟ ساہتیہ یوں نہیں پھل پھول سکتا۔ جب تک ہم اپنے ساہتیہ سیویوں کا ٹھوس ستکار کرنا نہ سیکھیں گے، ساہتیہ کبھی اُٹھی نہ کرے گا، اور دوسرے ساچار پتروں نے ملک کٹھ سے اس کا ستر تھن کیا۔ اچرج کی بات یہ تھی کہ وہ مہانو بھاؤ بھی جن کا دیوکار سے پرانا ساہتیہک ویمسنہ تھا، وہ بھی اس اُوسر پر اُدارتا کا پرچم دینے لگے۔ بات چل پڑی۔ ایک کمیٹی بن گئی۔ ایک راجا صاحب اس کے پردھان بن گئے۔ ستر سنہانے کبھی دیوکار کی کوئی پستک نہ پڑھی تھی، پر وہ اس آندولن میں بدھک بھاگ لیتے تھے۔ مس کامت اور مس ملک کی اور سے بھی ستر تھن ہو گیا۔ مہیلاؤں کو پرشوں سے پیچھے نہ رہنا چاہئے۔ جیٹھ میں تیجھی بچھ ہوئی۔ مگر کے انٹر میڈیٹ کالج میں اس آتم کی تیاریاں ہونے لگیں۔

آخر وہ تیتھی آگئی۔ آج شام کو وہ اتسو ہو گا۔ دوردور سے ساتھ پریمی آئے ہیں۔ سوراؤں کنور صاحب وہ قہلی بھینٹ کریں گے۔ آٹھاسے زیادہ بجن جمع ہو گئے ہیں۔ دیاکھیان ہوں گے گاٹا ہوگا، ڈرامہ کھیلا جائے گا، پریتی۔ بھوج ہوگا، کوئی تسمیلن ہوگا۔ شہر میں دیواروں پر پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ سنجے سماج میں اچھی ہلہل ہے۔ راجا صاحب سہا پتی ہیں۔

دیوکار کو تماشا بننے سے نفرت تھی۔ پبلک جلسوں میں بھی کم آتے جاتے تھے۔ لیکن آج تو بارات کا دولہا بنا ہی پڑا۔ جیوں جیوں سہا میں جانے کا سہ سمپ آتا تھا ان کے من پر ایک طرح کا اوساد چھایا جاتا تھا۔ جس وقت قہلی ان کو بھینٹ کی جائے گی اور وہ ہاتھ بڑھا کر لیں گے وہ درشہ کیسا لہجہ جنک ہوگا۔ جس نے کبھی دھن کے لیے ہاتھ نہیں پھیلایا وہ اس آخری وقت میں دوسروں کا دان لے؟ یہ دان ہی ہے، اور کچھ نہیں۔ ایک چھن کے لیے ان کا آتم ستان وڈرو ہی بن گیا۔ اس اوسر پر ان کے لیے شوبھا یہی دیتا ہے کہ وہ قہلی پاتے ہی اسی جگہ کسی سا روتھک سنسٹھا کو دے دیں۔ ان کے جیون کے آدرش کے لیے یہی انوکول ہوگا، لوگ ان سے یہی اشارہ کھتے ہیں، اسی میں ان کا گورو ہے۔ وہ پنڈال میں پہنچے تو ان کے کھ پر اُلاس کی جھلک نہ تھی۔ وہ کچھ کھسائے سے لگتے تھے۔ نیک نامی کی لالسا ایک اور کھینچتی تھی، لوبھ دوسری اور۔ من کو کیسے سمجھائیں کہ یہ دان دان نہیں، ان کا حق ہے۔ لوگ نہیں گے، آخر پیسے پر ٹوٹ پڑا۔ ان کا جیون بڑھک تھا، اور ہڈی جو کچھ کرتی ہے ننتی پر کس کر کرتی ہے۔ ننتی کا سہارا مل جائے تو پھر وہ دنیا کی پرواہ نہیں کرتی۔ وہ پہنچے تو سواگت ہوا، منگل گان ہوا، دیاکھیان ہونے لگے۔ جن میں ان کی کیرتی گائی گئی۔ مگر ان کی دشا اس آدمی کی سی ہو رہی تھی جس کے سر میں درد ہو رہا ہو۔ انھیں اس وقت اس درد کی دوا چاہئے۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ سبھی وڈوان ہیں، مگر ان کی آلوچنا کتنی قہلی، اوپری ہے جیسے کوئی ان کے سندیشوں کو سمجھا ہی نہیں، جیسے یہ ساری واہ واہ اور سارا یشگان اندھ بھلکی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کوئی بھی انھیں نہیں سمجھا۔ کس پر پریتا نے چالیس سال تک انھیں سنبھالے رکھا، وہ کون سا پرکاش تھا جس کی جیوتی کبھی مند نہیں ہوئی۔

سہا انھیں ایک آشریہ مل گیا اور ان کے دچار شیل، پہلے کھ پر ہلکی سی سرفی دوڑ گئی۔ یہ دان نہیں پراوینٹ فنڈ ہے جو آج تک ان کی آمدنی سے کٹتا جا رہا ہے۔ سرکار کی نو

کری میں لوگ بیٹھن پاتے ہیں، کیا وہ دان ہے؟ انھوں نے ہنسا کی سیوا کی ہے، تن
 من سے کی ہے، اس دھن سے کی ہے، جو بڑے سے بڑے دھن سے بھی نہ آسکتی
 تھی۔ بیٹھن لینے میں کیوں لاج آئے؟
 راجا صاحب نے جب حیلی بیٹھ کی تو دیوکار کے منہ پر گرد تھا، ہر ش تھا،
 دے تھی۔

